تعلیم و تدریس

مباحث و مسائل



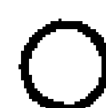
ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی



پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد

تعلیم و تدریس

مباحث و مسائل



ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی

پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد

حکومت پنجاب محکمہ تعلیم سے منظور شدہ
(برائے سکولز / کالجز / تعلیمی ادارے / پبلک لائبریریز)
بذریعہ چٹھی نمبر
ایس ۔او (اے ۔iv)۔۴۔۲۳/۹۸ مورخہ ۳ جولائی ۱۹۹۸

کتاب : تعلیم و تدریس: مباحث و مسائل
مصنف : ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی
پروفیسر آف ایجوکیشن
انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ
یونیورسٹی آف دی پنجاب' لاہور (پاکستان)
ناشر : پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن
گرین پلازہ بلاک نمبر ۳۳ 'جی ۹ مرکز' اسلام آباد
طابع : شرکت پرنٹنگ پریس
۴۳۔ نسبت روڈ' لاہور
کمپوزر : کلاسک کمپوزرز
80۔ چوک نسبت روڈ لاہور
طبع اول : مارچ 1998ء
طبع دوم : جون 1998ء
قیمت : 250 روپے

اسٹاکسٹ

الائیڈ بک کمپنی۔ نئی مارکیٹ 75 دی مال۔ لاہور
الائیڈ بک کمپنی۔ بشیر پلازہ بالمقابل جی پی ایس صدر۔ راولپنڈی
الائیڈ بک کمپنی۔ چنیوٹ بازار۔ فیصل آباد

انتساب

طلبہ و اساتذہ میں
اسلام دوستی، حب الوطنی، پیشہ تدریس سے گہری وابستگی
اور حصول علم کی آرزو تخلیق کرنے والے
عظیم استاد، ممتاز مفکر تعلیم

گرامی قدر جناب علامہ سید غلام شبیر بخاری کے نام

ترتیب

مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات

چند دیگر مباحث و مسائل

پیش لفظ

آج دنیا میں مغربی تصورات کا غلبہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ مغربی افکار کی اساس انکار آخرت اور لادینیت (Secularism) پر ہے۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد سے لادینیت کا فلسفہ مغرب میں امر مسلم بن چکا ہے۔ چنانچہ مغرب میں انسان کے حیوانیاتی (Biological) تصور کے تحت وہاں کا تعلیمی تصور بھی بالعموم معلوماتی ہے' اور اسی کے زیر اثر "تدریس" کا تصور بھی محض "سدھانے" کے مترادف بن چکا ہے۔ یہ سب انسان کے مادی تصور کے شاخسانے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم و تحقیق کے نام سے مغربی جامعات میں جو کچھ تحقیق ہوتی ہے' وہ صرف اس قدر ہے کہ بہتر سے بہتر "طریقہ تدریس" کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن انسان کا مقصد حیات کیا ہے' اس کی تعلیم کیا ہونی چاہیے' اس پر صدیوں سے گفتگو بند ہے۔ اس وجہ سے مغرب کی جامعات کے پروردہ اساتذہ بالعموم مغربی انداز فکر کے حامل بن جاتے ہیں اور اس پر دل و جان سے قائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ مغربی تعلیم کے باوجود اسلامی ورثے کا غلبہ رہتا ہے۔ ان کا ذہن اسلامی فکری آفاق میں سرگرمی دکھاتا ہے۔ ان کا فکری ترشح اسلامی انداز فکر کی غمازی کرتا ہے ـــــ محترم ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی ایسے ہی افراد میں سے ہیں جو ڈاکٹریٹ کے ضمن میں ایک مغربی جامعہ کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ وہاں کی تعلیم و تحقیق سے استفادہ بھی کیا ہے' لیکن مرعوب و مغلوب ذہن سے نہیں' بلکہ تنقیدی شعور اور غالب ذہن کے ساتھ۔ ڈاکٹر صاحب ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور میں پروفیسر آف ایجوکیشن ہیں۔ وہ ایک مدت سے درجات اور مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں اسی انداز میں لیکچر دیتے رہے ہیں۔ ان کے یہ لیکچرز' مقالات کی شکل میں ملک کے معروف تعلیمی جرائد نے شائع کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعلیمیات کے موضوع پر اردو اور انگریزی میں بہت کچھ لکھا' لیکن زیر نظر مجموعے میں صرف "تعلیم و تدریس" سے متعلق اردو مقالات کو ہی شامل کیا ہے جسے "پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد" نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس کے لئے مصنف اور ناشر دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں۔

حقیقت میں اسلامی نظام تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ تعلیم' انسان کو (جو ہوش و خرد کی

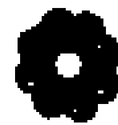
حامل ایک ذی روح ہستی ہے) اس قابل بناتی ہے کہ وہ اس طرح زندگی بسر کرے کہ آخرت میں کامیاب ہو اور خالق حقیقی کے سامنے سرخ رو ہو۔ ظاہر ہے ایسے انسان کے لئے مطلوب تعلیم نہ تو یک رخی ہوگی اور نہ ادھوری' بلکہ برتر اور بالاتر سرچشمہ علم وحی الٰہی کے بنیاد پر وہ جامع' متوازن اور صحت مند اقدار کی حامل ہوگی۔ اس تناظر میں "تعلیم و تدریس" کے حوالے سے اسلام کے نزدیک تربیت کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ استاد اپنی شخصیت' کردار اور روشن مثال' طلبہ کے سامنے پیش کرتا ہے۔ طلبہ اپنے استاد کی ذات سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ اسی طرح اسلامی انداز فکر' تعلیم کا جامع اور ہمہ گیر تصور رکھتا ہے۔ طلبہ و اساتذہ ایک طرف دینی و اخلاقی تربیت کے حامل ہوتے ہیں اور دوسری طرف دنیاوی تعلیم اور دیگر فنی امور میں بھی مہارت رکھتے ہیں یوں ان کی شخصیت "تعلیم و تربیت" کا حسین مرقع ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان کی جامعات کے شعبہ ہائے تعلیم و تدریس میں جو تعلیم دی جاتی ہے' اس کی فکری اساس عام طور پر مغربی جامعات سے اخذ کردہ ہے۔ وہ طلبہ کو مغربی انداز فکر و نظر سکھاتی ہے۔ یوں یہ "تربیت یافتہ" اساتذہ ساری عمر اس "مستعار فکر" کی ترویج و اشاعت کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ مغربی نظریات کے تحت تعلیم حاصل کرنے کے سبب' تعلیمیات کے اکثر طلبہ یہ یقین کر بیٹھتے ہیں کہ فن تعلیم کے مباحث پر جو کچھ ملتا ہے' وہ تو صرف مغربی اساتذہ اور مفکرین کا ہی تحریر کردہ ہے۔ مسلمان علماء اور حکماء نے تو اس میدان میں خالص فنی نقطہ نظر سے کچھ لکھا ہی نہیں۔

بدقسمتی سے پاکستان کی موجودہ نسل نہ تو عربی زبان سے واقف ہے اور نہ فارسی زبان و ادب سے۔ بلکہ وہ تو اردو زبان میں موجود عظیم علمی' ادبی اور تہذیبی سرمائے سے بھی بہت کم شناسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تاریخی' تعلیمی اور ثقافتی ورثے سے بالعموم بے خبر بھی ہے اور بے تعلق بھی۔ چنانچہ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ جہاں اسلامی فکر و ثقافت اور عربی' فارسی' اردو ادبیات کے حوالے سے تربیت اساتذہ کے مروجہ نصابات کی تشکیل نو کی جائے' وہاں ہمارے اساتذہ' علم التعلیم کے مختلف موضوعات پر اپنی قومی زبان میں اسلامی نظریہ و روایت اور منضبط مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں قابل ذکر لٹریچر بھی پیش کریں' تاکہ تربیت اساتذہ سے متعلق افراد اس سے استفادہ کر سکیں۔۔۔۔۔ زیر نظر مجموعہ مقالات اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی نے مسلمانوں کے علمی ثمرات اور جدید تعلیمی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے تعلیمیات سے متعلق اہم نکات کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے اور اس طرح اردو زبان میں معیاری تعلیمی ادب میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔ انہوں نے حکمت تعلیم' حکمت تدریس' مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات اور تعلیمی مسائل کے تحت'

عمل تعلیم کے مختلف عناصر اور دیگر اصولی مباحث کو نظریاتی تناظر میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ ہر چند کہ یہ مقالات اپنے موضوعات کے حوالے سے بڑے متنوع ہیں لیکن فکری وحدت کی بنا پر' یہ ایک واضح تعمیری نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ تعلیم و تدریس سے دلچسپی رکھنے والے افراد اس کتاب کو یقیناً مفید پائیں گے۔ میں محترم پروفیسر ڈاکٹر مشتاق الرحمن صدیقی کے مجموعہ مقالات کا دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے اور اس کتاب کو علمی حلقوں میں مقبولیت عطا کرے۔

سید محمد سلیم
سابق پرنسپل شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج' منصورہ' سندھ
پروفیسر (ریٹائرڈ) گورنمنٹ کالج' شکار پور' سندھ
ڈائریکٹر ریسرچ' ادارہ تعلیمی تحقیق' تنظیم اساتذہ پاکستان

کراچی
۱۲۔ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ
۱۳۔ جنوری ۱۹۹۸ء



تقریظ

تعلیمات کے موضوع پر اردو میں معیار و مقدار کے اعتبار سے کتب و جرائد کی شکایت عام ہے اور انگریزی میں جو کچھ دستیاب ہے وہ غیر ملکی اور عموماً" آوٹ آف ڈیٹ ہے۔ ایسے میں استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی کے تعلیمی مقالات کے مجموعے کی اشاعت تعلیمات کے طلبہ ہی نہیں، اساتذہ و محققین کے لئے بھی ایک مژدہ سے کم نہیں۔ غنیمت ہے کہ اس طرح ڈاکٹر صاحب کے فکر و مطالعہ کی تحریری جھلک تو منظر عام پر آئی۔ امید کی جاسکتی ہے کہ آئندہ ان کے رشحات قلم کی مزید جھلکیاں بھی نظر نواز ہوتی رہیں گی۔

زیر نظر مجموعہ انتیس مقالات پر مشتمل ہے۔ آٹھ مقالات حکمت تعلیم کے زیر عنوان حصہ اول میں شامل ہیں جو اسلامی تناظر میں تعلیم کی تعبیر و توجیہہ اور اس حوالے سے مغربی تعلیم و ثقافت کی تنقیدی جائزے پر مشتمل ہیں۔ ان مقالات میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کے رہنما خطوط موجود ہیں جن سے تعلیمی منصوبہ ساز خاطر خواہ فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔ مجموعے کا حصہ دوم حکمت تدریس کے زیر عنوان مقالات پر مشتمل ہے۔ تعلیم کا مقصود ہے تعلم جبکہ تدریس، تعلم کو انگیز کرنے کا عمل ہے۔ گویا تدریس موثر ہوگی تو تعلم کا حصول ممکن ہوگا۔ یوں تعلم کے کیف و کم کا انحصار تدریس پر ہے۔ دراصل تعلیم کا عملی اظہار تدریس ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی عملی معلم کی حیثیت سے اپنے تجربے کی وسعت اور اپنے مطالعے کی گہرائی کی وجہ سے عمل تدریس کی اس اہمیت کا کامل شعور رکھتے ہیں۔ لہذا زیر نظر مجموعے میں حکمت تدریس پر مقالات کی تعداد دوسرے عنوانات سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان مقالات میں تدریس کے فنی اور اخلاقی و معاشرتی دونوں پہلوؤں کا متوازن جائزہ پیش کیا ہے اور اس تناظر میں معلم کے مرتبہ و مقام، اس کے اوصاف و فرائض اور قائدانہ کردار پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں نمایاں امر یہ ہے کہ ان مباحث میں ڈاکٹر صاحب کے رشحات فکر، معلم انسانیت حضور نبی مکرم ﷺ کے اسوہ مبارکہ سے مستفاد ہیں۔

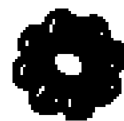
مسلمان مفکرین کے تعلیمی نظریات کے زیر عنوان صرف تین مشاہیر اسلام سید علی ہجویری، علامہ اقبال اور امام المودودی شامل کتاب ہیں۔ یہاں بھی ڈاکٹر صدیقی کا حسن انتخاب

قابل صد تحسین ہے۔ سید علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ صوفیانہ روحانی فکر کے میدان میں سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمتہ فلسفیانہ علمی انداز کے شہسوار ہیں اور امام المودودی رحمتہ اللہ علیہ علمی و روحانی دونوں پہلوؤں کے جامع ہیں۔ یوں ڈاکٹر صاحب نے اسلامی فکر و تصوف کا نچوڑ قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

زیر نظر کتاب تعلیمیات کے موضوع پر مستقل تصنیف نہیں' بلکہ ایک مجموعہ مقالات ہے اور مقالات بھی بیس پچیس سال کی طویل مدت پر پھیلے ہوئے ہیں لیکن زمانی بعد کے باوجود ان مقالات میں ایک فکری ربط موجود ہے جو ڈاکٹر صاحب کی فکری ہم آہنگی پر دلالت کرتا ہے۔ پھر "چند دیگر مباحث" کے زیر عنوان متفرق مقالات کی وجہ سے کتاب میں ایک جامعیت پیدا ہوگئی ہے اور تعلیمی عمل کی ماہیت کے اعتبار سے مقاصد اور ان کی اساسیات' نصاب' حکمت تدریس اور انتظامیات سبھی پہلوؤں کی کفالت ہوگئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب' اساتذہ' محققین اور تعلیمی منصوبہ سازوں کے لیے اہم حوالے کا کام دے گی اور تعلیمیات کے طلبہ کی درسیات کی بہت حد تک کفالت کرے گی۔ تعلیم و تعلم سے متعلق افراد اور اداروں کو ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن صدیقی کی اس کاوش سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور ڈاکٹر صاحب کو اس میدان میں اپنا راہوار قلم رواں دواں رکھنا چاہیے تاکہ قارئین کو ان کی ضرورت اور حسن ذوق کے مطابق مطالعاتی مواد دستیاب ہوتا رہے۔ اللھم زد فزد۔

منور ابن صادق
استاذ' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب
چیئرمین' اسلامک ایجوکیشنل ٹرسٹ

لاہور
۴۔ شوال ۱۴۱۸ھ
یکم۔ فروری ۱۹۹۸ء



حرف سپاس

"تعلیم و تدریس" میرے ان اردو مضامین کا ایک انتخاب ہے' جو مختلف مواقع پر لکھے یا پڑھے گئے' اور بعد ازاں ملکی جرائد میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کا انتخاب بلاشبہ ایک مشکل مرحلہ تھا' لیکن رفیق محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم خالد (چیئرمین ڈیپارٹمنٹ آف ایلیمنٹری ایجوکیشن' انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ' پنجاب یونیورسٹی' لاہور) نے ان مضامین کے انتخاب اور ترتیب و اشاعت کے مختلف مراحل میں جس اخلاص اور محنت کا مظاہرہ کیا' میں اس کے لئے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد کی مجلس انتظامیہ بالخصوص اس کے چیئرمین اور اپنے انتہائی محترم استاد جناب پروفیسر ڈاکٹر شوکت علی صدیقی کا بھی صمیم قلب سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی۔ درحقیقت یہ کتاب' استاد محترم کی تحریک اور قدر افزائی ہی کا نتیجہ ہے' ورنہ شاید بعض مراحل طے نہ ہو پاتے۔ میں ملک کے معروف مفکر تعلیم' محترم و مکرم جناب پروفیسر سید محمد سلیم کی پیہم شفقتوں اور حوصلہ افزائیوں کا بھی خلوص دل سے احسان مند ہوں' جو مسلسل ذوق پرواز عطا کرتی رہیں۔ میں ان کی یہ نوازش کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے شدید مصروفیات اور علالت کے باوجود اس کتاب کے لئے گراں قدر "پیش لفظ" عطا فرما کر میری عزت افزائی فرمائی۔ میں "تعلیمیات" کے ممتاز استاد اور محقق' رفیق مکرم جناب پروفیسر منور ابن صادق کا بھی شکر گزار ہوں' جنہوں نے "تقریظ" کی صورت میں اپنے کلمات تحسین سے نوازا۔

میں "محسن انسانیت ﷺ" کے مولف اور نامور ادیب' محترم جناب نعیم صدیقی کا دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں' جن کی پیہم حوصلہ افزائی نے نہ صرف اس مجموعے کی ترتیب پر راقم کو آمادہ کیا' بلکہ تعلیم و تدریس سے متعلق بعض فکری نکات کی تعبیر و توضیح میں اپنی قیمتی آراء سے مستفیض فرمایا۔ میں ملک کے معروف صحافی پروفیسر عرفان صدیقی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتاب کی تدوین و ادارت میں قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں ان تمام سکالرز اور احباب کا ممنون ہوں' جن کی نگارشات اور آراء سے میں نے کسی نہ کسی انداز میں استفادہ کیا۔

مجھے اس کا شدت سے احساس ہے کہ تعلیم و تدریس سے متعلق جن

معیاری تحقیقی مقالات کی ضرورت ہے' میں اس کا حق ادا نہیں کر سکا۔ البتہ میں نے اخلاص سے جو سوچا' اسے نذر قارئین کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ مجموعہ مقالات' تعلیمیات کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کی دعوت ضرور دے گا۔ میری دعا ہے کہ میری یہ عاجزانہ کوشش بارگاہ ایزدی میں شرف قبولیت حاصل کرے اور وہ ان تمام افراد کو جنہوں نے اس علمی کام میں تعاون فرمایا' جزائے خیر عطا فرمائے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ یہ کتاب اگر کسی کار خیر کا باعث بنے تو اس کا سہرا ان ہی حضرات کے سر ہے۔

میں اپنے محترم قارئین کا شکر گزار ہوں گا اگر وہ کتاب میں ممکنہ فروگزاشتوں سے آگاہ فرمائیں' تاکہ اگر اگلا ایڈیشن شائع کرنے کا موقع ملے' تو ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

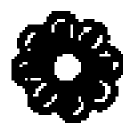
ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا۔

لاہور

۲۴۔ ذیقعد ۱۴۱۸ھ

۲۴۔ مارچ ۱۹۹۸ء

مشتاق الرحمٰن صدیقی



حکمت تعلیم

اسلامی حکمت تعلیم

اسلامی نظام تہذیب' فلاح انسانیت کے لئے ہے۔ یہ ایک معیاری انسانی تہذیب ہے جو پوری انسانیت کے لئے نیکی کا ایک پیمانہ دیتی ہے۔ یہ ایک خاص طرز کا انسان بنانا چاہتی ہے جو دنیائے انسانیت کے لئے باعث فلاح ہو۔ اس منفرد انسان کی تعمیر کے لئے حصول علم بنیادی قدر ہے' جس سے مراد' توحید و رسالت کی روشنی میں خیرو شر کا امتیاز ہے۔ دنیا کے سارے تمدن' سارے افکار' سارے علوم و فنون' ساری تہذیب اور ساری حکومتوں کو پرکھنے کی کسوٹی بھی یہی ہے۔ چنانچہ زندگی کا وہ علم جو فوز و فلاح کے معیار پر پورا اترتا ہے وہی نافع ہے ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس طرح کے نظام تہذیب کے احیاء کے لئے اہم ترین ذریعہ اسلامی نظام تعلیم ہے جو اس بنیادی نظریہ پر قائم ہے کہ علم حقیقت میں اللہ کا عطا کردہ ہے۔ علم کے سارے خزانے اسی کے پاس ہیں اور حواس و قیاس سے بالاتر ذریعہ علم وحی الٰہی ہے' جس کی صورت قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان یا پہلے نبی کو درحقیقت انسانیت کا معلم ہی بنا کر بھیجا ہے۔ ہدایت الٰہی کے تحت' اس نبی نے تعلیم کے جس کار خیر کا آغاز کیا تھا' اللہ تعالیٰ نے اس کی تکمیل نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعے کرائی اور انسانیت کی فلاح کے لئے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم آپؐ پر اتاری۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے اہم مقاصد یہ تھے کہ آپؐ اللہ کی کتاب یعنی قرآن حکیم کے متن کو من و عن انسانیت تک پہنچائیں' اس کی روشنی میں انسانوں کا تزکیہ کریں تاکہ وہ خیر کی طرف مائل ہوں اور شر سے متنفر۔ اس کے ساتھ ساتھ آپؐ انسانوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیں تاکہ وہ اپنی توانائیوں' قابلیتوں اور مادی وسائل کو انسانیت کی بہتری کے لئے استعمال کریں۔ اس حوالے سے چاہے کوئی سا بھی زمانہ ہو یا کوئی سا بھی علاقہ' اسلامی نظام تعلیم کی عمارت کی اٹھان ان ہی مقاصد اور اسی حکمت کامل (Perfect Wisdom) کی بنیاد پر ہوگی جس کا برتر اور قطعی ماخذ وحی الٰہی ہے۔

اسلامی تناظر میں تعلیم کا مفہوم

درج بالا نظریہ علم کی روشنی میں' اسلامی تعلیم کا مفہوم ان نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

1- تعلیم کا لفظ علم سے نکلا ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا جاننا اور ادراک کرنا۔ لغت کی رو سے علم کے معنی معلوم کرنے یا جاننے کے ہیں۔ چنانچہ تعلیم کا لغوی معنی

معلومات بہم پہنچاتا اور علم سے مستفید کرتا ہے۔

2- سادہ لفظوں کے طور پر ایک نسل کا اپنے تجربات کو اگلی نسل کی طرف منتقل کرنا تعلیم کہلاتا ہے۔ اس طرح تعلیم صرف انتقال معلومات کا نام ہے۔ لیکن تعلیم کی یہ محدود تعریف تو کسی حد تک حیوانات پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ حیوان کے ہاں چاہے بے ڈھب انداز میں ہی سہی، تعلیمی عملیہ تو ہے، تعلیمی نظریہ کوئی نہیں۔ انسان کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ اس کے پاس تعلیمی عملیہ بھی ہے اور تعلیمی نظریہ بھی۔ اسے جہاں حیات جسمانی کے مسائل اور تقاضوں کا شعور حاصل کرتا ہے، وہاں فطری اخلاقی رجحان کے تحت تقسیم خیروشر کا علم بھی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے تعلیم صرف سیکھنے سکھانے کا نام نہیں اور نہ محض الل ٹپ انتقال معلومات کا نام ہے۔ بلکہ حقیقت میں یہ ایک معاشرتی عمل ہے جس کے ذریعے ایک معاشرہ اپنا حیاتیاتی تسلسل بھی قائم رکھتا ہے اور تہذیبی تسلسل بھی۔ یعنی انسان کی ایک طبعی خواہش، تسلسل حیات اور افزائش نسل ہے، لیکن ایک خواہش یہ بھی ہے کہ اس کے اخلاقی یا روحانی وجود کا تسلسل بھی جاری رہے۔ اس حوالے سے انسانی تعلیم، تمدنی اور تہذیبی علوم کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ یہ عناصر مل کر ہی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کرتے ہیں۔

3- انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان کی سطح صرف جبلی (Instinctual) ضروریات کی تکمیل ہے۔ یعنی وہ صرف اپنی حیاتیاتی احتیاجات کی تکمیل کا محتاج (Need-Oriented) ہے۔ اس کے برعکس انسان جائز اور طیب فطری ضروریات کے خلاف نہیں لیکن وہ بنیادی طور پر زندگی کی معنویت اور مقصدیت کا طالب (Goal-Oriented) ہے۔ اس پس منظر میں انسان اور حیوان کے درمیان فیصلہ کن چیز روحانی فرق ہے۔ معاشرتی، معاشی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی نیز جمالیاتی پہلو اسی روح کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ انسان کو یہ مقصد، علم ہی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں اسلامی تعلیم درحقیقت انسانی ضروریات اور دلچسپیوں کی تہذیب ہے اور اس طرح صحیح تعلیم وہی ہو گی جو اسلامی معتقدات کی روشنی میں مقصد حیات اور فرائض خلافت کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور جو "ینفع الناس" کے معیار پر پوری اترتی ہو کیونکہ قرآن حکیم کی یہ وعید ہے کہ وہ چیز جو نفع رسانی کرتی ہے وہ زمین میں قائم رہتی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

ترجمہ :- "جھاگ تو سوکھ کر ناکارہ ہو جاتی ہے اور جس چیز سے عالم انسانیت کو منفعت پہنچتا ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رکھی جاتی ہے۔" (الرعد : 17، ترجمہ : سید شبیر بخاری، الاختصار البیان فی معانی القرآن ص 252)۔

4- تعلیم کا وسیع اور جامع تصور [illegible]

ساتھ ساتھ مختلف نسلوں کے جمع شدہ تمدنی اور تہذیبی تجربات و معلومات کو بھی اسلامی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھ کر اور تطہیر (Purification) کے عمل کے بعد نئی نسل کی طرف منتقل کرے۔ اس حوالے سے تعلیم، علم الادیان (Normative Science) اور علم الابدان (Physical Science) کی متوازن تحصیل کا نام ہے۔ البتہ تمام علوم معقولات (Rational Knowledge) اور علوم محسوسات (Empirical Knowldege) لازماً علوم مغیبات (Revealed Knowledge) کے تابع ہوں گے۔

-5 تعلیم کا مرکزی تصور چند بنیادی حقیقتوں سے متعلق افکار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ خدا، انسان، کائنات، آخرت، یہ انسانی زندگی کی اہم حقیقتیں ہیں۔ ان کے متعلق اثباتاً یا نفیاً کوئی نہ کوئی رائے یا عقیدہ قائم کئے بغیر چارہ نہیں۔ اس حوالے سے زندگی کا اساسی نظریہ درحقیقت عرفان خدا، شعور کائنات، تصور انسان، تصور علم اور تصور قدر پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلام کی روشنی میں یہ اساسی نظریہ، قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ کی تعلیمات سے ترتیب پاتا ہے اور یہی اساسی نظریہ، عمل تعلیم (Process of Education) کے تمام عناصر کو باہم مربوط (Coordinate) کرتا ہے۔

-6 تعلیم ـــــ جسم، ذہن اور روح کی متوازن، صحت مند اور جامع نشوونما کا نام ہے۔ اسلامی تعلیم نہ ترک دنیا کی قائل ہے اور نہ غلوفی الدنیا کی۔ وہ بدن کے حقوق اور روح کے مطالبات کی منصفانہ تکمیل کی قائل ہے۔ چنانچہ اسلامی تناظر میں متوازن شخصیت وہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل بجا لائے اور جو اللہ کی رضا کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرے اور ہر اس قول و فعل سے اجتناب کرے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس جو شخص نفس امارہ کے تابع ہو گا وہ لازماً عدم تسویہ (Mal-Adjustment) کا شکار ہو گا۔

-7 اسلامی تناظر میں تعلیم کا ایک اہم مفہوم یہ بھی ہے کہ انسان کو عمدہ اخلاق سے مزین کر کے فلاح و سعادت کے راستے پر ڈالا جائے اور اس کے تمام امور اللہ کی رضا کے تابع کئے جائیں۔ یعنی اسلامی تعلیم وہ ہے جو ان اقدار کی ترویج اور فروغ کا وسیلہ بنے جن کو اسلام بنی نوع انسان کے اندر پروان چڑھانا چاہتا ہے۔

-8 انسان میں نیکی کی صلاحیت فطرتاً موجود ہے۔ تعلیم کا یہ کام ہے کہ وہ انسان میں پہلے سے موجود نیکی کو بروئے کار لائے اور اس نیکی کو تحریک دے۔ حقیقت میں انسان کے [illegible] کی تمام صلاحیتوں کو خیر کی طرف منتقل کر دینے کا نام تعلیم ہے۔

[illegible] نظریہ کو مستقل بنیادوں پر اس طرح مرتب کرنا

ہے کہ وہ اپنی زندگی' اپنے فکر و عمل اور اپنی حکمت عملی میں اسلامی اخلاقیات سے نہ صرف نظری بلکہ عملی لحاظ سے بھی متاثر ہوں اور زندگی میں پیش آمدہ مسائل کا حل بھی اسی نقطہ نظر سے کریں۔ اس حوالے سے تعلیم کی ساری نتیجہ خیزی اخلاقی علو پر مبنی ہے اور حقیقت میں یہی اخلاقی علو' اسلامی معاشرہ میں تعلیمی انقلاب کی اصل بنیاد ہے' جس کے بغیر دائمی تبدیلی ممکن نہیں۔

10- بحیثیت مجموعی تعلیم کا مطلب ہے تہذیب نفس اور ذات کو خوب سے خوب تر بنانے کی کاوش۔ لیکن اس تہذیب نفس کی اساس' اسلامی نظریہ حیات ہی ہے۔ اس تناظر میں اسلامی تعلیم کا اصل نصب العین (Mission-Statement) یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اسلامی عقیدے اور اسلامی شریعت کی بنیاد پر منظم کرے اور انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی' جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے کائنات میں اس طرح تصرف کے قابل بنائے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ' رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اخروی فوز و فلاح حاصل ہو۔

اسلامی نظام تعلیم کی اصطلاح کا مفہوم

اسلامی نظام تعلیم کی اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ عمل تعلیم کے تمام عناصر مثلاً" مقاصد تعلیم' نصابیات' درسی کتب' تربیت اساتذہ' حکمت تدریس' تعلیمی انتظامیات' تعلیمی مالیات' طریق امتحانات کا اسلام کے نقطہ نظر کی روشنی میں بحیثیت کل مطالعہ کیا جائے۔اس مطالعہ کی روشنی میں ایک ایسا نظام تعلیم مرتب ہو جس میں اساتذہ' طلبہ اور تعلیمی منتظمین کی علمی' پیشہ ورانہ اور اخلاقی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا ہو اور جس میں دین و دنیا کی وحدت' اخلاقی شعور کے فروغ' غیر طبقاتی انداز تعلیم' مخلوط تعلیم سے اجتناب' عربی زبان کی تدریس' قیادت عالم کے مقصد کی تحصیل اور اسلام کو بحیثیت ایک مکمل نظام حیات کے شرط لازم قرار دیا گیا ہو۔ بحیثیت مجموعی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل اس نظریہ علم پر مبنی ہے کہ قطعی اور بالاتر ذریعہ علم' وحی الٰہی یعنی قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے اوریہ دائمی اور برتر سرچشمہ' دیگر علوم معقولات اور علوم محسوسات کو پرکھنے کی مستقل کسوٹی ہے۔

اسلامی تناظرمیں تعلیم کی فکری اساس

دنیا کا کوئی سا بھی تعلیمی نظام ہو' اس کے پس منظر میں [illegible]
تعلیمی فلسفہ [illegible] اساسی اور دائمی [illegible]

مثلاً" یہ کائنات کیا ہے؟ اس کائنات کا نظام کیا حکمت رکھتا ہے؟ انسان کیا ہے؟ اس کا مقصد حیات کیا ہے؟ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ زندگی میں انسان کے لئے صحیح رویہ کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ روح کیا ہے؟ جسم و روح کا کیا تعلق ہے؟ علم کیا ہے؟ علم کا اصل سرچشمہ کون سا ہے؟ قدر کا مفہوم کیا ہے؟ کیا اقدار دائمی ہیں یا تغیرپذیر؟ انسان فنا ہو کر مٹی ہو جائے گا یا حیات بعد الموت ایک حقیقت ہے؟ غرض اس طرح کے بے شمار اساسی نوعیت کے سوالات ہیں جو فطرت انسانی' دنیا کی حقیقت' علم کی نوعیت اور اقدار سے متعلق ہوتے ہیں' جن کے بارے میں ہر دور اور ہر زمانے کے انسان تدبر و تفکر کے مراحل سے گزرے ہیں۔ ان سوالات کے جوابات دیئے بغیر کوئی اور صورت ممکن بھی نہیں۔ خواہ وہ عام انسانوں کے طفلانہ جوابات ہوں' یا دانش وروں کے فلسفیانہ مباحث ہوں یا خدا کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کے جوابات ہوں۔ اگر نبیوں اور رسولوں کے عطا کردہ جوابات ہوں تو ان پر مبنی' مثبت نقطہ نظر تشکیل پاتا ہے۔ اخلاقی تہذیب پرورش پاتی ہے۔ لیکن اگر جوابات منفی ہوں یعنی الہیاتی تناظر میں نہ ہوں تو اس سے دنیا میں زندگی کے بارے میں منفی نقطہ نظر ترتیب پاتا ہے۔ نفرت' الحاد اور منکرات پر مبنی تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ غرض ان سولات کے حوالے سے جیسا فلسفہ یا نقطہ نظر مرتب ہوگا' نظام زندگی کا ہر شعبہ اس سے ضرور متاثر ہو گا (تفصیل کے لئے دیکھئے معروف دانشور پروفیسر سید محمد سلیم کی کتب "مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ" اور "اسلامی تعلیم : بنیادی افکار وتصورات")

زندگی کے ان شعبوں میں ایک اہم ترین شعبہ تعلیم و تربیت کا ہے یقیناً یہ شعبہ بھی اس فکری نقطہ نظریا نظریہ حیات سے متاثر ہوتا ہے۔ حقیقت میں تعلیمی فلسفہ بنیادی طور پر تعلیم سے متعلق اساسی نظریات قائم کرتا ہے۔ فلسفہ تعلیم کا سب سے اہم کردار تعلیمی نصب العین کا تعین ہے۔ اس حوالے سے ایک موثر استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت فلسفہ اور نفسیات کے تقاضوں سے شناسا ہو۔ فلسفہ سے اس لئے کہ اسے تعلیمی نصب العین کا شعور ہو اور نفسیات سے اس لئے کہ وہ ان اصولوں اور ان طریقوں سے آگاہ ہو کہ وہ کس موثر انداز میں بچے کی رہنمائی کرے جس سے وہ مقاصد کی تکمیل کر سکے۔۔۔۔۔ فلسفہ درحقیقت کائنات کا ایک جامع تصور پیش کرنے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ اس سوال کا جواب تلاش کرتا ہے کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے؟ یہ فلسفے کا مرکزی موضوع ہے اوریہی سوال تعلیم میں بھی اہم بن جاتا ہے کہ کسی معاشرہ کو کس طرح کا انسان مطلوب [illegible] کرتا ہے" تعلیمی نظام اس کی رہنمائی میں پورے عمل

تعلیم (Educational Process) کی تشکیل کرتا ہے اور اس کی روشنی میں تعلیمی مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ اسلامی فلسفہ کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے پاس قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کی صورت میں ایک سرچشمہ علم موجود ہے جسے ہم تمام علوم فنون کی شاہ کلید سمجھتے ہیں۔ یہی سرچشمہ ایک مرکز خیال (Nucleus of Thought) اور معیار نظر (Criterion) عطا کرتا ہے۔ خلاصہ کے طور پر اسلامی فلسفہ کا یہی اصل ماخذ ہے۔ البتہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مسلم فلاسفی اور اسلامک فلاسفی میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک فلسفی' عقیدہ کے لحاظ سے تو مسلمان ہو' لیکن علوم کے ماخذ میں گڈمڈ کرنے کی وجہ سے اس نے خالصتاً" اسلامی فکر نہ پیش کی ہو۔ اسی طرح بے خدا فلسفہ کے برعکس اسلامی فلسفہ بے لگام غور و فکر (Free-Thinking) کا قائل نہیں۔ اسلام میں تدبر و تفکر کی دعوت ہے البتہ حدود مقرر کر دی ہیں۔ یعنی یہ تدبر و تفکر دراصل برتر اور دائمی سرچشمہ علم وحی الٰہی کے تابع ہے۔ یہی اسلامی فلسفہ کا وہ اساسی معیار ہے جس کی روشنی میں فلسفیوں' سائنس دانوں اور دیگر علماء کے افکار و نظریات کو پرکھا جا سکتا ہے۔

اس بنیادی ماخذ اور مستقل معیار کی روشنی میں' اسلامی تعلیم درحقیقت درج ذیل فکری نکات کے گرد مرتب ہوتی ہے۔

1۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بدیہی صداقت اور قطعی حقیقت (Ultimate Reality) ہے۔ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی' بلکہ کائنات کی تخلیق اسی علیم و خبیر ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کے منصوبے' ارادے اور علم کا تقاضا ہے۔ اطاعت کا مستحق اللہ وحدہ لا شریک کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ تنہا اس کائنات کا خالق' مالک' حاکم اور مدبر ہے۔ اسی کے قائم رکھنے سے یہ کائنات قائم ہے۔ وہ ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے سوا سب فانی ہے۔ نظام کائنات ایک ہی ہے۔ کائنات کے تمام اصول و قوانین تصور توحید پر مبنی ہیں۔ کائنات کی ہر نشانی خدا کی توحید کی علامت ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ مظاہر فطرت ہوں' تاریخ ہو' سائنس ہو' نفسیات ہو' ادب ہو' توحید ہر چیز میں کام کر رہی ہے۔ خود انسان کی ساخت بجائے خود ایک وحدت ہے۔ ہر زمانے اور ہر علاقے میں اور ہر شعبے میں واحد رہنما نظریہ توحید ہے۔ خدا ہی انسان کا حقیقی معبود ہے۔ وہی کائنات کی تمام قوتوں کا حاکم ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مالک ہونے کی حیثیت سے اس کا قانون درحقیقت بالاتر قانون ہے۔ اللہ قادر مطلق ہے جس کی قدرت لا محدود ہے۔ تمام فطری اور طبعی قوانین جن پر اس کائنات کا نظام قائم ہے اسی کے جاری اور نافذ کردہ ہیں۔ انسان اتفاقی طور پر [illegible] آیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ منصوبے کے [illegible]

مخلوق ہے اور وہ اس کائنات کا مرکز ہے۔ یہ کائنات انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے یعنی اللہ نے اس کائنات کو انسان کی بہتری اور اس کی خدمت پر لگا رکھا ہے۔ قرآن حکیم نے تخلیق آدم کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہی دراصل "علم الانسان" ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلافت کے منصب کو ادا کرنے کے لئے ایک احسن شخصیت عطا کی ہے۔ اس حوالے سے وہ اشرف المخلوقات ہے۔اسے اختیار دیا گیا ہے لیکن وہ مطلق اختیار نہیں' بلکہ خلیفہ ہونے کے ناتے سے اس کا اختیار اللہ کی مرضی کے تابع ہے۔انسان کو صرف ان ہی چیزوں پر اختیار ہے جس کے لئے وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو اہم فرائض سونپے ہیں۔ ایک خالق کی عبادت' دوسرے مخلوق کی خدمت۔ اس حوالے سے اس کی شخصیت کا اہم مقصد' اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے اور یہی اطاعت انسان کے لئے اللہ کی بندگی اور بندوں کی خدمت کا ایک اساسی معیار دیتی ہے۔ اس معیار میں یہ انقلابی عقیدہ شامل ہے کہ انسان کے لئے یہ دنیا کی زندگی امتحان اور آزمائش ہے اور اس کے خاتمہ کے بعد اسے ایک ذمہ دار ہستی کی حیثیت سے خدا کے حضور اپنے کارنامہ حیات کا حساب دینا ہو گا۔ توحید و رسالت کے ساتھ آخرت' انسان کا بنیادی عقیدہ ہے اور یہ اللہ کے عدل کا عین تقاضا ہے۔

2- خدا نے نہ صرف آدمؑ کو پیدا کیا' انہیں پیغمبر مبعوث کیا' بلکہ علم الاسماء سے بھی نوازا اور پھر اپنی جانب سے مسلسل پیغمبر مبعوث کئے جو خدا کی طرف سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہترین اصول اور ضابطے لے کر آئے۔ اس حوالے سے انسانیت کی فلاح کے لئے آخری کتاب قرآن حکیم ہے جو نبی آخرالزماں ﷺ پر اتاری گئی۔ علم خدا کا عطا کردہ ہے اور یہی خشیت الٰہی کی اساس ہے۔ علم کے سارے خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل کی نعمت سے نوازا' کہ وہ تدبر و تفکر کے مراحل سے گزرے۔ اسے الہامی روشنی دی کہ وہ حیوان مطلق نہ بنے اور ان سب ذرائع سے بالاتر اور قطعی سرچشمہ علم وحی الٰہی کے آئینہ میں صحیح و غلط' خیر و شر' حق و باطل اور معروف و منکر کے امتیاز کا شعور حاصل کرے۔ اسلام کا نظریہ علم یہ ہے کہ حواس وقیاس کے ذرائع سے برتر ذریعہ علم وحی الٰہی ہے جسے ترک کر دینے سے کائنات کا وسیع مقصد گم ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں اسلامی علوم وہ ہو سکتے ہیں جو حس و تجربہ' مشاہدہ' قیاس و استدلال اور وجدان کے حاصل کو وحی الٰہی کی کسوٹی پر جانچ کر ترتیب دیئے گئے ہوں اور جو اللہ کے نام سے حاصل کئے گئے ہوں۔ حقیقت میں اسلامی تعلیم کی علمیاتی بنیاد' دائمی اور قطعی سرچشمہ علم وحی الٰہی یعنی قرآن و [illegible] ذرائع علم کو جانچنے کی اصل پرکھ ہے۔ اس پرکھ کی روشنی

میں انسانیت کا یہ فطری تقاضا ہے کہ وہ حقیقت کا علم حاصل کرے۔ سید مودودی کے نزدیک حقیقت کا علم یہ ہے کہ "انسان کو اس بات کا علم ہو کہ درحقیقت اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے اللہ کا عطیہ ہے اور اس پر تصرف کرنے کے جو اختیارات بھی اسے بخشے گئے ہیں' انہیں وہ اللہ ہی کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال پر اسے مالک حقیقی کے حضور جواب دہ ہونا ہے" (تفہیم القرآن' جلد دوم ص 561)- خلاصہ کے طور پر علم کا اصل مقصود یہ ہے کہ ہر فرد' علم حق اور عمل صالح کا پیکر بنے۔ اس طرح حیات طیبہ کی تشکیل کرتے ہوئے بالآخر نفس مطمئنہ کا مقام حاصل کرے' جو نفس انسانی کی معراج ہے۔

3- خیر اعلیٰ' اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار اور قدر اعلیٰ (Root Value) رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ یعنی قرآن و سنت میں جس چیز کو خیر قرار دیا گیا ہے' وہ ہمیشہ خیر ہے اور جس چیز کو شر کہا گیا ہے وہ ہمیشہ شر ہے۔ خیرو شر کے معاملہ میں مستقل معیار اور پیانہ خدا کا دین ہے۔ جو کچھ دین اسلام میں ہے وہی مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ نیکی کا دائمی' مستقل اور قطعی معیار اسلام ہے۔ چنانچہ اسلام کے نظریہ قدر کا اساسی نقطہ یہ ہے کہ اسلامی اخلاق و کردار کا حقیقی منبع توحید و رسالت ہے اور اس کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل قوت نافذہ آخرت کی باز پرس کا اندیشہ ہے۔ اس ضمن میں تعلیم غیر جانبدار (Neutral) اور اقدار سے بے نیاز (Value Free) نہیں۔ اصل میں تعلیم' اخلاقیات کے بغیر بے معنی ہے اور دائمی اخلاقیات کا وجود بغیر ایمانیات کے ہو ہی نہیں سکتا۔ اس حوالے سے مثبت قدریں وہ ہیں جو اسلام کی اصطلاح میں "معروف" ہیں۔ منفی قدریں وہ ہیں جن کو اسلام "منکر" کہتا ہے۔ مثلاً" چند نمایاں مثبت اور منفی اقدار یہ ہیں:

(الف) - مثبت اقدار : ایمان' تقویٰ' احسان' خیر' صبرو استقامت' حلم' شکر' انفاق فی سبیل اللہ' ایثار' ہمدردی' رحمدلی' محبت' حریت' اخوت' خیر خواہی' صداقت' عدالت' وحدت' حکمت' امانت' دیانت' سخاوت' قناعت' استغناء' شجاعت' محنت' حیا' توکل' صدق مقال' اکل حلال' ادب' عجزو انکسار' عفت' خوش کلامی' تواضع' عیادت' فیاضی' عفوو درگزر' ستر پوشی' اعتدال' شائستگی' صفائی' طہارت' خودداری' وقار' ایفائے عہد' توبہ و استغفار وغیرہ۔

(ب) - منفی اقدار : ناشکری' نا امیدی' تنگ نظری' بخل' حسد' بغض' حرص' کذب' غضب' کبر' بے حیائی' خود غرضی' بد عہدی' بد ظنی' انتشار' دھوکہ دہی' غفلت' [illegible] ظلم [illegible] چغل خوری' عیب جوئی' بہتان' ظلم' سرقہ' رشوت' [illegible] بدمعاشی' زر پرستی' ارتکاز دولت [illegible]

فتنہ' کنجوسی' فضول خرچی' سرکشی' دورخاپن' غلامی وغیرہ۔

خلاصہ کے طور پر مثبت قدریں وہ ہیں جن کے ضائع ہونے سے کردار ختم ہوجاتا ہے' قدریں ختم یا تبدیلی ہو جاتی ہیں اور انسانی رویئے خراب ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی نے ٹھیک کہا ہے کہ "مثبت یا ایجابی اقدار کی ترغیب دینے کے ساتھ ساتھ اسلام نے ہمیں منفی یا سلبی اقدار سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے۔ یہ وہ مذمومہ صفات ہیں جوانسان کو اس کے منصب سے گرا دیتی ہیں۔ یہ وہ ناپسندیدہ اوصاف ہیں جو مسلمان کو اس کے شرف سے محروم کر دیتے ہیں" (اسلام کا نظام تعلیم ص : 27) تعلیم کی اس قدری اساس سے یہ رہنما اصول ملتا ہے کہ مقاصد تعلیم کے تعین' نصاب کی تشکیل اور تربیت اساتذہ کے پورے پروگرام میں اصل سامان وابستگی (Binding Force) یہی مثبت اقدار و معیارات ہیں۔

4- تعلیم کا فکری سرمایہ محض عام اخلاقی' معاشرتی اور معاشی تجربات ہی نہیں بلکہ وہ اعتقادات ہیں جن سے اساسی فلسفہ حیات ترتیب پاتا ہے اور جن کی وجہ سے صحت مند اسلامی تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ اسلام'ایمان کے ساتھ عمل صالح کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ تعلیم کے اس تہذیبی شعور کے تحت افراد کے تزکیہ نفس' نظام عبادات اور تربیتی ماڈل میں نماز' زکوٰۃ' روزہ' حج اور جہاد فی سبیل اللہ نمایاں نکات ہیں۔ اسلام ان عقائد پر مبنی ایک مکمل نظام حیات دیتا ہے جو روحانی' اخلاقی' عائلی' معاشرتی' معاشی' سیاسی' قانونی' تعلیمی' ادبی' ثقافتی' غرض ہر شعبہ زندگی میں رہنمائی دیتا ہے۔

5- تعلیم کی فکری بنیادوں میں ایک اہم بنیاد جسم و روح یا دین و دنیا کی وحدت ہے۔ اسلام اس تصور پر مبنی' ایک جامع لائحہ عمل یا پروگرام بھی دیتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی امور میں کامل رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس طرح سیکولرازم' لبرل ازم' کیپٹل ازم' سوشلزم' فاشزم' بے خدا جمہوریت یا الٰہی ہدایت سے محروم تمام نظریات اور ازمیات (Isms) کی بالکلیہ (In Totality) نفی کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے اس لائحہ عمل کی روشنی میں عمل تعلیم کے تمام عناصر کی جامع اور متوازن ترتیب و تشکیل اور سیکولر یا بے خدا تعلیمی نظام کی مکمل تردید کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے تعلیم و تربیت کی اسلامی تشکیل و تنفیذ کے لئے قرآن و سنت کی یہ واضح ہدایات پیش نظر رکھنا' اسلامی ریاست کا فرض ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: ترجمہ : "اے محمدؐ یہ اک کتاب ہدایت ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ ان کے رب کی توفیق سے اس خدا [illegible] اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے" (ابراہیم : 1 ترجمہ : تفہیم [illegible]) رسول اکرم ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں ارشاد فرمایا

ترجمہ: "میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں' جن کے بعد تم گمراہ نہیں ہو سکتے۔ ایک اللہ کی کتاب' دوسری میری سنت۔"

اسلامی تناظر میں تعلیم کی نفسیاتی اساس

اسلامی تناظر میں علم النفس (Psychology) کا اپنا ایک مخصوص مفہوم ہے۔ جس کی رو سے انسان ایک احسن تقویم ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ ترین سرگرمیوں کے لئے بہترین ساخت کا جسم عطا کیا ہے۔ اس کی اس جسمانی ساخت کے ساتھ ساتھ ایک نفسیاتی ساخت بھی ہے۔ مثلاً" اسے علم' سمع' بصر' فواد' قوت حافظہ' قوت استدلال' قوت ارادہ و فیصلہ اور دیگر قوتیں عطا کی گئی ہیں۔ اگر انسان ان سے محروم ہو جائے تو اس کی جسمانی ساخت کی خوبی بھی اسے دوسرے حیوان سے بہتر نہیں بنا سکتی۔ انسان محض حیاتیاتی وجود نہیں رکھتا بلکہ وہ تاریخ کے ہر دور میں اپنی عملی زندگی میں آزاد اور متحرک رہا ہے۔ علی عزت بیگووچ' فلسفہ مادیت اور فلسفہ فطرت پسندی پر بحث کرتے ہوئے اس نکتہ کو واضح کرتے ہیں کہ مادیت اس چیز کو مد نظر رکھتی ہے کہ انسانوں اور حیوانوں میں مشترک چیز کیا ہے؟ جبکہ مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان اختلافات کی باتیں کیا ہیں؟ بیگووچ کی رائے میں جانور جبلی طور پر چند افعال پر قادر ہوتا ہے۔ وہ انسان کی طرح لامحدود قوت عمل نہیں رکھتا۔ وہ نہیں جانتا کہ کون سی بات اخلاق کے مطابق ہے اور کون سی اخلاق کے مطابق نہیں۔ (اسلام اور مغرب کی تہذیبی کشمکش' ص ص 80-85)- یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلاشبہ انسان کو بے بہا اور متنوع قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں دی ہیں' لیکن وہ لا محدود نہیں ہیں۔ انسان اس کائنات میں اللہ کا خلیفہ ہونے کے باوجود فطری طور پر ضعف' جہالت' عجلت' اور احتیاج سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے نفس اور ضابطہ حیات کو اس کی ذاتی اور ہر دم متغیر خواہشات' ضروریات اور دلچسپیوں پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت خاص سے اس پہلو پر توجہ فرمائی اور یوں ہر زمانے اور ہر علاقے پر محیط' انسان کی فطرت وساخت کے مطابق ایک عالمگیر اور آفاقی ضابطہ حیات عطا فرمایا۔ اس طرح خالق کائنات نے انسان کی زندگی پر حکمران نظام حیات از خود متعین کر دیا جو انسان کے متعدد وجود کو بھی پورا کرتا ہے' اس کے اعمال میں توازن لاتا ہے اور اس کی انفرادی اور اجتماعی جائز خواہشات اور ضروریات [illegible] ہے۔ پھر اس ضابطہ حیات کی عملی تفسیر کے لئے اور انسانوں کے [illegible] تعالیٰ نے [illegible]

ذریعہ کرائی۔ چنانچہ انسان اگر اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی ہدایت سے ہٹ کر کوئی نظام بنا بھی لیتا ہے تو وہ یقیناً انسانی زندگی کو اور خود انسان کو ہلاکت اور تباہی میں مبتلا کر دے گا' کیونکہ فطرت انسانی شرک کو پسند نہیں کرتی۔ سید قطب شہید کے بقول' اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک قانون اخلاق عطا کیا ہے جو کسی حیوان کے پاس موجود نہیں اور نہ کسی حیوان کی یہ ضرورت ہے۔ انسان ایک خاص بامقصد اور منفرد وجود ہے۔ اس کے ذمے ایک فرض ہے اور اس کا مقصد وجود متعین ہے۔ دنیاوی زندگی اس کے لئے امتحان ہے جس کے ذریعے اس کے اعمال کا حساب ہو گا اور یہی اعمال اس کا انجام متعین کریں گے۔ (اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل' ص 53)۔

اصل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے نفس انسانی کو جسم' حواس اور ذہن کے ساتھ ساتھ ایک فطری الہام کے ذریعے اسے خیر کے خیر اور شر کے شر ہونے کا احساس دے دیا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:ترجمہ :"اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا" (الشمس 7-10 ترجمہ تفہیم القرآن' جلد ششم ص 351)۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی' ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "ہموار کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامت راست اور اپنے ہاتھ پاؤں اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لئے موزوں ترین تھا۔ اس کو دیکھنے' سننے' چھونے' چکھنے اور سونگھنے کے ایسے حواس عطا کئے ہیں جو اپنے تناسب اور اپنی خصوصیات کی بناء پر اس کے لئے بہترین ذریعہ علم بن سکتے تھے۔ اس کی قوت عقل و فکر' قوت استدلال و استنباط' قوت خیال' قوت حافظہ' قوت تمیز' قوت فیصلہ' قوت ارادی اور دوسری ایسی ذہنی قوتیں عطا کی ہیں جن کی بدولت وہ دنیا میں اس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اس کے علاوہ ہموار کرنے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اسے پیدائشی گنہگار اور جبلی بدمعاش بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی خلقی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ یہی بات جسے سورہ روم میں بایں الفاظ بیان کیا گیا ہے کہ "فطرۃ اللہ التی فطرالناس علیہا" "قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔" (آیت 30) اور اسی بات کو نبی ﷺ نے ایک حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے کہ "کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو فطرت کے سوا کسی اور چیز پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا [illegible] اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے (مسند احمد) "میرا رب

فرماتا ہے کہ میں نے اپنے تمام بندوں کو حنیف (صحیح الفطرت) پیدا کیا تھا' پھر شیاطین نے آکر ان کو ان کے دین (یعنی انکے فطری دین) سے گمراہ کر دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لئے حلال کی تھیں اور ان کو حکم دیا کہ میرے ساتھ ان کو شریک کریں جن کے شریک ہونے پر میں نے کوئی دلیل نازل نہیں کی" (تفہیم القرآن' جلد ششم' حاشیہ 4 ص 351)-

حقیقت میں قرآن حکیم' انسانی نفسیات کا مفہوم درج ذیل تین خطوط کے حوالے سے متعین کرتا ہے۔ ان خطوط کے تناظر میں ہی کسی شخص کے اندر تضادات کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرنے سے کیا نتائج سامنے آتے ہیں کیونکہ قلب کے مبتلائے مرض اور بگاڑ کی بڑی وجہ تضادات کی یک جائی ہی تو ہے (انٹرویو: نعیم صدیقی)۔

(الف)۔ نفس امارہ جو انسان کو برائیوں پر اکساتا ہے (القرآن' سورہ یوسف : 53)

(ب) نفس لوامہ جو انسان کو غلط کام کرنے یا بری نیت رکھنے پر ملامت اور سرزنش کرتا ہے۔ (القرآن' سورہ القیمہ :2)

(ج) نفس مطمئنہ جو انسان کو صحیح راہ پر چلنے اور غلط راہ چھوڑ دینے میں اطمینان قلب نصیب کرتا ہے۔ (القرآن' سورہ الفجر:27)

مولانا امین احسن اصلاحی' ان خطوط کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں صرف نیکی اور بدی کا شعور ہی نہیں بلکہ اس کے اندر ایک مخفی زاجر (نفس لوامہ) بھی رکھا ہے جو اس کو جب وہ کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے ملامت اور سرزنش کرتا ہے اور جب نیکی کرتا ہے' تو اس کو شاباش دیتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور برائی کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن نفس چونکہ نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے اور اس کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ نیکی پر قائم رہے' اس وجہ سے جب تک توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے کو بھی' اگر اس سے کوئی برائی صادر ہوتی ہے' ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات اس پر ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اس پہلو کو نفس لوامہ سے تعبیر فرمایا گیا۔ نفس کے توازن کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر روز جزا اور سزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور آدمی کبھی اس کی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل ان کے آگے سپر انداز ہوجائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے [illegible] ہے اور وہ فوراً متنبہ ہو کر [illegible]

نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہوجائے،قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تربیت نفس کا سب سے اونچا مرتبہ یہی ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دعوت دی ہے اور شریعت کے ذریعہ جس کا اہتمام فرمایا ہے۔ اسی نفس کو آخرت میں راضیۃ مرضیہ کا مقام حاصل ہو گا جو نفس انسانی کی معراج ہے۔ (فلسفے کے بنیادی مسائل، ص ص 123-124)۔

اس تناظر میں تعلیم کا اصل مقصود، انسان کی نفس مطمئنہ تک رسائی ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی یہ اساس اس امر کی متقاضی ہے کہ طالب علم کی تربیت اس انداز اور اس نہج پر ہو کہ بالآخر وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ صفات کا حامل شخص ہو، اس کا شمار نیک بندوں میں ہو اور اس کا رب اس سے راضی ہو۔ ان پسندیدہ صفات بالخصوص نفس مطمئنہ کی تفسیر کے حوالے سے سید مودودی لکھتے ہیں کہ "نفس مطمئن سے مراد وہ انسان ہے جس نے کسی شک و شبہ کے بغیر پورے اطمینان اور ٹھنڈے دل کے ساتھ اللہ وحدہ لا شریک کو اپنا رب اور انبیاءؑ کے لائے ہوئے دین حق کو اپنا دین قرار دیا جو عقیدہ اور جو حکم بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ملا، اسے سراسر حق مانا، جس چیز سے بھی اللہ کے دین نے منع کیا اس سے با دل ناخواستہ نہیں بلکہ اس یقین کے ساتھ رک گیا کہ فی الواقعہ وہ بری چیز ہے، جس قربانی کی بھی حق پرستی کی راہ میں ضرورت پیش آئی، بے دریغ اسے پیش کر دیا۔ جن مشکلات اور تکالیف اور مصائب سے بھی اس راہ میں سابقہ در پیش ہوا، انہیں پورے سکون قلب کے ساتھ برداشت کیا اور دوسرے راستوں پر چلنے والوں کو دنیا میں جو فوائد اور منافع اور لذائذ حاصل ہوتے نظر آ رہے تھے ان سے محروم رہ جانے پر اسے کوئی حسرت لاحق نہ ہوئی بلکہ وہ اس بات پر پوری طرح مطمئن رہا کہ دین حق کی پیروی نے اسے ان گندگیوں سے محفوظ رکھا ہے" (تفہیم القرآن، جلد ششم، حاشیہ 18، سورہ الفجر: 27 ص 333)۔

فطرت انسانی کے حوالے سے ایک اور نکتہ کی وضاحت معروف دانشور اور محقق جناب نعیم صدیقی نے راقم الحروف سے ایک گفتگو میں یوں کی ہے کہ انسان کے اندر فطری طور پر ایک فعالیت مسلسل، ایک جوئے خیال اور ایک القائی عمل جاری رہتا ہے۔ پھر فطری اصول تزویج کے تحت اس کے ذہن میں بھی خیال زوج زوج یعنی جوڑا جوڑا آتے ہیں۔ منفی خیالات کے ساتھ ساتھ مثبت خیالات بھی۔ ذہن کا عمل ایک مکالماتی طرز کا فطری عمل ہے۔ سوچتا ہے یہ کروں یا نہ کروں۔ اس کا ذہنی معیار انتخاب، حیوانات کی طرح محض مادی اور افادی نہیں ہوتا بلکہ شعوری ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی بھی ہوتا ہے۔ صحیح اور غلط، حق [illegible] اور باطل، [illegible] اچھائی اور برائی، انصاف اور ظلم کا فیصلہ وہ اسی معیار انتخاب کی

روشنی میں کرتا ہے۔ اس طرح انسان محض حیاتیاتی وجود نہیں رکھتا بلکہ ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ انسانی ذہن کے بے شمار افعال ہیں' لیکن ان افعال کی تفہیم' خدا پرستانہ تصور کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ تصور نہ ہو' تو انسانی وجود جو نفسیاتی حوالے سے تصادم کی ایک جولانگاہ ہے' وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے گا کہ وہ اپنے رویئے اور کردار کا ارادی وزن' تصادم مسلسل میں کس طرف ڈالے۔ خیر کی طرف یا شر کی طرف۔ انسان کے اندر فطری طور پر خیر کی صلاحیت بھی ہے اور شر کی استعداد بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو عقل کی نعمت بھی عطا کی ہے جس کے ذریعے یہ خیرو شر میں فرق اور تمیز کرتا ہے۔ پھر قوت ارادہ بھی عطا فرمائی ہے جس کی مدد سے یہ دونوں میں کسی کو اختیار کرنے پر قادر ہے۔ حقیقت میں نفس انسانی کے اندر ذات باری تعالیٰ کے وجود پر انتہائی راسخ ایمان فطری طور پر مرتکز اور جاگزیں ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم' حیات انسانی کے اس پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ہدایت الٰہی بتاتی ہے کہ انسان درحقیقت ایک روحانی ہستی ہے۔ روح کو اپنی کارگزاری دکھانے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس غرض کے لئے یہ جسم عطا ہوا ہے۔ افعال اور اعمال کا صدور جسم کے اعضاء اور جوارح سے ہوتا ہے۔ اس لئے اسلامی نقطہ نظر سے روح اور جسم میں سازگاری ہے۔ منافرت اور بعد نہیں ہے۔" (مسلمان اور مغربی تعلیم: ص 11)۔ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں اگر اس رخ کے حوالے سے مناسب تعلیم و تربیت اور صحت مند ماحول فراہم کیا جائے' تو انسان کے اس فطری رجحان کو صحیح سمت مل سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بے پایاں معلومات کے باوجود وہ مکارم اخلاق اور شرف انسانیت سے محروم ہو جائے گا۔

اس سے قبل کہ اسلامی تناظر میں تعلیم کی نفسیاتی اساس سے متعلق چند دیگر نکات پیش کئے جائیں' یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسانی "فطرت" کی اصطلاح کو واضح کیا جائے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ ترجمہ "پس (اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیرو) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو' قائم ہوجاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی' یہی بالکل راست اور درست دین ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں" (الروم :30)۔ سید مودودیؒ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "تمام انسان اس فطرت پر پیدا کئے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبود اور مطاع حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر تم کو قائم ہو جانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا رویہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے اور اگر بندگی غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے تب بھی اپنی فطرت کے [illegible]

حاشیہ 45 ص 752)- سید مودودی انسانی فطرت کی اصطلاح کو ایک اور جگہ ایک سوال کے جواب میں یوں واضح کرتے ہیں:

"فطرت کے اصل معنی ساخت کے ہیں یعنی وہ بناوٹ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے ہر ایک جنس' نوع اور فرد کو عطا کی ہے' اور وہ صلاحیتیں اور قوتیں جو اس نے ہر ایک کی ساخت میں رکھ دی ہیں۔ ایک فطرت ہر ہر انسانی فرد کی جدا جدا ہے۔ جس سے ہر ایک کی الگ الگ ایک مستقل شخصیت و انفرادیت تشکیل پاتی ہے اور اس فطرت میں وہ قوتیں بھی شامل ہیں جن کو استعمال کر کے اپنے آپ کو درست کرنے یا بگاڑنے اور دوسروں کے مفید یا مضر اثرات کو قبول یا رد کرنے کی قدرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ نہ تو یہ کہنا درست ہے کہ انسان اپنی فطرت کو بنانے یا بدلنے پر کامل قدرت رکھتا ہے اور نہ یہ کہنا درست ہے کہ وہ بالکل مجبور ہے اور کوئی قدرت اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ بات ان دونوں کے درمیان ہے۔ آپ کوشش کر کے اپنی بعض فطری کمزوریوں کی اصلاح بھی کر سکتے ہیں اور یہ اصلاح کی فطرت بھی آپ کی فطرت کا حصہ ہے۔۔۔۔ اپنے نفس کا جائزہ لے کر اچھی طرح ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر اپنی قوت فکرو فہم' قوت تمیز اور قوت ارادی سے کام لے کر بتدریج ان کمزوریوں کو گھٹانے اور اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ اپنی قوت فکرو فہم اور قوت تمیز سے کام لے کر معلوم کیجئے کہ نقطہ اعتدال کون سا ہے' جس کی طرف اپنے آپ کو موڑنے اور آگے بڑھانے کے لئے آپ اپنی ارادی قوت استعمال کریں" (رسائل و مسائل' حصہ چہارم' ص ص 85-87)۔

علم النفس سے متعلق اس ابتدائی بحث کے بعد اسلامی تناظر میں تعلیم کی نفسیاتی اساس کے حوالے سے چند دیگر اہم نکات یہ ہیں:

1- عمل تعلیم کا ایک اہم جزو تعلم یا آموزش (Learning) ہے۔ تعلیمی سرگرمیوں میں بچے کی نشوونما اور عمل تعلیم کے مختلف اجزاء کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ ان سوالات سے اکثر سامنا ہوتا ہے کہ بچوں کی نشوونما کس طرح ہوتی ہے؟ عمر کے مختلف مدارج میں بچے سے کس قسم کے رویے کی توقع کی جاسکتی ہے؟ نصاب ساز بچوں کے متعلق واقفیت حاصل کر کے کیا کچھ کر سکتا ہے؟ بچوں کی دلچسپیاں اور ضرورتیں اسلامی نقطہ نظر سے کیا ہیں؟ کیا انسانی شخصیت میں جسم' روح' جبلت' جذبات' رجحانات' عقل و فہم' دنیا و آخرت' ان سب تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور کیا ان سب کو باہم حسن امتزاج سے سمو دیا گیا ہے؟ تعلیمی نظام ان سوالوں کا اور ان کے علاوہ بچوں کی مختلف انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کا خیال اگر اسلامی تناظر میں نہیں کرے گا تو وہ نفسیات کی اصطلاح میں غیر متوازن

یا عدم تسویہ کا شکار ہوگا۔ اس ضمن میں مسلم اساتذہ کی یہ اہم ترین ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے طلبہ میں دین حنیف کو ماننے کی جو فطری استعداد موجود ہے اس کی نشوونما کریں اور نصابی سرگرمیوں کے ذریعہ طلبہ کی خواہشات اور احتیاجات کی اس طرح تہذیب کریں کہ وہ طیب راستے کو اپنائیں اور حرام سے اجتناب کریں۔

2- تعلیمی نفسیات کے حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ توحید کا تصور انسانی فطرت کی بدیہات میں سے ہے۔ اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کا اقرار' اللہ نے انسان کی فطرت میں سمو دیا ہے۔ نفسیاتی حوالے سے ہر فرد کے اندر فطری طور پر دو رجحانات یا دو قوتیں پائی جاتی ہیں ایک رحمانی دوسرے شیطانی۔ ان دونوں قوتوں کی کشمکش کے اندر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور برائی کیا ہے؟ اس کا ضمیر (نفس لوامہ) نیکی میں خوشی محسوس کرتا ہے اور برائی میں آزردہ ہوتا ہے۔ لہذا طلبہ کے لئے سب سے مرغوب علم وہی ہے جو ان کی اصل فطرت یعنی اسلام کے نظام اطاعت سے متعلق ہے۔اس سے متصادم یا منحرف علمی مواد (Instructional Content) کامل نشوونما میں حائل ہوگا۔ اسلام درحقیقت انسان کی بنیادی فطری ضرورت اور اس کا فطری تقاضا ہے۔ اللہ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے' اس کو بگاڑنا اور مسخ کرنا درست نہیں۔ یعنی انسان کو فطرت سلیم پر قائم رکھنا ہی مطلوب نظریہ تعلیم ہے۔ اس نظریہ تعلیم کی روشنی میں جو طلبہ' اساتذہ' منتظمین اور دیگر افراد معاشرہ نفس لوامہ کی سرزنش پر کامل توجہ دیتے ہیں' حقیقت میں وہی لوگ سلیم الفطرت ہیں۔ اصل میں اللہ تعالیٰ نے ہر فرد میں خیرو شر کو پہچاننے کی ایک اخلاقی حس رکھ دی ہے۔ وہ اپنے لئے نیک و بد کا انتخاب کر سکتا ہے اور اسی حیثیت سے اسے اپنے ہر عمل کے سلسلے میں خدا کے حضور جوابدہ ہوتا ہے۔ اللہ نے نیکی اور بدی کے تصور کو اجاگر کرنے کے لئے انبیاءؑ کے ذریعہ مفصل ہدایات دیں کیونکہ انسان کے لئے پیدائشی شعور و آگہی کافی نہیں۔ اس کی رہنمائی کے لئے اللہ نے آخری کتاب قرآن حکیم اور اپنے آخری رسول ﷺ کو تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنایا۔ یہی ذریعہ اسلامی نظام تعلیم کی نمایاں اساس ہے۔

3- تربیت افراد کے حوالہ سے اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انسانی فطرت کے اندر حیوانی داعیوں کو ابھرنے سے روکنے والی چیز اسلامی اخلاقیات ہیں۔ نیکی انسان کی سرشت میں داخل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیات میں نیکی اور ادب' انسانی معاشرے کی ترقی کی اصل محرک ہیں۔ انسانی فطرت دراصل حیاتاتی [illegible] اور روحانی حیثیتوں کے درمیان توازن کی خرابی ہوتی ہے۔ یہ [illegible]

ہوئے لکھتے ہیں کہ "خالق نے انسان کے اندر بھلائی اور برائی' دونوں کے میلانات اور محرکات رکھ دیئے ہیں اور الہامی طور پر اسے ان دونوں کا فرق سمجھا دیا ہے کہ ایک فجور ہے اور وہ بری چیز ہے اور دوسرا تقویٰ ہے اور وہ اچھی چیز ہے۔ نفس انسانی کو ایک ہموار و مستقیم فطرت پر پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اس کا فجور اور اس کا تقویٰ اس پر الہام کر دیا۔ لیکن وحی کے ذریعے انبیاءؑ کو جو مفصل ہدایت دی' اسی کے تحت انسان کو یہ وضاحت ملتی ہے کہ فجور کا اطلاق کن کن چیزوں پر ہوتا ہے جن سے بچنا چاہئے اور تقویٰ کس چیز کا نام ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتا ہے" (تفہیم القرآن' جلد ششم' ص ص 353-356)۔

-4 معلم اور داعی کے لئے انسان کی ان فطری چاہتوں' ضرورتوں اور صلاحیتوں کی تفہیم ضروری ہے' جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں۔ بلاشبہ یہ صلاحیتیں انسان کی جوہری قوتیں ہیں اور ہر ایک قوت اپنی تسکین چاہتی ہے' لیکن توازن و تناسب اور تسویہ و تعدیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ہی عقل و ضمیر کا تازیانہ تادیب بھی رکھا ہے۔ انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حس بھی دی گی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور برائی میں امتیاز کرتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جبلت اور فطرت کی اصطلاحوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان جبلت کا بالکلیہ تابع ہے اور اس سے بندھا ہوا ہے' لیکن انسانی فطرت اختیار اور ارادہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ صحیح اور غلط کی تمیز نہ کرنے والا انسان' اس اعلیٰ منصب انسانیت پر فائز نہیں رہ سکتا' جو اسلام کے پیش نظر ہے۔ حقیقت میں فطرت انسانی کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ انسان اللہ ہی کو اپنا نصب العین بنائے اور اخلاقی قوت کے وسیلے سے انسان اپنی نفسانی خواہشات اور چاہتوں پر غلبہ حاصل کرے' کیونکہ اسی جوہر سے اعتدال کا دامن ہاتھ میں رہتا ہے۔ اس نفسیاتی اساس سے جو رہنما اصول ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم و تعلم کے سارے عمل میں اخلاقی نقطہ نظر (Moralistic View) کو مادی نقطہ نظر (Materialistic View) پر فوقیت دی جائے۔

-5 اسلامی تصور نفسیات کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ انسان کی عملی تربیت کے لئے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادے پر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ اس بدیہی علم پر مبنی ہے جو تحت الشعور میں راسخ ہونے کے بعد انسان کے فکر و عمل کی قوتوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ البتہ یہ بدیہی علم' الٰہی ہدایت کے تحت ہی صحیح سمت اختیار کر سکتا ہے۔ یہی عقیدہ ایمان کی بنیاد ہے۔ اسی ایمان کی روشنی میں صالح عمل ضروری ہے تاکہ انسان صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اسلام حالت ایمان اور کیفیت گناہ کا ایک

نفسیاتی پیمانہ دیتا ہے کہ اگر انسانی فطرت آلائشوں سے پاک ہو کر نکھر آئے تو کس ارفع مقام پر ہو گی اور اگر آلائشوں میں ہی گھری رہے تو گراوٹ کے کس مقام پر ہو گی؟ اسلام انسان کو احسن تقویم کہتا ہے یعنی طبعی وجود بھی اعلیٰ ترین قوتوں کے ساتھ عطا کیا گیا ہے لیکن اس سے بھی اہم چیز جو اسے احسن تقویم بناتی ہے وہ اس کا نفسیاتی اخلاقی یا روحانی وجود ہے۔ یعنی اس کا ذہن' اس کا علم' اس کا حافظہ اس کا ارادہ اور خیرو شر کی کشمکش میں اس کا واضح نقطہ نظر۔

-6 علم النفسیات اور فلسفہ کا ایک اہم موضوع' انسان کی منفرد شخصیت اور اس کی خودی (Ego) کی معرفت اور تربیت ہے۔ اس حوالے سے معروف دانشور اور اقبالیات کے ماہر ڈاکٹر عبدالمغنی نے فکر اقبال کے تناظر میں تربیت خودی کے تین مراحل کو بڑی اہمیت دی ہے۔

(الف) اطاعت حق : عبادت الٰہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کے تابع کر لینا۔

(ب) ضبط نفس : نفس سرکش ہے' اسے الٰہی ضابطہ کے تحت لگام دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ جو شخص رضائے الٰہی کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہیں پاسکتا اور اس طرح بڑی آسانی سے بے خدا نظریات کے حامل لوگوں کے قابو میں آجاتا ہے اور بالآخر رضائے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔

(ج) نیابت الٰہی : خلافت الٰہیہ کے بلند ترین منصب پر فائز ہونے کے لئے "علم" کا حصول فرض ہے تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق کا شعور حاصل کرے۔ کیونکہ یہی شعور انسانی زندگی کی فلاح کا ضامن ہے۔۔۔۔۔ حقیقت میں خودی کا مرد کامل خیرالبشر رسول اللہ ﷺ ہیں۔ لہٰذا نظام تعلیم میں فرد کی تربیت خودی بھی اسی صورت ہو سکتی ہے کہ اگر اسے خودی کامل سے مربوط کیا جائے۔

-7 تعلیم انسان کی فطری ضرورت ہے لہٰذا اس مقصد کے لئے طلبہ کی ایسی ہمہ جہت نشوونما مطلوب ہے جس میں روحانی' ذہنی اور جسمانی تمام صلاحیتیں شامل ہوں۔ تعلیم کی اسلامی تشکیل سے متعلق افراد کے پیش نظر یہ نکتہ رہنا چاہیے کہ نفس انسانی میں دو قسم کی حرکتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک حرکت کا رخ بلندی کی طرف ہے اور دوسری حرکت کا رخ پستی کی طرف ہے۔ پہلی حرکت سے سعادت حاصل ہوتی ہے۔ احسن صفات' صالح اعمال اور پاکیزہ خیالات پروان چڑھتے ہیں۔ انسان اچھا سوچتا ہے' اچھے کام کرتا ہے' روشن ضمیر ہوتا ہے اور اس کی منزل خوشنودی رب کا حصول ہوتا ہے۔ [illegible]

میں خود غرضی، دولت دنیوی کی ہوس، جنسی بے راہ روی، اور عیش و آرام کی آرزو، جھوٹا وقار اور کئی روحانی عوارض پیدا کرتی ہے۔ حقیقت میں نفس کی اصل شقاوت اور بدبختی کی وجہ نفس کی یہی ارذل حرکت ہے۔ چنانچہ اسلام، نفس انسانی کو اخلاقی عوارض سے بچانے اور اس میں احسن اخلاقی صفات کی نشوونما کے لئے ایک تعلیمی و تربیتی پروگرام دیتا ہے۔اس تناظر میں وہ حصول علم کو انسان کا فطری حق تسلیم کرتا ہے۔ علم و معرفت کے اس بنیادی انسانی حق کے لئے اسلام تزکیہ نفس پر مبنی تعلیمی اور تربیتی منہج عطا کرتا ہے جس کی روشنی میں اساتذہ اور طلبہ دونوں، اسلامی تعلیمی تحریک کے ایسے فعال سپاہی تیار ہوتے ہیں، جن کا ہر عمل خوشنودی رب کے تابع ہوتا ہے۔

8- انسانی وجود کے دو رخ ہیں، ایک جسمانی، طبعی یا حیاتیاتی اور دوسرا روحانی، اخلاقی یا اعتقادی۔ فطری لحاظ سے پہلا رخ بالعموم از خود نشوونما پاتا رہتا ہے۔ کسی نظام تعلیم کے ذریعے اس کی جسمانی ساخت یا رنگ و نسل یا قدو قامت میں تبدیلی نہیں لائی جاتی۔ نظام تعلیم بنیادی طور پر انسانی وجود کے دوسرے یعنی اخلاقی رخ کے لئے ہے جو از خود نشوونما نہیں پاتا۔ بلکہ اس کے لئے مناسب ماحول اور شعوری حکمت عملی درکار ہوتی ہے۔ اسلام بلاشبہ مادہ اور روح کی تقسیم کا قائل نہیں۔وہ جسم کی نفی (Negation) نہیں کرتا اور اس کے جائز طبعی تقاضوں کے خلاف نہیں۔ البتہ وہ جسم کو روح کے تابع رکھتا ہے اور اس تناظر میں وہ اہمیت اور برتری ان اخلاقی، روحانی اور اعتقادی ضابطوں کو دیتا ہے جس کے لئے اسلام اپنا متوازن تربیتی نظام پیش کرتا ہے۔ جس کا مقصود ایک فرد کا اپنی جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کو اسلام کے روحانی اور اخلاقی نظریہ کی روشنی میں مرتب کرنا ہے۔۔۔۔ اسی طرح اسلام انسان میں فطری طور پر موجود جذبات کو ختم نہیں کرتا بلکہ ان کا رخ قدر اعلیٰ یعنی حصول رضائے الٰہی کی روشنی میں معروف کی طرف موڑ دیتا ہے۔مثلاً محبت، نفرت، جمال اور خوف جیسے جذبات کا رخ مثبت طور پر اس سمت لے جاتا ہے جو پسندیدہ مثبت قدروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جیسے محبت کا پیمانہ، اطاعت احکام خداوندی ہے۔ منکرات سے نفرت ایک مثبت قدر بن جاتی ہے۔ جمالیات (Aesthetics) کے حوالے سے کلام اللہ کی تلاوت، حسن قرات، حسن صوت، تحسین خط، حب رسول ﷺ، حسن سیرت، پاکیزہ نثری اور شعری ادب، حمد و نعت، بیت اللہ کا حسن، مسجد نبوی ﷺ کا جمال، تعمیر مساجد، حسن تخلیق و تعمیر غرضیکہ تقرب الی اللہ کے تناظر میں یہ ساری چیزیں اسلامی جمالیات کے زمرے میں آ کر، اعلیٰ قدریں بن جائیں گی۔ پھر جذبہ خوف ختم تو نہیں ہوتا مگر اس کا رخ اس طرف پھیر [illegible] سے پرہیز کرے اور ثواب آخرت کو دنیوی لذتوں پر ترجیح دے۔

اس طرح خوف کا جذبہ' خوف خدا یا خشیت رب میں ڈھل کر صاحب علم شخص کی پہچان بن جاتا ہے اور یوں تمام دیگر دنیوی اور نفسیاتی خوف بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔ خلاصہ کے طور پر فرد کی صحت مند نشوونما میں یہ نکتہ اہم ہے کہ نظام تعلیم میں انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کو طبعی اور حیاتیاتی وجود پر فوقیت دی جائے تاکہ انسانی فکرو عمل کی تمام قوتیں خیرو خوبی کی طرف منتقل ہوں۔ اس تناظر میں فرد کی روحانی ارتقاء میں ہمہ جہت (Multi Dimensional) ترقی پنہاں ہے یعنی اخلاقی' ذہنی' جسمانی غرض تمام معاشرتی' معاشی اور سیاسی ضرورتوں کی جامع اسلامی تہذیب۔

9- تعلیمی نفسیات کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ انسان فطرتاً" آزاد پیدا ہوا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود کی سوا اس پر کوئی پابندی عائد کرنا درست نہیں۔ اسی طرح اسلام فطری طور پر ہر نوع کی غلامی کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اور غلامی یکجا نہیں رہ سکتے۔ انسان فطری طور پر محکومیت اور غلامی کے خلاف ہے۔ صرف اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی غلامی ہی انسانی شخصیت کی تکمیل ہے۔ باقی ہر نوع کی غلامی ایک انتشار زدہ شخصیت (Split Personality) کو جنم دیتی ہے۔ دین فطرت یعنی اسلام' تخلیق' تحقیق اور علمی آزادی (Academic Freedom) کی اجازت دیتا ہے' لیکن تمام نصابی سرگرمیوں کو لازماً" دینی پابندیوں کے تابع کرتا ہے' کیونکہ مادر پدر آزادی اور الٰہی ہدایت سے محروم تفکر' فطرت انسانی کے خلاف ہے۔

10- انسان اپنی عضوی' عقلی اور روحانی ترکیب میں بڑا پیچیدہ (Complex) ہے۔ محض ظاہری اور سطحی مطالعہ سے اس کی حقیقت معلوم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔وہ اپنی طبیعت' ترکیب' اپنے کردار اپنے مقصد زندگی اور اپنے انجام کے لحاظ سے کائنات میں بڑا منفرد ہے۔ لیکن اس انفرادیت کے ساتھ ساتھ افراد میں استعداد اور میلان طبع کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ خصوصیت سے مرد اور عورت کے درمیان حیاتیاتی اور نفسیاتی حوالے سے جو فرق ہے یعنی دونوں کی ساخت اور جذباتی نمو میں جو تفاوت پایا جاتا ہے' اس تناظر میں مردوں اور عورتوں کے لئے بعض امور میں جداگانہ نصاب تعلیم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ جن مروجہ نصابی موضوعات میں عورتوں کو نسوانیت' جذبہ مادریت' عفت' حجاب' حیاء اور دیگر دینی اقدار سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے وہ تعلیمی نظام سے خارج کر دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی نفسیات اور علم التعلیم سے متعلق اساتذہ کے پیش نظر یہ اصول بھی رہنا چاہیے کہ بلا شبہ انسان اپنی افتاد طبع اور اپنے [illegible] یکساں نہیں' لیکن ان میں وہ انسانی [illegible]

میں حقیقی تفریق' اخلاق و اعمال کی نیکی اور بدی کی بنیاد پر ہے۔ فطری فرق اور انفرادی اختلاف (Individual Differences) کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی بنیاد پر نظام تعلیم میں اونچ نیچ' شریف اور کمین' برتر اور کم تر کے امتیازات قائم کئے جائیں اور اس طرح بالآخر ایک طبقاتی نظام تعلیم تشکیل پائے۔ طلبہ کی علمی استعداد اور میلان طبع کا فرق درحقیقت علم التعلیم سے وابستہ افراد کو ایک نکتہ فراہم کرتا ہے کہ وہ اس کے پیش نظر موزوں نصابی اور تدریسی حکمت عملی کا تعین کریں' تاکہ مقصد حیات جو سب کے لئے یکساں ہے کی بہتر تکمیل ہو سکے۔

اسلامی تناظر میں تعلیم کی معاشرتی اساس

دین اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔۔۔ اور حقیقت میں معاشرت' سیاست' معیشت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق مباحث' دین ہی کی اصطلاح میں پنہاں ہیں جس کی روشنی میں انسان خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ وحی الٰہی کو قطعی سرچشمہ ہدایت تسلیم کرتے ہوئے اسلامی معاشرہ ایک ایسا مقصدی اور آفاقی معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس کی بنیاد نہ نسل پر ہے نہ رنگ پر' نہ زبان پر اور نہ محض وطنی مفادات پر۔ اس کے برعکس اس کی اصل بنیاد کلمہ طیبہ ہے اور جہاں قرآن و سنت کو سپریم لا کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔ وہ قیادت صالح افراد کے سپرد کرتا ہے البتہ اصل حاکمیت اور طاقت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی اساس پر معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے لیکن اللہ کے نزدیک سب سے افضل وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں۔ دونوں معاشرے کے معمار ہیں۔ اسلام عورت اور مرد کو انسانیت کے لحاظ سے مساوی اور ایک وحدت قرار دیتا ہے تاکہ وہ تمام نظریات ختم ہوجائیں جو عورت کو مرد سے گری ہوئی مخلوق بتاتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک عورت اور مرد کا عام رشتہ بہن اور بھائی کا ہے۔ صرف نکاح ہی وہ طریقہ ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے خواتین تہذیب و ثقافت کی معمار ہیں۔ وہ نئی نسل کی پرورش اور ان کی روحانی غذا کا سرچشمہ ہیں۔ سید قطب شہید کا تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام کا تصور انسان اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ [illegible] تعلق بن کر رہ جائے کیونکہ انسان اللہ کی مخلوق' اپنے مقصد وجود اور

اپنے انجام میں منفرد ہے (اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل ص 81)--- معاشرتی حوالے سے ایک صحت مند اسلامی سوسائٹی ایک ایسی فضا اور ماحول کی طالب ہوتی ہے جہاں زندگی کے تمام شعبوں میں خیر خواہی' تعاون' اشتراک عمل اور بھائی چارے کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ اسلام جہاں ہر فرد کو انفرادی طور پر ذمہ دار سمجھتا ہے وہاں پوری سوسائٹی کو بھی اجتماعی طور پر ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور اس طرح انسانوں کے باہم فرائض و حقوق کا ایک مکمل نظام بھی دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے مستقل معاشرتی ادارے (Social Institutions) مثلاً گھر' خاندان' قرابت' محلّہ' گاؤں' مسجد' مدرسہ اور حدود و تعزیرات کا نظام بھی قائم کرتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے نقطہ نظر سے وہ بچوں کی تربیت کا کام صرف تعلیمی ادارہ تک محدود نہیں کرتا بلکہ اس معاملہ میں وہ خاندان اور گھر کو مقدم سمجھتا ہے۔ اسلامی معاشرہ' مدرسہ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اسے تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ علم و عمل کی وحدت کے مظہر کے طور پر مسجد سے مربوط کرتا ہے کیونکہ اصل مرکز تعلیم تو مسجد ہی ہے۔ پھر اسلامی ریاست اور معاشرہ اپنے اجتماعی وسائل سے لوگوں کی تعلیم کا ایسا انتظام کرتا ہے کہ غربت کسی صورت بھی حصول علم کی راہ میں مانع نہیں رہتی اور اس طرح علم و عدل کا حصول مفت اور آسان ہو جاتا ہے۔

معاشی حوالے سے اسلام سب سے پہلے معیشت اور اخلاق کے اساسی تعلق پر زور دیتا ہے۔ وہ انسان کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ خدا کی ساری زمین انسان کے لئے میدان عمل ہے لہٰذا وہ اپنے معاش کے حصول کیلئے جدوجہد کرے۔ لیکن معیار زندگی کے گرنے اور قلت وسائل کے پروپیگنڈا سے انسانوں کو کم نہ کرے' بلکہ معیشت کو فروغ دے۔ قرآن معاش کو اللہ کا فضل کہتا ہے۔ اس تناظر میں معاشی زندگی شرعی حدود کی پابند ہوتی ہے۔ اسلامی معیشت کا اہم مقصد غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا ہے۔ اسلام اپنی معاشی پالیسی' طلب حلال اور اجتناب حرام کے اصول پر مرتب کرتا ہے۔ اس پالیسی کا اساسی ضابطہ' سودی نظام کو مکمل طور پر مسترد کرتا ہے۔ اسلام کا نظام معاش' طلب حلال اور معاشی جدوجہد کے ساتھ انسانوں کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور ایک فلاحی ریاست (Welfare State) کے لئے زکوٰۃ' صدقات واجبہ' وراثت' حق سوئی الزکوٰۃ اور بحیثیت مجموعی انفاق فی سبیل اللہ کی تدابیر متعین کرتا ہے تاکہ ایک تو ذخیرہ اندوزی (Hoarding) نہ ہو سکے' دوسرے ان قوانین اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور دولت مسلسل گردش کرے۔ (اسلام کے معاشرتی و سیاسی نظام کے خدوخال

مودودی کی کتاب "اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات" پروفیسر خورشید احمد کی کتاب "اسلامی نظریہ حیات" محمد یوسف اصلاحی کی کتاب "حسن معاشرت" اور نعیم صدیقی کی کتاب "معرکہ دین و سیاست" سے اخذ کیے گئے ہیں)۔ خلاصہ کے طور پر پروفیسر سید محمد سلیم کی کتاب "مسلمان اور مغربی تعلیم" سے یہ اقتباس جہاں اسلامی معاشرہ کی منفرد خصوصیت کو واضح کرتا ہے وہاں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کے لئے ایک رہنما نقطہ نظر بھی فراہم کرتا ہے۔

> دنیا میں کتنی ہی ایسی قومیں آباد ہیں جن کا معاشرہ خود رو درختوں کے جھنڈ کی مانند ہوتا ہے۔ کوئی شعوری مقصد ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔ ماضی ان کا دھندلا، مستقبل انکا مبہم۔ ان کی زندگی کی زمام کار جذبات اور جبلت کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔جو تلون پسند ہیں۔ مادی احتیاجات اور وقتی مصلحتوں سے بڑھ کر کوئی مقصد عالی ان کے لئے محرک عمل نہیں ہوتا۔ خواہشات نفس سے بڑھ کر کوئی ان کا رہنما نہیں ہوتا۔ نفس امارہ نے جس طرف چاہا ان کی نکیل موڑ دی۔ اسی محور کے گرد ان کی ساری زندگی گھومتی رہتی ہے۔ اسلامی معاشرہ کا معاملہ ان سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمان قوم ہدایت الٰہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ مسلمان معاشرہ ایک نظریہ حیات پر مبنی ہے۔ مسلمان کی ساری زندگی اور زندگی کا ایک ایک گوشہ اس نظریہ حیات سے متاثر ہوتا ہے۔ مسلمان قوم کے معمار اول نے ایک ایک فرد کو اسلامی نظریہ حیات کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ملت اسلامیہ ایک ایسی تعمیر ہے جس کی ایک ایک اینٹ کو پہلے ایک خاص نقطہ نظر سے گھڑا گیا ہے، تراشا گیا ہے اور پھر اس کو دیوار میں چنا گیا ہے
>
> (مسلمان اور مغربی تعلیم ص ۵)

حقیقت میں اسلامی معاشرہ کا قیام انسان کی فطری ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ ہی واحد راہ نجات ہے۔

بان اساسی مباحث کی روشنی میں، اسلامی نظام تعلیم کی معاشرتی اساس سے متعلق چند اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ تعلیم بنیادی طور پر ایک معاشرتی عمل ہے اور تعلیم گاہ ایک معاشرتی ادارہ ہے۔ [illegible] نظام براہ راست معاشرے کے مسائل اور ضرورتوں سے متاثر ہوتا ہے۔ ہر معاشرے [illegible] ہوتی ہیں۔ افراد کی طرح معاشرے کی بھی اقدار ہوتی ہیں اور حقیقت

میں زندہ قومیں وہی ہوتی ہیں جو اپنی اقدار اور تہذیبی روایات کو زندہ رکھتی ہیں۔ اسلام ایک خوش حال اور متوازن معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے جس کو وہ حیات طیبہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں وہ اسلامی نظریہ حیات کے علم کو ہر شخص کے لئے ایک ناگزیر ضرورت قرار دیتا ہے' جسے تعلیم و تربیت کے ذریعے ہی پورا کیاجا سکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیم کی اہم معاشرتی اساس یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ اپنے اعتقادات' اپنے نظام عبادات' اپنی منفرد دینی اقدار' اپنے تہذیبی شعور' اپنی تمدنی اور مادی ضروریات' اپنے تاریخی ورثہ' اپنی زبان' اپنے فنون لطیفہ اور اپنے مجموعی ملی تشخص کو لازمی (Compulsory) تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل کو منتقل کرے تاکہ وہ ذہنی لادینیت (Intellectual Secularism) اور تشکیک و ارتیابیت (Scepticism) سے نجات حاصل کرے اور دل و جان سے اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات (Complete Code of Life) کے طور پر تسلیم کرے۔

-2 تعلیم کی معاشرتی بنیادوں میں جس اہم نقطہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام نے تاریخ کے ہر دور میں اپنے معاشرے کی تکمیل کی وہ دراصل یہ گواہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہی کائنات کا مدبر و منتظم ہے۔ وہی حاکم حقیقی ہے۔ نبی آخرالزماں ﷺ پوری انسانیت کے سید و محسن ہیں۔ تعلیم کو اس تہذیبی بنیاد پر قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی پوری کی پوری اللہ کے تصرف میں دے دی جائے اور بالآخر ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آئے۔ چنانچہ اس نظام تعلیم کی تیار کردہ شخصیت زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں اللہ ہی کی ہدایت کی طرف رجوع کرے گی۔ اس بنیادی تہذیبی نصب العین کے بغیر تعلیم کی اسلامی تعمیر و تشکیل کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

-3 اسلامی تعلیم کی معاشرتی اساس میں یہ نقطہ بڑا اہم ہے کہ ساری انسانیت آدمؑ کی اولاد ہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اسلام "العظمتہ للانسان" (جسے آج کے دور میں انسان دوستی "Humanism" کہا جاتا ہے) کی بعض مثبت باتوں کا قائل ہے لیکن وہ العظمتہ للانسان سے پہلے "العظمتہ للہ" کا قائل ہے کیونکہ خدا کی عظمت اور خدا کی محبت کے بغیر انسانوں سے محبت کا آخر کیا معیار ہے؟ اسلام جہاں پوری امت مسلمہ میں وحدت' یکجہتی اور اخوت کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے وہاں پوری دنیا کی مظلوم انسانیت کا بھی آخری سہارا بنتا ہے۔ وہ رنگ و نسل' علاقہ' زبان' اور مذاہب سے بالاتر ہر انسان کو ظلم' غربت' جہالت' بیماری اور ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرہ افراد کے [illegible]

اور اس کی روشنی میں ایک ایسی اجتماعی اسلامی تحریک قائم کرتا ہے جو فعال ہو اور اس کے افراد کے اندر باہمی تعاون اور یکجہتی ہو۔ اس مقصد کے لئے نظری تعلیم کے ساتھ انسانی خدمت اور بحیثیت مجموعی جہاد فی سبیل اللہ کے تناظر میں عملی تربیت بھی لازمہ نصاب ہے۔

-4 اسلام اپنے تمدنی اور تہذیبی ورثے کے فروغ کے لئے حصول علم کو مردوں اور عورتوں پر فرض قرار دیتا ہے لیکن صحت مند معاشرہ کے قیام کے لئے مخلوط تعلیم کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام ایسی تعلیم کی قطعاً" اجازت نہیں دیتا جو مسلم معاشرے کی خاندانی فضا کو مکدر کرے۔ چنانچہ اسلام نے آفاقی قدروں کی تجدید اور ثقافتی روایات کے احیاء کے لئے حجاب اور ساتر لباس کو ضروری قرار دیا ہے اور تعلیمی اداروں میں ایسی حکمت عملی وضع کرنے کی تاکید کی ہے کہ بالغ طالبات حصول علم کے لئے پردہ ترک کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

-5 اسلامی نظریہ حیات پر مبنی نظام تعلیم ہر فرد میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بیدار کرتا ہے۔ یہ نظام تعلیم پورے معاشرہ میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا اور برائیوں کو روکنے والا ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں ایسی انفرادیت کی کوئی گنجائش نہیں جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے ناآشنا ہو۔ اس حوالے سے اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ تعلیم کو اس انداز پر مرتب کرے کہ اس تربیتی نصاب میں طالب علم چاہے کسی شعبہ میں تعلیم حاصل کر رہا ہو اس کے لئے اسلامی تعلیم' اسلامی تاریخ' اسلامی ادب' اسلامی ثقافت' اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کرنا لازمی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں مختلف تعلیمی و تربیتی پروگرام مثلاً" عملی معاشرتی خدمت (Social Work) عسکری تعلیم (Military Education) تعلیم بالغاں (Adult Education) اور خصوصی تعلیم (Special Education) کا بھی اجراء ضروری ہے۔ لیکن ان تمام تعلیمی تحریکات کے نصاب کی اصل بنیاد دینی عقائد و اقدار کو ہی ہونا چاہئے ورنہ محض سیکولر تشکیل تعلیم' اسلامی معاشرہ کے لئے بے معنی ہے۔

-6 تعلیم کے درج ذیل معاشرتی وظائف یا کردار (Roles) بڑی اہمیت رکھتے ہیں:

(الف) ۔ تعلیم کا حفاظتی کردار: تعلیم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ کی مستقل یا دائمی قدروں کا تحفظ کرے اور ان اقدار کو اپنی صحیح صورت میں نئی نسل کو منتقل کرے۔ اس حوالے سے تعلیم کا اہم کردار اسلامی تہذیب و تمدن کا احیاء اور فروغ ہے۔ اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ میں یہ عمرانی اصول پیش نظر رہنا چاہئے کہ کسی ثقافت کے قلب و روح تک پہنچنے کے لئے زبان ہی سب سے بڑا وسیلہ ہوتی ہے۔ لہذا اسلامی تہذیب و تاریخ کی [illegible] ضروری ہے کہ عربی زبان کو ابتدا سے ہی لازمی مضمون کی حیثیت

سے پڑھایا جائے تاکہ مسلم طلبہ بنیادی ماخذ یعنی قرآن و حدیث کو اس کی اپنی زبان میں پڑھیں' اسے سمجھیں' اس پر عمل کریں اور پھر اس علم کو دوسروں تک منتقل کرنے کا فریضہ سنبھالیں۔

(ب) ۔ تعلیم کا ناقدانہ کردار : تعلیم کا یہ ایک اہم کردار ہے کہ معاشرہ میں پہلے سے موجود چیزوں کو تنقیدی نظر سے دیکھے۔ اسلامی معاشرے میں بسا اوقات ایسے افکار و تصورات بھی جڑ پکڑ جاتے ہیں جنہیں ہو بہو طلبہ تک منتقل نہیں کیا جا سکتا' بلکہ انہیں چھانٹ پرکھ کر اگلی نسل کو پہنچایا جاتا ہے۔ معاشرہ میں بعض چیزیں خلط ملط یا گڈ مڈ ہو جاتی ہیں۔ تعلیم کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ انہیں اسلام کے نظریہ علم کی روشنی میں تنقیدی نظر سے دیکھے اور تطہیر کے عمل کے بعد مطلوب و مفید نظریات' معلومات اور تجربات کو طلبہ تک منتقل کرے۔

(ج) ۔ تعلیم کا تخلیقی کردار : تعلیم کا بلا شبہ یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اسلامی اقدار کا تحفظ کرے اور معاشرہ میں دوسری اقوام کے زیر اثر نفوذ پانے والی بعض نئی روایات و اقدار کا تنقیدی جائزہ بھی لے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے کہ اسلام کی دائمی اقدار' تاریخی روایات اور مستقل معیار رد و قبول کی روشنی میں حال اور مستقبل کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو حل کرنے کے لئے اجتہاد' تحقیق اور تخلیق سے بھی کام لے' لیکن اس عظیم کام کے لئے تفہیم دین بنیادی شرط ہے۔ تعلیم کے اس معاشرتی کردار کی تکمیل کے لئے اعلیٰ تعلیم بالخصوص تربیت اساتذہ کے نصابات میں اسلام کے اہم وسائل تعلیم یعنی سمع' بصر اور فواد کی روشنی میں تخصص (Specialization) "تفقہ فی الدین" کو ہی حاصل ہو گا' تاکہ اساتذہ جدید علوم اور اسلامی علوم میں اجتہاد کر سکیں اور صحیح فکر طلبہ تک پہنچا سکیں۔

7- اسلامی معاشرہ' پوری دنیا میں اپنی علمی و ثقافتی سیادت اور بحیثیت مجموعی امامت عالم کے لئے مادی ترقی کے خلاف نہیں' لیکن وہ معیار زندگی سے زیادہ معیار انسانیت پر زور دیتا ہے۔ اس طرح وہ مادی ترقی کو اخلاقی ترقی کے تابع رکھتا ہے۔ معاشرتی نقطہ نگاہ سے اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے تمام معاشرتی ادارے صحیح معنوں میں ایسی قائدانہ صلاحیتوں کے حامل افراد تیار کریں جو دنیا میں اسلامی تہذیب و تمدن کے نظام کو چلانے کے قابل ہوں۔ اس تناظر میں تعلیم کا اہم مقصد ایسے قابل اساتذہ' طلبہ' منتظمین اور ہر شعبہ زندگی میں ایسے ماہرین تیار کرنا ہے جو بیک وقت اعلیٰ اخلاق کے حامل پختہ مسلمان بھی ہوں اور اپنے اپنے شعبہ و فن میں بھی ماہر ہوں۔

8- تعلیم کی سیاسی بنیادوں کے حوالے سے ایک نمایاں نکتہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقصد اعلیٰ کی [illegible]

ہے۔ اسلامی ریاست ایک آمرانہ نظام نہیں بلکہ شورائی نظام قائم کرتی ہے۔ یہ ریاست کلمہ طیبہ پر مبنی اسلامی قومیت اور امت واحدہ کی تشکیل کرتی ہے۔ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے جو قیام انصاف اور بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دیتی ہے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے تعلیم کا فروغ' ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا اولین منصب معلم کا ہے۔ ان کے جانشین کی حیثیت سے اسلامی ریاست پوری آبادی کے لئے معلم اور مربی کا مقام رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ ایک ایسے آفاقی نظام تعلیم کی پیامبر ہے جو ہر طرح کے جاہلی تعصبات سے پاک ہو اور پوری انسانیت کے لئے باعث رحمت ہو۔

9- معاشی اساسیات کے حوالے سے طلب حلال اور اجتناب حرام' اسلامی نظام تعلیم کی محوری قدر ہے۔ اسلام کسی معاش کے ذرائع سے ہی حلال و حرام میں تمیز کرتا ہے۔ حلال وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور حرام بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنا درحقیقت قانون الٰہی کے بجائے اپنے نفس کی پیروی کرنا ہے۔

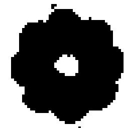
10- اسلامی تعلیم کی معاشی بنیادوں میں اس نکتہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے کہ انسان حصول معاش کے لئے مثبت طور پر زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے۔ انسانوں کی جائز معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے وسائل معاش کی فراہمی انتہائی ضروری ہے۔ اس حوالے سے نظام تعلیم میں ان مضامین (Disciplines) کو بلاشبہ اہم سمجھا جاتا ہے جو مادی نقطہ نظر سے پیداواری (Productive) ہوں' لیکن اسلام اس تصور کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف وہی تعلیم کار آمد ہے جو مادی لحاظ سے نافع ہو۔ اسلام معاشی حوالے سے جائز مادی افادہ کی نفی نہیں کرتا' البتہ اسے لازماً" اسلامی اخلاقیات اور اسلام کے معاشرتی ضابطوں (Social Checks) کے تابع کرتا ہے چنانچہ نصابی ترجیحات (Priorities) کے لحاظ سے مغیبات' معقولات اور محسوسات کو درجہ بدرجہ مقام حاصل ہے۔ البتہ یہ علوم جدا جدا نہیں بلکہ ان میں مغیبات یعنی قرآن و حدیث کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عمرانی اور سائنسی علوم اسی مرکز کے گرد مدون کئے جاتے ہیں۔ یوں علم الادیان اور علم الابدان ایک وحدت علم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ دنیوی اور اخروی دونوں حوالوں سے فوز و فلاح کا باعث بنتا ہے۔

خلاصہ بحث

اسلام ایک جامع اور متوازن نظام پیش کرتا ہے جو ماضی' حال اور مستقبل کے علم پر

محیط ہے' زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہے' حیات و کائنات کو مکمل ہم آہنگی بخشتا ہے اور جو ہر دور میں معیار اعلیٰ کا کام دیتا ہے۔ اس معیار کے تناظر میں تعلیم کی فکری' نفسیاتی اور معاشرتی اساس پر اسلامی نظام تعلیم کی عمارت کی تعمیر کا زیادہ تر انحصار معلم کی مربیانہ اور داعیانہ شخصیت پر ہے جو کردار سازی اور نتیجہ خیزی کے حوالے سے اصل جوہر ہے۔ استاد معمار قلب و نظر ہے' جس کا ذاتی تشخص' ایمان کی پختگی' صالح عمل' اپنے مضمون پر علمی عبور' موثر حکمت تدریس اور اسلامی مقاصد تعلیم سے گہری وابستگی یہ سب ایسی صفات ہیں جو تدریس کے عمل کو موثر اور روحانی تحرک کا باعث بناتی ہیں۔ طالب علم سب سے پہلے استاد کی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اخلاص و عقیدت کے جذبے کے ساتھ تعلم کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ حقیقت میں آج امت مسلمہ کا جو بھی فرد اسلامی نظام تعلیم کے میدان میں سرگرم عمل ہے وہ دراصل انبیاءؑ کے منصب کا وارث ہے۔ اس تناظر میں اسلامی ریاست کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اساتذہ کی نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کا پورا نصاب' اسلامی اساسیات تعلیم کی روشنی میں مرتب کریں' بالخصوص تعلیم و تعلم کی تمام سرگرمیوں کو اس محوری نکتہ کے گرد تشکیل دیں کہ دائمی اور برتر نوعیت کا ذریعہ علم' وحی الٰہی ہے اور باقی تمام حسی' تجربی اور قیاسی علوم اسی بالاتر سرچشمہ علم کے تابع ہیں۔ خلاصہ کے طور پر تعلیم کی ہر سطح اور ہر مضمون میں' مقاصد تعلیم کے تعین' نصابات کی تشکیل' اساتذہ کے لیکچرز اور ان کے افکار و اعمال' غرض پورے تعلیمی اور تربیتی پروگرام میں اسلامی اقدار کے فروغ کو مرکزی حیثیت دینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ نظام تعلیم اسلامی تشخص سے یقیناً محروم ہو گا۔

(سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویئے اسلام آباد' جلد 7' شمارہ 2' جولائی 1995ء)



علوم کی اسلامی تشکیل

علم میں ایک تو حقائق ہیں اور پھر ان حقائق پر مبنی قیاسی' استدلالی' استنباطی' استقرائی یا استنتاجی معلومات شامل ہوتی ہیں۔ اب اس میں یہ چیز قابل غور ہے کہ کیا انسان کے لئے صرف حسی یا قیاسی علم کافی ہے؟ اس کے جواب میں بے خدا اور سیکولر تہذیبوں نے طے کرلیا ہے کہ صرف وہی حقائق جو سادہ حواس' ٹیسٹ ٹیوب' ترازو' خوردبین یا دوربین کے ذریعے ہمیں معلوم ہوں' یا قیاس و استدلال کے ذریعے ان حقائق کی جو تفاصیل متعین ہوں صرف وہی علم (Knowledge) کی تعریف میں داخل ہو سکتی ہیں ــــــ اس یک رخے اور ادھورے نقطہ نظر سے نہ تو کائنات کے نظم و قانون کی توجیہہ کی جاسکتی ہے' نہ حیات کی ماہیت اپنی مختلف اشکال کے ساتھ متعین ہوسکتی ہے اور نہ انسان کے لئے کوئی ایسا مقصد' ماسوا دولت' لذت' اور اقتدار کے معین کیا جاسکتا ہے' جو اس میں اخلاقی اصول و حدود کی پابندی یا بعض طریقوں پر قدغن لگاسکے۔ وہ کس اعلیٰ چیز کے لئے قربانیاں دے؟ وہ کیوں انسانی فلاح کے لئے کام کرے؟ کیوں غریبوں اور مظلوموں سے ہمدردی و تعاون کا رشتہ رکھے؟ الحاد تو صرف ان ہی اغراض کے لئے جینے اور ان کو سیدھے اور الٹے ہر طریقے سے حاصل کرنے والے انسان پیدا کر سکتا ہے ــــ اور اپنی اغراض کے لئے کام کرنے والے انسان حقیقی معنوں میں دوسروں کی فلاح کے لئے قربانیاں نہیں دے سکتے اور نہ وہ لازمی طور پر معاشرے کے لئے دیانت دار ہوسکتے ہیں۔

حقیقت میں خدائے واحد کو نہ ماننے کی وجہ سے ایسے تمام لوگوں کو یا تو اپنے وطن کو یا اپنی نسل کو یا اپنے خود ساختہ نظریاتی رجحانات کو خدا بنانا پڑتا ہے اور پھر یہ خدا جو کچھ لازم کرتے جائیں وہ اپنے سر لینا ضروری ہے ــــ اس الحادی عقلی سرمایہ علم نے ارتقاء کا نظریہ وضع کیا' جس نے نوع انسانی میں دو بڑی قوتیں ابھار دیں۔ ایک افراد کا سرمایہ دارانہ نظام اور ایک آمرانہ اسٹیٹ کا سرمایہ دارانہ نظام۔ دعویٰ یہ تھا کہ تھیسس (Thesis) اور سنتھسس(Synthesis) کے بعد اب شجر ارتقاء کا وہ "گل سرسبد" رونما ہوا ہے جو انسان کو آزادی' مساوات اور انصاف سے مالا مال کر دے گا۔ پہلے مزدور کی ڈکٹیٹر شپ کے نام سے دانشوروں (Intellectuals) نے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کرکے کسانوں اور مزدوروں کو

خوب کو لہو میں پیسا۔ نتیجہ یہ کہ شجر تاریخ کا یہ "گل سرسبد" ایسا مرجھایا کہ اسکی پتیوں کو ہوائیں اڑالے گئیں۔ آج وہاں فاقہ مستی ہے۔ الحلو کی ستم رسیدہ دنیا کے ہاتھوں اب مقابلے کی دوسری شاخ بھی ٹوٹنے والی ہے اور قانون قدرت کے مطابق اسے ٹوٹنا چاہیے۔

اس بحث سے یہ خلاصہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کیمونزم کی تباہی ہو یا کل سرمایہ داری کا بھٹہ بیٹھ جائے' اس کا اہم ترین سبب' علم کو غلط مفہوم کے ساتھ نہایت محدود کرکے لینا ہے۔

علوم کی اسلامی تشکیل: اساسی مباحث

ہمارے دینی شعور کے لحاظ سے خدا نے نہ صرف آدمؑ کو پیدا کیا' انہیں پیغمبر مبعوث کیا' بلکہ علم الاسماء سے بھی نوازا اور پھر اپنی جانب سے مسلسل پیغمبر مبعوث کیے جو خدا کی طرف سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بہترین اصول اور ضابطے لے کر آئے۔ اس حوالے سے انسانیت کی فلاح کے لئے آخری کتاب قرآن حکیم ہے جو نبی آخر الزماں ﷺ پر اتاری گئی۔۔۔۔ یہ سب علم تھا اور اس علم کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ تمہاری زندگی کی نعمتوں اور کارناموں کا حساب بھی لیا جائے گا۔ پس ہمارا ایمان یہ ہے کہ علم کے خزائن اللہ کے پاس ہیں' اس نے ان خزائن میں سے انسان کو مسلسل حصہ عطا کیا ہے۔ بعضوں نے اس علم کو غلط استعمال کیا اور قول و عمل کے تضاد پیدا کیے۔ بعضوں نے خدا اور اس کے پیغمبروں اور خدائی سرچشمہ علم کا انکار کرکے اپنے آپ کو حسی اور قیاسی علوم تک محدود کرلیا۔۔۔۔ اس لئے ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم حواس اور قیاس سے برتر نوعیت کے ذریعہ علم وحی کو تسلیم کریں۔ حواس و قیاس کے حاصل کو وحی الٰہی کی کسوٹی پر پرکھیں۔ ہم خدا کی طرف سے اخلاقی منزلت لے کر آئے ہیں۔ ہمیں ایک دن احتساب کے لئے پیش ہونا ہے۔ لہٰذا ہماری زندگی کا اصل نصب العین الٰہی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔

علم حقیقت میں خدا کا عطا کردہ ہے۔ علم کے سارے خزانے اسی کے پاس ہیں۔ اس تناظر میں اسلامی علوم وہ ہو سکتے ہیں جو حس و تجربہ' مشاہدہ اور قیاس و استدلال کے علاوہ وحی کی برتر روشنی مان کر ترتیب دیئے گئے ہوں۔ علوم کی اسلامی تشکیل کے حوالے سے اس مختصر تعریف کی روشنی میں ہمارے نظام تعلیم کی عمارت کی اٹھان اس بنیاد پر ہوگی کہ یہ نظام اللہ تعالٰی کا عطا کردہ ہے اور نبی آخر الزماں ﷺ کے ذریعے انسانیت تک پہنچا۔ چنانچہ اس مستقل رہنما اصول کی روشنی میں اس تعلیمی ماڈل میں سب سے پہلے فکری اساس کی وضع اور پھر اس پر مبنی درسی مضامین کی اسلامی تعبیر (Interpretation) کرنا ہوگی۔ اس طرح

میں درج ذیل چند نکات بڑی اہمیت کے حامل ہیں:

ا - علم و ہدایت کا قطعی سرچشمہ' اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وحی الٰہی سب سے اعلیٰ اور حتمی ذریعہ علم ہے۔ اس علم کا مستقل ماخذ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ علم کے اسی نظریہ کی اساس (Epistemological Base) پر ہی وجودیات (Ontology) اور قدریات (Axiology) سے متعلق نظریات کا تعین کرنا ہوتا ہے۔

ب - حقیقت اعلیٰ' خدائے واحد ہے جو قادر مطلق ہے۔ اس نے یہ کائنات بامقصد بنائی اور اس میں انسان کی زندگی کا اہم مقصد بندگی رب ہے۔ وہ زندگی کی اخلاقی تعبیر کے حوالے سے اس کائنات میں اشرف المخلوقات ہے اور اس زمین پر خدا کا خلیفہ اور اس کا نائب ہے۔ اس طرح وہ ایک ذمہ دار شخص ہے۔

ج - سب سے اعلیٰ قدر' اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرنا ہے لہذا خیر و شر کے معاملہ میں مستقل معیار اور پیمانہ' خدا کا دین ہے یعنی جو کچھ دین اسلام میں ہے' وہ خیر ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ شر ہے۔ اس ضمن میں تعلیم غیر جانب دار (Neutral) نہیں۔

د - نبی آخر الزماں ﷺ پوری انسانیت کے قائد اور محسن ہیں۔ فکری اور عملی ہر لحاظ سے اور ہر زماں و مکاں میں آپ' کا اسوہ ہی قابل اتباع ہے۔

ہ - امامت عالم کے منصب کے حصول کے لئے فریضہ جہاد فی سبیل اللہ کی ادائیگی لازمی ہے۔

و - دنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی ابدی ہے' جہاں انسان کو خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

اس فکری اساس کے تناظر میں ہمیں مختلف سطحوں پر پڑھائے جانے والے مضامین (Disciplines) کی تشکیل و تنفیذ میں اصل مرکز خیال' اسلام کے نظریہ علم کو ہی ٹھہرانا پڑے گا۔ پھر خاص طور پر ان مضامین کے لوازمہ (Content) کی تشکیل و تعبیر بھی اسی نظریہ کے حوالے سے کرنا ہوگی۔ اس تناظر میں' نمونے کے طور پر بعض علوم کی اسلامی تشکیل (Islamization) سے متعلق چند نمایاں اساسی نکات ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

تاریخ

ا - ... تاریخ کی اساس مستقل اخلاقی قدریں ہوں گی نہ کہ ہر دم متغیر مادی ... قرآن حکیم نے تاریخ کے اصول وضع کر دیئے ہیں اور ...

زوال کے اخلاقی اسباب بتا دیئے ہیں۔ یعنی اصل چیز خیر و شر کی کشمکش ہے۔ اچھے نظریات اور برے نظریات کا ٹکراؤ۔ اس اخلاقی (Moralistic) نظریہ تاریخ کی بنیاد ہمارا یہ نظریہ علم ہوگا کہ حواس و قیاس کے ذرائع سے بالاتر ذریعہ علم، وحی الٰہی ہے جسے ترک کر دینے سے کائنات کا وسیع مقصد گم ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اب اگر ہم اپنے ہاں، خصوصیت سے سکول کے تعلیمی نصاب کا مطالعہ کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہمیں تاریخ جغرافیہ سے لاتعلق کیا گیا اور اس کی جگہ چند میکانکی اقدار پر مبنی "اچھا شہری" (Good Citizen) تیار کرنے کے لئے سوشل اسٹڈیز کے نام سے ایک ایسا مضمون دیا گیا، جس نے مستقل اخلاقی نقطہ نظر کی جگہ مادی (Materialistic) نقطہ نظر کو اہمیت دی۔ اس طرح جو طالب علم تیار ہوا، وہ بالعموم یک رخا، ادھورا اور منتشر شخصیت (Split Personality) کا مالک بنا۔ حقیقت میں ہمیں تاریخ کی تعبیر و ترتیب میں جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کے بجائے اسلام کے تہذیبی و اخلاقی تصور کو نمایاں کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ مضمون واقعات کی ایک ایسی وقوفی کھتونی (Congnitive Ledger) بن جائے گا جو طلبہ میں قطعاً کوئی واضح تعمیری نظریہ حیات راسخ نہیں کرسکے گا۔

سیاسیات

اسی طرح سوشل سائنسز بالخصوص سیاسیات میں ہماری فکری بنیاد یہ ہوگی، کہ انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور اصل حاکمیت اور طاقت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ چنانچہ نظام شورائیت کے تحت، ایمان، علم اور مستقل اخلاقی اقدار کو اہمیت ملے گی اور عملی سیاست میں اسلامی اقدار سے عاری، جذباتی مشتعل ہجوموں سے فائدہ اٹھانا درست نہ ہوگا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام کے نظریہ علم کی روشنی میں، دین و سیاست کی تفریق صحیح نہیں۔ بلکہ وحی الٰہی کو قطعی سرچشمہ ہدایت تسلیم کرتے ہوئے، اسلامی ریاست ایک ایسی مقصدی اور آفاقی ریاست ہوگی، جس کی بنیاد نہ نسل پر ہے، نہ رنگ پر، نہ زبان پر، نہ وطن پر، اور نہ محض معاشی مفادات پر۔ بلکہ اس کے برعکس اس کی قومیت کی اصل بنیاد کلمہ طیبہ ہے۔ چنانچہ سیاسیات کی اسلامی تعبیر میں یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اسلامی سیاست کا اولین مقصد اسلامی نظریہ حیات کی علم برداری، شریعت کی بالادستی اور اسلامی ریاست کے قیام و تحفظ کی بھرپور جدوجہد ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے ارکان کا چناؤ اور ان ارکان کے ذریعے قانون سازی کا فریضہ بھی اسی مقصد [illegible] پارلیمنٹ کو یہ حق اور اختیار حاصل [illegible]

دائمی اقدار و روایات اور تہذیبی علامات کو محض اپنی عددی قوت سے یا تو یکسر ختم کر دیں یا ان میں اپنی مرضی سے رد و بدل کر دیں۔ اسلامی تناظر میں طاقت کا سرچشمہ عوام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ چنانچہ اسلام کے تصور علم کی رو سے اصل مقصود یہ ہے کہ اخلاقیات، قانون، معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیمات، غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں قرآن و سنت کو سپریم لا کی حیثیت حاصل ہو اور معاشرہ میں خدا کی حاکمیت ہو۔

نفسیات

قرآن حکیم کی اپنی نفسیات ہے۔ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ ـــــ یہ گویا تین خطوط (Lines) ہیں، جن کے تناظر میں ہم تجزیہ نفس کے بعد یہ معلوم کر سکیں گے کہ کسی کے اندر تضادات کی نوعیت کیا ہے؟ اور دو متضاد چیزوں کو اکٹھا کرنے سے کیا نتائج سامنے آتے ہیں؟ حقیقت میں قلب کی جتلائے مرض اور بگاڑ کی بڑی وجہ تضادات کی یک جائی ہی تو ہے ـــــ دور حاضر میں نفسیاتی حوالے سے، نصاب تعلیم کی تشکیل و تنفیذ کے ضمن میں ایک نعرہ (Slogan) بڑا معروف ہے اور وہ یہ ہے کہ نصابی سرگرمیوں کی تنظیم اور طلبہ کی تعلیم و تربیت، بچوں کی فطرت (Nature) کے مطابق ہو۔ لیکن انسانی فطرت اور انسانی ضرورتوں کی تشریح کلیتہً "حیاتیاتی (Biological) اور حیوانی معیار سے کی گئی۔ بندگی رب کے تصور کو خارج کیا گیا اور یوں انسان کو محض ایک معاشری حیوان سمجھا گیا جو صرف اپنی جبلت (Instinct) سے بندھا ہوا ہے۔ اس حیوانیت کے تناظر میں علوم کی تشکیل کی گئی اور اسے ہی ترقی پسندیت کہا گیا۔ گویا جدید مادی نفسیات کی منطق محض حیوانی منطق ہے۔ جس میں تصور انسانیت کا حوالہ سوائے جانوریت (Animalism) کے اور کچھ نہیں ـــــ

حقیقت میں خلیفتہ اللہ کے منصب کا تصور جب ماہرین نفسیات اور معلمین کی آنکھوں سے او جھل ہوا اور ان کا کام تشکیل اخلاق کے بجائے صرف وجودی تسلسل سے متعلق انتقال علم ہی ٹھہرا، تو پھر سوائے کچھ محدود جسمانی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کے کچھ نہ رہا۔ یوں فطرت انسانی سے متعلق اس انتہائی ناقص اور مسخ شدہ تصور نے خود استاد کی شخصیت کو مسخ کر دیا کیونکہ فطرت کی اس تعبیر میں نہ حلال و حرام کا کوئی تصور تھا نہ معروف و منکر کا اور نہ ہی آخرت میں جواب دہی (Accountability) کے احساس کا ـــــ اس کے برعکس ہمارے نظریہ علم کے حوالے سے یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، کہ ماہر نصاب یا استاد کا واسطہ، اشیاء، کھلونوں، درختوں اور حیوانوں سے نہیں ہوتا بلکہ زندہ انسان سے ہوتا ہے۔ اس زندہ انسان کے [illegible] احساسات ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا، کائنات،

انسان اور پھر ان تینوں کے باہمی تعلق کے اسلامی تصور کو سمجھے۔ ان اساسی سوالات کے جوابات اگر اس نے قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ کے حوالے سے حاصل کئے تو وحدت' اخوت' انسانیت' ایثار اور رحمت کے جذبات پروان چڑھیں گے' لیکن اس کے برعکس ان سوالات کی توضیح اگر بے خدا ماہرین نفسیات اور فلسفیوں کے حوالے سے محض حواس و قیاس کے تناظر میں کی گئی تو اس سے فطرت انسانی کا صحیح شعور انسان کو نہ مل سکے گا۔ بدقسمتی سے یہ غلط شعور اگر عمل تعلیم (Educational Process) کے جملہ عناصر کی تعمیر و تشکیل میں منتقل ہو جائے تو اس سے طالب علم کی اخلاقی' روحانی' ادبی' تہذیبی' ذہنی' جسمانی غرض اس کی بھرپور متوازن اور صحت مند نشوونما کی راہ میں زبردست رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ نصابات کے ماہرین اور اساتذہ' علم نفسیات سے متعلق جدید لٹریچر کا ضرور مطالعہ کریں' لیکن فکری لحاظ سے انہیں یہ امتیاز پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلامی نظام فکر' انسان کو خلیفتہ اللہ کہتا ہے اور بے خدا نظام فکر' انسان کو حیاتیاتی جانور کہتا ہے۔ لہذا فطرت انسانی سے متعلق اگر غلط تعبیر کی گئی' تو اس سے نہ صرف تعلیم و تعلم کا پورا عمل ناقص ہوگا بلکہ اس کے نتیجے میں بے آہنگی یا عدم مطابقت (Mal-adjustment) کا بھی شکار ہوگا۔

ادب

آج فلسفہ جدیدیت یا لبرل اقدار پر مبنی فن یا ادب کی کوئی بھی صنف ہو' ان سب کی اساس دراصل وہی نظریہ ہے جو مادہ پرستانہ نفسیات پیش کرتی ہے۔ یعنی انسان ایک جانور ہے۔ لہذا اس کا مقصد حیات سوائے طبعی یا حیوانی ضروریات کی تکمیل کے کچھ اور نہیں۔۔۔۔ اور اس کے برعکس ہمارا ادب کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ ادب صرف فن کا نام نہیں' بلکہ دوسروں تک ایسے خیالات و تجربات کو منتقل کرنا ہے جو فی نفسہ برحق اور حسین ہوں تاکہ تعمیر انسانیت ہو سکے۔ مسلمان ادیب' خیر و شر کی کشمکش میں خیر کا نمائندہ ہوتا ہے اور اس طرح اس کی تمام صلاحیتیں رضائے نفس کے بجائے رضائے الٰہی کے لئے صرف ہوتی ہیں۔ حقیقت میں اسلامی نظریہ علم کی روشنی میں ادب کی اصل غایت یہ ہوگی کہ وہ صالح اور مستقل اخلاقی اقدار کے فروغ کا باعث بنے اور مظاہر ہے' ان اقدار کا ماخذ دین اسلام ہی ہوگا۔ اس ضمن میں ہمیں پاکیزہ تعمیری ادب کو ہر سطح کے نصاب میں شامل کرنا ہوگا۔ پھر اس فلسفہ ادب کی بھی تردید کرنا ہوگی جو نئی نسل کو اپنے اصل مقصد حیات سے دور لے جائے اور ان میں غیر اخلاقی رجحانات کو فروغ دے۔ ادب کی [illegible] نظریہ کی [illegible]

قدر ہے جو معاشیات کی اصطلاح میں زیادہ پیداوار (Higher Production) کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ ہم معاشی زاویہ نظر سے بہتر "معیار زندگی" کے خلاف نہیں۔ لیکن اس سے زیادہ' بہتر "معیار انسانیت" کے قائل ہیں۔ جس کا سرچشمہ دینی علم کے ساتھ ساتھ وہ جائز اور پاکیزہ ادب ہے جو طلب حلال اور اجتناب حرام کی تعلیم دیتا ہے۔

طبعی علوم

جہاں تک طبعی علوم کا تعلق ہے تو ہمارا تصور علم یہ ہوگا کہ کائنات خدا کی خلق کردہ اور اسی کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ اور اس میں کام کرنے والوں کے لئے اللہ نے قانون مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ خدا کے مقرر کردہ طبعی قوانین کو معلوم کرنا اور انہیں بہتر اور پاکیزہ مقاصد کے لئے استعمال کرنا ہمارا اصل ہدف ہوگا۔ اس مقصد اور اصول کے تناظر میں میڈیکل سائنسز میں ادویہ سازی اور علاج میں بھی قطعی حرام چیزوں سے اجتناب کرنا ہوگا۔۔۔۔ اصل میں مظاہر فطرت کے حوالے سے یہ کوہ' صحرا' دشت' دریا' بحروبر' درحقیقت وہ تختہ تعلیم ہے جس پر معلم اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم دیتا ہے۔ انسان غور و فکر کرے تو اس انفس و آفاق میں ہر جگہ آیات الٰہی ہیں۔ صرف الٰہی ہدایت کی رہنمائی میں بصیرت اور تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور اس میں تجربہ و تحقیق' امت مسلمہ کے نظام تعلیم میں ایک اہم مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔

چند عمومی نکات

○ علوم کی اسلامی تشکیل کے حوالے سے بحیثیت مجموعی یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ مغربی فکری غلبہ کا ایک اہم ترین ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ بلاشبہ عالمی معلومات کی فراہمی اور سائنسی ترقی کے تناظر میں اس زبان کی اپنی ایک اہمیت ہے اور اس حد تک اس زبان کے سیکھنے اور اس کے حوالے سے سائنسی تعلیم کے حصول میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کسی ثقافت کے اصل تک پہنچنے کے لئے زبان ہی سب سے بڑا وسیلہ ہوتی ہے۔ اگر ہم انگریزی زبان کو مکمل طور پر اپنائیں گے تو ان ممالک کا کلچر جن کی زبان انگریزی ہے' وہ یقیناً غلبہ حاصل کرے گا۔ ہمیں اس کا احساس ہونا چاہئے کہ اسلام کے سرچشمہ علم کے ماخذ چونکہ عربی زبان میں ہیں' اس لئے اسلام کی روح کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کو ابتداء سے ہی لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا

جائے تاکہ قرآن و سنت کی تعلیم جو مسلمانوں کے اعتقادات' اخلاقیات اور تدبر و تفکر کی تشکیل میں بنیادی قدم ہے' حاصل کی جائے۔

○ اسلامائزیشن کے عمل سے متعلق یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ علم کا حصول مردوں اور عورتوں پر فرض ہے' لیکن اس ضمن میں مسلمانوں کی تاریخ میں مخلوط تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج ماحول کو اسلامی رخ پر ڈھالنے کے عمل میں مخلوط تعلیم ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کا فی الفور خاتمہ کیا جائے اور ایسی حکمت عملی وضع کی جائے کہ طالبات حصول علم کے لئے پردہ ترک کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی واضح علامت کے طور پر پاکستان کے ہر صوبہ میں خواتین کی الگ یونیورسٹی کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔

○ امت واحدہ کی تشکیل کے لئے ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں غیر طبقاتی تعلیم' یکساں نصاب' یکساں ذریعہ تعلیم' یکساں طریق امتحان اور یکساں سہولیات کا انتظام کیا جائے اور کئی نظاموں کو ختم کرکے ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔

○ ملی یک جہتی کے حوالے سے پاکستان میں سرکاری یا نجی تعلیمی اداروں کو یہ اختیار نہ دیا جائے کہ وہ پاکستان کے بجائے ایسے غیر ملکی تعلیمی اداروں سے الحاق کریں جو مغربی بے خدا فلسفہ تعلیم کی بنیاد پر تدوین کئے گئے نصابات کے حوالے سے طلبہ کو تیار کریں۔ الحاق کی صورت میں طلبہ ان مضامین کی تدریس سے محروم رہتے ہیں' جو پاکستان کے سرکاری مدارس میں لازمی ہیں۔ مثلاً" مطالعہ اسلام' نظریہ پاکستان' تاریخ امت اور عربی' فارسی' اردو زبان و ادب وغیرہ۔ حقیقت میں یہی وہ اساسی مضامین ہیں جو نظریاتی حوالے سے انتہائی ضروری ہیں۔ نیز ہر سطح پر ایسی غیر ملکی درسی کتب کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا جائے جو طلبہ میں فکری لادینیت (Intellectual Secularism) کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔

○ تعلیم کی اسلامی تشکیل کے عمل کو کامیاب بنانے کے لئے ہمیں ایسے اساتذہ اور ایسے ماہرین کی ضرورت ہوگی جو نہ صرف قرآن و سنت کا صحیح فہم رکھتے ہوں' عالم باعمل ہوں' بلکہ علوم جدیدہ پر بصیرت رکھنے والے اور زمانے کی جائز ضروریات اور سائنٹفک تحقیقات سے بھی پوری طرح واقف ہوں۔ ایسے اساتذہ سے ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ تیم جدوجہد اور حکیمانہ بصیرت سے کام لے کر سیادت عالم کا منصب دوبارہ حاصل کریں گے۔ اس مقصد کے لئے پاکستان میں "تعلیم کی اسلامی تشکیل کا کمیشن" اس اہم کام کی تکمیل کر سکتا ہے۔ خاص طور پر کمیشن کی علمی اور [illegible]
اسلام آباد یا انسٹی ٹیوٹ آف [illegible]

انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ لاہور کو یہ کام سونپا جاسکتا ہے کہ وہ ایم ایس / ایم فل / پی ایچ ڈی کی سطح پر "اسلامک ایجوکیشن" میں ایسے ماہرین تعلیم تیار کریں' جو اسلام کے طریق فکر و تحقیق کی قوت سے بے خدا نظریات کا مقابلہ کرسکیں اور بحیثیت مجموعی نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس نہج پر کریں کہ وہ قیادت عالم کے منصب کو سنبھال سکیں۔ اس ضمن میں وفاقی سطح پر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (IIER) کا قیام بھی عمل میں لایا جاسکتا ہے۔

خلاصہ

علوم کی اسلامی تشکیل سے متعلق اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ حواس اور قیاس سے برتر نوعیت کا ذریعہ علم' وحی الٰہی ہے' جو قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس تناظر میں تعلیم کا فکری سرمایہ محض عام اخلاق' معاشرتی اور معاشی تجربات ہی نہیں' بلکہ وہ اعتقادات اور مقاصد بھی ہیں جن سے اسلام کا اساسی فلسفہ حیات ترتیب پاتا ہے۔ حقیقت میں علم ایک اکائی یا وحدت ہے جسے ہم العلم (The Knowledge) کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی العلم کی روشنی میں جدید علوم کی اسلامی تدوین' تشکیل اور تنفید وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

(پاکستان ماڈل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام انٹرنیشنل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ 27 - 28 فروری 1992ء بمقام جناح ہال لاہور کے دوسرے سیشن میں پیش کیا گیا۔۔۔۔ سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے' اسلام آباد' جلد 3' شمارہ 2' جولائی 1992)

اسلامی نظام تعلیم کے چند نمایاں پہلو

اسلام کا نظام تعلیم و تربیت اس نقطہ نظر کے گرد مرتب ہوتا ہے کہ یہ نظام ہدایت' اللہ کا عطا کردہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ انسانیت تک پہنچا۔ اس نظام تعلیم کے مختلف پہلوؤں کی باہم وابستگی کا سامان درحقیقت وہ کلچر یا وہ طریق زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق ترتیب دیا گیا ہو۔ اسلامی نقطہ نظر' دراصل دائمی نوعیت کے سوالات کے جوابات سے عبارت ہوتا ہے۔ ان جوابات کی بنیاد پر ہی اسلامی نظام کے تمام پہلوؤں کی تعبیر اور جامع تعلیمی عمارت استوار ہوتی ہے۔

فکری نقطہ نظر

اسلامی حوالے سے تعلیم کا محوری نقطہ نظر' جو عمل تعلیم کے تمام عناصر کو باہم مربوط کرتا ہے' درج ذیل اساسی نکات سے ترتیب پاتا ہے:

- دین اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے' جو انفرادی اور اجتماعی امور میں مستقل رہنما ضابطہ ہے' جس کا قطعی ماخذ اور محور قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وحدہ لاشریک اور حقیقت اصلیہ ہے۔ اس نے یہ کائنات بامقصد بنائی اور اس میں انسان کی حیثیت عام موجودات کی سی نہیں بلکہ خلیفتہ اللہ کی ہے' جس کا اہم مقصد بندگی رب ہے۔
- حس و تجربہ' مشاہدہ' قیاس' استدلال اور وجدان ضروری ذرائع علم ہیں لیکن ان سب سے بالاتر اور برتر ذریعہ علم وحی الٰہی ہے' جسے ترک کر دینے سے کائنات کا وسیع مقصد گم ہو جاتا ہے۔
- سب سے اعلیٰ قدر' حصول رضائے الٰہی ہے۔ خیر و شر' حلال و حرام' معروف و منکر' اور حق و باطل کا مستقل معیار یا پیمانہ خدا کا دین ہے۔ یعنی جو کچھ دین اسلام میں ہے' وہ خیر ہے اور جو اس سے باہر ہے وہ شر ہے۔
- دنیا کی زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی ابدی ہے۔ جہاں انسان کو خدا کے حضور اپنے کارنامہ حیات کی جواب دہی کرنی ہے۔ حقیقت میں اسلامی اخلاقیات

کے نفاذ کی پشت پر خدا کا خوف اور آخرت میں جواب وہی کا اندیشہ ہی اصل قوت نافذہ ہے۔

- صحت مند اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو ایمان' عمل صالح اور حسن اخلاق کے پیکر ہوں۔ چنانچہ افراد کے تزکیہ نفس اور تربیتی ماڈل میں نماز' زکوۃ' روزہ' حج اور جہاد فی سبیل اللہ' دین اسلام کے لازمی ارکان ہیں۔ گویا ایک مہذب اور متوازن شخصیت ہونے کی اہم ترین علامت یہ ہے کہ اس کی اسلامی تعلیمات سے کتنی گہری محبت اور وابستگی ہے۔
- اسلامی معاشرہ کی وحدت اور اسلامی تہذیب کے تشخص کو قائم رکھنے کی ایک اہم قوت جاذبہ' اسلام کا تصور قومیت اور جذبہ اخوت ہے' جس کی اساس کلمہ طیبہ ہے۔
- اسلامی تہذیب و تمدن میں مسلم خاتون کا مقام انتہائی اہم ہے۔ وہ ممتاز حیثیت کی حامل اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی معمار ہے اور اس طرح نئی نسل کی پرورش اور ان کی روحانی غذا کا سرچشمہ ہے۔
- تحصیل علم' دین و دنیا کی وحدت' طلب حلال' اجتناب حرام' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور انفرادی و اجتماعی ذمہ داری جیسی اقدار و عایات کی ترویج و تبلیغ' اسلامی ریاست کی اہم ذمہ داری ہے۔
- بحیثیت مجموعی اسلامی تہذیب کی اساس' اسلام کا نظریہ علم ہے' جس کی رو سے علم ایک اکائی ہے اس "العلم" کا ماخذ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ وہ علم الادیان کو لازمی اور فرض عین گردانتا ہے اور علم الابدان کو بھی ضروری سمجھتاہے' لیکن اسے علم الادیان کے تابع کرتا ہے۔

تعلیمی مقاصد

اسلامی تناظر میں تعلیم کا مقصد اعلیٰ' جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے' وہ اس کی بندگی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذاریات: 52)۔

ترجمہ : " میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں " (تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص 155)۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے [illegible]

[illegible]

راہ یہ ہے کہ جو آزادی انہیں بخشی گئی ہے اسے غلط استعمال نہ کریں بلکہ اس آزادی کی حدود میں بھی خود اپنی مرضی سے اسی طرح خدا کی بندگی کریں جس طرح ان کے جسم کا رو نگٹا رو نگٹا ان کی زندگی کے غیر اختیاری حدود میں اس کی بندگی کر رہا ہے۔۔۔۔ جن اور انسان' اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش' اطاعت' فرماں برداری اور نیاز مندی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ ان کا کام کسی اور کے سامنے جھکنا' کسی اور کے احکام بجا لانا' کسی اور سے تقویٰ کرنا' کسی اور کے بنائے ہوئے دین کی پیروی کرنا' کسی اور کو اپنی قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا سمجھنا' اور کسی دوسری ہستی کے آگے دعا کے لئے ہاتھ پھیلانا نہیں ہے۔۔۔۔" (تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص ص 155-156)۔

اصل میں تعلیمی مقاصد کی تشکیل میں قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ سے اخذ شدہ اقدار ہی سب سے بڑا سرچشمہ ہیں - اسی سرچشمہ کی روشنی میں تعلیم کا کام ایسے افراد تیار کرنا ہے جو ہر دور میں دین اسلام کے مطابق زندگی کے مختلف انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں دنیا کی رہنمائی کے قابل ہوں اور ان کے اندر آخرت کی جوابدہی کا احساس ہو۔ اس حوالے سے اسلامی تعلیم صرف علمی اور نظری ہی نہیں بلکہ یہ سراپا پیغام عمل بھی ہے۔ یہ ایک خاص طرز کا انسان بنانا چاہتی ہے۔ وہ انسان جس کے لئے دائمی نمونہ عمل' قرآن حکیم کے ابدی اصولوں کی عملی تفسیر نبی آخر الزماں ﷺ کی حیات طیبہ ہے۔اس اساسی نظریہ علم کی روشنی میں اسلامی نظام تعلیم کے اہم مقاصد یہ ہیں :

- ایمان کی استقامت' عمل صالح کی تربیت اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے حوالے سے انسان کا اپنے خالق حقیقی سے تعلق استوار کرنا۔
- خالق کی ربوبیت اور بندے کی عبودیت کے عقیدے کی نشوونما کے ذریعے انسانی زندگی کے مجموعی اسلامی رویئے کی تشکیل کرنا۔
- خلافت ارضی اور امامت عالم کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی اہلیت پیدا کرنا۔
- امت واحدہ کی تشکیل اور اس حوالے سے اتحاد عالم اسلام کا جذبہ اجاگر کرنا۔
- اسلامی نظریہ حیات کی ترویج و اشاعت اور اسلامی نظام حیات کے تمکن کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرنا۔
- طلب حلال' اجتناب حرام اور اسلامی نظریہ اخلاق کے تحت' معاشرتی' معاشی' عسکری' سائنسی' ٹیکنالوجیکل اور ایٹمی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل بنانا۔
- [illegible] تخلیق اور اختراعی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا۔

- وحی الٰہی یعنی قرآن و سنت کو برتر، معتبر اور قطعی علم تسلیم کرتے ہوئے عصری علوم کی اسلامی تشکیل کرنا۔
- حصول رضائے الٰہی کی روشنی میں عمومی تعلیم اور شرح نوشت و خواند میں مسلسل اضافہ کرنا۔
- نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل و تنفیذ کے لئے اساتذہ، طلبہ، تعلیمی منتظمین، تعلیمی منصوبہ سازوں اور دیگر عملے کی نظریاتی، علمی اور فنی تربیت اور ان کے معاشرتی و معاشی رتبہ کو بلند کرنا۔

نظریہ نصاب

نصاب، تعلیمی نظام کا ایک اہم عنصر ہے اور طالب علم کے ذہنی اور عملی رویئے کی تشکیل میں بہت ہی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نصاب کسی بھی تعلیمی نظام کا عکس ہوتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اس نظام کو تشکیل دینے والے اور اسے نفاذ کرنے والے اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نصاب، حقیقت میں ان تمام سرگرمیوں کا نام ہے جو تعلیمی اداروں کی کوشش سے وجود میں آتا ہے۔ چاہے یہ سرگرمیاں کمرہ جماعت کے اندر ہوں یا کمرہ جماعت کے باہر۔ یہ دراصل ایک جامع تعلیمی منصوبہ یا پروگرام ہوتا ہے جس کی روشنی میں اساتذہ، طلبہ کو تعلیم دیتے ہیں۔ اس پروگرام سے مراد محض نصابی خاکہ اور درسی کتب ہی نہیں، بلکہ وہ سارا ماحول ہے جو تعلیم کو متاثر کرتا ہے۔ طلبہ کو اسی ماحول سے گزرنا ہوتا ہے، چنانچہ ضروری تجربات کے حصول کے لئے باقاعدہ تدریسی لوازمہ کی تیاری، تشکیل نصاب میں ایک اہم قدم ہوتا ہے۔

اسلامی حوالے سے طلبہ کے فکر و عمل کو واضح رخ دینے میں نصاب تعلیم کچھ زیادہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اسلامی فلسفہ حیات کے حوالے سے تشکیل و تدوین میں اہم ترین سوال یہ ہے کہ اسلامی ریاست کو کس طرح کے انسان اور ان میں کون سے لازمی اوصاف مطلوب ہیں؟ اس تناظر میں نصاب کی اسلامی تشکیل میں، اسلامی تہذیب کے احیاء کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی سارے تعلیمی عمل کا رشتہ اس رب سے جوڑا جائے جو پوری کائنات کا خالق ہے۔ چنانچہ نصاب تعلیم چاہے سائنسی علوم سے متعلق ہو یا عمرانی علوم سے اور چاہے وہ کسی بھی درجے میں پڑھایا جا رہا ہو، یا کسی بھی زمانے یا علاقے میں ہو، وہ اس نظریہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا جس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے۔ اس سرچشمہ کے ذریعے اللہ نے اپنے بندوں کی تربیت اور خلافت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے اعلیٰ کتابوں کی صورت میں نصاب تعلیم عطا کیا۔ انسانیت کی فلاح کے لئے آخری [illegible]

پر اتاری گئی لہٰذا نصاب کی اہم علمیاتی بنیاد (Epistemological Base) قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے اور یہی نصاب کا مرکز و محور ہے۔ اسلام کے نزدیک عقل و حواس کے ذریعے علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے لیکن اسے یقین کا درجہ حاصل نہیں۔ لہٰذا یہ ذرائع لازماً بالاتر اور یقینی ذریعہ علم یعنی وحی الٰہی کے تابع ہوں گے۔۔۔۔ حقیقت میں انسان مطلوب کے لازمی اوصاف کے حوالے سے تمام تعلیمی اور تربیتی سرگرمیوں کا اساسی رہنما اصول دراصل وہ مشن ہے "جس کے لئے انبیاء علیہم السلام مبعوث کیے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا مشن ہے جو اصحاب علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق یہ مشن اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔۔۔۔ پس اسلامی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن میں مقصد کی تعلیم دینا' ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔" (پروفیسر خورشید احمد "نظام تعلیم: نظریہ' روایت' مسائل" ص ص 23-24)۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد اور پیغمبرانہ فرائض کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

هوالذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلوا علیهم ایته ویزکیهم ویعلمهم الکتب والحکمة وان کانوامن قبل لفی ضلل مبین۔ (الجمعہ :2)۔

ترجمہ: وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا' جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے' ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔" (تفہیم القرآن' جلد پنجم' ص ص 485-487)۔

اس آیت کی روشنی میں جو نظریہ زندگی' فلاح انسانیت کے لئے ضروری قرار دیا گیا' اس کی بنیاد پر ہر تعلیمی سطح اور ہر قسم کی درسگاہ کے نصاب کی تشکیل میں تلاوت آیات' تزکیہ نفس' تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو اساسی حیثیت حاصل ہو گی۔ ان بنیادی مقاصد کے حوالے سے نصاب تعلیم کی اسلامی تشکیل سے متعلق چند اہم اصولی نکات یہ ہیں۔

(1) اسلام جس "العلم" کے حصول کو فرض قرار دیتا ہے' وہ علم دین ہی ہے' جو درحقیقت ایک وحدت یا اکائی ہے۔ ہرچند کہ بعض مفکرین تعلیم نے علم کو مختلف شاخوں اور شعبوں کے حوالے سے مختلف اقسام کی صورت میں پیش کیا ہے۔ لیکن اسلام کے اصول [illegible] البتہ مروجہ علوم کی ترتیب یا درجہ بندی

(Knowledge Taxonomy) کی اصطلاح میں، پہلی عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ المکرمہ نے اپنی سفارشات میں علوم کو درج ذیل دو اقسام کی صورت میں واضح کیا ہے:

(الف) یقینی، ہدایتی، یا الہامی علم (Revealed Knowledge)

وہ علوم جو قرآن و سنت کے حوالے سے عطا کیے گئے۔ مثلاً اعتقادات، عبادات، انسانی معاملات کے اصول، حق و باطل، معروف و منکر، خیرو شر اور فلاح وخسارہ کے معیارات جو انسان کی ذات کے تزکیہ اور اس کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کے حوالے سے ہیں۔ یہ علوم، یقینی ہیں اور ان پر انسانی فوزو فلاح کا دارو مدار ہے یعنی وحی الہی کے ذریعے حاصل شدہ علم جو قرآن و سنت پر مبنی ہے، وہی قطعی، معتبر اور بالاتر ہے۔

(ب) امکانی، حسی یا عقلی علم (Acquired Knowledge)

وہ علوم جن کے حاصل کرنے کا ذریعہ انسان کے حسی اور عقلی محرکات ہیں۔ مثلاً طبیعات، کیمیا، حیاتیات، ریاضی، شماریات، حیوانیات، ارضیات، فارمیسی، انجینئرنگ، ٹیکنالوجی، میڈیکل سائنس، زرعی سائنس، کامرس، مینجمنٹ ایڈ منسٹریشن، کمپیوٹر سائنس، فلسفہ، نفسیات، تعلیمیات، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات، نباتیات، فلکیات، تاریخ، جغرافیہ، قانون، ابلاغ عامہ، لسانیات، ادبیات و فنون اور دیگر سوشل، فزیکل، نیچرل سائنسز وغیرہ، یہ امکانی علوم ہیں اور دنیاوی زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ بلاشبہ حصول علم کے معاملے میں حس و تجربہ، مشاہدہ، قیاس و استدلال اور وجدان بڑے اہم ذرائع ہیں لیکن یہ یقینی نہیں۔ ان کو پرکھنے کی کسوٹی قطعی سرچشمہ علم وحی الہی ہی ہے۔

ان دونوں علوم کا حصول ضروری ہے، لیکن نصاب تعلیم میں اولین اور لازمی حیثیت دینی تعلیم کی ہے۔ اسلامی نصاب تعلیم کا مزاج وحدت کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ دین و دنیا اور مادہ و روح کے تناقض کو دور کرتا ہے اور اس طرح دنیوی اور اخروی حسنات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ یعنی نصاب بیک وقت دینی بھی ہوتا ہے اور دنیوی بھی، تاکہ انسان دنیا کو دین ہی کے حوالے سے سمجھے اور اللہ ہی کی ہدایت کے مطابق زندگی کے کام چلائے۔ اس طرح اسلامی نصاب تعلیم، سیکولر اور ملحدانہ نظریات کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ آج مسلم دنیا میں مروجہ نصاب چاہے دینی اداروں کا ہو یا دنیوی اداروں کا ان کی اسلامی تعمیر و تدوین کی ضرورت ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے نزدیک اسلامی نصاب تعلیم میں ترجیحات کے لحاظ سے درج ذیل ترتیب و ترجیح کو اہمیت حاصل ہے:

(الف) منقولات (قرآن و حدیث کی تعلیم)

(ب) معقولات (عمرانی و معاشرتی تعلیم)
(ج) محسوسات (طبعی و فطری تعلیم)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلامی حوالے سے' معقولات اور محسوسات سے متعلق نصابات الگ جزو کے طور پر نہیں بلکہ ان کی تشکیل و تنفیذ لازماً" مغیبات یعنی قرآن و حدیث کے تحت مرتب ہوں گے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی وحی الٰہی تمام نصاب کا مرکز و محور ہو گی۔

(2) اسلامی نصابات تعلیم کی اصل فکری بنیاد (Philosophical Base) اس وقت تک متعین نہیں کی جا سکتی جب تک اسلامی تناظر میں درج ذیل سوالات کے جوابات کی روشنی میں کوئی واضح نقطہ نظر ترتیب نہیں پاتا۔ اسی فکری نقطہ نظر کی بنیاد پر ہی نصاب تعلیم استوار ہو گا۔ نیز مضمون کے تدریسی مواد اور تمام نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کی ترتیب میں بھی مرکز و محور یہی زاویہ نظر ہو گا:

(الف) دنیوی زندگی کا تصور (ب) زندگی کا نصب العین
(ج) اساسی عقائد و افکار (د) تربیت افراد (ہ) نظام اجتماعی

(نکات "الف تا ہ" حوالہ : سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" ص ص 10-11)۔

ان سوالات سے متعلق اہم نکات "فکری نقطہ نظر" اور "تعلیمی مقاصد" کے تحت زیر بحث آ چکے ہیں۔

(3) اسلامی نصاب تعلیم کی اہم نفسیاتی بنیاد (Psychological Base) یہ ہے کہ ساری دنیا دین کا موضوع ہے اور دین درحقیقت انسان کی بنیادی فطری ضرورت ہے۔ اسلام کا پورا فلسفہ نصاب اسی نکتہ میں پنہاں ہے۔ یہ نہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اور نہ غلوئی الدنیا کی۔ چنانچہ متوازن اسلامی نصاب کی تشکیل کا مقصد اعلیٰ ایسے متوازن اور صحت مند افراد کی تیاری ہے جو صرف قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کی طرف متوجہ ہوں اور ہر دور اور ہر شعبہ زندگی میں صراط مستقیم یا دین فطرت کے مطابق چلنے اور دوسروں کی رہنمائی کے قابل ہوں۔ وہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے اتنے مستحکم ہوں کہ وہ کسی باطل نظام سے مرعوب نہ ہوں اور ہمیشہ تنقیدی صلاحیتوں سے کام لے کر اسے اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں۔ وہ دوسروں کے علوم و فنون کو حاصل بھی کریں' لیکن مرعوب و مغلوب ذہن سے نہیں بلکہ غالب اور مطالعاتی ذہن سے۔ اس رہنما نکتہ کے تناظر میں تعلیم کی ہر سطح اور ہر شاخ میں' [illegible] لیے نصاب میں ایسا لوازمہ شامل کیا جائے جس کے نتیجے میں طلبہ

کو "توحید، نبوت، وحی، اخروی جزا و سزا، تقدیر، خیر و شر کا علم اور اس پر ایمان، پھر خدا کی نازل کردہ الہامی ہدایت کا علم اور اس کے ساتھ اسوہ نبوت ﷺ یا کتاب اللہ کی اس قولی و عملی تشریح کا علم جسے سنت رسول اللہ ﷺ کہتے ہیں۔ آخر میں تفسیر و حدیث سے متعلقہ علوم اور فقہ اوراجتہاد کے اصول و طریقہ کا علم حاصل ہو جائے۔ ان سارے بنیادی علوم سے جن دوسرے علوم کو گہرا تعلق ہے ان پر بھی عبور ہو، خواہ وہ لغت اور نحو ہو، تاریخ و سیر ہو، تہذیب و تمدن ہو، اسماء الرجال ہو یا ادب و بلاغت ہو۔ مسلمان کسی بھی علاقے کا آدمی ہو اور کوئی بھی بولی بولتا ہو، اس کا صحیح مقام یہ ہے کہ وہ علم دین کو ان ماخذ سے براہ راست حاصل کرے" (نعیم صدیقی "اشارات" ماہنامہ ترجمان القرآن، نومبر 1980 ص 3)۔ خلاصہ کے طور پر نفسیاتی تناظر میں نصابی سرگرمیوں کا اصل مقصود ایسی متوازن شخصیت (Balanced Personality) کی تیاری ہے جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل بجا لائے اور جو اللہ کی رضا کے سامنے بلا چوں و چرا سر تسلیم خم کرے اور ہر اس قول و فعل سے اجتناب کرے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ اس کے برعکس جو شخص نفس امارہ کے تابع ہو گا وہ نفسیات کی اصطلاح میں عدم تسویہ (Mal- adjustment) کا شکار ہو گا۔

(4) نصاب کی تشکیل اور درسی کتب کی تدوین میں معاشرتی اساس (Sociological Basc) کے حوالے سے درج ذیل وظائف یا کردار (Roles) اہمیت کے حامل ہیں:

(الف) حفاظتی : یعنی نصاب، اسلامی معاشرہ کی دائمی اخلاقی اقدار، تہذیبی روایات اور تاریخی و ادبی ورثے کا تحفظ کرے اور انہیں صحیح صورت میں طلبہ تک منتقل کرے۔

(ب) ناقدانہ : یعنی نصاب، معاشرہ میں موجود تجربات و افکار کو الل ٹپ منتقل نہ کرے بلکہ انہیں تنقیدی نظر سے دیکھے اور تطہیر کے عمل کے بعد مطلوب اور مفید لوازمہ کو طلبہ تک منتقل کرے۔

(ج) تخلیقی : یعنی معاشرہ کی دائمی اقدار اور ماضی کی مثبت روایات کی روشنی میں حال اور مستقبل کے مسائل کو حل کرنے کے لئے تحقیق و اجتہاد سے کام لے۔

اسلامی نظریہ علم کے تناظر میں نصاب کی تشکیل کا بنیادی رہنما نکتہ یہ ہے کہ ثبات و تغیر کے درمیان کامل توازن قائم کرے۔ یعنی ابدی اور [illegible] معاشرتی اقدار کا بھی لحاظ رکھے اور انسانی معاشرہ کی بدلتی ہوئی جائز ضرورتوں کو بھی [illegible] علوم طبعی کے مسائل سے [illegible]

ہے۔ البتہ جو ضابطے' قوانین اور تجربات' دائمی اسلامی معیارات سے ٹکراتے ہوں' انہیں رد کر دیتا ہے۔ یہ ابدی معیار' جس کا خالق اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' ماضی' حال اور مستقبل سب زمانوں پر محیط ہے۔

(5) ملی اور قومی یک جہتی کے لئے ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں یکساں مقاصد' یکساں نصاب' یکساں تعلیمی سہولیات' یکساں معیارات' اور یکساں طریق امتحان کا انتظام ہونا چاہئے۔ اس طرح تعلیم میں طبقہ واریت اور کئی نظاموں کو ختم کر کے ایک ہی نظام تعلیم رائج کرنا' امت واحدہ کے مقصد کی تکمیل کا باعث ہو گا۔

(6) مسلم قوم کو جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لئے جسمانی صحت اور عسکری تربیت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ نصابات میں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ طلبہ و طالبات دونوں کے لئے اس تربیت کی ضرورت ہے' لیکن یہ تربیت اخلاقی قیود اور تہذیبی حدود کے اندر ہی ہونی چاہئے۔

(7) اسلام' عورت کو معاشرہ میں باوقار مقام دیتا ہے اور اس کے لئے تحصیل علم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس نظریہ کو ضرر رساں سمجھتا ہے کہ عورت کو مردوں کے "شانہ بشانہ" کردار ادا کرنے پر مجبور کیا جائے۔ عورت کے اصل مقام کا تعین اس بنیادی کردار سے ہوتا ہے جس کے بغیر خاندان اور معاشرے کی متوازن اور صحت مند نشوونما کا تصور ہی ناممکن ہے۔ اسلامی نظام تعلیم' مسلم خواتین کو حالت جمود میں نہیں رکھتا بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ خواتین تحریک اقامت دین کے ضمن میں انتہائی متحرک ہوں اور پردہ و حیا کے دائرہ کے اندر نئی نسل کی اس طرح تربیت کریں کہ وہ اسلامی تحریک کا ایک عظیم سرمایہ بنیں۔ البتہ مرد اور عورت کے درمیان حیاتیاتی اور نفسیاتی حوالے سے جو فرق ہے یعنی دونوں کے طبعی اور جذبات رجحانات و میلانات میں جو فطری تفاوت پایا جاتا ہے' اس تناظر میں عورتوں کے لئے بعض امور میں جداگانہ نصاب کی ضرورت ہے۔ نصاب میں ایسے تمام موضوعات جن میں عورت کو نسوانیت اور اخلاقی قدروں سے محروم کر دینے کا میلان پایا جائے' مروجہ نصابات سے خارج کر دینے چاہئیں۔

(8) ہر سطح کے نصاب میں عربی زبان کو لازمی مضمون کی حیثیت دینا ضروری ہے تاکہ طلبہ' اسلام کی اصل روح کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ مجموعی طور پر ابتدائی' ثانوی اور اعلیٰ سطح کے نصابات میں اسلامی تعلیمات کی ترویج کے حوالے سے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "تعلیمات" سے ماخوذ درج ذیل چند رہنما خطوط کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے:

(الف) [illegible] کی [illegible] پر سارا زور تعلیم کے لئے جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اسلام ایک

خود کار نظام تعلیم تشکیل دیتا ہے جس کی نصابی سرگرمیاں صرف مساجد تک محدود نہ تھیں بلکہ گھر' خاندان' معاشرہ اور اس کے ہر ادارے تک وسیع تھیں۔ اسلامی نصاب میں بچے کی تعلیم کا آغاز قرآن حکیم کی تدریس سے ہوتا ہے۔ قرآن حکیم سے قلبی تعلق قائم کرنے کے لئے سب سے پہلے اس کی ناظرہ تعلیم ضروری ہے۔ نیز رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر ابتدا سے ہی زور دیا جانا چاہئے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی سا بھی دور ہو' انکی ترقی کا راز اس میں ہے کہ وہ اس بنیادی سرچشمہ علم کو نصاب کا مرکز و محور بنائیں۔

(ب) ثانوی تعلیم تک جدید علوم کے ساتھ ہر مسلمان طالب علم کو اسلامی عقائد اور اسلامی زندگی کے ضروری احکام سے واقف کرایا جائے۔ نیز ہر مسلمان طالب علم کو قرآن پڑھنے اور بہت حد تک قرآن کو سمجھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیرت نبوی ﷺ کی تعلیم اور اس حوالے سے تفہیم حدیث کو بھی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔

(ج) اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اسلامی تعلیمات کے لئے ایک عام نصاب ہو جو تمام طلبہ کو لازمی پڑھایا جائے خواہ وہ کسی شعبہ علم کی تعلیم حاصل کر رہے ہوں۔ اس کے علاوہ ایک خاص نصاب ہو جو ہر شعبہ علم کے طلبہ و طالبات کو انکے مخصوص شعبے کی مناسبت سے پڑھایا جائے۔ حقیقت میں اعلیٰ تعلیم کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ ایسے صالح علماء تیار ہوں جو ہر دور میں دین حق کے مطابق رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔

(9) تعلم (Learning) کے مستند اصولوں کے پیش نظر' تعلیم کی تمام سطحوں پر نصاب میں عصر حاضر کے مسائل زیر بحث آنے چاہئیں تاکہ طلبہ ان مسائل و مباحث کو اسلامی تعلیمات کے مطابق حل کرنے کے قابل ہوں۔ نصاب کا اہم مقصد' مسائل کے ادراک اور ان کے حل کے لئے طلبہ میں سمع' بصر اور فواد کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے موجودہ نصابات اور درسی کتب کو ان نظریات سے جو اسلامی عقیدہ سے براہ راست متصادم ہوں' یکسر پاک و صاف ہونا چاہئے۔ نیز اس میدان میں یہ تحقیق بھی ہونی چاہئے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں سائنس کی ترقی اور بعد میں اس کے زوال کے کیا اسباب ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ ہر سطح کے نصاب تعلیم کی تشکیل سے متعلق درسی کتب کی تیاری کے بارے میں عالمی سطح پر جو تعلیمی تحقیقات اب تک ہوئی ہیں یا آئندہ کی جائیں' ان کے نتائج سے استفادہ کیا جائے۔ البتہ تنقیدی نگاہ سے ان کو پرکھنا ضروری ہے۔ بہر حال یہ چیز زیادہ بہتر ہے کہ اسلامی ریاستوں کے تعلیمی ادارے اور مسلمان اساتذہ خود تعلیمی و تحقیقی قیادت کا منصب سنبھالیں [illegible] تعلیم و تحقیق میں آگے بڑھیں [illegible]

(10) نصاب تعلیم اور درسی کتب کے ذریعے طلبہ کو تنقیدی شعور اور غالب ذہن سے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ امت مسلمہ کی اجتماعی پسماندگی کو ایک فطری امر سمجھ کر قبول نہ کریں۔ اس مقصد کے لئے تشکیل نصاب اور درسی کتب کی تیاری میں ایسے افراد کا انتخاب کیا جائے جو نہ صرف اپنے مضمون میں اعلیٰ مہارت رکھتے ہوں بلکہ علوم کی اسلامی تشکیل، نصاب سازی اور درسی کتب کی تیاری میں بھی کامل ادراک رکھتے ہوں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو، تو موزوں افراد کی تربیت کے لئے خصوصی پروگرام منعقد ہونے چاہئیں۔

بحیثیت مجموعی وہ نصاب لادین قرار پائے گا جس میں ہر مضمون کو اسلامی اصولوں کے بجائے، کسی لادینی فلسفہ کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہو یا نصاب میں اسلامیات کا سرے سے کوئی انتظام ہی نہ ہو یا اس کی حیثیت محض ایک بے اثر مضمون کی سی ہو یا اسی کی حیثیت نیچرل اور سوشل سائنسز کے بعد ہو۔ اسی طرح نصاب سازی کے عمل اور تعلیم و تربیت کے کام میں ذمہ داری اگر ایسے افراد کے ہاتھ میں دی گئی جو اسلام کے بجائے کچھ دوسرے نظریات یا ازمیات (Isms) پر یقین رکھتے ہوں یا اپنی فکر و سیرت کے اعتبار سے ایک مسلمان استاد کے کم سے کم معیار پر بھی پورے نہ اترتے ہوں تو تہذیبی اور تمدنی ہر لحاظ سے یہ انتہائی مہلک ہوگا۔ پھر نصاب کی کامیابی کا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ اس نصاب سے متعلق استاد اپنے مضمون اور طریقہ تدریس میں مہارت کے ساتھ اسلامی تہذیب، اسلامی ادب، اور اعلیٰ انسانی اقدار کا حامل ہو۔ نصاب اگر صحیح ہو، لیکن استاد اس کیلئے تیار نہیں تو کوئی مثبت تبدیلی ممکن نہیں۔

معلم مطلوب

اسلامی تعلیمی انقلاب کے لئے تربیت اساتذہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم و تعلم سے متعلق تحقیقات اس امر کی شاہد ہیں کہ تعلیمی عمل میں کوئی تبدیلی معلم کو تیار کئے بغیر نہیں آئی۔ تعلیم و تدریس کے عمل میں نئی فنی میکانیات کی افادیت اور سمعی و بصری معاونات کی ہمہ گیری کے باوجود، استاد کی انفرادیت و اہمیت مسلمہ ہے۔ اسلام، معلم کی اس مرکزی حیثیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ اسلامی حکمت تعلیم کے حوالے سے معلم ایک واجب الاحترام شخصیت ہے۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے۔
اسلامی نظام تعلیم میں اساتذہ کی تعلیم و تربیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تربیت اس بنیادی اصول پر تشکیل پاتی ہے کہ استاد کا کام صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے اور نئی نسل کی اخلاقی تربیت [illegible] لازمی ہے کہ اساتذہ کی اعلیٰ معیار کی علمی، عملی اور اخلاقی تربیت [illegible]

ہو اور جس میں ان کا نصابی تخصص (Specialization) تفقہ فی الدین ہو۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے تعلیم کے اس مقصد حقیقی سے متعلق سورہ التوبہ میں فرمایا ہے:

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلو لا نفر من کل فرقۃ منهم طائفۃ لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون (التوبہ :122)۔

ترجمہ : "اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمان روش سے) پرہیز کرتے۔" (تفہیم القرآن، جلد دوم ص ص 251-252)۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "تعلیم عمومی کے جس انتظام کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے اس کا اصل مقصد عامتہ الناس کو محض خواندہ بنانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا بلکہ واضح طور پر اسکا مقصد حقیقی یہ متعین کیا گیا تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویہ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور کتاب خوانی اور دنیوی علوم کی واقفیت پھیلانا نہیں چاہتا۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے تو تفقہ فی الدین کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکرو عمل کے ہر گوشے اور ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کون سا طریق فکر اور کون سا طرز عمل روح دین کے مطابق ہو" (تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ص 251-252)۔ مولانا امین احسن اصلاحی اسی آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ" اسلام میں تعلیم و تعلم کا اصل مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی فلاح کے لئے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے۔ باقی چیزیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں اور اسی نصب العین کے تابع ہیں" (تدبر قرآن، جلد سوم، ص 251)۔

بلاشبہ تفقہ فی الدین، مسلمانوں کی تعلیم کا اہم ترین مقصد ہے اور تعلیمی نظام پرکھنے کا معیار بھی یہی ہے لیکن اس مقصد کی تحصیل سے متعلق تعلیم و تدریس کی ذمہ داری چونکہ زیادہ تر علماء، اساتذہ اور تعلیمی قائدین پر عاید ہوتی ہے اس لئے ان کی [illegible] علمی اور [illegible] تربیت میں اس پہلو کو مقصد اول کی حیثیت حاصل ہو [illegible]

متعلق چند اہم رہنما خطوط یہ ہیں۔

(1) تربیت اساتذہ کی ہر سطح کے نصاب میں اسلامی روح کو مختلف مضامین میں اس طرح سمو دینے کی ضرورت ہے کہ اساتذہ واضح نظریاتی پختگی، نفس مضمون میں مہارت اور موثر حکمت تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کے سامنے اسلام کا واضح نقطہ نظر پیش کرنے کے قابل ہوں۔ اس حوالے سے معلم کا محض فن تدریس یا تعلیمی ٹیکنالوجی کا ماہر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا، جب تک وہ بنیادی طور پر پختہ مسلمان اور داعیانہ مزاج نہ رکھتا ہو۔ معلم انسانیت ﷺ کے اسوہ معظمی کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ معلم کو صرف فراہمی معلومات ہی نہیں کرنا ہوتیں، بلکہ وہ ایک مربی، مصلح اور تعلیمی قائد بھی ہوتا ہے، جس کا کام بندگیٔ رب کے اصول پر افراد کی تربیت کرنا ہے تاکہ یہ قوت بالاخر قیادت عالم کے اہل بن سکے۔ اس مقصد کے لئے تربیت اساتذہ کے اداروں کو بھی اسلامی رخ پر ڈھالنا ہو گا۔ حقیقت میں علم اور تربیت کے امتزاج سے تشکیل پایا ہوا نظام ہی مطلوب نظام ہے۔۔۔۔ خلاصہ کے طور پر مسلم استاد محض نفس مضمون اور طریقہ ہائے تدریس کا ماہر نہیں ہوتا بلکہ مزکی اور داعی بھی ہوتا ہے اور اس طرح اس کے نزدیک معلمی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔

(2) تعلیم کی ہر سطح پر اور بالخصوص تربیت اساتذہ کے اداروں میں ایسی فیکلٹی کی ضرورت ہے جو علمی و فنی مہارت (Academic and Pedagogic Excellence) اور اپنے اسلامی افکار و اعمال کے ساتھ، اسلامی تہذیب و ثقافت کے احیاء کے لئے مفید ہو۔ اسی مطلوب اہلیت کے حوالے سے تربیت اساتذہ کے اداروں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی مراکز کے لئے ایسے اساتذہ تیار کریں جو بہ یک وقت اچھے مسلمان بھی ہوں اور اپنے مضمون کی تدریس میں بھی ماہر۔ اس مقصد کے لئے تربیت اساتذہ کے نصاب کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایسے تحقیقی مراکز بھی قائم ہونے چاہئیں جہاں نامور ماہرین تعلیم اور علماء باہمی تبادلہ خیال کے ذریعے علوم کی اسلامی تشکیل کا کام کریں۔

(3) مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی، عالم بے عمل کو تسلیم نہیں کرتا۔ کردار کی اہمیت ہمیشہ بنیادی رہی ہے۔ استاد کی شخصیت کا اہم ترین عنصر جو طلبہ کو متاثر کرتا ہے وہ اس کی سیرت و کردار کا ماڈل ہے۔ ایسا استاد جو اپنے طلبہ پر مثبت اور تعمیری اثرات ڈالتا ہے، وہ دراصل ایک حقیقی دولت (Asset) ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں ایک اہم معلمانہ خصوصیت رہی ہے۔ لہذا اساتذہ کی تعلیم و تربیت میں اہم ترین عنصر ان کی تعمیر سیرت ہے۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اسلام کی دعوت، طلبہ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے معلم کو خود

اس کا ٹھوس مطالعہ کرنا چاہئے اور اسلام کی حقانیت پر سچے دل سے ایمان لاکر اپنے عمل سے' اپنے عقیدے کی صداقت' کردار کی پختگی اور خلوص نیت کا ثبوت دینا چاہئے۔ اس کے بعد ہی دعوت موثر ہو سکتی ہے۔ اس پس منظر میں ایک مسلم استاد کو اپنے مضمون (Discipline) اور طریقہ تدریس (Methodology) پر مہارت کے ساتھ ساتھ درج ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہئے:۔

(الف) اساسی نصب العین یعنی بندگئی رب' تفقہ فی الدین اور تحریک اقامت دین کا شعور۔

(ب) اسلامی ادب' تاریخ' اور تہذیب و ثقافت سے آگہی۔

(ج) دینی علوم پر دسترس کے ساتھ جدید عصری حالات پر نظر اور دعوت و تربیت کے اسالیب میں خصوصی تربیت۔

(د) شخصی اوصاف مثلاً" تقویٰ' احسان' دیانت' حق گوئی' خدمت خلق' ایثار' قربانی' صدق مقال' اکل حلال' اخوت' امانت' ایفائے عہد' اختلاف رائے کا احترام' محنت' تنظیم وقت اور بحیثیت مجموعی اعلیٰ اخلاق و کردار۔

(ہ) اچھی صحت' جذباتی ٹھہراؤ (Emotional Stability) اور مشکل حالات میں بھی صحیح فیصلہ کی صلاحیت۔

(و) طلبہ کا احترام' ان کی قدرو منزلت ، ان سے شفقت اور ان کی خیر خواہی، طلبہ کو سزا دینے میں انتہائی محتاط' غیض وغضب اور طعن و تشنیع سے اجتناب کرنا۔ طلبہ کی تلخ باتوں کو بھی گوارا کرنا اور ان کے مسائل میں دلچسپی لینا تاکہ طلبہ کو محسوس ہو کہ ان کے استاد کو ان کی فکر ہے۔

(ز) ملی اور قومی مفادات کا تحفظ' نیز اپنے ملک سے گہری محبت اور وفاداری کا جذبہ

(ح) مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق۔

(4) تربیت اساتذہ کے نصاب کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ مستقبل کے اساتذہ کو احتساب ذات (Self-Accountability) کے حوالے سے فکر آخرت کا واضح شعور دیا جائے۔ اساتذہ میں وہ مشنری جذبہ پروان چڑھایا جائے جو انہیں اس منصب کے تقاضے صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے تیار کرے۔ اس عمل میں درج ذیل اقدامات بڑے اہم ہیں:

(الف) تربیت اساتذہ کے نصاب کی تشکیل و تنفیذ میں مرکزیت قرآن و حدیث کو حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے تربیت اساتذہ کے اداروں میں تعینات اساتذہ کے لئے عربی زبان کی تعلیم لازمی ہو' تاکہ وہ قرآن و حدیث کا فہم حاصل کر سکیں اور نصابی سرگرمیوں کو اسلامی تناظر میں ترتیب دے سکیں۔

(ب) اساتذہ کے تربیتی نصاب میں فن تدریس کے علاوہ' اسلامک کلچر' اسلامی تاریخ اور اسلامی ادب (Literature) سے متعلق کورسز بھی ہونے چاہئیں۔ نیز اساتذہ کو اپنے ملک' دیگر اقوام اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے مسائل کے بارے میں آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں زیر تعلیم طلبہ کو ان عصری مباحث سے باخبر رکھ سکیں۔

(ج) اساتذہ کے تربیتی پروگرام میں اساسی مضامین مثلاً" فلسفہ' نفسیات' عمرانیات کے اسلامی نقطہ نظر کو واضح کیا جائے اور پھر اس کی روشنی میں تعلیمی مضمرات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ تربیت بھی دی جائے کہ تعلیمی معیارات کو کیسے پرکھاجاتا ہے؟

(د) اساتذہ کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ مختلف مضامین خواہ وہ طبعی علوم سے متعلق ہوں یا عمرانی علوم سے متعلق' انہیں اسلامی نظریہ علم کی روشنی میں پڑھانے کے قابل بن جائیں۔ اس ضمن میں اساتذہ کو علوم کی اسلامی تشکیل کے بارے میں مناسب تربیت دینا بھی انتہائی ضروری ہے۔

(ہ) تدریس کو موثر بنانے کے لئے جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقف کرایا جائے اور انہیں جدید تعلیمی تحقیق کے طریقوں میں بھی تربیت دی جائے' تاکہ مقاصد کی تکمیل میں اس تربیت سے مدد لی جائے۔

(5) اسلامی ریاست' اساتذہ کی جائز معاشرتی اور معاشی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ دار ہے۔ اساتذہ کو ملازمت کا تحفظ' بہتر سہولیات اور اعلیٰ گریڈز کی فراہمی' تعلیم و تعلم کے عمل کو موثر بنانے کا ایک اہم ترین عامل ہے۔ اس مقصد کے لئے اساتذہ کی ایسی پیشہ ورانہ تنظیمیں (Professional Organizations) ہونی چاہیں جو اساتذہ کی علمی اور فنی نشوونما کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل اور نفاذ کے لئے بھی جدوجہد کریں اور رضاکارانہ طور پر طے شدہ ضابطہ اخلاق (Code of Ethics) کی پابندی بھی کریں۔

حکمت تدریس

تربیت اساتذہ کے اداروں میں جدید طریقہ ہائے تدریس' سمعی و بصری معاونات کا استعمال' بلکہ آج کل کے دور کے حوالے سے تدریس بذریعہ کمپیوٹر انتہائی ضروری ہے۔ البتہ موثر تعلم کے لئے حکمت تدریس کے مجموعی اسلوب کو لازماً" اقدار و روایات کے تحت مرتب ہونا چاہئے۔ حکمت تدریس دراصل نفس مضمون پر مہارت' موثر فنی طریقہ ہائے تدریس پر عبور' اور استاد کے منفرد شخصی کردار کے امتزاج کا نام ہے۔ فن تدریس تو میکانکی ہو سکتا ہے لیکن معلم کا تو اپنا نظریہ حیات ہوتا ہے اور وہ فن تدریس کو اسی نظریے کی روشنی میں تشکیل دیتا ہے۔ اسلامی حوالے سے حکمت تدریس کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ معلم

ایسا اسلوب اپنائے جس کی رو سے وہ اپنے طلبہ میں اسلامی افکار و خیالات کاشت بوئے اور ان کے جذبات و میلانات کو ایک خاص اسلامی رخ پر ڈھالے۔ اس تناظر میں تربیت اساتذہ کے نصاب میں درج ذیل نکات اہمیت کے حامل ہیں۔

(ا) ہر مضمون کی موثر تدریس کے لئے ضروری ہے کہ استاد کا ذہن جہاں مضمون سے متعلق معلومات کا خزانہ ہو وہاں فکری اور عملی لحاظ سے ایک راسخ مسلمان بھی ہو۔ مسلم استاد عصری تحقیق کے نتائج سے بھی استفادہ کرتا ہے لیکن اصل چیز یہ ہے کہ اسے اسلام کی فطرت اور مزاج کا ادراک ہو' تاکہ وہ اس کی روشنی میں معروف کو اخذ کر سکے اور منکرات سے اجتناب کرے۔ بہر حال اصل مقصود یہ ہے کہ استاد کو جس حقیقت کا فہم مطلوب ہو وہ اس بارے میں واضح ہو اور طلبہ کی ذہنی سطح کے پیش نظر اس کو اپنے متنوع اسالیب سے قابل قبول بنا کر طلبہ کے اذہان و قلوب میں اتار دینے کی تمام ضروری تدابیر عمل میں لائے۔

(2) اسلامی تناظر میں حکمت تدریس کا مطلب یہ ہے کہ استاد دلچسپ پیرائے میں اپنے لیکچر تیار کرے۔ اس کے لیکچر میں نہ اجمال و ابہام ہو نہ غیر ضروری طوالت' غصہ کے بجائے دلسوزی اور سختی کے بجائے نرم خوئی اچھے لیکچرز کا خاصا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے موثر استاد کے لئے ضروری ہے کہ زبان و ادب پر بھی اس کی نظر ہو۔ وہ جس زبان کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنائے اس کی صنف شعری سے بر محل اشعار اسے یاد ہوں۔ اچھے نثر نگاروں کے اچھے جملے' عمدہ محاورے اور اچھی تشبیہات' یہ سبھی چیزیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے زبان و ادب کی اس اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے: ترجمہ "اچھا کلام جادو کی تاثیر رکھتا ہے اور کتنے ہی اشعار ہیں جن میں حکمت کے خزانے بھرے ہوتے ہیں۔" (مشکوۃ المصابیح' جلد 2 کتاب الادب' باب البیان والشعر) حضرت عمر فاروقؓ کا مشہور قول ہے کہ "اپنے بچوں کو تیراکی' تیر اندازی اور گھڑ سواری کا فن سکھاؤ اور انہیں عمدہ اشعار یاد کراؤ"۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں "اپنے بچوں کو عمدہ اشعار یاد کراؤ۔ ان کی زبان میں مٹھاس آجائے گی۔" (علامہ یوسف القرضاوی" دعوت دین اور اس کے علمی تقاضے" ص 264)۔

(3) استاد اپنے اخلاق' ولولہ تدریس' علم کی یقین آفرینی' ایمان کی پختگی اور اپنے مدعا کو سمجھانے کی شدید خواہش سے اپنا ایک مخصوص تدریسی اسلوب بنا لیتا ہے جو بالآخر خود ایک مثال کا کام دیتا ہے۔ بہر حال چند رہنما خطوط ایسے ہیں جو استاد کو پیش نظر رکھنے چاہیں مثلاً۔

- قرآن و حدیث کی روشنی میں مقاصد تعلیم اور انسانی نفسیات کا گہرا شعور
- نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ امور سے متعلق مطالعہ و تحقیق اور عملی تربیت
- نفس مضمون کی مناسبت سے استعارات اور تمثیلات پر عبور

○ اخلاق و کردار کے حوالے سے مثالی تشخص
○ ذوق مزاح اور شگفتہ مزاجی
○ ظاہری وضع قطع میں نفاست اور وقار
○ اسلامی اقدار کے دائرہ میں منعقد علمی' ادبی اور معاشرتی تقریبات میں شرکت
○ تعلیمی ماحصل اور تعلیمی عمل کے دیگر پہلوؤں پر گہری نظر

(4) ہر مضمون کی تدریس میں اساسی فکر' قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے لی جائے۔ اس حوالے سے موثر تدریس کے لئے استاد کا نمونہ عمل' اس کی اسلامی عقیدے سے کمل وابستگی اور اس کے اظہار پر مہارت تامہ' اہم لازمی خصوصیات ہیں۔

(5) ہر مضمون کے اہم تصورات سے متعلق قرآن و حدیث سے موزوں مواد منتخب کرنے کا سلیقہ ہونا چاہئے تاکہ استاد تدریس کے دوران موضوع کی مناسبت سے اس سے مدد لے۔

(6) ہر مضمون کی اسلامی حوالے سے تدریس کے لئے ضروری رہنمائے اساتذہ (Teachers' Guides) تیار کی جائیں۔ ان میں ہر اہم موضوع یا سبق کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ سبق' اسلامی تناظر میں کیسے پڑھایا جائے۔

(7) قرآن حکیم کی حکمت ابلاغ' رسول اکرم ﷺ کی معلمانہ حکمت عملی' اسلامی تعلیمی روایات اور مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ کی سوانح عمریوں کو تربیت اساتذہ کے نصابات میں شامل کیا جائے کیونکہ اسلامی حوالے سے موثر تدریس کے لئے یہ اہم ماخذ ہیں۔

(8) قدیم اسلامی مدارس میں بالعموم درج ذیل تدریسی طریقے اور اسالیب رائج تھے۔ آج کے دور میں ان کے موثر ہونے سے متعلق مزید تحقیق کی جاسکتی ہے۔ البتہ مسلمانوں کی تعلیمی روایات سے تو بہر حال واضح ہے کہ موثر تعلیم و تعلم کے لئے یہ انتہائی اہم تھے (نظام تعلیم' طریق تربیت' اسلوب دعوت اور علم النفس سے متعلق تفصیل سے دیکھئے جناب الفضل حسین' ڈاکٹر شبلی' سید مودودی' سید محمد سلیم' عبدالبدیع صقر' محمد قطب' محمد صلاح الدین' ڈاکٹر نجاتی اور نعیم صدیقی کی تحریریں اور بالخصوص چوتھی عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ جکارتہ کی سفارشات):

○ محاضرہ (Lecture / Presentation)
○ محادثہ (Narration)
○ استماع' تحفیظ' تفہیم (Listening /Retention / Understanding)
○ [illegible] (Reflective Thinking)

○ تجزیہ، تنقید، تبصرہ (Analysis/Critique/Comments)
○ تخلیق و انکشاف (Creativity & Discovery)
○ استخراجیہ (Deductive Reasoning)
○ استقرائیہ (Inductive Reasoning)
○ تفویض، منصوبہ، استحضار (Assignment / Project / Presentation)
○ الکتابہ (Note-Taking)
○ حوار و مناقشہ (Discussion / Interaction / Dialogue)
○ محاکاۃ (Immitation)
○ شخصی مثال (Teacher as a Model)
○ تفہیم بذریعہ مثال (Logical Proving)
○ قصص (Teaching Through Stories)
○ سوال و جواب (Question - Answer)
○ مطالعہ، تجربہ، تحقیق (Study / Experimentation / Reaserach)
○ تعبیر، توضیح، تفسیر (Interpretation / Commentary)
○ بحث و مذاکرہ (Seminar)
○ قراۃ و اطلاع (Reading and Communication)
○ مشق، اعادہ (Drill / Recaptulation)
○ اشراط (Conditioning)
○ سعی و خطا (Trial and Error)
○ حلقہ و دائرہ (Circle / Halaqa)
○ زیارہ و رحلات (Educational Visits / Field Trips)
○ تقریر و تحریر کی مشقیں (Speech & Writing Practices)
○ انفرادی توجہ (Individual Attention)
○ ہم نصابی سرگرمیاں (Co-Curricular Activities)
○ الریاضۃ البدنیہ (Physical Training)
○ جامع جانچ پرکھ (Process-Product Evaluation)

(9) مسلم اساتذہ نے اس الٰہی ضابطہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ وہ اپنی تدریس کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کریں۔ انہوں نے اس کلمہ کو بھی اہمیت دی کہ طلبہ کی تربیت

صرف لفظوں سے نہیں بلکہ درحقیقت وہ کردار ہے جو استاد کے پورے وجود سے ہر ادا کی شکل میں جھلکتا ہے۔ اسی کو اقبال' فیضان نظر کہتے ہیں - مسلم اساتذہ اپنے دینی' علمی اور اخلاقی تشخص کے ساتھ سارے تدریسی عمل میں بالعموم درج ذیل ترتیب کو پیش نظر رکھتے تھے:

○ تکریم و تعظیم (Mutual Respect and Esteem)

○ تعلیم' تفہیم' تفکیر (Educating / Understanding / Reflecting)

○ تزکیہ و تربیت (Purification / Tazkiyah / Tarbiyah)

○ تعمیل (Doing / Obeying)

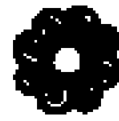
○ تبلیغ و دعوت (Imparting / Dawah)

○ تنبیہ و تعزیر (Warning / Punishment)

اسلامی نفسیات کے تناظر میں یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ استاد کے ساتھ ساتھ طالب علم بھی مکرم و محترم ہے۔ استاد اور طالب علم کے درمیان احترام و تکریم کی فضا بحال کئے بغیر تعلیم و تربیت نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اس ترتیب میں سزا' بالکل آخر میں ہے۔ یعنی بغیر ابتدائی مراحل سے گزرے' ابتدا میں ہی سزا کا اطلاق' تعلیمی عمل کو ناکام بنا دے گا۔

(10) بحیثیت مجموعی ہر مضمون میں زندگی کے ہمہ گیر اسلامی تصور کو پیش نظر رکھا جائے۔ بالخصوص طلبہ کی جامع صحت مند نشوونما کے لئے صرف اتنا کافی نہیں کہ استاد اپنے مضمون میں ماہر ہو' بلکہ اس کی پوری شخصیت ایسی ہو جو سیرت و کردار میں مثالی ہو اور جس میں قول و فعل کے حوالے سے کوئی تضاد نہ ہو۔

(سہ ماہی تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 8 شمارہ 2' 1997ء)



اسوہ نبوی ﷺ کی روشنی میں تعلیم کی تعمیر نو

امت مسلمہ وہ خوش قسمت امت ہے جس کو نبی آخرالزماں ﷺ کے ذریعے زندگی کی واضح تعلیمی حکمت نصیب ہوئی۔ یہ حکمت دائمی اور ابدی صداقتوں کی حامل ہے۔ اس حکمت تعلیم نے حلال و حرام کی حدود اور خیر و شر کے پیمانوں کو واضح کیا اور ایسی زندہ و محکم اقدار دیں' جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خدا کے ایسے اطاعت شعار انسان تیار ہوئے' جنہوں نے معلم انسانیت ﷺ کی سنت کی پیروی کی اور اسلام کے برعکس کسی دوسرے نظریے کو قبول نہ کیا۔ شرک' کبر' ظلم' رقص و سرود اور بے حجابی سے اجتناب کیا۔ ان تفریحات سے نفرت کی' جو معلم کامل ﷺ کی ثقافت سے مختلف تھیں۔ تفرقہ بازی کو قطعاً شعار نہ بنایا۔ غرض نبی ﷺ کے قائم کردہ نظام تعلیم سے ایسے جری افراد تیار ہو کر نکلے جو فکری اور عملی ہر لحاظ سے یہ کہنے کے لئے تیار ہوئے کہ: "کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے" (سورہ الانعام :162)۔

معلم انسانیت ﷺ کے اسوہ تعلیمی کے حوالے سے عمل تعلیم کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ علم' دین اسلام کا مرکز و محور ہے۔ اسلام نے خدا' انسان' کائنات' رسالت اور آخرت کے تناظر میں جو نظام زندگی تجویز کیا ہے' حقیقت میں وہی ایک قوت محرکہ ہے جو مسلمانوں کے نظام تعلیم کو فکری بنیاد فراہم کرتی ہے۔ اس نظام تعلیم کی اساس قرآن حکیم پر رکھی گئی۔ پورا نظام تعلیم قرآن ہی کے تابع ہے۔ اس حوالے سے تعلیمی پالیسی کا اہم نکتہ یہ تھا کہ مسلمان صرف قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کی طرف ہی متوجہ رہیں۔ نبی ﷺ کی حکمت تعلیم کے تین فکری پہلو بڑے اہم ہیں:

(ا) حقیقت الحقائق یا حقیقت اصلیہ (Ultimate Reality) اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

(ب) حتمی اور برتر ذریعہ علم وحی الٰہی ہے اور اس کی صورت قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ ہے۔

(ج) قدر اعلیٰ (Root Value) رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے اسوہ تعلیمی کی روشنی میں جو روح پورے نظام تعلیم میں کار فرما تھی انہی کے مطابق پوری تہذیب تشکیل پا رہی تھی۔ تعلیم میں نہ ثنویت تھی' نہ طبقاتی کشمکش [illegible] رضائے الٰہی نماز روزے میں مطلوب تھی' بلکہ زندگی کے باقی امور میں

بھی مطلوب تھی۔ آپ ﷺ کا تعلیمی نظام کلی طور پر پیغام عمل تھا۔ اس تصور کے تحت تعلیمی پالیسی کا تربیتی ماڈل یہ تھا کہ سب سے پہلے ایمان کے بل بوتے پر انسانی سیرت و کردار کی تشکیل ہو۔ حقیقت میں ایمان ہی نبی ﷺ کے نظام تعلیم و تربیت کی اہم فکری بنیاد ہے۔
چنانچہ تمام نصابی سرگرمیاں بالعموم درج ذیل اہم مقاصد کے گرد مرتب ہوتی تھیں:

(ا) ایمان' علم دین اور عمل صالح کی تربیت۔
(ب) دنیا بھر کی قیادت اور اس کے لئے امت واحدہ کی تشکیل
(ج) عسکری اور مادی قوت کا حصول۔

پاکستان میں درج بالا نکات کو اگر تعلیمی منصوبہ بندی کی فکری اساسیات کے طور پر پیش نظر رکھا جائے تو یہاں کے تعلیمی نظام کو یقیناً صحیح سمت مل سکتی ہے۔ اس ضمن میں چند تجاویز درج ذیل ہیں:

○ پاکستان میں اس وقت دو تعلیمی نظام رائج ہیں۔ ایک تو روایتی مذہبی نظام اور دوسرا مستعار مغربی نظام تعلیم۔ عملاً یہ نظام دین و دنیا کی شنویت پر قائم ہے۔ تعلیم کی اسلامی تعمیر نو کے لئے ضروری ہے کہ دین و دنیا کی تفریق کو ختم کیا جائے اور یکساں نظام تعلیم اور یکساں نصاب کی تشکیل کی جائے۔ اس مقصد کے لئے عالمی سطح پر جو چار اسلامی تعلیمی کانفرنسیں مکہ مکرمہ' اسلام آباد' ڈھاکہ اور جکارتہ میں منعقد ہوئیں' ان کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ خصوصیت سے طائف مکہ مکرمہ میں منعقدہ سربراہ کانفرنس میں منظور شدہ "اعلان مکہ" کو پیش نظر رکھا جائے۔ جس میں تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلامی رخ پر ڈھالنے کا عزم کیا گیا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تعلیمی تحقیقی مراکز' تربیت اساتذہ کے اداروں اور اساتذہ کی تنظیموں کو بھی یہ پراجیکٹ لینا چاہئے کہ تعلیم میں اس دوہرے پن کو کس طرح تدریجاً ختم کیا جاسکتا ہے۔

○ تعلیم کی اسلامی تعمیر نو کے لئے ضروری ہے کہ ہر سطح پر نصاب اور درسی کتب کا اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے مسلسل جائزہ لیا جاتا رہے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ ہمارے ملک میں حکومتی سطح پر ابتدائی اور ثانوی سطح کے نصاب پر نظرثانی کا کچھ کام ہوا ہے' لیکن اصولی طور پر ہمارے پیش نظر یہ بات رہنی چاہئے کہ پہلی جماعت سے لے کر ایم اے' ایم ایس سی کی سطح تک اگر نصابی خاکہ یا درسی کتاب میں کوئی سبق یا کوئی اصول و نظریہ صاف طور پر اسلامی قدروں سے ٹکراتا ہو' اس کی تردید کرتا ہو یا بچوں کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں تشکیک پیدا کرتا ہو' تو وہ لازماً اس قابل ہے کہ اسے نصاب سے خارج کردیا جائے۔ البتہ اعلیٰ سطح پر اگر تقابلی مطالعہ کے لئے مختلف نظریات کی جامعیت کو شامل کیا

ضروری ہو تو محتاط طریقے سے ایسا کرنا ہو گا۔ اس ضمن میں اس فرق کو بھی پیش نظر رکھنا ہو گا کہ غالب اور تنقیدی ذہن سے دوسرے نظریات کا مطالعہ کچھ اور اثرات مرتب کرتا ہے اور مغلوب' مرعوب اور تقلیدی ذہن سے کچھ اور۔نصابات کی اسلامی تشکیل جدید سے متعلق اس بنیادی کام سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے' جو مارچ 1980ء میں اسلام آباد میں منعقدہ دوسری عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس نے مکمل کیا تھا۔

○ معلم کامل ﷺ کے اسوہ کی روشنی میں ہمیں جس نظام تعلیم کی تعمیر کرنی ہے' اس کے لئے ملک و ملت سے محبت کرنے والے صالح ذہن و کردار کے اساتذہ درکار ہیں۔ جو اساتذہ نبی ﷺ کے نظام تعلیم کے مقاصد اور ان کے اخلاقی تقاضوں سے' باوجود ساری کوششوں کے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ بنا سکیں' ان کے لئے کوئی متبادل روزگار تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست کا کام بہرحال ایسے "پیشہ ور اساتذہ" کے بس کا نہیں۔ جو استاد نظریہ پاکستان کے خلاف ہو' جس شخص کے ذہن میں اسلامی آئیڈیالوجی کے برعکس کوئی دوسرا نظریہ یا نظام بسا ہوا ہو' اس کا ایک ایسی قوم کے نظام تعلیم میں کیا کام ہے؟ جس کے پیش نظر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہے۔ پاکستان کے تعلیمی ادارے ایسے نہیں ہونے چاہیں کہ ان اداروں میں اسلام کے برعکس جس نظریے کا حامل جب چاہے معلمی کے منصب پر فائز ہو جائے اور نئی نسل کے ذہنوں کو پاکستان کے اساسی نظریے کے خلاف تیار کرے۔ اس مقصد کے لئے تربیت اساتذہ کے نصابات کا بھی تحقیقی جائزہ لینا اشد ضروری ہے۔ پھر تعلیم و تحقیق کے میدان میں مستقل بنیادوں پر ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو عمل تعلیم کے اہم عناصر مثلاً" مقاصد' نصاب' درسی کتب' طریقہ ہائے تدریس' تعلیمی مالیات' تعلیمی انتظامیات' طریق امتحان وغیرہ سے متعلق اسلامی تناظر میں تحقیقی منصوبوں پر کام کرے۔ ہمیں تعلیم کی تعمیر نو کے حوالے سے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ جزوی اصلاح سے کام نہیں ہو گا' اس کے لئے کلی تبدیلی چاہئے۔ اس تبدیلی کے لئے منضبط اور منظم تحقیق کی ضرورت ہے۔

○ نبی اکرم ﷺ کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پوری انسانیت پر علم کے دروازے کھول دیئے۔ آپ ﷺ نے ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے علم کا حاصل کرنا لازمی اور بنیادی ضرورت قرار دیا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہمیں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بہترین انتظام کرنے ہوں گے۔ کم از کم تعلیمی نصاب جو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے لازمی اور بنیادی ضرورت ہے' اس میں تعلیم قرآن' حکمت نبوی ﷺ' [illegible] سیرت و کردار شامل ہے۔ نبی ﷺ کے اسوہ تعلیمی کی روشنی میں

ہمیں خواتین کو جو تعلیم دینی ہے' وہ ساری تعلیم اخلاقی قیود' تہذیبی حدود اور حیا دارانہ ماحول کے اندر رہتے ہوئے ہی ہونی چاہئے۔ اس وقت پردہ پسند خواتین کی تعلیمی ترقی کے راستے میں مخلوط تعلیم حائل ہے۔ تعلیمی اداروں میں ایسے انتظامات کئے جائیں کہ بالغ بچیاں حصول تعلیم کے لئے پردہ داری کو ترک کرنے پر مجبور نہ ہوں۔ اگر مسلم ممالک کے تعلیمی اداروں میں مسلمان لڑکیاں پردہ ترک کرنے پر مجبور ہوں تو یہ ظلم ہے۔ ہمیں اپنے تعلیمی اداروں کے پورے ماحول کو اسلامی روح کے مطابق ڈھالنا ہوگا اور اس کے لئے مخلوط تعلیم کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ اعلیٰ سطح پر اسلامی معاشرت و ثقافت کی واضح علامت کے طور پر خواتین یونیورسٹی کا قیام انتہائی ضروری ہے۔

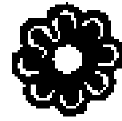
○ نظام تعلیم کو صحیح رخ پر ڈھالنے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک میں ہر سطح پر اور ہر شعبہ علم میں عربی زبان کی تدریس لازمی قرار دی جائے۔ عربی سے نابلد مسلمان اپنے بنیادی سرچشمہ علم تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے۔ اس ضمن میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی ہر یونیورسٹی میں بھی عربی کی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہئے۔

○ مسلم ممالک میں تعلیم کو اسلامیانے کے عمل میں بہت سی مزاحم قوتیں بھی ہیں جو اپنے اپنے انداز سے کام کر رہی ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مسلم ممالک میں وہ افراد جو کلیدی مناصب پر ہیں' ان میں سے بعض کھلم کھلا اور بعض مخفی انداز میں تعلیم کی اسلامی تشکیل کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ بہر حال یہ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان میں طلبہ' اساتذہ' اسمبلی' سینٹ' سیاسی حلقے اور خود حکومت کے اندر بھی ایک ایسی قوت موجود ہے جو مخالفانہ علمی' فکری اور ثقافتی ماحول میں گھرے ہونے کے باوجود اپنا رشتہ نبی ﷺ کی تعلیمی تحریک سے جوڑے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے اساتذہ' طلبہ' تعلیمی منتظمین' محققین کی ایک اچھی خاصی قوت علمی اور فکری لحاظ سے تیار ہونی چاہئے' جو یہ علم و تجربہ رکھتے ہوں کہ قرآن و سنت کا اطلاق کس طرح اس جدید زندگی اور اس کے حالات پر کیا جائے؟ ہمیں ہر سطح پر ایسی قیادت کی ضرورت ہے جو اسلامی ذہنیت و کردار کی حامل ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ نظام تعلیم کے ذریعے سکول' کالج اور یونیورسٹی سطح کے طالب علم ابتداء ہی سے اسلامی نظریات کی قدر و قیمت اور قوت کا اندازہ لگالیں اور اس کو تہ دل سے تسلیم کرلیں۔ طلبہ کے اذہان و قلوب کو ابتداء ہی سے ایک خاص انداز میں متعین کرنا اور ان کے ذہنوں کو بدلنا ہوگا۔ یہ اسی صورت ممکن ہے اگر اساتذہ اور تعلیمی منتظمین کی تربیت کا بھی مکمل انتظام موجود ہو۔اس مقصد کے لئے رسمی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ذرائع ابلاغ کو لازما" تعلیمی نظام کا ساتھ دینا ہوگا' بلکہ ذرائع ابلاغ کو تو تعلیم ہی کے شعبے

کا ایک حصہ ہونا چاہئے۔

○ تعلیم کی تعمیر نو کے لئے ہمیں ترغیب، تحقیق اور علمی و فکری انداز اختیار کرنا ہوگا۔ ہمیں اساتذہ، اسکالرز، طلبہ، سیاسی قائدین اور منتظمین کو بھی علمی لحاظ سے قائل کرنا ہوگا۔ بعض مسلم دانشوروں کے اذہان جو ابھی تک مغربی طرز فکر کے تحت کسی حد تک مسحور و مغلوب ہوچکے ہیں، ان کو بھی حکمت سے بدلنے کی ضرورت ہے، اور ان کی مزاحمت کو بھی کم کرنا ہے۔ اگر تعلیمی اور تبلیغی کوشش کے باوجود یہ لوگ اسلامی نظام تعلیم کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں تو اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ قانونی طور پر ان سے نپٹے۔ بہرحال تبدیلی کے لئے ہمیں پرامن علمی و فکری جدوجہد کرنا ہوگی بہ نسبت کسی طوفانی تغیر کے۔ کیونکہ ہمیں بہرحال علم و تحقیق کی دنیا میں ہی کام کرنا ہے اور تبدیلی کا یہی ایک موثر اور دیرپا ذریعہ ہے۔

(تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور کے زیر اہتمام "معلم انسانیت" کانفرنس" میں 29- نومبر 1985ء کو جناح ہال لاہور میں پڑھا گیا۔۔۔۔ ششماہی مجلہ ابتدائی تعلیم لاہور، شمارہ، 2، جون 1989ء)



تعلیم اور قومی تقاضے

انسان کی کردار سازی میں متعدد عوامل کردار ادا کرتے ہیں لیکن ان میں سب سے موثر اور سب سے کارگر عمل، تعلیم کا ہے۔ جغرافیائی اور ماحولیاتی عناصر ہر جاندار کی زندگی پر اثر انداز ہوتے اور اس کے اسلوب حیات کو مخصوص رخ دیتے ہیں لیکن انسان کا معاملہ عام جانداروں سے بڑا مختلف ہے۔ وہ بہت سی باتیں اپنے گردوپیش پھیلے ماحول سے اخذ کرتا ہے۔ لہٰذا اسے کلیۃً" ماحولیاتی عناصر کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا کیونکہ ہر معاشرہ انسان کو ایک ایسے خاص سانچے میں ڈھلا دیکھنا چاہتا ہے جو اس معاشرے یا قوم کے متعینہ مقاصد کے حصول میں اپنا موثر کردار ادا کر سکے۔

نظریاتی ممالک کے پیش نظر سب سے اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں مادی مقاصد کی تکمیل کے لئے بھی افرادی قوت تیار کرنا ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ایسے افراد بھی مطلوب ہوتے ہیں جو اس قوم کے اساسی نظریات اور اخلاقی داعیوں کے علمبردار ہوں۔ گویا نظریے کی حامل اقوام کو مادی ترقی کے ساتھ ساتھ اس نظریے کے تحفظ اور بقا کی جنگ بھی لڑنا ہوتی ہے جو اس قوم کے وجود کی اساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی اقوام کو اپنے تعلیمی نظام پر خصوصی توجہ دینا ہوتی ہے۔ اگر وہ ہنگامی یا فوری مقاصد کی تکمیل کے لئے دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی مادہ پرستانہ نظام اپنالیں تو ان کا نظریاتی وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اگر وہ محض نظریے کی آبیاری پر توجہ دیتے ہوئے تیز پا دنیا کے جائز اور اہم تقاضوں کو نظرانداز کر دیں تو پسماندگی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ یہ پسماندگی نہ صرف قوموں کے مادی وجود کو خطرے میں ڈال دیتی ہے بلکہ ان کی نظریاتی بقا بھی معرض خطر میں پڑ جاتی ہے۔

ہمارے ہاں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے اور قدیم طرز کے اسلامی مدارس اسی تفریق اور دوئیت (Duality) کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک طرف مادی ماحول کے تقاضوں کی پاسداری کا اہتمام ہے اور دوسری طرف اپنے بنیادی نظریہ حیات کو محدود کرتے ہوئے ایسی نصابی قدغنیں لگا دی گئی ہیں جو مدرسے کے نظام تعلیم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہونے دیتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں طرح کے نظام ہائے تعلیم کی فیکٹریوں سے نکلنے والے افراد میں کسی طرح کی کوئی ذہنی و فکری ہم آہنگی پیدا نہ ہوسکی بلکہ یہ کہنا بے

محل نہ ہوگا کہ دونوں کے فکر و نظر میں تضاد پیدا ہوا اور دونوں طبقے ایک دوسرے کے حریف ٹھہرے۔

اصل میں ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ پاکستان کی تخلیق کے محرکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک ایسا متوازن' معتدل اور موثر نظام تعلیم اپنائیں جو بہ یک وقت نظریاتی اور مادی تقاضوں کو پورا کرسکے۔ اس کی ضرورت یوں بھی محسوس ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں مروجہ متوازی دھاروں میں سے کوئی دھارا بھی ایسے عظیم افراد پیدا نہیں کرسکا جو اپنے اپنے میدان میں معتبر ٹھہرتے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے کوئی ذہین و فطین اور باصلاحیت فرد پیدا نہیں کیا یا قدیم مدرسوں سے کسی صاحب فکر و نظر نے جنم نہیں لیا' اصل بات صرف اس قدر ہے کہ استثنائی صورتوں کو چھوڑ کے ان تعلیمی اداروں نے بالعموم اوسط صلاحیت کے حامل افراد پیدا کئے جنھوں نے کسی شعبہ حیات میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں ہمارا معاشرہ اجتماعی زوال کا شکار ہوتا چلا گیا نہ کوئی معیار علم و دانش تشکیل پاسکا اور نہ کوئی معیار اخلاق و کردار۔ تقریباً" نصف صدی کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج اگر ہمارا معاشرہ مادی ترقی اور اسلامی معیار کردار کے اعتبار سے ایک انتہائی روح فرسا منظر پیش کرتا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے نظام تعلیم نے اپنا کردار ادا نہیں کیا اور اس طرح عملاً تمام معاشرتی ادارے بالعموم انحطاط کا شکار ہیں۔۔۔۔جب ہم معیار اخلاق و کردار کی پستی کا یہ عالم دیکھتے ہیں تو ہمارا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ مطلوبہ نتائج (چاہے وہ مادی ہی کیوں نہ ہوں) حاصل کرنے کے لئے ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں ضمیر کے چراغ روشن ہوں' جن کی فکر میں کجی نہ ہو اور جو علمی و اخلاقی قوت سے آراستہ ہوں۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں پہنچ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں "مکتب کی کرامت" کے ساتھ ساتھ "فیضان نظر" کی بھی ضرورت ہے اور یہ فیضان نظر پیدا کرنے کے لئے ہمیں اپنے نظام تعلیم کو ان خطوط پر استوار کرنا ہوگا جو ہمارے قومی و ملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔

حقیقت میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظام تعلیم کا محوری نصب العین دستور پاکستان میں شامل قرار داد مقاصد میں طے کیا جاچکا ہے' جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ میں متعین ہیں' ترتیب دے سکیں۔اس دفعہ (Clause) کی موجودگی میں پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ملک میں ایسا نظام تعلیم قائم کرے جس سے یہ نصب العین حاصل ہو۔ لہذا اس مقصد کی تکمیل کے

لئے تعلیمی نصابات' درسی کتب' تربیت اساتذہ' تعلیمی انتظامیہ' طریق امتحانات' غرض پورے تعلیمی عمل کو اس انداز پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے کہ ابتدائی سے انتہائی مدارج تک' ہر علم و فن کی تعلیم میں اسلامی نظریہ حیات پیوست ہو جائے اور طلبہ کی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھل کر نکلیں اور وہ بیک وقت خدا ترس اور فرض شناس بھی بنیں اور اپنے اپنے علم و فن میں بھی ماہر ہوں۔ اس ضمن میں مختلف ادوار میں کچھ نہ کچھ جزدی تبدیلیاں لائی گئیں لیکن بحیثیت کل یہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ اور اگر کبھی کوئی جامع لائحہ عمل مرتب بھی کیا گیا تو سیکولر محاذ کی طرف سے جلی اور خفی مزاحمت اور کسی حد تک خود دین پسند طبقے کی مناسب حکمت عملی کے فقدان کی وجہ سے اسلامی نظام تعلیم کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ قرارداد مقاصد کے تناظر میں پاکستان کی پارلیمنٹ' شریعت بل 1991ء کو متفقہ طور پر منظور کر چکی ہے اور جسے صدر مملکت کے دستخطوں کے بعد قانونی شکل بھی حاصل ہوگئی ہے۔ تعلیمی حوالے سے اس قانون کے تحت مملکت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسے موثر اقدام کرے جن کے ذریعے ابلاغ عامہ سے اسلامی اقدار کو فروغ ملے۔ نیز مملکت' اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے جامع اور متوازن ترقی کے لئے موثر اقدامات کرے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ پاکستان کا نظام تعلیم و تدریس' اسلامی اقدار پر استوار ہو۔ اس قانون کے تحت حکومت کی یہ ذمہ داری متعین کی گئی کہ وہ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے درج ذیل مقاصد کی تحصیل کے لئے ایک کمیشن مقرر کرے جو ماہرین تعلیم' ماہرین ابلاغ عامہ' علماء اور منتخب نمائندگان پارلیمنٹ پر مشتمل ہو۔

(الف) تعلیم کی اسلامی تشکیل اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے ذرائع ابلاغ عامہ کا جائزہ اور اس بارے میں سفارشات مرتب کرنا۔

(ب) تعلیم اور ذرائع ابلاغ کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے عمل کی نگرانی کرنا اور عدم تعمیل کے معاملات وفاقی حکومت کے علم میں لانا۔

(ج) کمیشن کی سفارشات پر مشتمل ایک جامع رپورٹ اس کے تقرر کی تاریخ سے ایک سال کی مدت کے اندر وفاقی حکومت کو پیش کرنا۔

(د) اس کے بعد حسب ضرورت وقتاً فوقتاً رپورٹیں تیار کرنا۔

پارلیمنٹ سے منظور شدہ شریعت بل کی ان شقوں سے جو بالخصوص تعلیم سے متعلق ہیں اور ان شقوں سے جو بالعموم دیگر انفرادی اور اجتماعی امور زندگی سے متعلق ہیں' رہنمائی لیتے ہوئے مجوزہ کمیشن کی خدمت میں قومی اور ملی تقاضوں کے تناظر میں درج ذیل چند تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔

○ اسلامی حکمت تعلیم میں دین و دنیا کی تفریق یا ثنویت کا نظریہ صحیح نہیں بلکہ اس کے برعکس وحدت فکر و عمل اور وحدت دین و دنیا کے عالمگیر آفاقی نظریہ کی روشنی میں دینی اور دنیوی مدرسوں کے نصاب اور درسی کتب کو قرآن و حدیث کے آئینے میں اس طرح وضع کیا جائے کہ خالق کائنات اور اس کے نبی آخر الزماں ﷺ کی سیرت طیبہ کو نمایاں حیثیت دی جائے۔ نیز اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب سے متعلق دشمنان اسلام کے مبینہ الزامات کو دلیل سے مسترد کیا جائے اور نوجوان نسل کے دلوں میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی محبت کو جاگزین کیا جائے۔

○ اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے عقیدوں' اپنے اصول و مقاصد ' اپنے بزرگوں' اپنی تاریخ' اپنی تہذیب' اپنے قانون' دنیا پر پڑنے والے اپنے اثرات اور اب ان اثرات کے دھندلا جانے اور باہر سے مسلمانوں پر پڑنے والے اثرات کا علم رکھتے ہوں۔ یہی وہ علم ہے جسے طلبہ تک منتقل کرنے کے لئے ہمیں نصاب کی اسلامی تدوین کرنا ہوگی۔

○ فزیکل' نیچرل اور اطلاقی سائنسز کی تشکیل نو' اسلامی عقیدہ سے ہو اور طلبہ کے دینی افکار میں وسعت پیدا ہو۔ نیز وہ خالق ارض و سما کی عظمت کا اندازہ کر سکیں۔ موجودہ سائنسی نصاب اور درسی کتابوں کو ان نظریات سے جو اسلامی عقیدہ سے براہ راست متصادم ہوں' یکسر پاک و صاف ہونا چاہئے۔ نیز اس میدان میں یہ تحقیق بھی کی جائے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں سائنس کی ترقی اور بعد میں اس کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟

○ ملی یکجہتی کے لئے ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں اسلامی تہذیبی معیارات کی روشنی میں غیر طبقاتی تعلیم' یکساں مقاصد تعلیم' یکساں نصاب تعلیم' یکساں ذریعہ تعلیم یعنی قومی زبان' یکساں طریق تربیت' یکساں طریق امتحان' یکساں تعلیمی معیار اور یکساں سہولیات کا انتظام کیا جائے۔ اس طرح تعلیم میں طبقہ واریت اور کئی نظاموں کو ختم کرکے ایک ہی نظام تعلیم رائج کیا جائے۔

○ اسلام میں تحصیل علم' مردوں اور عورتوں دونوں پر فرض ہے لیکن اس ضمن میں مسلمانوں کی تاریخ میں مخلوط تعلیم کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ اسلامی نظام کی تشکیل میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل تجاویز بڑی اہمیت کی حامل ہیں:

(الف) مخلوط تعلیم کا فی الفور خاتمہ کیا جائے بالخصوص سات آٹھ سال کی عمر کے بعد طلبا و طالبات کے لئے الگ الگ انتظامات کئے جائیں۔

(ب) پاکستان کے ہر صوبہ میں کم از کم ایک "خواتین یونیورسٹی" اسلامی تہذیب و ثقافت کی

واضح علامت کے طور پر قائم کی جائے۔ نیز خواتین سے متعلق تعلیمی اور انتظامی اداروں کا انتظام خود خواتین کریں۔ اس طرح اسلامی اقدار کو بھی فروغ حاصل ہوگا اور خواتین کے روزگار اور ترقی کے مواقع میں بھی اضافہ ہوگا۔

(ج) تعلیمی اداروں میں ایسی حکمت عملی وضع کی جائے کہ بالغ طالبات حصول علم کے لئے پردہ ترک کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

○ اسلام کے سارے ماخذ چونکہ عربی زبان میں ہیں' اس لئے تفہیم دین کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کو کم از کم دسویں جماعت تک بطور لازمی مضمون پڑھایا جائے تاکہ قرآن و حدیث کی تعلیم جو مسلمانوں کے اعتقادات' اخلاقیات اور تدبر و تفکر کی تشکیل میں بنیادی قدم ہے' حاصل کی جاسکے۔

○ تعلیم و انتظام کی ہر سطح پر قومی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ نیز بورڈوں' یونیورسٹیوں اور مقابلے کے تمام تحریری اور زبانی امتحانات قومی زبان میں ہوں۔ اس کے ساتھ ہی علاقائی زبانوں کی ترقی کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

○ ملک کے تمام افراد کو بلا تمیز رنگ و نسل اور زبان و مذہب پرائمری تک لازمی اور مفت تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

○ حصول علم میں غربت کو کسی صورت رکاوٹ نہ بننے دیا جائے۔ غریب گھرانوں کے ذہین و فطین بچوں کے لئے سرکاری خرچ پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے تخصیصی شعبوں میں اندرون و بیرون ملک تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

○ تعلیمی سہولتیں صرف شہری آبادی تک ہی محدود نہ ہوں بلکہ دور دراز دیہی علاقوں اور خانہ بدوش قبائل تک کے لئے بھی مختص کی جائیں۔ ان لوگوں کی تعلیم کے لئے سفری سکولوں (Mobile Schools) کا انتظام کیا جائے۔ نیز علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

○ ملک کی ہر بستی میں لازماً کم از کم ایک پرائمری سکول ہو اور تدریجاً پورے ملک میں ہائی سکولوں کو اس طرح پھیلا دیا جائے کہ خرچ اور فاصلے کے لحاظ سے میٹرک تک تعلیم سہل الحصول ہو جائے۔ نیز یہ کوشش کی جائے کہ قریب قریب ہر گاؤں میں مکتب یا قرآنی مدرسے قائم ہو جائیں تاکہ سو فی صد شرح خواندگی کا ہدف بھی جلد از جلد پورا ہو سکے۔

○ ثانوی تعلیم تک جدید علوم کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان بچے کو اسلامی عقائد اور اسلامی زندگی کے ضروری احکام سے واقف کرایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ہر مسلمان طالب علم کو قرآن پڑھنے اور بہت حد تک قرآن کو سمجھنے کے قابل بھی بنایا جائے۔

○ سکول اور کالج کی سطح پر فنی تعلیم و تربیت کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا جائے اور ہر تحصیل میں مردانہ اور زنانہ فنی و حرفتی ادارے قائم کئے جائیں۔

○ ملک سے ناخواندگی کو جلد سے جلد دور کرنے کے لئے ممکنہ تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس مقصد کے لئے شام کے وقت تمام سکولوں میں خواندگی کے مراکز قائم کئے جائیں اور تمام کارخانوں اور دفاتر میں ناخواندہ افراد کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ نیز تعلیم عامہ اور تاحیات تعلیم کے لئے جدید ترین تعلیمی ٹیکنالوجی سے کام لیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہنی یا جسمانی طور پر کمزور خصوصی بچوں کے لئے سپیشل ایجوکیشن کے ادارے کھولے جائیں۔

○ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعلیم و تحقیق کے اعلیٰ ادارے قائم کئے جائیں۔ ملک میں اعلیٰ سطح کی ایک "سائنس اور ٹیکنالوجی یونیورسٹی" قائم کی جائے جس میں ایٹمی اور شمسی توانائی کی تعلیم و تحقیق پر خصوصی توجہ دی جائے۔ اس ضمن میں اعلیٰ سطح کے تربیت اساتذہ کے اداروں میں سائنس ایجوکیشن کے مراکز بھی قائم کئے جائیں۔

○ نظام تعلیم و تربیت میں ہر سطح پر مسجد کے قیام کو مرکزی حیثیت دی جائے۔ تمام ثانوی مدارس' کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مساجد تعمیر کی جائیں' تاکہ علم کا رشتہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے استوار کیا جائے۔

○ پیشہ ورانہ تعلیم سے متعلق طلب و رسد (Supply and Demand) میں توازن لایا جائے۔ جو لوگ باقاعدہ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے حامل ہوں ان کو ملازمت نہ ملنے تک "بے روزگاری الاؤنس" دیا جائے۔

○ قومی یک جہتی کے لئے ایسی تعلیمی پالیسی بنائی جائے کہ پاکستان کے کسی بھی علاقے کا طالب علم' پاکستان کے کسی بھی علاقے کے تعلیمی ادارے میں میرٹ کی بنیاد پر داخلہ لے سکے اور تمام مراعات سے مستفید ہو سکے۔

○ ذرائع ابلاغ کو وزارت تعلیم سے وابستہ کرکے فروغ تعلیم کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس طرح پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو اپنے تمام پروگرام' مقاصد تعلیم کے تناظر میں مرتب کرنا چاہیں' تاکہ علمی و اخلاقی لحاظ سے قوم کی بہتر تربیت ہو سکے۔

○ اسلام نے ذمیوں کو جتنے حقوق دیئے ہیں اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس استحقاق کے پیش نظر اقلیتوں کو اپنی کمیونٹی کی تعلیم کے لئے ہر ممکن آزادی اور انہیں تمام ضروری تعلیمی سہولتیں میسر کی جائیں۔

○ سرکاری سطح پر یہ بات طے ہونی چاہئے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مسلمان شہری اس امر سے اجتناب کریں کہ وہ اپنے بچوں کو غیر اسلامی نظریات کے تحت چلنے والے سکولوں میں

داخلہ دلائیں جو اس ملک میں چل رہے ہیں۔ خواہ یہ ادارے کتنی بڑی ترغیب ہی کیوں نہ دیں۔ کیونکہ طلبہ پر ان اداروں کے مجموعی تعلیمی پروگرام کے بالعموم جو خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے ان کے دین و ایمان کو بڑا سخت ضعف پہنچتا ہے۔

○ پاکستان میں کسی سرکاری یا نجی تعلیمی ادارے کو یہ اختیار نہ دیا جائے کہ وہ کسی ایسے غیر ملکی سرکاری یا نجی تعلیمی ادارے سے الحاق (Affiliation) کرے اور اس کے نصاب کے حوالے سے طلبہ کو تیار کرے۔ جس کا تعلیمی پروگرام اسلامی تاریخی روایات اور تہذیبی معیارات کے منافی ہوں۔ خصوصیت سے عمرانی علوم (Social Sciences) کے ضمن میں اس طرح کے تعلیمی ادارے سے الحاق ہمارے مطلوب تہذیبی تشخص کے سراسر خلاف ہے۔

○ تعلیم و تحقیق کے ادارے دیگر تعلیمی مسائل کے علاوہ امتحانات کی اصلاح کے ضمن میں بھی منظم اور منضبط تحقیق کریں۔ اس ضمن میں جدید کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی جائزہ لیا جائے کہ یہ کس حد تک تعلیمی تحقیق بالخصوص امتحانات کے نظام میں مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ نظام تعلیم میں طلبہ کو معلومات دینے کے ساتھ ساتھ ان کی تشکیل سیرت کا سامان بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اس رخ پر طلبہ کی کارکردگی کا جائزہ زبانی' تحریری' موضوعی' معروضی' اور عملی نوعیت کی تفویضات (Assignments) اور طلبہ کے جامع احوال (Cumulative Record) کی بنیاد پر کیا جائے۔ اس حوالے سے نظام امتحانات میں بھی انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے تاکہ طلبہ کی معلومات کی جانچ پرکھ کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت و کردار کو بھی پرکھا جائے۔

○ سارے تعلیمی عمل کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ معاشرہ میں اساتذہ کا مقام و مرتبہ بلند کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے فوری طور پر درج ذیل اقدامات کئے جائیں۔

(الف) فن تعلیم و تربیت میں بہتر اور جدید تعلیمی ٹیکنالوجی اور سہولتوں کے لئے ملکی سطح پر ایک خود مختار "ٹیچر ایجوکیشن یونیورسٹی" قائم کی جائے جو نظریہ پاکستان کی روشنی میں تعلیم و تحقیق کے پروگراموں کے لحاظ سے مثالی ہو اور جہاں حقیقی معنوں میں نظریاتی' علمی اور فنی نقطہ نظر سے ماہر معلم تیار ہوں۔

(ب) قومی سطح پر ایک "انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ایجوکیشن اینڈ ریسرچ" قائم کیا جائے جو نظریاتی تناظر میں تحقیقی کام بھی کرے اور تربیت اساتذہ کے مختلف پروگراموں سے متعلق نصابات کی تشکیل کا کام بھی۔ نیز یہ مجوزہ ادارہ اساتذہ کی قبل از ملازمت اور دوران

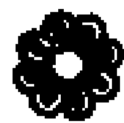
ملازمت تربیت کا بھی بندوبست کرے۔
(ج) تعلیمی اداروں کی سطح اور پوسٹ کا لحاظ کئے بغیر اساتذہ کو ان کی علمی اور پیشہ ورانہ قابلیت کے مطابق تنخواہیں دی جائیں اور بہتر شرائط کار کا انتظام کیا جائے۔
(د) اساتذہ کے الاؤنسز کے حوالے سے دیہات' قصبہ یا شہر کی تفریق ختم کی جائے بلکہ شہر سے دور دراز علاقوں کے تعلیمی اداروں میں تعینات عملہ کو شہری علاقہ سے زیادہ الاؤنسز دیئے جائیں۔ خاص طور پر خواتین اساتذہ کے لئے بہتر سفری اور رہائشی سہولتیں ہونی چاہئیں۔

خلاصہ بحث

بلاشبہ کسی بھی ملک کی بقاء اور ارتقاء کا انحصار اس کے اچھے نظام تعلیم پر ہے۔ جب تک ہمارے پاس صحیح معنوں میں قابل' مخلص' تحقیق کے دلدادہ اور قابل رشک کردار کے حامل اساتذہ' ڈاکٹر' انجینئر' سائنس دان' جرنیل' ایڈمنسٹریٹرز' سول سروٹس' صحافی اور سیاست دان نہیں ہوں گے' ہم کسی ترقی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے' خواہ ہمارے پاس دولت اور اسلحہ کے انبار ہی کیوں نہ جمع ہو جائیں۔ یہ ہمارے لئے لمحہ فکریہ ہے کہ آخر ہمارا علم وہ مقاصد کیوں پورے نہیں کر رہا جس سے ایسے عالی کردار شخصیت کے مالک افراد تیار ہوسکیں۔ ہماری ڈگریاں کیوں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ علم کا اطلاق صحیح نہیں' کہیں علم کا رشتہ جان کے بجائے محض جسم سے تو استوار نہیں ہوگیا۔ ہمیں اگر پاکستان میں اپنے راہرو علم کو صحیح راہ پر گامزن کرنا ہے تو لازماً" درج بالا تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔۔۔۔ حقیقت میں پاکستان کا نام آتے ہی یہ تصور ابھرتا ہے کہ یہ ہمارا قومی گھر ہے جسے باہر کے حملوں سے بھی بچانا ہے اور اندر کے فتنوں سے بھی۔ اسی طرح تحفظ پاکستان کے بنیادی فریضہ کا تصور ابھرتا ہے جس کی شرط اول پاکستان کے لئے سچا جذبہ محبت ہے۔ مگر محبت پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے صحیح نصب العین کا شعور موجود ہو اور اس کی تعمیر اور حفاظت کے لئے جس طرح کے مشنری رضاکارانہ جذبات کی ضرورت ہے وہ کار فرما ہوں۔ یہ کام لازماً" تعلیم ہی کے ذریعے ہوگا۔ قومی تقاضوں کے حوالے سے تعلیم کی نظریاتی تشکیل میں ہمیں اس بات کا بھی گہرا شعور ہونا چاہئے کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی کاوشوں سے پاکستان اس لئے نہیں بنا کہ یہ قبیلوں' نسلوں' لسانی اور علاقائی گروہوں کا دنگل بنا رہے۔ پاکستان کی غرض یہ بھی نہیں ہوسکتی کہ یہ غیر ممالک کی تحریر فکر و ثقافت کی نقل درج کرنے کا تختہ سیاہ ہو۔ پاکستان ایسا بے معنی خلا بھی نہیں ہے کہ زمانے کے تندرو دریا میں بغیر سوچے سمجھے اس سفینے کو ڈال دیا جائے جس میں کروڑوں افراد لدے ہیں اور ہمارا

کوئی منتہا نہ ہو کہ اسے جانا کہاں ہے اور اسے کس کس خطرے اور موڑ سے بچانا ہے؟ پاکستان کرائے کا ایک ایسا ہال بھی نہیں کہ اس میں کچھ لوگ جب چاہیں اس کے اساسی نظریہ اور یک جہتی کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالیں۔ پاکستان کو اگر اسلامی نصب العین رکھنے والے ملک کی حیثیت سے سامنے رکھا جائے تو اس کے تحفظ کے لئے عسکری' تکنیکی اور اقتصادی قوت بلاشبہ ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری ایمان کی قوت ہے' پھر علم کی' پھر اخلاقی قدروں کی ـــــ نظام تعلیم اگر ان قوتوں سے اساتذہ اور نوجوان نسل کو آراستہ کرکے لاسکے تو وہ ذہنی غلامی کے اس چکر سے نکل آئیں گے۔ ان کے اذہان و قلوب میں صدیوں کا جما ہوا احساس کمتری کھرچ کر نکالا جاسکتا ہے اور وہ دنیا کے سامنے وہ انقلابی توحید کا پرچم اس احساس سے بلند کرسکتے ہیں کہ ہمارے پاس وہ عظیم پیغام اور نظام ہے جس سے تمام انسانیت محروم ہے۔ اس محرومیت کا مداوا ہم ہی کرسکتے ہیں کیونکہ ہم تمام انسانیت کے معلم ہیں۔ صرف ایسے اساتذہ اور طلبہ ہی "سپرپاور" کے سامنے اس چیلنج کے سامنے کھڑے ہوسکتے ہیں کہ "تم ہمیں خرید نہیں سکتے۔ تم ہماری حیوانی خواہشات کو اکسا کر ہماری انسانی اور ایمانی عظمت کی گردن میں خم نہیں پیدا کرسکتے۔ تم ہمیں تعمیر پاکستان اور تحفظ مقصد پاکستان کے معرکوں میں کبھی شکست نہیں دے سکتے"۔

(انجمن فاضلین' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور کے زیر اہتمام "تحفظ پاکستان اور تعلیم" کے موضوع پر وحید شہید ہال' آئی ای آر' لاہور میں منعقد سیمینار میں پڑھا گیا۔۔۔ سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 1' شمارہ 3' اکتوبر 1990ء)



مغربی ثقافتی استعماریت اور تعلیم

بیسویں صدی کو مجموعی طور پر آویزش و پیکار اور تصادم و کشمکش کی صدی کہا جاسکتا ہے۔ دو عظیم جنگیں اور لاتعداد چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ایک دوسرے پر عسکری تسلط کی کوششیں تھیں۔ انسانی شعور کی نمو کے باعث عسکری بالادستی کے رجحان کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس لئے جنگ' ایٹم اور گولہ بارود کے میدان سے نکل کر نظریاتی حدود میں داخل ہو گئی۔ دنیا معاشی و سیاسی نظام کی بنیادوں پر استوار ہونے والے نظریات کی آماجگاہ بن گئی اور متحارب قوتیں اس محاذ پر ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کرنے لگیں۔ اشتراکی بلاک نے اپنے ارد گرد ایک مضبوط دفاعی حصار قائم کر لیا جس کے باعث وہ باقی دنیا سے الگ تھلگ ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنے نظریے کی درآمد کے لئے بھی کھلی یلغار کے بجائے مخفی طریقے استعمال کئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشتراکی معاشروں میں تجسس اور تاک جھانک کی جبلت سر اٹھانے لگی۔ ادھر مغرب نے نہ صرف اپنے سیاسی و اقتصادی نظام کی ترویج پر زیادہ سائنٹفک انداز میں توجہ دی بلکہ میدان خالی دیکھ کر اپنے تہذیبی و ثقافتی مظاہر کی برآمد کو بھی مشن کا درجہ دے دیا۔ مغرب کو بوجوہ انگریزی زبان کے حوالے سے بھی فوقیت حاصل تھی۔ کیونکہ زبان کسی بھی ثقافت کی ترویج کا سب سے توانا ذریعہ ہوتی ہے۔ یوں عسکری تصادم سے شروع ہونے والی صدی جب آخری چوتھائی میں داخل ہوئی تو مغربی استعمار کی ثقافتی یلغار پوری قوت سے اپنے اہداف کی طرف لپک رہی تھی۔ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ممالک براہ راست اس کی زد میں رہے اور اپنے کمزور اقتصادی و سیاسی ڈھانچوں کے باعث یہاں کے معاشرے تہذیبی تاخت و تاراج کا نشانہ بنتے چلے گئے۔ پاکستان کا شمار بھی بلاشبہ ان ممالک میں ہوتا ہے جن میں مغربی استعمار کے ثقافتی اثر و نفوذ نے خاص طور پر گل کھلائے ہیں۔

آج تیز رفتار ذرائع ابلاغ کے باعث سکڑتے ہوئے کرہ ارض نے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے کے اتنے قریب کر دیا ہے کہ کسی مصنوعی حد فاصل کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے دور نہیں رکھا جاسکتا۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر مغرب کی اجارہ داری کے باعث اس کے تہذیبی اثرات ملک کے ایوان ہائے اقتدار سے لے کر مدرسہ و مکتب تک اور

کوچہ و بازار سے لے کر افراد کے انفرادی رویوں تک' ہر کہیں مرتب ہو رہے ہیں۔ استعمار کی اس نئی لشکر کشی کے بے شمار عوامل ہیں' جن میں سے بعض کو ہم فطری یا عمرانی ارتقاء کے قدرتی تقاضوں کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ بلاشبہ آج کے دور میں کسی طرح کی مصنوعی قلعہ بندی سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی شاید درست نہ ہوگا کہ بغیر کسی منضبط کاوش کے محض نظریاتی داعیے یا روایتی اقدار کی پاسداری کا نعرہ اور وہ بھی نیم دلانہ' اس سیلاب بلا کے سامنے کوئی مضبوط بند باندھ سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ ایک ایسا معاشرہ جو اپنا توانا تاریخی و نظریاتی پس منظر رکھتا ہو اور جس کی اپنی تہذیبی و ثقافتی ساکھ انتہائی معتبر ہو' وہ اپنے اعصاب کی قوت مزاحمت سے دست کش ہو کر اپنے آپ کو پکے ہوئے پھل کی طرح دوسروں کی جھولی میں گرا دے۔ معاشرتی و سماجی عوامل کے فطری تقاضوں کی اثر آفرینی کے باوجود زندہ اور متحرک معاشروں کی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے تشخص کو معدوم نہیں ہونے دیتے اور تہذیب نو کی چکا چوند کے باوجود اپنی آنکھوں کو خیرہ ہونے سے بچائے رکھتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کی اس ثقافتی استعماریت (Cultural Imperialism) کے مقابلے میں ہمیں اپنی اقدار کے تحفظ اور اپنی تہذیبی روایات کی بقاء کے لئے جس حکیمانہ دفاعی حکمت عملی کی ضرورت ہے' اس میں تعلیم کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جنگ ہمیشہ مدرسہ و مکتب میں ہی لڑی گئی اور استاد نے اس دفاع کاری میں سالار اعظم کا کردار ادا کیا ہے۔ آج جب کہ ثقافتی استعماریت کی فتنہ سامانیاں بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں اور من حیث القوم ہمارے اعصاب کی قوت مزاحمت کم ہوتی جا رہی ہے' تعلیمی نظام اور استاد کی ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ چکی ہیں۔ بیسویں صدی کا یہ آخری عشرہ شاید اس اعتبار سے فیصلہ کن ثابت ہو کہ ہم نے احساس کمتری کا شکار ہوکر مغربی تہذیب کا تر نوالہ بننا ہے یا اپنے نظریاتی' تہذیبی اور ثقافتی تشخص کی بقا کے لئے کوئی کارگر دفاعی حکمت عملی اختیار کرنی ہے۔

مغربی ثقافتی استعماریت: تاثر' تنقید' تبصرہ

دور حاضر میں مختلف مغربی ممالک کے ساتھ' بالخصوص امریکہ کے حوالے سے تجارت' سفر اور ذرائع ابلاغ نے ہماری زندگی کے اسلوب کو بڑا متاثر کیا ہے۔ پھر مغرب کے مواصلاتی سیاروں کے ذریعے ٹی-وی نشریات نے خاص طور پر شہروں کے اندر' کھانے پینے کے انداز' لباس' زبان' فیشن' تعلیم' ادب' صحافت' سیاست' فنون لطیفہ' تعمیرات' تفریحات ــــــ غرض

ہمارے کلچر کی قریب قریب ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ چنانچہ مغرب کی یہ مادی حسی تہذیب اور مغربی ثقافتی استعماریت' پوری دنیا خاص طور پر ترقی پذیر اور پس ماندہ ممالک میں گہرے نقوش مرتب کر رہی ہے۔ جن کے ذریعے مغرب کے زیر اثر ایک مخصوص کلچر ـــــ بلیو جینز' ٹی شرٹس' ڈریس سٹائل' ہیر سٹائل' کاسمیٹکس' پیپسی کولا' کوکا کولا' سیون اپ' فاسٹ فوڈ ☆ ' کنفیکشنری' ہوٹلنگ' پاپ' راک' جیز (Jazz) میوزک' میوزیکل کنسرٹس' ڈسکو' بریک ڈانس' سیکس' وائیلنس اور لاقانونیت کو فروغ دینے والی موشن پکچرز' سٹیج ڈرامے' ٹی وی اور عام پبلک جگہوں پر کمرشل اشتہارات (جن میں سے بعض اباحیت کی نشوونما کا باعث بنتے ہیں)' وڈیو گیمز' آرٹ گیلریز' فلم' ٹی وی ایوارڈز کی تقریبات' پامسٹری' ہارو سکوپ' منشیات' رـیفل ٹکٹوں پر جوئے کی تکنیک' نائٹ کلب' مخلوط مجالس' مخلوط تعلیم ـــــ غرض بے شمار دیگر صورتوں میں رواج پذیر ہو رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض مغرب زدہ مسلم ممالک میں پینے کا پانی تک یورپی کارخانوں سے پیک (Pack) ہو کر آتا ہے۔ اس لئے کہ مغرب نے ان کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ "مقامی" اور "دیسی" پانی ان کی صحت کے لئے انتہائی "مضر" ہے۔ اسی طرح ان ممالک کے ہاں مغربی لباس کو جو پذیرائی حاصل ہو رہی ہے' وہ بھی ان کی غلامانہ ذہن کی غمازی کرتی ہے۔ بدقسمتی یہ کہ اس "مغربیت" کو عین "ترقی" سمجھا جا رہا ہے۔ ان ہی مرعوب اور جدیدیت پسند (Modernist) مسلمانوں کے منفی رویوں پر تنقید کرتے ہوئے امریکی نژاد نو مسلمہ اور معروف سکالر محترمہ مریم جمیلہ اپنی کتاب "Islam and Modernism" میں لکھتی ہیں:

> "The adoption of western clothing is officially encouraged by every Government in the Muslim world. Western clothing has become symbolic of "Advancement" and "progress" while the indigenous clothing, increasingly confined to the very poor in the rural districts, is cited as synonymous with "Back wardness". (p. 24).

☆ ہر چند کہ امریکن فاسٹ فوڈ (Fast-Food) سٹائل کی ہمارے ہاں بڑی پذیرائی ہو رہی ہے' لیکن خود امریکہ کے طبی ماہرین کی یہ رائے ہے کہ اس طرح کے کھانوں میں شامل (Fat-Cholesterol-Sodium) کی زیادہ مقدار دل کے مرض کا ایک اہم عامل (Factor) ثابت ہو رہا ہے۔ (Naisbitt, p. 126) .... اصل میں "غلامی" کی کئی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ "غلام" اپنے کھانے پینے کے سٹائل حتیٰ کہ باورچی خانے کی ہر شے کو بھی "حکمران ملک" سے درآمد کرتا ہے اور اس طرح "باورچی خانے سے متعلق استعمار" (Culinary Imperialism) بڑی خاموشی سے اپنا اثر دکھا جاتا ہے۔

اس طرح مسلم ممالک اپنی دولت کو تعلیمی ترقی پر خرچ کرنے اور سو فیصد شرح خواندگی حاصل کرنے کے بجائے اس کا زیادہ حصہ اشیائے تعیش پر ضائع کرتے ہیں اور یوں بالواسطہ طور پر وہ مغربی استعمار کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کے دیگر ذرائع ابلاغ مثلاً" ٹائم ویکلی ' نیوز ویک' ریڈرز ڈائجسٹ' اکانومسٹ' وال سٹریٹ جرنل' دی ٹائمز' گارڈین' فائنینشل ٹائمز' دی نیو یارک ٹائمز' انٹرنیشنل ہیرالڈ ٹریبون' بی بی سی ورلڈ سروس' وائس آف امریکہ ورلڈ سروس' امریکی سی این این انٹرنیشنل اور ڈش کے ذریعے کئی دیگر عالمی نشریاتی اداروں کے پروگراموں نے جہاں ہمارے قومی اخبارات' جرائد اور دیگر ذرائع ابلاغ کے مواد (Content) اور پیش کش کے اسلوب (Presentation Style) کو متاثر کیا ہے' وہاں ثقافتی نقطہ نظر سے ہماری معاشرتی زندگی پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ انٹرنیشنل فیشن میڈیا' یہاں کی نوجوان نسل کو فیشن کے معاملے میں اپ ٹو ڈیٹ رکھنے کے لئے نت نئے انداز اختیار کرتا ہے۔ ہمارے ہاں مغربی طرز زندگی کے دلدادہ نوجوانوں کا ایک گروہ چاہے ابھی تعداد میں قلیل ہی کیوں نہ ہو' "ماڈ" بننے کے شوق میں مائیکل جیکسن اور میڈونا کے گانے سنتا ہے اور چاہے اسے سمجھتا ہے یا نہیں "محظوظ" ضرور ہوتا ہے۔۔۔۔ پاکستان کے معروف دانش ور جناب حکیم محمد سعید نے اپنے حالیہ سفر نامہ "درون روس: دید و شنید" میں ایک جگہ بڑا ہی معنی خیز اور دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ ان کے بقول "ہم ہی ایسے بدقسمت لوگ ہیں کہ ہم دوسروں کا کوڑا اٹھا کرپاکستان لے آتے ہیں۔ خود بھی بے وقوف بنتے ہیں اور بنائے بھی جاتے ہیں۔" (ص - 221) ---- معروف پاکستانی صحافی مختار حسن نے اپنے مخصوص طنز و مزاح کے پیرائے میں مغرب کی اس پیش کش کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ ان کے لفظوں میں:

> --- (مغرب تو یہ چاہتا ہے کہ) میڈونا' مائیکل جیکسن لے لو' وسکی شیمپین لے لو' رنگل ٹکٹوں پر جوئے کی تکنیک لے لو' لیکن وہ اینٹی بکل گھر جس کی رقم ہم سولہ سترہ برس پیشتر ادا کر چکے ہیں' وہ ہمیں نہیں مل سکتا۔
>
> (ماہنامہ بنیادی حقوق لاہور' دسمبر 1991ء' ص 14)۔

حال ہی میں نیس بٹ (Naisbitt) اور ابرڈین (Aburdene) کی کتاب (Megatrends 2000) شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ دور حاضر میں پوری دنیا کے لائف سٹائل پر کسی نہ کسی طرح' امریکی ثقافت گہرے اثرات ڈال رہی ہے۔ مثلاً" پوری دنیا میں درآمد کیے گئے 75 فیصد ٹی وی پروگرام امریکہ کے ہی ہوتے ہیں۔ پھر امریکی جینز اور ڈسکو نے تو جیسے پوری دنیا کو "فتح" کرلیا ہو۔ اس تناظر میں چین آخری میدان جنگ تھا' لیکن اب اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور روس کی طرح وہاں بھی امریکی معاشرہ کی بلیو جینز' جینز' ڈسکو اور دیگر اسالیب زندگی کو بڑی مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔۔۔ چین کے معروف میوزیکل ڈائریکٹر لی۔ ڈیلن (Li-delun) نے امریکی کلچر کے نفوذ سے متعلق بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"Mass culture from the U.S. ---- from jazz to disco has conqured the world. China is the last battle ground, and we are putting up hardly any resistance." (Naisbitt. p. 132).

لیکن خود ممتاز امریکی دانشور اور فیوچر شاک (Future Shock) کے مصنف ایلون ٹافلر (Alvin Toffler) جس طنز بھرے لہجے میں اپنے ہی کلچر کا مضحکہ اڑاتا ہے' وہ بڑا بامعنی ہے۔ ٹافلر کے انٹرویو سے ایک اقتباس:

"----- Americans have no past and no future. It is the now generation---- The Pepsi slogan embodied" (Quarterly Dialogue, No, 3. 1991, p.10).

ہوسکتا ہے' امریکیوں کا نہ کوئی ماضی ہو' نہ مستقبل اور وہ "مادی ضروریات" کے حوالے سے صرف "بہتر حال" کے پجاری ہوں۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ "ماضی" تو صرف ان کے نزدیک اہمیت رکھتا ہے جو اپنی مادی ضروریات کو مستقل اخلاقی اور روحانی اقدار کے تابع رکھتے ہوں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو امت مسلمہ کا ایک درخشاں ماضی بھی ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں قیادت بھی اسی امت کی ہوگی۔ بلکہ ماضی' حال' مستقبل یہ سب زمانے ایک اکائی کی صورت میں اسی کے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ایمان' تقویٰ اور احسان کے حوالے سے اپنا مقصد زندگی مرتب کرے اور پورے نظام زندگی کی تشکیل اسی مقصد کی روشنی میں کرے۔

اب اگر دائمی اسلامی اقدار کے آئینہ میں' ہم زندگی کا شعور' کلیت اور جامعیت کے نقطہ نظر سے نہیں حاصل کریں گے اور مادی اقدار کو اخلاقی اقدار کے تابع نہیں کریں گے۔۔۔ تو "پیپسی سلوگن" سوسائٹی چاہے امریکہ کی ہو یا پورے یورپ کی' ہمیں اپنے ثقافتی

فریب میں پھانس کر چھوڑے گی۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں غلامی کی خو اور بے راہ روی مزید جڑ پکڑے گی اور اس طرح ان میں نہ اخلاقی خوبیاں باقی رہیں گی' نہ خود اعتمادی' نہ خود داری' نہ اللہ کی راہ میں جہاد کی تمنا اور نہ شہادت کی آرزو ـــــ حقیقت میں ہمیں یہ دائمی اصول پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس قوت نے اسلام کے دور اول میں مسلمانوں کو اس وقت کی غالب تہذیبوں کے مقابلے میں سربلند کیا' وہی قوت انہیں اس دور میں بھی مغرب کے ثقافتی غلبے سے نہ صرف محفوظ رکھے گی' بلکہ خود ایک غالب امت کی حیثیت سے دنیا بھر کو متاثر کرے گی ـــــ یہ قوت ہے قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کا اتباع۔ اگر مسلم عوام اور حکمران اس اصل سرچشمہ کی طرف رجوع کریں اور اپنے وسائل کو ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کریں تو انشاء اللہ مغربی کلچر کے مقابلے میں اسلامی کلچر ہی غالب ہوگا اور اس طرح مسلم دنیا ایک عظیم علمی' سیاسی اور عسکری قوت بن کر ابھرے گی۔ لیکن بدقسمتی سے اس وقت صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔ ہم بڑی تیزی سے غلامانہ ذہن کے ساتھ تقریباً" ہر شعبہ میں مغرب کی نقالی کر رہے ہیں۔ اس مرعوبیت نے ہم سے خود انحصاری' خود اعتمادی' قومی و ملی شعور اور آزادانہ مطالعہ و تحقیق کی قدریں جیسے چھین لی ہوں۔

ہمارے ہاں مغربی "ڈسکو کلچر" کی مرعوبیت کی ایک اور نئی صورت یہ سامنے آئی ہے کہ اب ہمارے بعض قومی اور ملی نغمے بھی مغربی انداز میں پیش کئے جانے لگے ہیں۔ مثلاً" ایک مقبول نغمہ "دل دل پاکستان ـــــ جان جان پاکستان" چاہے کتنا ہی دل پذیر کیوں نہ ہو' اس کی بصری (Visual) پیش کش میں بہر حال مغربی ثقافت کی مرعوبیت اور مغلوبیت جھلکتی ہے۔ اس طرح مغرب سے متاثر ہوکر ہمارے ہاں پی ٹی وی اور ایس ٹی این کے بعض ڈراموں اور پروگراموں میں ذومعنی فقرے' غیر اخلاقی مکالمے اور ناپسندیدہ مناظر سنائے اور دکھائے جاتے ہیں۔ پی ٹی وی کی سہ ماہی (اکتوبر - دسمبر 1991ء) میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کی اشاعت کے حوالے سے ڈرامہ سیریز دکھائی گئیں۔ مغربی کلچر سے مرعوب اس ڈرامہ میں اسلامی تعلیم کے برعکس جس انداز میں بے باکانہ مکالمے اور مناظر پیش کئے گئے' وہ اسلامی ریاست کو قطعاً" زیب نہیں دیتے۔ مثلاً" اس ڈرامہ کی ایک قسط میں ایک عورت دوسری عورت کو محض اس لئے "بے غیرت" کہتی ہے کہ اس کے ہاں بچے زیادہ ہیں۔ پھر اولاد کو "لعنت" قرار دیا گیا ـــــ یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ مغربی ممالک ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی میں تو مدد دینے سے ہچکچاتے ہیں' لیکن فیملی پلاننگ کے نام پر امداد دینے میں بڑی "سخاوت" کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مطلب صرف مسلم آبادی کم

کرنا ہی نہیں بلکہ بے حیائی پھیلانا بھی ہے ★۔ چنانچہ ہمارے ہاں کے پروپیگنڈا سلوگنز درحقیقت مغرب کے لٹریچر کا ہی چربہ ہوتے ہیں۔ جسے افسانہ یا ڈرامہ کی صورت میں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اصل میں مغرب کے نزدیک مسلمانوں کی آبادی کم کرنے کا مسئلہ فی الحقیقت سیاسی نوعیت کا ہے۔ لیکن ہمارا مرعوب ذہن' مغرب کی چال کو یا تو سمجھتا نہیں' یا جان بوجھ کر اس کے فریب میں آجاتا ہے۔ اسی موضوع سے متعلق معروف ادیب' تنقید نگار اور مفکر تعلیم جناب نعیم صدیقی' اپنے ایک مقالہ میں امت مسلمہ کو باخبر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس آبادی سیاسی لحاظ سے ایک ایسی قوت ہے جس کے سامنے ہر طاقت بے بس ہو جاتی ہے۔۔۔ ہمارے دانش ور اور سیاست دان آج تک اس بوسیدہ نظریئے پر چل رہے ہیں کہ آبادی کے مسئلے کا تعلق خوراک سے ہے۔ حالانکہ اس مسئلہ کا تعلق سیاست سے' آزادی سے' حقوق سے' اخلاق سے' جنگ سے' محنت سے' اور کتنے ہی مسائل سے ہے۔ خصوصاً" مغرب اپنے جس مفاد کے لئے ہمیں پیسے دے دے کر "اولاد روک" فتنے میں مبتلا کرنا چاہتا ہے' وہ سیاسی' جنگی اور بین الاقوامی نوعیت کا ہے۔۔۔ افغان اور کشمیری اگر فیملی پلاننگ کرنے والی قومیں ہوتیں تو ان میں لڑائی کی سکت کہاں ہوتی۔۔۔
>
> ("خبردار امریکہ"۔۔۔ روزنامہ پاکستان لاہور' 15 جنوری 1991ء)۔

مغرب کی یہ "آبادی روک" تشہیر اور ثقافتی استعماریت دراصل ریڈیو' ٹی وی' ٹریڈ اور سیاحت کے ذریعے سرایت کرتی ہے اور کسی نظریاتی ملک میں یہ اثرات اس لئے بھی بڑے دھماکہ خیز اور نزاعی ہوتے ہیں' کیونکہ یہ سب سے پہلے اقدار کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔ خاص طور پر جب غیر ملکی زبان اور کلچر' تفریحی انداز میں اور وہ بھی تصویر' گیت اور موسیقی کے ذریعے سرایت کرتے ہیں تو زبان سمجھے بغیر بھی ہماری نئی پود اس سے مغلوب ہوتی چلی جاتی ہے۔۔۔ مغربی ثقافت کی مرعوبیت کی ایک اور مثال شارجہ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ کے فائنل میچ (منعقدہ اکتوبر 1991ء) کے دوران سامنے آئی۔ مغربی ٹی وی

★ حقیقت میں وہ ترقی یافتہ اور امیر ممالک' جو ترقی پذیر اور پس ماندہ دنیا کے وسائل اور ان کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں' انہیں اندر ہی اندر یہ "نفسیاتی خوف" کھائے جا رہا ہے کہ اگر اس دنیا کے "انسانی ہجوم" کا "قتل" نہ کیا گیا' تو کہیں یہ "ہجوم" کسی وقت اپنی کھوئی ہوئی دولت کے حصول کے لئے ان پر ٹوٹ نہ پڑے۔ لہذا اس کو "فیملی پلاننگ" کے نام پر پہلے ہی اپنے قابو میں لے لیا جائے۔ ورنہ بھلا دنیا میں کون سا ترقی [illegible] آبادی کم کی اور وہاں معاشی مسائل "آناً" "فاناً" حل ہو گئے۔

کمنٹیٹر کی رومانوی اور ذو معنی فقرہ بازیاں اور جینز پینٹوں میں ملبوس بعض نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے ایک گروہ کا بے بے باکانہ "ڈسکو" بھی اس میچ کا ایک "اہم" حصہ تھا۔ جس کے ذریعے وہ اپنے ملک کے کھلاڑیوں کی "حوصلہ افزائی" کر رہا تھا۔ اب اگر پاکستانی لڑکیوں اور لڑکوں کا تہذیبی معیار بھی وہی ہے جو غیرپاکستانیوں کا ہے تو "تاطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے!"۔۔۔۔ شارجہ میں اس حد تک تو ہمیں لمحاتی تسکین ملی گئی کہ ہم نے بھارت کو شکست سے ہمکنار کیا۔ لیکن جس تہذیبی شکست کا سامان ہم اس طرح کے مواقع پر کرتے ہیں، کاش اس کا احساس ہمیں بھی اور ہمارے قائدین کو بھی ہو جائے۔ اسی طرح حال ہی میں چار قومی جونیئر ہاکی ٹورنامنٹ کی افتتاحی تقریب جو لاہور میں منعقد ہوئی، اس میں صوبائی ثقافتوں کے نام پر لڑکے لڑکیوں کا مشترکہ علاقائی رقص بھی درحقیقت مغربی اسلوب زندگی کی نقالی ہی تھا۔

اس "بے خدا ثقافت" کو ہمارے ذہنوں اور ہمارے دلوں پر مسلط کرنے کے لئے امریکی سی این این انٹرنیشنل کے ذریعے متعصبانہ یک طرفہ خبریں، جائزے، انٹرویوز، کمرشلز اور ایسے رنگا رنگ پروگرام پیش کئے جاتے ہیں، جو ہمیں بڑی تیزی سے اپنے ثقافتی شکنجے میں جکڑے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے اپنے الیکٹرانک میڈیا مثلاً پی ٹی وی، ایس ٹی این، این ٹی ایم اور ریڈیو کے بعض پروگرام بھی مغربی ذرائع ابلاغ سے کوئی پیچھے نہیں بلکہ اپنی قومی اور علاقائی زبانوں میں اپنی فلموں، اپنے گانوں، اپنے ڈراموں اور دیگر تفریحی پروگراموں کی وساطت سے سیکولرازم اور لبرل ازم کی تعلیم کا ذریعہ بن رہے ہیں۔۔۔۔ پاکستان میں پہلے سے موجود ذرائع ابلاغ کیا قیامت ڈھا رہے تھے کہ اب پریس میں ایک خبر آئی ہے (روزنامہ نوائے وقت لاہور، 27، 31 اکتوبر 1991ء) کہ بعض غیر ملکی بزنس پارٹیوں نے حکومت پاکستان کو یہ پیش کش کی ہے کہ وہ پاکستان میں تین نئے چینل قائم کرنے کے لئے سرمایہ کاری پر تیار ہیں۔ اس طرح سوئٹزر لینڈ کی ایک فرم نے بھی پاکستان میں ٹیلی ویژن کا ایک خصوصی سپورٹس چینل قائم کرنے کی پیش کش کی ہے۔ جس پر وزارت اطلاعات و نشریات غور کر رہی ہے۔ لیکن سردست ہماری وزارت کو غالباً اگر کوئی پریشانی ہے تو بس اتنی کہ اس سے پی ٹی وی کو ملنے والی اشتہارات کی آمدنی تقسیم ہو جائے گی۔ نہ یہ کہ نئے چینل ہماری ملی اور قومی اقدار کو کتنا متاثر کریں گے؟ ایک اور اخباری اطلاع کے مطابق بی بی سی نے بھی ورلڈ سروس ٹیلی ویژن کا آغاز کیا ہے۔ پہلے یہ ادارہ صرف خبروں کی نشریات تک محدود تھا۔ اب اس سال یورپ بھر کے ناظرین کی "ضروریات" اور "دلچسپیوں" کا خیال رکھے گا اور پھر اس سروس کا دائرہ 1992ء تک ایشیاء کے 38 ممالک تک پھیلا دیا جائے گا

اور پھر 1993ء میں افریقہ اور شمالی امریکہ تک اس کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ اس طرح مغربی ثقافتی یلغار میں سی این این اور بی بی سی کا مقابلہ ہوگا اور اس مقابلے کی زد میں "جرم ضعیفی" کے حامل ملک ہی آئیں گے۔ پھر دنیا کے بڑے براڈ کاسٹرز' سی بی ایس' این بی ایس' اے بی سی' بی بی سی' اور سی بی سی (کینیڈین براڈ کاسٹنگ کارپوریشن) کے اثرات الگ ہیں۔

مغربی الیکٹرانک میڈیا کے ان تہذیبی اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر وسیم اختر نے صدر پاکستان کے نام اپنے ایک کھلے خط میں بڑا جامع تجزیہ کیا ہے۔ اس جائزہ میں انہوں نے امریکی فیڈرل کمیونیکیشن کمیشن کے سابق چیئرمین اور امریکی ٹی وی سٹیشن سی بی ایس کے سابق ڈائریکٹر نیوٹن مینو (Newton Mino) کی ایک حالیہ ٹی وی تقریر کا ذکر کیا ہے۔ نیوٹن نے اپنے ذرائع ابلاغ کو ایسی وسیع بے کار بنجر زمین (Vast Waste Land) سے تشبیہ دی ہے جو انسانیت کے لئے قطعاً" کوئی منفعت بخش نہیں بلکہ پوری ثقافتی فضاء کو متعفن بنانے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ وہ کہتا ہے:

> میں 1961ء میں پریشان ہوا کرتا تھا کہ میرے بچے امریکی ٹی وی سے کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور اب 1991ء میں مجھے یہ پریشانی لاحق ہوگئی ہے کہ میرے بچوں کی اولادیں اس ٹی وی سے کتنا نقصان اٹھا رہی ہیں---- امریکہ میں بچہ جب 18 سال کی عمر تک پہنچ جاتا ہے' وہ امریکی ٹی وی پر تقریباً" 25 ہزار مرتبہ قتل و غارت اور زنا بالجبر کے مناظر دیکھ لیتا ہے۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور' ستمبر 1991ء)۔

اس الیکٹرانک اور سپر صنعتی ثقافت نے ہمیں بلکہ پوری دنیا کو بقول ڈاکٹر احمد سجاد' کلچر شاک (Cultural Shock) اور فیوچر شاک (Future Shock) کے بھیانک خطرات سے دوچار کردیا ہے۔ پھر مستقبل میں کیمیائی بموں کی طرح نئی حیاتی اور وبائی امراض کی لڑائیوں کا خطرہ سر پر آچکا ہے۔ مغرب کے یہ سارے "تجربات" انسانی اعصاب کو بری طرح تباہ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بائیو ٹیکنالوجی (Biotechnolgy)' بائیو میڈیکل (Biomedical)' جینٹک انجینئرنگ (Genetic Engineering) اور تولید کی متبادل صورتوں سے متعلق تجربات (Surrogacy) نے ---- اخلاقیات اور قدریات میں مسائل اور مباحث کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ ان سائنسی تجربات اور ثقافتی حملوں کے ساتھ ساتھ تعلیمی دنیا میں بھی ڈارون' مارکس' میکڈوگل' فرائڈ' ایڈلر' ولیم جیمز اور جان ڈیوی نے [illegible] مادہ پرستی' جبلت پرستی' جنس پرستی' عملی افادیت' تجربیت اور ترقی پسندیت [illegible] مغرب کی ماڈرن ازم یا جدیدیت پسندی کی تحریک' ہو در حقیقت

مذہب اور روحانی اقدار کے خلاف ایک بغاوت تھی' نے "ازمیات" (Isms) کے مختلف لیبلوں کے تحت دنیا میں کام کیا۔ مثلاً" کیمونزم' سوشلزم' کیپٹل ازم' زائیونزم' نازی ازم' پروگریسو ازم' لبرل ازم' ماؤازم' نیشنل ازم' ہیومن ازم' سیکولر ازم وغیرہ۔۔۔۔ یہ نظریات بادی النظر میں ایک دوسرے سے کسی حد تک مختلف ہی کیوں نہ ہوں' لیکن ان کا شجرہ نسب ایک ہی ہے۔ یعنی یہ ایک ہی شجر مادیت کی مختلف شاخیں ہیں' جو ہر ملک میں وہاں کے حالات کے مطابق پیوند کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ان نظریات کی آکاش بیل سب سے پہلے متعلقہ ملک کے نظام تعلیم' ادب اور ذرائع ابلاغ کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے اور پھر لادین اور بے دین ماہرین تعلیم' صحافیوں' ادیبوں اور فن کاروں کے ذریعے اپنے درج ذیل مغربی افکار کو نئی نسل کے اذہان و قلوب میں راسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے:

- اخلاقی قدروں کا خالق خود انسان ہے۔ یہ اقدار اضافی' غیر مستقل اور تغیر پذیر ہیں۔
- نیچر یا فطرت ہی اصل حقیقت ہے۔ علم کا سرچشمہ خود انسانی ذہن یا تجربہ ہے۔ علم مختلف ٹکڑوں اور شعبوں میں بٹا ہوا ہے۔ "العلم" کا کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ علمی حوالے سے حقیقت اعلیٰ وہی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئے۔
- انسان معاشرتی جانور ہے اور اس کی ضرورتیں اور دلچسپیاں' حیوانیت (Animalism) کی جبلی (Instinctive) تعبیر کے حوالے سے ہیں۔ چنانچہ مغربی نصاب تعلیم کی تشکیل میں یہ ایک اہم اساسی اصول ہے۔
- رنگ' نسل' زبان اور دھرتی پر مبنی قوم پرستی کا تصور صحیح ہے۔
- صداقت اعلیٰ وہ ہے جسے جمہور تسلیم کرے۔ اقدار کے تعین میں انسانوں کا عددی فیصلہ اہمیت رکھتا ہے۔
- عورت نئی نسل کی پرورش اور اس کی روحانی تربیت کا مرکز نہیں بلکہ محض جنسی تلذذ کا ایک ذریعہ ہے۔
- کائنات کا مالک خود انسان ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور اس میں بھی صرف سفید فام یورپی یا امریکی ہی حکمرانی اور قیادت کے اہل ہیں۔ بلکہ یہ زمین تو ہے ہی صرف ان کے لئے۔ باقی اقوام تو سب محکوم اور غلام ہیں۔
- سب سے بڑی قدر مادی افادیت (Pragmatism) ہے۔ لہٰذا تعلیم کے اس بینکاری (Banking) اور مہاجنی یا بیوپاری (Mercantile) تصور کے تحت مضامین وہی قابل قدر ہیں جو تجارتی لحاظ سے یا معاشیات (Economics) کی اصطلاح میں زیادہ پیداوار (Higher Production) کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔

○ تعلیم غیر جانب دار ہے۔ طلبہ اور اساتذہ کو آزادی ہے کہ وہ اساسی نظریات مثلاً" خدا، کائنات، انسان، رسالت، زندگی، آخرت، اقدار اور علم کے بارے میں جو چاہیں نقطہ نظر مرتب کریں۔

○ اگر مذہب کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اسے انسان کا محض پرائیویٹ معاملہ سمجھا جائے اور اس کا نظام اجتماعی مثلاً" معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظام سے کوئی تعلق نہ جوڑا جائے۔

○ ترقی اور آزادی کی راہ میں سب سے بڑی معاشرتی رکاوٹ (Social Check) مذہب ہے۔ لہٰذا تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روح "لبرل ازم" ہے جو مذہبی اور تہذیبی روایات و اقدار سے بغاوت پر اکساتی ہے۔

اس سارے "علمی تعفن" نے خود یورپ اور امریکہ کو بے سکون کر دیا ہے۔ اطمینان قلب نام کی کوئی چیز نہیں۔ خود مغرب کو غالباً" یہ احساس ہو چکا ہے (ہرچند کہ وہ اس کا برملا اظہار نہیں کر رہا) کہ اس کی تہذیب بس "شاخ نازک پہ آشیانہ" کی مانند ہے۔ لیکن خود مغرب کے دانشوروں کی سوچی سمجھی (Calculated) رائے ہے کہ جس "ثقافت" نے ان کا بیڑا غرق کیا ہے، اب دوسری اقوام بھی اسے اپنائیں تاکہ تہذیبی اور ثقافتی نقطہ نظر سے ان کا بھی بیڑا غرق ہو۔ انہیں یہ احساس ہو چکا ہے کہ مغربی تہذیب صرف اپنے جوہر (Merit) پر غالب نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے مادی و عسکری قوت اور سیاسی ہیر پھیر کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مغرب کے ان "بتوں" نے پس ماندہ ملکوں کو "لنڈا بازار" کی حیثیت دی ہوئی ہے اور اس طرح وہ ان ملکوں کے شہریوں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ مغرب کے لائف سٹائل حتیٰ کہ ان کے افکار کی "اترنیں" بھی استعمال کریں۔ پھر ٹریجڈی یہ کہ "غلاموں" کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جاتی ہے کہ ان "اترنوں" کا استعمال عین "ترقی پسندیت" ہے اور برتر تہذیب تو صرف مغرب کی ہے، "غلام" کی تو اپنی نہ کوئی روایت ہے اور نہ ثقافت۔۔۔۔۔ حالانکہ یورپ کا معروف فلسفی برٹرینڈ رسل (Bertrand Russel) خود اس بات کو تسلیم کرتا ہے "کہ اب یہ تصور کہ دنیا میں صرف امریکی یا یورپی نسل اور ان کی تہذیب (Civilization) ہی اہم ہے، صحیح نہیں بلکہ اگر کسی حادثہ میں یہ ختم بھی ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ نسل انسانی یا انسانی تہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ بلکہ دنیا میں اور بھی تہذیبیں ہیں جو اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ کہتا ہے:

> "---- I have come to realize that the white race is not as important as I used to think it was. If Europe and America kill themselves off in war it will not necessarily mean the destruction of human species. Nor even an end to civilization". (The Story of Philosophy, p. [illegible])

لیکن اس احساس کے باوجود مختلف حوالوں سے ہمارے ذہن میں یہ بات راسخ کی جاتی ہے کہ مغرب کی ہر چیز اچھی ہے اور ہماری معاشی ترقی (Development) صرف اسی صورت ممکن ہے کہ اگر ہم مغرب کے "نوکر" بن کر رہیں۔۔۔۔ اس علمی اور نظریاتی مغلوبیت نے ایک اہم مسئلہ یہ پیدا کر دیا ہے کہ ہم اپنا علمی' ملی اور تہذیبی تشخص بڑی تیزی سے کھو رہے ہیں اور اس طرح الٰہی ہدایت سے محروم مغربی علوم کے مرتب کردہ اثرات نے ایک ایسی "ثقافت نو" تشکیل دینا شروع کر دی ہے' جس کا حامل اپنے خدوخال اور قد و قامت کے حوالے سے تو شاید پہچانا جائے کہ یہ پاکستانی ہے' لیکن اپنی اقدار و عادات اور اپنے ذوق و شوق کے لحاظ سے اسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مسلم شہری کہنا شاید مشکل ہو۔ اصل میں امریکہ اور یورپ کی استعماری قوتوں میں قومی کبر اور استعلاء کا ایک خاص تعصب پایا جاتا ہے' جس کے تحت ایک آقا کی حیثیت سے وہ دوسری اقوام کو دیکھتے ہیں۔ وہ دعویٰ تو معروضیت (Obectivity) کا کرتے ہیں' لیکن درپردہ ان کی ذاتی پسند و ناپسند کا معیار اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اس اہم نکتہ سے متعلق عالم اسلام کے عظیم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنے مایہ ناز مقالہ "نیشنل ازم اور اسلام" میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ سید مودودیؒ فرماتے ہیں:

> قومی استعلاء و استکبار (National Aggrandizement) کا جذبہ جو ہر ترقی یافتہ اور طاقت ور قوم کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہو' دوسروں کے خرچ پر اپنی خوش حالی بڑھائے' اپنے آپ کو پس ماندہ قوموں میں تہذیب پھیلانے کی خدمت پر خود بخود مامور سمجھے اور دوسرے ممالک کی قدرتی دولت سے استفادہ کرنے کو اپنا پیدائشی حق قرار دے۔۔۔۔ اس نیشنل ازم کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد' خوش حال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک شریف جذبہ ہوتا' لیکن محبت سے زیادہ عداوت' نفرت اور انتقام کے جذبات اس کو جنم دیتے اور پرورش کرتے ہیں۔۔۔۔ بظاہر اس کا آغاز ان بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے' واقعی یا خیالی طور پر کی ہوں' لیکن چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت' کوئی روحانی تعلیم' کوئی الٰہی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ اپنی حد سے گزر کر تعصب (Imperialism) معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism) نسل

منافرت' جنگ اور بین الاقوامی بدامنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ (عصر حاضر میں امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل' ص ص 21-20)۔

مغرب اپنی اس فکر کی تنفیذ کے لئے مختلف حیلوں بہانوں سے ہمیں اپنے ثقافتی پھندے (Cultural Trap) میں پھانستا ہے اور اس کا اہم ترین پھندہ اس کا تصور علم ہے جو وحی الٰہی (Revealed Guidance) کو برتر اور مستقل سرچشمہ علم ماننے کے بجائے صرف انسانی رائے اور تجربے کو اہم اور بالاتر سمجھتا ہے۔ چنانچہ الٰہی ہدایت سے محروم یہ تصور علم سب سے پہلے انسان سے ایمان کی دولت چھینتا ہے اور پھر ان کے ملی و اخروی شعور اور جذبہ جہاد کو ختم کرتا ہے۔ امت مسلمہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے افراد کا ایک بااثر گروہ مغرب کے اس "خوشنما علمی پھندے" میں خوشی خوشی آپھنستا ہے۔

اس المیہ سے متعلق معروف مفکر تعلیم پروفیسر سید محمد سلیم نے اپنے مقالہ "تعلیم اور قومی شعور" میں بڑا قابل قدر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس جائزہ کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانوں کے نظام تعلیم کی اہم ترین خامی' جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے دام فریب میں آجاتے ہیں' وہ ملی اور قومی شعور کا فقدان ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم کی یہ رائے کتنی وقیع ہے کہ لباس صرف جسم ڈھانپنے کا ذریعہ نہیں بلکہ کسی قوم کے معنوی یا تہذیبی تسلسل کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ قومی اور ملی شعور اپنی انفرادیت کا اظہار چاہتا ہے۔ علوم میں' ادب میں' استعارات (Phraseology) میں' فنون لطیفہ میں' فن تعمیر میں' غرض ہر میدان میں یہ شعور اپنی انفرادیت کا نقش چھوڑتا ہے۔ آج جو مسلمانوں کے اندر دشمنوں کے آلہ کار اور تخریب کار فراہم ہو جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ مسلمانوں میں ملی شعور کا فقدان اور ان کا سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے مغربی اقوام کا غلام بننا ہے۔

ہمارے ہاں ملی شعور کے فقدان اور تہذیبی غلامی کا یہ عالم ہے کہ جو شخص امریکہ' برطانیہ یا کسی اور مغربی ملک میں تعلیم' تجارت یا سیر و تفریح کی غرض سے جاتا ہے' وہ (استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر) بالعموم ان ممالک کے ثقافتی شکنجے میں جکڑا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی نے ان ملکوں کی کسی یونیورسٹی سے کوئی ڈگری لی ہو' تو وہ ساری زندگی اس یونیورسٹی' وہاں کی تعلیم اور وہاں کی ثقافتی برتری کا تذکرہ کرتا رہے گا۔ وہاں کی یادگار اشیاء (Souvenirs) کی نمائش کرے گا۔ وہ اگر معلم ہے تو کلاس کے اندر' کلاس کے باہر' سٹاف روم میں' جا و بے جا' مغربی زندگی' وہاں کی انفرادی آزادی اور آسائشوں کا تذکرہ کرتا رہے گا (تقابلی مطالعہ کے تناظر میں تو اس تذکرہ میں کوئی مضائقہ نہیں' لیکن ہمہ وقت یہ [illegible] طلبہ پر بہت منفی اثرات مرتب کرتا ہے) چنانچہ ایسا محکوم و مرعوب معلم [illegible] اور اپنی ثقافت سے بے تعلق ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح

غیر ملکی یونیورسٹی میں اس نے جس طرح اپنے پروفیسر کو دیکھا تھا' وہ اس کے اچھے رویوں کو تو شاید بھول جائے' لیکن اسی کی طرح جسمانی اشارات کا استعمال' انگریزی بولنے کا انداز' طلبہ و طالبات سے خوش گوار باہمی روابط (Interpersonal Rapport) کے نام پر بے تکلف گپ شپ ـــــ اس کا محبوب اسلوب تدریس بن جاتا ہے۔ پھر اس اسلوب کے تحت وہاں کی اصطلاحوں سے وہ اپنے طلبہ کو "مرعوب" کرتا ہے اور مغربی فلسفہ کے زیر اثر شعوری یا لاشعوری طور پر نہ صرف ان میں فکری لادینیت (Intellectual Secularism) کی پرورش کرتا ہے بلکہ ان میں یہ ذہنی الجھاؤ (Complex) بھی پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک محکوم اور غلام قوم کے افراد ہیں اور انہیں اگر "ترقی" کرنا ہے تو مغرب کے تصورات اور طور طریقے اپنا لینے میں ہی عافیت ہے اور اس کا بہترین مظہر انگریزی زبان' مغربی اسلوب زندگی' مخلوط تعلیم اور لبرل فضاء ہے۔ (حالانکہ خود امریکہ اور یورپ کی مادی ترقی کا ان عوامل سے ہرگز کوئی باہمی ربط (Co-relationship) نہیں)ـــــ ہمارے لئے اس احساس کمتری کی اہم ترین وجہ یہ ہے کہ یہ مرعوب معلم خود اپنی اسلامی تہذیب اور اپنے تابناک تاریخی پس منظر سے بے خبر ہے۔ بدقسمتی سے یہی بے خبری طلبہ کو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بلاشبہ آج کے دور میں ہم کسی جغرافیائی کیپسول میں مقید نہیں رہ سکتے۔ ہم لازماً علم و فن کی دنیا میں دوسروں کا اثر قبول کرتے ہیں' لیکن ایک بات واضح رہنی چاہئے کہ علوم کا غالب اور تنقیدی ذہن سے مطالعہ کرنا اور معنی رکھتا ہے اور مغلوب ذہن کے ساتھ اورـــــ اس موضوع سے متعلق عالم اسلام کے معروف دانشور مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور تنبیہہ کی ہے کہ:

> اگر مغربی تہذیب اور اس کے وسائل و ثمرات سے استفادہ باقاعدہ سوچی سمجھی اسکیم' بصیرت و تدبر' اور خیر و شر میں تمیز کی بنیاد پر نہ ہوا تو یہ تہذیب ملک کے رہنماؤں اور ارباب حل و عقد اور علماء دین کی مرضی اور خواہش کے خلاف اس ملک یا سوسائٹی پر جبراً قابض ہو جائے گی۔ عوام گرم جوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ادباء اور اہل فکر اس کے لئے راستہ صاف کریں گے اور خیر و شر اور مفید و مضر میں تمیز کئے بغیر اس ملک کے باشندے فاقہ زدوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں گے' ساری اخلاقی و دینی قدریں اس کے ساتھ فنا ہو جائیں گی' ملک کے رہنما اور ذمہ دار سیاست داں اس صورت حال کے سامنے بے دست و پا اور

> مفلوج نظر آئیں گے اور ان کے ہاتھ سے زمام قیادت ہمیشہ کے لئے نکل چکی ہوگی۔ (ص ص 29-28)۔

اسی تناظر میں پروفیسر سید محمد سلیم نے ٹھیک کہا ہے کہ "غیر قوموں کی شاگردی اختیار کرنے میں تو کوئی عیب کی بات نہیں، لیکن غلامی اور نقالی ہمارا شیوہ نہیں۔ ہمیں تو اپنی عقل اور اپنے علم کی کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھنا ہوگا۔ اس کا غلط اور صحیح معلوم کرنا ہوگا۔ تنقید و تحقیق سے یہ جاننا ہوگا کہ کس قدر حصہ صحیح ہے اور کس قدر باطل کی آمیزش ہے۔" (ہمارا نظام تعلیم: تاثرات و تجاویز، ص 15)۔ اسی حوالے سے "علم التعلیم" کے استاد جناب مشتاق احمد گوراہا نے اپنے ایک مضمون "زندہ تعلیم" میں پاکستان کے نظام تعلیم کا بڑی خوبصورتی سے تجزیہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ معلومات تو رکھتے ہیں اور اپنے لیکچرز میں افلاطون سے لے کر رسل ــــ اور کنفیوشس سے چل کر جان ڈیوی تک کے حوالے بھی دے ڈالتے ہیں۔ لیکن نہ علم میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہمارے طلبہ و اساتذہ، علمی جمود، انفعالیت اور خوئے غلامی سے نکل پاتے ہیں۔ پروفیسر گوراہا اپنے مخصوص ادبی اسلوب میں، تعلیم و تعلم سے وابستہ افراد کے غور و فکر کے لئے یہ اساسی سوال اٹھاتے ہیں کہ:

> ــــ آج ذرا سوچئے تو سہی، یہ سارے کا سارا قافلہ کہاں لٹ گیا؟ آخر کیا بات ہے کہ نیلگوں آسمان پر پرواز کرنے والے عقاب، بیاباں کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں سایہ گیر ہوگئے؟ کیا ان سب کی قوت پرواز جواب دے چکی ہے۔
>
> ہمہ بے بال و پر گشتند چوں موران دانہ چیں!
> چہ شد آخر کہ یک مرغ سلیماں نے نمی بینم
>
> (اکبر منیر)
>
> (مجلہ تعلیم و تحقیق لاہور، 1966، ص 36)

معروف دانش ور، ادیب، شاعر اور تنقید نگار سلیم احمد نے اس کی اہم وجہ مغرب کے ہاتھوں مشرق کی سیاسی محکومیت اور ذہنی غلامی کو ٹھہرایا۔ لیکن اس "شکست" سے پہلے مغرب نے مشرق کو ثقافتی محاذ پر مرعوب و محکوم کیا۔ سلیم احمد نے اپنی اہم ترین نظم "مشرق ہار گیا" میں اپنے کرب کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ شدید احساس درد اور طنزیہ اسلوب میں یہ کہتا ہے کہ ہرچند کہ وہ "ہار گیا ہے" لیکن وہ پر امید ہے اور ہارنا نہیں چاہتا۔ اس کا یہ نقطہ نظر ہے کہ [illegible] کو مدلل کرنے کا [illegible] سوائے اپنی تاریخ کے اپنے [illegible] شعور کے

احساس اور اپنے کھوئے ہوؤں کی آرزو کے اور کچھ نہیں ــــــ اس نظم کا ہرچند کہ ایک مخصوص پس منظر ہے جب 1970ء کے انتخابات میں مغربی اور مشرقی پاکستان میں اسلامی تہذیب کی حامی جماعتوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی دلدادہ جماعتوں کو بوجوہ کامیابی حاصل ہوئی۔ جس کے نتیجے میں سقوط ڈھاکہ کا المیہ پیش آیا ــــــ لیکن بحیثیت مجموعی یہ پوری مسلم دنیا کا المیہ ہے کہ اس نے تنقیدی شعور کے بغیر ہر شعبہ زندگی میں مغرب کی نقالی کی اور اس طرح ان ممالک میں اس وقت استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر بالعموم لادین قوتیں برسراقتدار آئیں اور یوں بغیر کسی موثر مزاحمت کے مغربی تہذیب کا لقمہ تر بنتی چلی گئیں۔ سلیم احمد کی نظم "مشرق ہار گیا" ان ہی المیوں کا عکس ہے۔ ★

حقیقت میں اس شکست و ریخت کی ایک اہم وجہ فکری اور سیاسی محکومیت ہے۔ مغرب کو تو کوشش کرنا ہی ہے کہ ہم اس کے غلام بنیں، لیکن بدقسمتی سے اس وقت صورت حال اور گھمبیر ہو جاتی ہے جب ہم خود اس "قفس" کی طرف لپکتے ہیں اور "قیدی" ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس طرح کی غلامی کی صورت حال میں مسلمان مشرق کا ہو یا مغرب کا، ہارنا اس کا مقدر ہے ــــــ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی شہرہ آفاق کتاب "تنقیحات" میں لکھتے ہیں:

> مسلمان آج کل اس دوہری غلامی میں مبتلا ہیں۔ کہیں دونوں قسم کی غلامیاں پوری طرح مسلط ہیں اور کہیں سیاسی غلامی کم اور ذہنی غلامی زیادہ

★ سلیم احمد کی نظم "مشرق ہار گیا" سے چند حصے:

○

کپلنگ نے کہا تھا
مشرق مشرق ہے
اور مغرب مغرب ہے
اور دونوں کا ملنا ناممکن ہے لیکن مغرب،
مشرق کے گھر، آنگن میں آ پہنچا ہے۔
میرے بچوں کے کپڑے لندن سے آتے ہیں
میرا نوکر بی بی سی سے خبریں سنتا ہے
میں بیدل اور حافظ کے بجائے
شیکسپیئر اور رلکے کی باتیں کرتا ہوں۔

○

اخباروں میں مغرب کے چکلوں کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں۔
مجھ کو چٹی داڑھی والے اکبر کی کھسیانی ہنسی پر رحم آتا ہے۔
اقبال کی باتیں (گستاخی ہوتی ہے) ---- مجذوب کی بڑ ہیں۔
---- وارث شاہ اور بلھے شاہ اور بابا فرید
چلئے جانے دیجئے ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔

○

میں ہار گیا ہوں
میں نے اپنے گھر کی دیواروں پر لکھا ہے۔ میں ہار گیا ہوں
میری روح کے اندر ایک ایسا گہرا زخم لگا ہے
جس کے بھرنے کے لئے صدیاں بھی ناکافی ہیں
میں اپنے بچے اور کتے دونوں کو چپ کرتا ہوں۔ "میں ہار گیا ہوں"

○

ہے۔ بدقسمتی سے اس وقت کوئی اسلامی آبادی ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں سیاسی اور ذہنی اعتبار سے پوری طرح آزاد ہو۔ جہاں ان کو سیاسی استقلال اور خود اختیاری حاصل بھی ہے' وہاں وہ ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہے۔ ان کے مدرسے' ان کے دفتر' ان کے بازار' ان کی انجمنیں' ان کے گھر' حتیٰ کہ ان کے جسم تک اپنی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ ان پر مغرب کی تہذیب' مغرب کے افکار' مغرب کے علوم و فنون حکمران ہیں۔ وہ مغرب کے دماغ سے سوچتے ہیں۔ مغرب کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ مغرب کی بنائی ہوئی راہوں پر چلتے ہیں۔ خواہ ان کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو' بہرصورت یہ مفروضہ ان کے دماغوں پر مسلط ہے کہ حق وہ ہے جس کو مغرب حق سمجھتا ہے اور باطل وہ ہے جس کو مغرب نے باطل قرار دیا ہے۔ حق' صداقت' تہذیب' اخلاق' انسانیت' شائستگی' ہر ایک کا معیار ان کے نزدیک وہی ہے جو مغرب نے مقرر کر رکھا ہے' اپنے دین و ایمان' اپنے افکار و تخیلات' اپنی تہذیب و شائستگی' اپنے اخلاق و آداب' سب کو اسی معیار پر جانچتے ہیں۔ (ص ص 8-7)۔

سید مودودیؒ مزید واضح کرتے ہیں کہ "جو چیز اس معیار پر پوری اترتی ہے وہ اسے درست سمجھتے ہیں' مطمئن ہوتے ہیں' فخر کرتے ہیں کہ ہماری فلاں چیز مغرب کے معیار پر پوری اتر آئی اور جو چیز اس معیار پر پوری نہیں اترتی اسے شعوری یا غیر شعوری طور پر غلط مان لیتے ہیں۔ کوئی علانیہ اس کو ٹھکرا دیتا ہے۔ کوئی دل میں گھٹتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر اسے مغربی معیار کے مطابق کردے۔۔۔۔ جب ہماری آزاد قوموں کا حال یہ ہے تو جو مسلمان قومیں مغربی اقوام کی محکوم ہیں' ان کی ذہنی غلامی کا کیا پوچھنا"۔ (ص 8)۔

محترمہ مریم جملہ' اس دوہری غلامی میں مبتلا "ماڈرن" مسلمانوں کے بارے میں لکھتی ہیں کہ ان کا معیار رد و قبول بس وہی ہے' جس کی سند یورپ دیتا ہے۔ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر یورپ کی فکر کو ہی مسلمہ سمجھتا ہے اور اس طرح اپنی جو چیز اس کے مطابق نہیں سمجھتا' اسے رد کر دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"---- Although a Muslim by name, "Modernist" passes judgement upon Islam solely on the basis of those ideals Imported from Europe which he conciously or unconciously assumes are superior. Any thing of the former found incompatiable with the latter must be discarded." (Islam and Modernism, p.25).

اس انحطاط اور غلامی کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں' لیکن ایک اہم وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ نے فکری اجتہاد اور علمی تحقیق کے میدان میں امامت کا منصب کھودیا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ وہ حاکم قوموں کے نظریات کی مقلد اور غلام ہوتی چلی گئی۔ ہر چند کہ دور حاضر میں احیاء اسلام کی تحریکوں بالخصوص برصغیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور عرب میں حسن البنا شہید کی رہنمائی میں عظیم فکری' تحقیقی اور تحریکی کام ہوا اور بلاشبہ اس کام کے اثرات کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے' لیکن بحیثیت مجموعی عالم اسلام اپنے مغرب پرست اور سیکولر حکمرانوں اور سیاست دانوں کی وجہ سے تہذیبی انحطاط کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ادھر پاکستان میں ہمیں جو نظام تعلیم ورثے میں ملا وہ برطانوی استعمار کی پیداوار تھا۔ پھر آزادی کے بعد امریکہ' یورپ اور روس نے اپنی سیاسی' معاشی اور ثقافتی تناظر میں اس کی مزید آبیاری کی۔ اس طرح استعمار کے ان سب نمائندوں نے مل کر ہمیں ہر میدان میں غلامانہ ذہنیت کا مالک بنا دیا اور یوں ہم مطالعہ و تحقیق اور تخلیق و اجتہاد کی صلاحیتوں سے بہت حد تک محروم ہوتے چلے گئے۔ نتیجتہً ہماری تعلیمی کاوشیں جمود کا شکار ہوتی چلی گئیں اور ہمیں تدریجاً عالمی سیادت کے رتبہ (Status) سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس صورت حال سے' اس وقت کی "سپر امپیریل پاور" امریکہ بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے بقیہ دنیا بالخصوص امت مسلمہ کو ثقافتی محاذ پر شکست دینے کے لئے اپنے سارے ذرائع داؤ پر لگا دیئے ہیں اور اس طرح ہم اس کی غلامی کے شکنجے میں کستے چلے جا رہے ہیں۔ گو احیاء اسلام کی تحریک سے وابستہ افراد کی طرف سے اس رجحان کی شدید مزاحمت بھی ہے' لیکن بالعموم حکمرانوں' کھاتے پیتے لبرل گھرانوں اور دین کا صحیح تصور نہ رکھنے والے طبقے' میں مغرب کا یہ ثقافتی استعمار جڑ پکڑ رہا ہے۔ اس کا مقابلہ جب تک قومی اور ملی سطح پر نہیں ہوگا مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے۔

مغربی تہذیب کے لقمہ تر ہونے اور ان کے جذبہ استکبار کے حوالے سے امریکہ کے نام نہاد نئے عالمی نظام (New World Order) کی "قیصریت" "معاشی و ثقافتی قوم پرستی" اور امریکی "عالمی بالادستی" (Pax Americana) کی پالیسی بھی درحقیقت بنیادی طور پر پس ماندہ اقوام بالخصوص عالم اسلام کے خلاف ہے۔ کیونکہ امریکہ کو علم ہے کہ تمام تر انسانی اور مادی وسائل' تیل کی دولت اور وسیع رقبہ مسلمانوں کے پاس ہونے کے باوجود زراعت' تجارت' صنعت و حرفت' تعلیم' سائنس' ٹیکنالوجی اور صحت کے شعبوں میں پس ماندہ ہے۔ لہٰذا پس ماندہ قوم کو اپنے "نئے عالمی نظام" کے شکنجے میں کسنا ان کے نزدیک کوئی مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ اور کئی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ وہ ان کی اقتصادی' حربی اور فنی صلاحیتیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس معاملے میں صرف اکیلا امریکہ ہی نہیں بلکہ وہ اپنی نئی حلیف قوت روس سے

مل کر اپنی مشترکہ فورس کو اسلامی دنیا کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جناب حکیم محمد سعید نے اپنے سفرنامہ "درون روس: دید و شنید" میں بڑا واضح انتباہ کیا ہے:

> روس اور امریکہ کی باہم گفت و شنید حد درجہ حامل اہمیت ہوتی جا رہی ہے۔ بالخصوص عالم اسلام کے تناظر میں اس کی زبردست اہمیت ہے۔ میری رائے کے مطابق روس اور امریکہ پوری قطعیت کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں اور اس پر متفق ہیں کہ عالم اسلام کو دبائے رکھا جائے اور کم از کم آنے والے پچاس سال تک ان کو مفلوج رکھا جائے۔ میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ عالم اسلام نے اس نہایت خطرناک فکر کا کاملاً ادراک نہیں کیا ہے اور وہ اپنے دفاع کی طرف سے غافل ہے۔
> (ص-177)۔

فی الواقعہ یہ امت مسلمہ کا المیہ ہے کہ وہ نہ صرف اتحاد اور جذبہ اخوت سے محروم ہے بلکہ الٹا کئی مسلم ممالک ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اسلامی کانفرنس کی تنظیم (OIC)' موتمر عالم اسلامی' عرب لیگ' آر سی ڈی' خلیجی تعاون کونسل' رابطہ عالم اسلامی اور مسلم دنیا کی اسلامی تحریکوں کا اب یہ کام ہے کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں اور کوئی لائحہ عمل مرتب کریں۔ خاص طور پر امت مسلمہ کے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کے حوالے سے۔ کیونکہ اسلامی فکر اور منفرد تہذیبی تشخص کے احیاء کے لئے بہترین پلیٹ فارم تعلیمی اداروں کا ہی ہوتا ہے۔

اصل میں استعماری قوتیں اپنا یہ قومی فریضہ سمجھتی ہیں کہ دوسری قوموں کو غلام بنانے کے لئے وہ کس طرح اپنے نظام تعلیم سے کام لیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رحیم بخش شاہین کا یہ جائزہ بڑا جاندار ہے کہ:

> استعماری طاقتوں کا ہمیشہ سے یہی طریق کار رہا ہے کہ وہ محکوم اقوام کو دائمی غلامی اور محکومی کے شکنجے میں جکڑنے کے لئے تلوار کے ساتھ ساتھ نظام تعلیم سے بھی کام لیتی ہیں۔ تلوار صرف میدان جنگ میں فتح دیتی ہے۔ جبکہ تعلیم شہروں کے گلی کوچوں اور گھروں میں فاتح قوم کے غلبہ کا ذریعہ بنتی ہے۔۔۔۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ غلام قوموں کا پڑھا لکھا طبقہ' علم و دانش کے میدان میں سامراجی طاقتوں کے عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ غلام قوموں کے شعراء' حکماء اور علماء ان ہی مقاصد کی تبلیغ کرنے لگتے ہیں۔ جو سامراجی قوتوں کے پیش نظر ہوتے

ہیں۔ (ماہنامہ تعلیمات لاہور' ستمبر 1987ء ص 28)۔

حقیقت میں آج' استعمار کا چاہے کوئی سا بھی انداز ہو' ہمیں جرأت سے اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمارے نزدیک یہ میدان جنگ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اگر اس کے تدارک کے لئے کوئی نتیجہ خیز کوشش نہ کی گئی تو اس ثقافتی جنگ سے بچنا خاصا مشکل ہوگا۔ آج مغرب اپنے معاشی' سیاسی اور جغرافیائی مقاصد کے تحت مختلف ممالک میں اپنا اثر و نفوذ قائم رکھنے کے لئے مختلف سیاسی اور معاشی طریقوں سے کوشاں ہے' لیکن مغربی ثقافت کے اثر و نفوذ کا ایک اور نمائندہ (Agent) بھی ہے۔ جو ہے تو کسی حد تک غیر مرئی' لیکن ہے بڑا موثر' اور وہ ہے "مغربی نظام تعلیم" جس کے تحت اس کے سکول' کالج' یونیورسٹیاں' اپنے فلسفہ زندگی کی منتقلی کا کام کرتے ہیں' اور جس کا مرکز خیال (Nucleus of Thought) بے خدا نظریہ جمہوریت ہے۔★

اس نظریہ کی منتقلی کے لئے مغربی اساتذہ کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ علم و فن کے حوالے سے نہ صرف محنت کرتے ہیں بلکہ طلبہ اور وہ بھی خصوصیت سے غیر ملکی طلبہ کے لئے ایک اچھے سیلز مین کی طرح بے حد "خلیق" بھی ہوتے ہیں۔ ان کا یہی دوستانہ اور جمہوری طریق تدریس اکثر طلبہ کو اپنے معاشرتی' سیاسی' معاشی' تعلیمی اور ثقافتی طلسم میں لے آتا ہے۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کی اصل قوت جس سے وہ دنیا بھر میں ثقافتی حکمرانی کرتے ہیں' وہ ان کا افادی تاجرانہ فلسفہ اخلاق ہے۔ جس کی حوالے سے وہ مختلف طریقوں سے دوسرے ملکوں کے نظام تعلیم میں اپنی اقدار ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں ان کے اندروں کی تاریکی کا علم نہ ہوسکے۔۔۔۔ اصل میں اس وقت مغرب کی اگر کوئی اساسی قدر (Root Value) ہے تو وہ اس کا یہی میکانکی نظریہ اخلاق' اس کی محنت و مشقت' اس کی سائنسی ترقی اور اس کا مالی اور تمدنی استحکام ہے' جو اس کے وجود کو کسی نہ کسی طرح سنبھالے ہوئے ہے' ورنہ سماوی برکات سے محروم شاخ نازک پر مغرب کا یہ آشیانہ

★ خود امریکہ کے ممتاز فلسفی جارج سینٹایانا (George Santayana) جو بنیادی طور پر شاہانہ طرز حکومت کے خلاف تھا' لیکن تجربہ کے بعد اس نے جمہوری تصور کی بھی مخالفت کی۔ وہ دراصل ایک ایسے طرز سیاست کا قائل تھا' جو ان دونوں نظریات کے اچھے پہلوؤں کا امتزاج ہو۔ جہاں ایسے افراد کی حکمرانی ہو' جو قابلیت' حسن خدمت' حسن اخلاق' وقار اور عظمت انسان جیسی اقدار کے حامل ہوں۔ وہ بڑے طنز اور دکھ بھرے انداز میں کہتا ہے۔

"----But now that democracy has opened the great free for - all. catch-as -catch- can wrestling match of laissez faire industrialisin. Every soul is torn with climbing and no one knows content." (The Story of Philosophy p. 386)

کاش مغرب کے فلسفی' اسلام کا بھی مطالعہ کرتے' یا اسلامی تحریکیں ہی ان تک یہ دعوت پہنچاتیں کہ دنیا میں عدل اور احترام آدمیت کی بنیاد پر سیاسی نظام صرف اسلام کے پاس ہے' جو دین فطرت ہے اور جس کا خالق خدائے واحد ہے۔

اب زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔ پروفیسر سید محمد سلیم کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ مغرب کی خوش حالی سے کوئی یہ اندازہ نہ لگائے کہ اس کی وجہ اس کے بے خدا نظریات اور الٰہی ہدایت سے محروم اقدار ہیں۔ بلکہ اس محرومیت کی وجہ سے تو وہ تہذیبی لحاظ سے خود روبہ زوال ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے نزدیک مغرب کے تمدنی اور معاشرتی استحکام کی ایک وجہ درحقیقت وہ دولت ہے جو وہ صدیوں سے اہل مشرق سے لوٹ رہا ہے۔ سید صاحب کے مقالہ "مغربی تہذیب کی ترقی اساسی تصورات کی بنیاد پر نہیں ہوئی" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> یورپ میں جب دولت کی فراوانی ہوئی' معاشرہ میں استحکام اور تمدنی ترقی ہوئی تو یہ درحقیقت ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی لوٹ کھسوٹ کے بعد ہوا۔ قدیم متمدن ممالک میں افلاس اور معاشرتی عدم استحکام پیدا کرنے کے بعد ہوا۔ حکومتیں ان کی ختم کردیں۔ دولت ان کی سمیٹ لی۔ تہذیبی اور تمدنی ادارے ان کے تباہ کر دیئے۔ ذہنی غلامی میں جتلا کردیا۔ پرانے عقائد میں تزلزل پیدا کردیا۔ فکری اور اخلاقی انتشار و اختلال کو پروان چڑھایا۔ اس دور میں مغربی تہذیب کی برتری اور کامیابی کا تصور عام ہوگیا۔ صدیوں سے انفرادی خوش حالی' ذہنی و فکری ٹھہراؤ اور معاشرتی اور تمدنی استحکام کے باعث ان ممالک میں عمومی سطح پر سلیقہ' قرینہ' شائستگی اور انفرادی احترام نظر آتا ہے۔۔۔۔۔۔ وہ ان صفات کا رشتہ مغربی تہذیب کے اساسی تصورات سے جوڑ دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا رابطہ تین صدیوں کی خوش حالی اور تمدنی استحکام سے ہے جو اہل مشرق کی لوٹ کھسوٹ کے بعد قائم ہوا۔(ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور' دسمبر 1991ء ص 78)۔

مغرب اپنے اس مادی استحکام اور تمدنی ترقی کی وجہ سے اس زعم میں جتلا ہوگیا کہ دنیا بھر کی قیادت کا اہل بس وہی ہے لہٰذا سب کے لئے "پولیس مین" کا کردار بھی اسے ہی ادا کرنا ہے اور "معلم" کا بھی اسے ہی۔ حالانکہ جامعیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو زندگی کے مسائل صرف اقتصادی ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے بھی اہم ترین وہ تہذیبی' اخلاقی' روحانی' نفسیاتی اور عائلی مسائل ہوتے ہیں' جن پر قوموں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ ان حوالوں سے مغرب اب کھوکھلا ہوچکا ہے۔ اس کے باوجود محض اپنی مادی قوت کے بل بوتے پر اس نے جبراً دوسرے ممالک' خصوصیت سے عالم اسلام کو اپنے زیر اثر لانے کے لئے'

سب سے پہلے ان کے نظام تعلیم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ ان ممالک کے طلبہ' اساتذہ اور تعلیمی قائدین کے اندر اس احساس کو جاگزیں کیا گیا کہ ہر قدیم چیز شر ہے اور ہر جدید چیز خیر ہے۔ قدیم ہونا ذلت اور جدید ہونا ترقی کی علامت ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ادب' صحافت' ریڈیو' ٹی وی' فلم' سیاست' تعلیم' غرض ہر شعبہ میں خود اس ملک کے اندر سے ایسے "غلام" تیار کئے گئے جو ان اقدار کی اپنے "آقاؤں" سے بڑھ کر ترجمانی کرنے لگے۔ پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیمی نظام میں ان مضامین کی نفی کی جانے لگی جو مادی افادیت کے لحاظ سے غیر پیداواری (Un- productive) سمجھے گئے۔ چنانچہ اس کی زد میں سب سے پہلے دینی علوم آئے اور پھر عمرانی علوم کے وہ مضامین جن کا تعلق زندگی کے اساسی اور دائمی نوعیت کے مسائل سے تھا۔ مثلاً" اسلامیات' تاریخ' فلسفہ' ادب' عربی زبان اور دیگر نظریاتی مضامین کو بے وقعت سمجھا گیا اور اگر ان مضامین کو اہمیت دی بھی گئی تو ان کی تعبیر و توضیح مادی تناظر میں کی گئی نہ کہ اخلاقی حوالے سے——— ہمیں یہ تسلیم ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بلاشبہ اپنی ایک اہمیت ہے اور ہم اس ضمن میں تحقیق اور ترقی کے ہرگز خلاف نہیں۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کبھی زندگی کے معانی اور مقاصد نہیں دیتے' یہ تو ہم دین اور اس حوالے سے فلسفہ' تاریخ اور تعمیری ادب سے حاصل کرتے ہیں۔ اصل میں تعلیم جس کا اہم موضوع ہی انسان اور اس کی زندگی کے اصل معانی سے ہے' یہ بنیادی طور پر ایک روحانی مسئلہ ہے۔ اس کی نفی کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیمی اداروں سے فارغ ہونے والے طلبہ کی اچھی خاصی تعداد' بالعموم منتشر شخصیت کی حامل بنتی چلی جاتی ہے اور بالآخر مغرب اسے اپنے تہذیبی پھندے میں پھانسنے میں کامیاب ہو جاتا ہے——— جناب نعیم صدیقی نے مغربی تہذیب کے ان بنیادی عناصر ترکیبی کا جائزہ لیا ہے' جو تعلیمی تناظر میں ہمارے لئے اصل بیزاری کا سبب ہیں۔ ان عناصر میں ترک دین' خدا ناشناسی' الحاد' مادہ پرستی' افادی اخلاقیات' عقلی اور حسی علوم کی غلامی' وطنیت' نسلیت' جنسی بے راہ روی' آزاد اختلاط صنفین اور فاسد قسم کے تصورات مساوات مرد و زن اہمیت کے حامل ہیں۔ نعیم صدیقی' مغربی تہذیب کے اصل روپ سے باخبر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ----دوسری طرف مغربی تہذیب کا وہ منحوس بین الاقوامی کردار ہے جو امپیریلزم' نو آبادیات سازی' ملک گیری' سیاسی فوقیت کے لئے جنگ جوئی و خون ریزی اور اقتصادی نفع اندوزی کے لئے عیاری و فریب کاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔ آج اس کے کردار کا رنگ ذرا سا بدل گیا ہے مگر اس

کی روح اب بھی وہی ہے۔ تیسرا کارنامہ اس تہذیب کا یہ رہا ہے کہ اس کے علمبردار جہاں پہنچے انہوں نے قوتوں کی داخلی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ ان کے مذاہب کو متزلزل کردیا' ان کی اخلاقی اور قومی روایات کو اجاڑ دیا اور ان کے افراد کی سیرتوں کو طرح طرح کے گھن لگا دیئے۔ خصوصاً" مسلمانوں کے عالم افکار کی ویرانی' ان کے مذہب و اخلاق کی تخریب اور ان کے کردار کی تباہی بہت بڑے پیمانے پر اور بہت تیز رفتاری سے اسی تہذیب کے ہاتھوں ظاہر ہوئی۔(اقبال: مغربی مادیت اور سوشلزم' ص 8)۔

مسلمانوں کے عالم افکار کی اس خانہ ویرانی کا بیشتر کام بالعموم مغرب کا نظام تعلیم اور اس کے اساتذہ ہی سرانجام دے رہے ہیں۔ ان اساتذہ کو اپنے نظام تعلیم کی اس حکمت عملی لے مکمل آگہی ہے کہ دوسرے ممالک میں سیاسی غلبہ سے پہلے ثقافتی غلبہ ضروری ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک دوسرے ممالک نے اگر تہذیبی شکست کھالی تو سیاسی شکست ان کا مقدر ہوگی۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ہم امریکہ یا کسی اور مغربی ملک کی تعلیمی اداروں میں پڑھائے گئے علم و فن کے کلیتہً نہ خلاف ہیں نہ خائف۔ ہمیں تو ان کے نظام تعلیم میں جو چیزیں اسلام کے مزاج کے مطابق ہیں' انہیں اخذ کر لینے میں کوئی تعرض نہیں۔ البتہ ہمارے اساتذہ اور ہمارے طلبہ کے لئے اصل چیز تو اسلام کے مزاج کا صحیح ادراک ہے اور یہی ہمارے لئے مستقل معیار رد و قبول ہے۔ اس بات کا شعور جتنا جلد امت مسلمہ' بالخصوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ہوگا' اتنا ہی امت کے حق میں بہتر ہوگا کیونکہ امریکہ اور بعض دیگر مغربی ممالک کو اگر اصل تہذیبی خطرہ ہے تو احیاء اسلام کی ان تحریکوں سے ہے جو اسلام کو بحیثیت دین نافذ کرنے کے لئے منظم جدوجہد کررہی ہیں۔

انگریزی زبان: مغربی ثقافتی استعماریت کا اہم ذریعہ

اس ضمن میں یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ مغربی یا امریکی ثقافتی غلبہ کا ایک اہم ترین ذریعہ انگریزی زبان ہے۔ بلاشبہ عالمی معلومات کی فراہمی اور سائنسی ترقی کے تناظر میں اس زبان کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ مثلاً" اس وقت پوری دنیا میں کمپیوٹر پروگرام' میڈیکل سائنس' خلائی ٹیکنالوجی' انٹرنیشنل بزنس' ڈپلومیسی' سائنس' ٹیکنالوجی' ریسرچ' انفارمیشن ٹیکنالوجی اور کمیونی کیشن کی زبان زیادہ تر انگریزی ہے۔ اس حد تک اس زبان کے سیکھنے اور اس کے حوالے سے سائنسی تعلیم کے حصول میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اس [illegible] نہیں رہنا چاہئے کہ ہر قوم کی زبان' اس کی تہذیب کی ترجمان ہوتی

ہے۔ ہمیں یہ عمرانی اصول بھی ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ کسی ثقافت کے قلب و روح تک پہنچنے کے لئے زبان ہی سب سے بڑا وسیلہ ہوتی ہے۔ اگر ہم انگریزی زبان کو بحیثیت کل اپنائیں گے تو اس کے مضمرات بڑے واضح ہیں۔ یعنی ان ممالک کا کلچر جن کی زبان انگریزی ہے' وہ ہمارے ہاں غلبہ حاصل کرے گا۔ مغرب بالخصوص امریکہ درحقیقت غیر ضروری طور پر بلکہ جارحانہ انداز میں اپنی لسانی اور ثقافتی حکمرانی ہم پر ٹھونسنا چاہتا ہے۔ ہمیں اس کی بھرپور مزاحمت کرنی ہے۔ ہمیں پاکستان میں بغیر کسی توقف کے اپنی زبانوں عربی' فارسی اور اردو کی طرف لوٹ جانا چاہئے۔ اسی میں ہماری خیر ہے اور اسی میں عافیت۔ البتہ اس میں کوئی استثناء نہیں ہونا چاہئے کہ چند طبقات کو تو انگریزی ذریعہ تعلیم' انگریزی زبان کی بالادستی' اور مغرب کی تعلیمی اداروں سے نصابی اور امتحانی الحاق کی کھلی اجازت ہو اور باقی طبقات کے لئے اردو یا کسی علاقائی زبان کے لئے پند و نصائح کئے جائیں۔ ★ ہمیں اس حوالے سے کلی تغیر لانا ہوگا اور ہر ادارہ میں چاہے وہ سول ادارہ ہو یا ملٹری کا' وہاں قومی زبان کے ساتھ ساتھ یکساں نصاب تعلیم بھی نافذ کرنا ہوگا۔ غیر ملکی منفی ثقافتی اثرات کا یقینا یہ ایک بہت بڑا توڑ ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارے لئے سٹلائیٹ ڈشز کے اس دور میں غیر اسلامی لائف سٹائل اور انگریزی زبان و ادب کے اثرات سے بچنا خاصا مشکل ہے لیکن ہمیں اس کا تدارک ضرور کرنا ہوگا۔ ہمارے ہاں جہاں برطانوی بالادستی (Pax-Britanica) اور جاگیرداری نظام کی وجہ سے طبقہ واریت پہلے ہی سے موجود ہے' وہاں انگریزی زبان کی بالادستی اور موجودہ مغربی تہذیبی حملہ نے اور بھیانک صورت پیدا کردی ہے۔ بدقسمتی سے سرکاری سطح پر اور بعض پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے شہری نوجوانوں کی ثقافتی زبان یا تو انگریزی بن رہی ہے یا "انگریزی' اردو یا علاقائی زبان کا ایک ملغوبہ"۔۔۔۔۔ اس طرح نام نہاد سٹیٹس سمبل کے طور پر جہاں سلام و دعا کے جملے انگریزی زبان میں ہوتے ہیں وہاں ٹی شرٹس' جینز کی پینٹوں' بیگز' حتیٰ کہ شاپنگ بیگز' سکول بیگز اور نوٹ بکس یا کاپیوں پر بھی مغربی "سلوگنز" یا

★ بیرونی تعلیمی اداروں سے الحاق (Affiliation) کی تعلیمی پالیسی کی وجہ سے' ہمارے اکثر انگلش میڈیم تعلیمی ادارے ایسے ہیں جہاں مغربی ممالک خصوصاً" امریکہ اور برطانیہ کے تعلیمی اداروں کی درسی کتب اور دیگر نصابی سرگرمیاں رائج ہیں۔ یہ نصابی سرگرمیاں کس طرح کی ثقافت' ذہنی مرعوبیت اور تہذیبی غلامی' پاکستانی اساتذہ اور طلبہ میں منتقل کر رہی ہیں' اس کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ الگ موضوع ہے۔ ویسے اس موضوع سے متعلق' جناب عزیز احمد مرزا کا فکر انگیز مقالہ اور اس پر جناب نعیم صدیقی کے تفصیلی اشارات' ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں۔ البتہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس موضوع کے حوالے سے تفصیلی مطالعہ کوئی تعلیمی و تحقیقی ادارہ ہی کرے۔

کارٹون چھپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کالج یونیورسٹی سطح پر بعض طلبہ کے فولڈرز پر رومانوی تصویروں کی نمائش کا بڑے ذوق و شوق سے اہتمام ہوتا ہے۔ یوں ہماری نوجوان نسل چلتی پھرتی' مغرب کی وکالت اور سفارت کاری کا "فریضہ" سرانجام دیتی رہتی ہے۔ یہ تصاویر' مزاحیہ جملے' کارٹون' بیجز' بظاہر بے ضرر محسوس ہوتے ہیں لیکن یہ مغربی ثقافتی نفوذ کا بڑا کامیاب وسیلہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً" سکول کاپیوں کے ٹائیٹلوں پر کسی زمانے میں "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" یا "تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا" یا "چاند تاروں میں تو مرغزاروں میں تو اے خدایا" والی نظمیں چھاپی جاتی تھیں' لیکن اب اس کی جگہ بعض پبلشرز' بروس لی' Ninja ' Knight Rider ' Donald Duck ' Micky Mouse Turtle اور Bugs Bunny کی تصویریں یا کارٹون چھاپتے ہیں۔ اسی طرح ٹی شرٹس پر چھپا ہوا یہ جملہ "I feel Coca-Cola" یا قمیصوں' بیٹوں پر دیگر بے معنی یا ذومعنی رومانوی جملے یا تصاویر یا کارٹون یا بچوں کے بستوں یا جیکٹوں یا لیڈیز پرسوں (Purses) پر چھپے ہوئے تاریخ پیدائش کی مناسبت سے سیاروں یا برجوں کے نشان یا "Us Army ' Navy 'Air Force" کے بیجز یا بعض گاڑیوں پر لڑائی مارکٹائی کی علامت ننجا کے سٹکرز۔۔۔۔ ہماری ذہنی "غلامی" کا چلتا پھرتا اشتہار بن جاتے ہیں۔ ویسے اب اس کی مزاحمت میں بھی کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ اب بعض بچے اور نوجوان ایسے نظر آتے ہیں جن کی قمیصوں یا جیکٹوں پر اس طرح کے سلوگنز یا بیجز نظر آتے ہیں مثلاً" اللہ اکبر' رہبرو رہنما مصطفیٰؐ۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ اسلامی انقلاب' الجہاد و الجہاد۔ پاکستان زندہ باد۔ اقبال زندہ باد۔ قائداعظم زندہ باد۔ پاک فوج زندہ باد۔ اسلام ہمارا دین ہے' شہادت ہماری آرزو ہے۔ کشمیر ہمارا ہے۔ استعمار مردہ باد۔ We Love Pakistan - Be Pakistani Buy Pakistani وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔ لیکن ناجائز دولت اور عوام سے لوٹی ہوئی کمائی والے افراد اور ان کی اولادیں' لبرل صحافت' شوبز لٹریچر اور بحیثیت مجموعی سیکولر حکمران طبقہ۔۔۔۔ صحیح احتساب کے فقدان اور شریعت اسلامیہ سے روگردانی کی وجہ سے کھلم کھلا اور بلا خوف اپنی "سیادت" عوام پر مسلط کرتا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن (Television)' سیر و سیاحت (Travel) اور تجارت (Trade) کے ذریعے مغربی طرز زندگی کو فی الفور اپنا لیتا ہے۔ اگر یہ طبقہ اس "مغربیت" کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا تو خرابی کے باوجود شاید اتنی "ہلاکت" نہ ہوتی جتنی وہ اپنی دھونس اور اپنی سیاسی و ابلاغی قوت سے اس مغربی مرعوبیت کو گھر گھر منتقل کرنے سے لاتا ہے (ویسے سوشیالوجی اور سائیکالوجی کے حوالے سے یہ ایک اہم تحقیق [illegible] سکتا ہے کہ صرف ٹیلی ویژن کے بعض لبرل ڈراموں اور اشتہارات نے

ہمارے غریب اور متوسط طبقے کے افراد بالخصوص نئی نسل پر کیا معاشرتی اور نفسیاتی اثرات مرتب کئے ہیں۔ نیز ان پروگراموں میں پیش کی گئی امارت' ثقافت اور ان ڈراموں کے کرداروں نے بچوں بڑوں میں کن ذہنی اور روحانی عوارض کو جنم دیا ہے)۔

بہرحال تعلیم کی حد تک ہمیں اپنے ملی و قومی شعور اور اپنی تہذیبی وابستگی کو طلبہ کے اذہان و قلوب میں جاگزیں کرنے کے لئے سخت محنت کرنا ہوگی۔ بلکہ فوری طور پر مغربی ثقافت کی مزاحمت اور اپنے ثقافتی ورثے کے تحفظ کے لئے اپنی منفرد اسلامی قومیت اور ثقافتی شناخت جس کی اساس اسلامی اقدار و روایات ہوں' کو بروئے کار لانا ہوگا۔ ہمیں مغربی ثقافتی اثرات' مادی ترغیبات اور اس کے پورے لائف سٹائل سے قطع تعلق کرنا ہوگا۔ ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں غیر طبقاتی تعلیم' یکساں نصاب' قومی زبان کے فروغ اور یکساں سہولیات کا انتظام کرنا ہوگا۔ اسی طرح فوری طور پر مخلوط تعلیم کا خاتمہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ اسلامی ثقافت کے احیاء کی راہ میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

پھر اردو جو برصغیر کے کسی مخصوص علاقے یا کسی مخصوص نسل کی زبان نہیں بلکہ یہ بنیادی طور پر تہذیبی زبان ہے اور جو اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے سبب پاکستان میں زبان مشترک (Lingua Franca) کی حیثیت رکھتی ہے' اس کی بالادستی کے ساتھ ساتھ ایک اور اصولی فیصلہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ ذرائع ابلاغ کو وزارت تعلیم سے وابستہ کیا جائے اور پھر ان سب قوتوں کو اسلامی نظام زندگی کی تشکیل کے لئے وقف کیا جائے۔ اصل میں ملی اور قومی زبانوں کی ترقی' ملی شعور' متعین راہ عمل' انفرادی اور اجتماعی زندگی کی وحدت' مادی اور صنعتی ترقی' اخلاقی قوت کا استحکام' خود اعتمادی' خود انحصاری' اخروی شعور اور دیگر تعلیمات و متقضیات جو قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ میں متعین ہیں' وہی ہمارے نظام تعلیم کے لئے وہ اہم ترین محرک قوتیں ہیں جو ہمیں اخلاقی حوالے سے معیار انسانیت بھی دیتی ہیں اور جائز مادی ضرورتوں کے حوالے سے معیار زندگی بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ ہمیں پوری انسانیت کی قائد بناتی ہیں۔ اس قوت کے بغیر نئی نسل کو عصر حاضر کے اس مغربی ثقافتی فریب حسن (Cultural Glamour) سے بچانا مشکل ہوگا۔ اور اگر اس طلسم سے نکلنے کی کوئی سنجیدہ کوشش حکومت' عدلیہ' ادیبوں' صحافیوں' سیاست دانوں' ذرائع ابلاغ' مساجد کے اماموں اور خطیبوں' علماء' اساتذہ' طلبہ' افواج' بیوروکریسی' مزدوروں' کسانوں' تھانوں' صنعتی' تجارتی اور معاشرتی اداروں' غرض ہر پاکستانی کی طرف سے نہ کی گئی تو خدانخواستہ اس ملک کا نظریاتی وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ سقوط ڈھاکہ کی صورت میں ہمارے وجود پر پہلے ہی گہرا گھاؤ لگ چکا ہے۔ دشمن بھی تاک میں ہے۔ لہذا ہمیں ہر محاذ پر' مغرب کی تہذیبی اور لسانی یلغار

کا بھرپور اور موثر جواب دینا ہوگا۔

ان نکات کے علاوہ جو پچھلے صفحات میں زیر بحث آئے ہیں' مغربی تہذیب کے درج ذیل چند دیگر پہلو بھی ایسے ہیں جن پر تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے افراد کو غور و فکر کرنا ہوگا۔ ★

مغربی تہذیب کے چند دیگر منفی پہلو

مغربی ثقافت کے چند دیگر منفی پہلو ایسے ہیں' جن سے ہمیں بچنا ہوگا۔ کیونکہ جن ظاہری چیزوں سے ہم متاثر ہو رہے ہیں' اس کا منطقی نتیجہ وہی نکلے گا جس نے خود مغرب کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ مثلاً" امریکہ یا کسی بھی ترقی یافتہ سیکولر یا ملحد مغربی ملک کا خاندانی نظام تقریباً" تباہ ہو چکا ہے۔ حیوانی اباحیت اپنے عروج پر ہے۔ امریکہ میں تقریباً" 13 فیصد لڑکے لڑکیاں' باپ اور بھائیوں کی دراز دستیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تقریباً 65 فیصد کنواری لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں۔ اس طرح اچھی خاصی تعداد بن باپ کے ہے۔ عفت اور ممتا کی کوئی قیمت نہیں۔ مختار حسن کے بقول:

> مغرب کی اس شیطانی تہذیب کا طرہ امتیاز عورت کی بے قدری اور استحصال ہے جسے عورت کی آزادی کی پرفسوں اصطلاح میں چھپایا گیا ہے۔ مغرب کی اس شیطانی تہذیب کے آقا اپنی اس ثقافت کے بارے میں بہت حساس اور جارح ہیں اور اسے "لبرل ازم" کے خواب آور نظریے تلے کیموفلاج کرتے ہیں۔ اس شیطانی تہذیب کے ثقافتی پہلو کا یہ خاصا ہے کہ عریاں سے عریاں تر ہونا قابل رشک ہے۔ جتنا کوئی بے حجاب ہوگا اتنا ہی اس ثقافت کا لیڈنگ فرد اور ہراول شخصیت ہوگا۔ رحمانی تہذیب کے بالکل برعکس جہاں جتنا کوئی باحیا ہوگا' اتنا ہی اس تہذیب کا سرخیل ہوگا۔ (ماہنامہ بنیادی حقوق لاہور' دسمبر 1991ء ص 15)۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مغربی معاشرہ میں بچے بلوغت کے بعد والدین سے عام طور پر بے

★ ان نکات کی ترتیب میں ڈاکٹر محمد فاروق کی کتاب "پاکستان اکیسویں صدی کی جانب" سید ابوالحسن ندوی کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب "اسلام کا روشن مستقبل" اور پروفیسر سید محمد سلیم کی کتاب "مغربی تعلیم کی مخالفت کیوں؟" سے زیادہ تر استفادہ کیا گیا۔ نیز راقم کے بعض مشاہدات و تاثرات ہیں' جو اس نے پی ایچ ڈی کی تعلیم کے حوالے سے امریکہ میں قیام (78-1977) کے دوران

تعلق ہو جاتے ہیں۔ شرح طلاق بڑھ گئی ہے۔ ہر فرد تنہا تنہا سا ہے۔ مغربی معاشرہ پریشان افراد کا ایک مجموعہ (Lonely Crowd) ہے جس میں ہر شخص کی ایک بڑی بیماری کرب تنہائی ہے۔ پروفیسر ممتاز محی الدین غوری نے اپنے منفرد انداز میں اپنے ایک مقالہ میں مغرب کی فکری غلامی سے متعلق مختصر لیکن بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے برونو بٹیل ہین (Bruno Bettelhein) کی کتاب "Informed Heart" (دل آگاہ) کا حوالہ دیا ہے جس میں برونو اپنے کرب کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

> ہم بہت جلدی میں ہیں کہ خلاء میں پیغام بھجوا اور وصول کرسکیں' لیکن ہمارے دن اتنے پریشانی' ہیجانی اور طوفانی مصروفیات کا شکار ہیں کہ اپنے گرد کے انسان کے لئے کوئی پیغام نہیں رکھتے۔(مسئلہ کیا ہے؟ ص 3)۔

مغرب کا ایک اور معاشرتی مسئلہ یہ ہے کہ وہاں فحاشی و عریانی عروج پر ہے۔ انفرادی اور جنسی آزادی نے پاکیزہ زندگی کا تصور ناپید کر دیا ہے۔ ہر شخص طبعی اور حیاتیاتی جبلتوں کا غلام ہے۔ جنسی بیماریاں' نسلی فسادات' دہشت گردی' ایٹمی دھماکوں اور زہریلی گیسوں نے ماحول پر بڑے منفی اور غیر صحت مند اثرات مرتب کئے ہیں۔ معروف نقاد' ادیب اور مفکر ڈاکٹر احمد سجاد نے مستقبل کے بھیانک خطرات کے حوالے سے یہ واضح کیا ہے کہ مغرب میں ٹیکنالوجی کے ذریعے بلاشبہ بعض پیداواری ضرورتوں کے لئے مصنوعی بیکٹیریا پیدا کئے جا رہے ہیں۔ لیکن ان جرثوموں سے نئی نئی قسم کی لاعلاج بیماریاں بھی پیدا ہو رہی ہیں مثلاً" ڈینگو بخار اور ایڈز کی نئی پیچیدہ صورتیں۔ اس کے علاوہ مستقبل میں کیمیائی بموں کی طرح نئی حیاتی اور وبائی امراض کی لڑائیوں کا خطرہ سر پر آچکا ہے۔ پھر اس وقت خاص طور پر امریکہ اور یورپ میں شراب نوشی نے معاشرتی اور عائلی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ایڈز اور دوسری بیماریوں نے ان کی جنسی اکتاہٹ (Sexual Frustration) میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ ہر فرد اپنی لذت پرستی میں مبتلا ہے۔ چاہے اس کی صورت کوئی سی بھی ہو۔ عورتوں اور بچوں کی مارپیٹ کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ مثلاً" امریکہ میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے گھرانوں کی ہے جہاں منشیات اور دیگر جسمانی اور روحانی بیماریوں کی وجہ سے عائلی زندگی تقریباً" تباہ ہو چکی ہے۔ شادی سے قبل "جنسی تجربات" بالآخر رنگ لاتے ہیں اور یوں یا تو نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے اور اگر ایسی صورت نہیں تو ان گھروں کی زندگی انتہائی اجیرن ہوتی ہے۔ خاوند اپنی بیویوں کو پیٹتے ہیں اور جہاں بیوی کا بس چلتا ہے وہ اپنے خاوندوں کو پیٹتی ہیں۔ اس طرح مارپیٹ سے دوچار خاندان (Battered Families) اور پھر ان کی آل اولاد جس کرب اور اذیت میں زندگی بسر کرتی ہے' وہ خود ایک الگ موضوع ہے۔ چنانچہ

ہزارہا میاں بیوی ایسے ہیں جن کی زندگی بس ایک روٹین ہوتی ہے' اور ان میں کوئی پاکیزہ محبت یا حقیقی چاہت (Fascination) نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔

تعلیمی نقطہ نظر سے ایک اور اہم مسئلہ ان بھگوڑے بچوں (Runaway Children) کا ہے جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار خاندان یا سوتیلے ماں باپ کے غیر اخلاقی رویوں کی بنا پر گھروں سے بھاگ جاتے ہیں اور پھر مناسب دیکھ بھال اور تعلیم نہ ہونے کی بنا پر عادی مجرموں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ اگر اس مسئلہ کا جائزہ لیا جائے تو ایک اہم نکتہ یہ سامنے آتا ہے کہ مغرب کی اکثر معاشرتی بیماریوں کی اصل وجہ الکحل کا استعمال اور جنسی بے راہ روی ہے۔ سید قطب شہید کی رائے میں کتنا وزن ہے کہ وہ معاشرے جن کے تعلقات میں حیوانی اخلاق' حیوانی جذبات اور حیوانی قدریں کار فرما ہوں' وہ کبھی مہذب معاشرے نہیں ہو سکتے' چاہے صنعتی' اقتصادی اور علمی حیثیت سے کتنے ہی ترقی یافتہ ہوں۔ سید قطب' جدید جاہلی معاشرہ پر تنقید کرتے ہوئے اس کے منفی پہلوؤں کو یوں اجاگر کرتے ہیں:

> جدید جاہلی معاشروں میں تو "اخلاق" تصور بالکل ہی برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ ان تمام قدروں سے خالی ہو چکا ہے جو "انسان" کو "حیوان" سے ممتاز کرنے والی ہیں۔ ان معاشروں میں غیر قانونی جنسی روابط۔۔۔۔ حتیٰ کہ خلاف فطرت جنسی تعلقات بھی۔۔۔۔ کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی تصور بس اقتصادی اور سیاسی معاملات کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا ہے اور سیاسی معاملات میں بھی اس کی جھلک بس اسی حد تک ہے جس حد تک "مصالح حکومت" کا تقاضا ہو۔" (نقوش راہ' ص 184)۔

ان معاشروں میں عمر رسیدہ افراد کی نگہداشت کے لئے بڑے خوبصورت اجتماعی گھر یا دارالضعفاء (Elderly People Care Centres) بنائے گئے ہیں جہاں انہیں ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں' لیکن جس اذیت میں یہ بوڑھے "قید تنہائی" گزار رہے ہوتے ہیں' ان کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ ان کی اولاد' عزیز و اقارب' بس کبھی کبھار "مدرز ڈے" یا "فادرز ڈے" پر پھولوں کا گلدستہ یا کوئی تحفہ لئے پہنچ جائیں تو یہ مختصر سا لمحہ بھی ان بوڑھوں کے لئے بہت قیمتی ہوتا ہے۔۔۔۔ دوسری طرف نوجوان نسل' جرائم کی طرف بڑی تیزی سے راغب ہو رہی ہے۔ سکولوں میں ایسے قبیح جرائم حتیٰ کہ جنسی تشدد اور قتل تک کی مثالیں ملتی ہیں۔ پھر سیکولر مذہب کی مروجہ "روحانیت" بھی لوگوں کو قطعاً "مطمئن" نہیں کر رہی۔ [illegible] ہے گویا ہر لحاظ سے اپنے آپ کو کالے پر فائق سمجھتا

ہے۔ امریکہ میں کالوں (Afro-American Community) کی حالت سخت قابل رحم ہے۔ کاغذ پر تو ان کو بنیادی حقوق حاصل ہیں۔ لیکن عملاً ان کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ رنگ و نسل کی بنیاد پر انہیں کم تر انسان سمجھا جاتا ہے۔ ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہوں پر کالوں کے چرچ اور ان کے پادری' گوروں سے الگ ہیں۔ نتیجتہ" ان کالوں میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو یہ سوچتی ہے کہ اس کا حال اور مستقبل چونکہ دونوں تاریک ہیں' اس لئے نفسیاتی طور پر وہ آرام طلب' کم ہمت یا بے حوصلہ بنتی چلی جا رہی ہیں۔

پھر ان معاشرتی بیماریوں کے تدارک کے لئے اگر کسی بھی مذہب کی دعوت پیش کی جاتی ہے تو امریکی سیاستدان اور مذہبی رہنما اسے اس حد تک تو تسلیم کرلیتے ہیں اگر جیلوں میں جرائم کی روک تھام کیلئے کوئی "واعظانہ" یا "صوفیانہ" عمل ہو اور اس سے وہ مجرم' جرائم سے کنارہ کش ہوجائے یا اپنی ذاتی زندگی کی حد تک "مذہب پرست" ہوجائے یا "اچھا شہری" بن جائے تو اس طرح کی "مذہبی تبلیغ" سے امریکی مشنریوں اور سیکولر پریس کو کوئی پریشانی نہیں۔ البتہ جب بھی اسلام کی دعوت بحیثیت دین پیش کی جاتی ہے (اور ظاہر ہے کہ وہ امریکی قوانین کے دائرہ کے اندر حکمت سے ہی پیش کی جاتی ہے) تو امریکی ذرائع ابلاغ' دستوری آزادیوں اور کھلے معاشرے (Open Society) کا "منشور" لگانے کے باوجود لٹھ لیکر پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ شمیم صدیقی جو برسوں سے امریکہ رہ رہے ہیں اپنی کتاب "Methodology of Dawah Ilallah In American Perspective" میں لکھتے ہیں:

> "We can term America as society of modern Ignorance (Jadid Jahiliyah) with slight variations here and there. America, no doubt, is a free society for all practical purposes. But when the question of Islam arises, centuries old perjudices come in the fore front. The missionary zealous and the secular press both create an unfounded hew and cry to poison the innocent minds of the people against Islam" (p. 118).

امریکہ ہو یا یورپ کا کوئی ملک اس کا ایک اور منفی پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں ایک عجیب دہرا معیار ہے۔ یعنی سیاسی' معاشی' معاشرتی اور تعلیمی حوالوں سے تو اپنے لئے اور معیارات لیکن دوسروں بالخصوص تیسری دنیا اور اس میں بھی مسلمانوں کیلئے ان کے ہاں کوئی مستقل اصول اور ضابطہ نہیں۔ تیسری دنیا ہو یا اسلامی دنیا' اسے قرضے دینے کیلئے من مانی شرائط طے کرتے ہیں۔ ان شرائط کے حوالے سے مختلف ملک کے نظام تعلیم' عسکری

پروگرام' سیاسی ہیئت اور نظریاتی تشخص کو متاثر کرتے ہیں۔ ٹیکنالوجی کی فراہمی اور تعلیم کے فروغ کے نام پر بے شمار پراجیکٹس پر اپنے ہی ایڈوائزرز' مشیر (Consultants) اور کارکنوں کو بھیجتے ہیں جو نہ صرف اپنے نظریات اور طرز زندگی کو متعارف کراتے ہیں بلکہ بڑی بڑی تنخواہوں اور اعزازیوں کی صورت میں کل رقم کا بیشتر حصہ اپنے ہی ملک واپس لے جاتے ہیں۔ غریب ممالک ان بڑے ملکوں کی مصنوعات کی منڈی بنے ہوئے ہیں۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ پس ماندہ ممالک بہت جلد مرعوبیت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ مغرب کی معاشرتی نقالی کو عین ترقی سمجھتے ہوئے اپنے پورے لائف سٹائل کو بدل لیتے ہیں لیکن رہتے وہ پس ماندہ کے پس ماندہ ہی بلکہ معاشرتی اور معاشی غلامی سے بڑھ کر سیاسی اور جغرافیائی غلامی کا بھی شکار ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ ان ممالک کا اگر کوئی مخلص دوست ہوسکتا ہے تو وہی جو ان کی نظریاتی اور سیاسی دنیا میں دخل دینے کے بجائے ان کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں مدد بہم پہنچائے۔ کیونکہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے مغربی ممالک غریب دنیا بالخصوص مسلم دنیا کے طلبہ کو سوشل' فزیکل اور نیچرل سائنسز کے عمومی موضوعات میں تو تعلیم و تربیت دینے پر آمادہ ہوجاتے ہیں لیکن جدید ترین ایٹمی ٹیکنالوجی کی تربیت دینے سے انکاری ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے معیار اخلاق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر مسلم دنیا کا کوئی ملک محض اپنی ذہانت' اپنی محنت اور اپنی بھرپور قربانی سے کوئی ایسی ایٹمی قوت حاصل بھی کرلے جو خالصتاً" اس کی اپنی جائز معاشی ضروریات کی تکمیل کیلئے ہو تو یہ "بڑے" اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور نام نہاد عالمی اداروں کے ذریعے جہاں ان کی اجارہ داری ہے اس ملک کے خلاف سیاسی مداخلت' بغاوت' تخریب کاری حتیٰ کہ کھلم کھلا جنگ ' سے بھی گریز نہیں کرتے۔ خاص طور پر مغربی ممالک چونکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو پوری مسلم اور پس ماندہ دنیا کی ترقی کے تناظر میں تشکیل خیال کا اصل مرکز فکر (Think Tank) سمجھتے ہیں اس لئے ان کی "عنایات" کا یہ ہروقت نشانہ بنا رہتا ہے۔ پروفیسر محمد یعقوب شاہق کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ:

"___ سپر طاقتیں اپنے اسلحہ' ٹیکنالوجی اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ کی بنا پر مسلمانان پاکستان کو مکمل طور پر اچھوت بنا دینے کی فکر میں ہیں۔ ان کو اس ملک کی اقتصادی ترقی اور ایٹمی توانائی پر دسترس ایک آنکھ نہیں بھاتی۔" (روزنامہ نوائے وقت لاہور 23 دسمبر 1991ء)۔

پھر جنگ کی صورت میں استعمار کے یہ ایجنٹ پہلے اس چھوٹے ملک کو تباہ کرتے ہیں۔ اس کی افرادی قوت (Manpower) کو ختم کرتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت [illegible] بھی وصول کرتے ہیں۔ اس کے اسلحہ اور دوسری جا

سکیموں کو' معائنہ کے بہانے اپنے کنٹرول میں لیتے ہیں اور پھر "تعمیر نو" کے نام پر اس ملک کی بچی کھچی دولت کے حصول کیلئے اپنے ہی ملک کے ٹھیکے داروں کو بڑے بڑے ٹھیکے دلاتے ہیں۔ مثلاً خلیج کی جنگ میں امریکہ نے اپنے اتحادیوں کی مدد سے عالم اسلام کو شدید ترین نقصان پہنچایا۔ اس نے کویت کی جنگ اور تعمیر نو کیلئے اپنی حمایت کو عالم اسلام بالخصوص سعودی عرب اور کویت سے کیش بھی خوب کرایا اور یہ بھی ایک تاثر ہے کہ شاید ان جارح اتحادیوں نے کویتی تیل کے چشموں سے بڑی برق رفتاری سے پہلے تیل لوٹا اور پھر انہیں آگ بھی خود ہی لگائی' اسے بجھانے کیلئے اربوں ڈالر کے ٹھیکے بھی خود ہی لئے اور پھر دنیا سے اپنی "انسان دوستی" اور "فنی اور پیشہ ورانہ مہارت" کا لوہا بھی منوا لیا کہ کتنے کم عرصے میں اس نے بہت سے کنوؤں کی آگ کو بجھا لیا ہے ـــــ اس طرح امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے اربوں ڈالر سعودی عرب اور کویت سے بٹور لئے اور یوں عملاً مسلم عرب دنیا کو مالی لحاظ سے قلاش کردیا ـــــ مثلاً ایک اخباری اطلاع (روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 نومبر 1991ء) کے مطابق اس وقت کویت میں ہر قسم کے اداروں کی دوبارہ بحالی کیلئے ستر فیصد بڑے ٹھیکے خود امریکی کمپنیوں کے حصے میں ہی آئے۔ پچیس فیصد دیگر بڑے اتحادیوں نے تقسیم کرلئے اور پانچ فیصد تیسرے نمبر کے حامی اتحادیوں نے بانٹ لئے۔ عالم اسلام کے ایک اہم رکن ملک پاکستان جس کے پاس اتنی فنی اور پیشہ ورانہ صلاحیت تھی کہ وہ ملی جذبہ' اخوت اور امت واحدہ کے تصور کے تحت اپنے برادر ملک کی تعمیر نو میں اہم کردار ادا کرتا۔ لیکن ان عالمی " وڈیروں" نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس کے برعکس اس وقت زیادہ تر کام جو پاکستانیوں کو سونپا گیا ہے وہ عام طور نچلی سطح کے کام (Menial Work) تک محدود ہے۔ ہم اس سطح کی مشقت اور محنت کی عظمت کے خلاف نہیں اور پھر خاص طور پر اپنے برادر ملک کی تعمیر و ترقی کیلئے تو بغیر کسی معاوضہ کے اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں کھپا دینے کو تیار ہیں لیکن "نیو ورلڈ آرڈر" کے فریم میں شاید مسلمانوں کی باہمی اخوت' اتحادیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

مغربی تہذیب کے چند مثبت پہلو

ہر چند کہ کسی تہذیب کے بارے میں حتمی رائے' کلیت اور جامعیت کے تناظر میں ہی مرتب کی جاتی ہے۔ یعنی کسی تہذیب کا مطالعہ ٹکڑوں یا اجزا میں نہیں کیا جاتا بلکہ ہر تہذیب اپنی فکری اساس اور اپنے کل میں (In Totality) ہی دیکھی جاتی ہے اور اس کا ہر جزو درحقیقت ایک دوسرے سے باہم مربوط ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مغربی تہذیب کے بعض تمدنی پہلو اور اجزاء چاہے اچھے بھی کیوں نہ ہوں وہ تہذیب مجموعی فکری تناظر میں اس قابل نہیں

کہ وہ دنیا کی ایک صحت مند دائمی تہذیب بن سکے۔ بلکہ اس "تہذیب" سے اگر عسکری اور مادی قوت (جو ایک عارضی چیز ہے) چھین لی جائے تو اس میں قطعاً کوئی دائمی اخلاقی خوبی اور استحقاق نہیں جس کی بنا پر یہ کسی چھوٹی سی کمیونٹی میں بھی پسندیدہ بن سکے۔ بہرحال بادی النظر میں مغربی یا امریکی تہذیب کے کچھ ایسے مثبت پہلو ضرور ہیں جو ہیں تو سراسر مادیت کی بالادستی اور محض بقائے ذات (Preservation of Self) کے حوالے سے' لیکن باوجود اپنے خود غرض اور منفی پہلوؤں کے کسی نہ کسی طرح اس معاشرہ کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

ہمیں بحیثیت استاد اپنے تنقیدی اور تقابلی مطالعہ میں ان نکات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا—— مثلاً ان کے بعض معاشرتی اور سیاسی ادارے بڑے مستحکم ہیں۔ تعلیم' تحقیق' ٹیکنالوجی اور جدید ترین سائنس میں انتہائی بلند مقام پر ہیں۔ ان کی بعض سائنسی ایجادات اور اختراعات نے زندگی میں فی الواقعہ دنیوی آرام بھی مہیا کیا ہے۔ مغربی معاشرہ میں عام سطح پر بالعموم رشوت اور سفارش کا بہت کم دخل ہے۔ چاہے مقننہ ہو یا انتظامیہ یا عدلیہ' قانون کا اتباع بالعموم سب کے لئے انتہائی اہم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملی زندگی میں اس سے مختلف مظاہر بھی سامنے آتے ہیں۔ مثلاً 1970ء میں تقریباً سات ماہ تک نیو یارک ٹائمز کی لسٹ پر رہنے والی Best Seller کتاب کے امریکی مصنف Robert Townsend نے بڑا حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے:

> "----It's your job to create a system that's fair. And that is not easy. Injustice is built in to our society and even in to our instincts. (Up the Organization, p. 43).

بہرحال بحیثیت مجموعی میکانکی قوانین و روایات کا پاس کیا جاتا ہے۔ مثلاً وقت کی پابندی کا سخت خیال رکھا جاتا ہے۔ محنت اور مشقت کی قدر کی جاتی ہے۔ مختلف اداروں میں لوگوں کا دفتری کام کم سے کم وقت میں ہوتا ہے۔ سیاسی انتخابات پرامن طریقے سے ہوتے ہیں۔ انتخابات میں دھاندلی' امیدواروں کی اپنی معاشرتی اور معاشی رتبہ کی دھونس اور قانون ساز اداروں میں "فلور کراسنگ" اور "ہارس ٹریڈنگ" کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ حکمرانوں کا احتساب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ حکمرانوں کی پرائیویٹ زندگیاں بھی قابل گرفت ہوتی ہیں۔ عوام یہ پسند نہیں کرتے کہ بعض برائیاں جو معاشرے میں عام ہیں وہی برائیاں ان کے قائدین میں بھی ہوں۔ احتجاجی مجموعی سیاست کا کوئی تصور نہیں۔ اپوزیشن حکومت کے خلاف سخت سے سخت احتجاج کرتی ہے لیکن حزب اختلاف اور حزب اقتدار اپنے ملک کو توڑنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ پھر آئین ساز اداروں میں ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے بھی

ہوتے ہیں۔ لیکن قومی روایات اور آئین کی پاسداری مقدم ہے۔ پریس عام طور پر آزاد ہے۔ اجتماعی رسمیں بڑی سادہ ہوتی ہیں۔ ملاوٹ اور ٹیکس چوری ناپسندیدہ قدریں ہیں۔ معیاری تعلیمی اداروں میں طلبہ کا داخلہ میرٹ پر ہوتا ہے۔ طلبہ تعلیمی اور انتظامی امور میں قطعاً" رکاوٹ نہیں ڈالتے۔ کلاسوں کے بائیکاٹ' توڑ پھوڑ اور ہڑتال کا منظر کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ مستند تعلیمی اداروں میں طلبہ ہر روز نت نئے لباس اور نئے فیشن کے ساتھ نہیں آتے بلکہ تعلیم کے ساتھ ساتھ پارٹ ٹائم ملازمت کو قطعاً" گھٹیا نہیں سمجھتے۔ امتحانات کے حوالے سے کوئی "قبضہ گروپ" نہیں ہوتا۔ نقل اور تفویض کار (Assignment) کی تکمیل کے حوالے کسی قسم کا دھوکا یا عیاری (Cheating) انتہائی ناپسندیدہ قدر ہے——

اچھی جامعات کی لائبریریاں دن رات کھلی رہتی ہیں۔ ان لائبریریوں میں ہر مضمون سے متعلق جدید ترین لٹریچر' ریسرچ اور انفارمیشن کی سہولیات' طلبہ اور اساتذہ دونوں کو میسر ہوتی ہیں۔ ان جامعات کے سالانہ ٹائم ٹیبل (Schedule) بہت پہلے ہی تیار ہوجاتے ہیں اوران میں شاذ ہی کوئی ردو بدل ہوا ہے۔ اساتذہ بالعموم بڑے محنتی' مشنری' مشفق اور تحقیق و تصنیف سے دلچسپی رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان ممالک میں اصل قوت' اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اساتذہ ہی ہوتے ہیں جو مستقبل بینی (Futurism) کے حوالے سے عوام اور حکومت دونوں کو دلیل اور تحقیق کی بنیاد پر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیمیں بلا شبہ اپنے ارکان کی سہولیات اور مراعات میں اضافے کیلئے کوشاں رہتی ہیں لیکن یہ تنظیمیں اپنے ارکان کی علمی' فنی اور پیشہ ورانہ ترقی کیلئے رضاکارانہ طور پر از خود مختلف سیمینارز' کانفرنسیں' ورکشاپس اور سٹڈی گروپس کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان ممالک میں پیشہ ورانہ لٹریچر مثلاً کتب' جرائد او دیگر تدریسی مواد (Instructional Material)' زیادہ تر ان اساتذہ تنظیموں کا ہی تیار کردہ ہوتا ہے۔

استعمار کی تمام کوششوں کا ماحصل

اصل میں امریکہ اور مغربی بلاک اس وقت متحد ہوکر کمزور ممالک بالخصوص مسلم دنیا سے ثقافتی محاذ پر برسرپیکار ہے۔ ایک طرح سے اس وقت "ثقافتوں کی جنگ" ہے۔ اس ثقافتی جنگ میں اپنے غلبے کے لئے مغرب' خبط اور دیوانگی (Craze) میں مبتلا ہوکر عسکری جنگ سے بھی گریز نہیں کرتا۔ حقیقت میں استعمار کی تمام کوششوں کا ماحصل یہ ہے کہ وہ ہمیں اپنا یہ "نظریہ" سمجھائے کہ امریکہ یا یورپ کے ممالک کی "ترقی" کا اصل راز یہ ہے کہ یا تو انہوں نے مذہب کا انکار کیا یا وہ سیکولر نظریات کے حامل [illegible] ان کے

نزدیک وہ مسلم ممالک جو "ترقی یافتہ" قوم کی صف میں کھڑا ہونا چاہتے ہیں وہ یا تو دین سے کنارہ کش ہو جائیں یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر وہ بے شک مذہب سے کنارہ کش نہ ہوں البتہ اتنا کام کریں کہ مذہب کو ایک ذاتی معاملہ بنا کر رکھیں اور اس کو نظام اجتماعی یعنی معاشرت' معیشت' سیاست' ادب' صحافت' ابلاغ' تعلیم اور اخلاق وغیرہ سے بالکل لاتعلق کردیں۔ اس طرح یہ ممالک عملاً مغرب کے زیر اثر کالونیاں بن کر رہیں اور اپنی ساری پالیسیاں' مغرب ہی کی مرضی کے مطابق طے کریں' تاکہ مسلم ممالک کی ساری دولت اور وسائل کا مغرب بلا شرکت غیرے "مالک" بنا رہے۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے ان ممالک میں مختلف طریقوں سے ایسے لبرل یا سیکولر حکمرانوں کو مسلط کیا گیا جنہوں نے ایسا نظام تعلیم رائج کیا جس کی بدولت نوجوان نسل میں بالعموم خدا سے بیزاری (Theophobia) یا لادینیت (Secularism) کا مرض پھیلتا چلا گیا۔۔۔۔ استعمار کی اس خطرناک حکمت عملی کے بارے میں آیتہ اللہ خمینی اپنی کتاب "اسلامی حکومت" میں اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

> امپیریل ازم کی کوشش یہ ہے کہ ہم صرف نماز روزہ کرتے رہیں' اور ہماری زندگی صرف عبادات تک محدود رہے تاکہ ہمارا اس سے کبھی سیاسی ٹکراؤ نہ ہو۔ امپیریل ازم ہم کو دعوت دیتا ہے کہ ہم نماز پڑھتے رہیں' جتنا جی چاہے' صبح و شام۔۔۔۔ اور ہمارے پٹرول پر اس کا قبضہ رہے' ہماری نماز سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے' اگر ہمارے بازار اس کے مال کیلئے' ہمارا سرمایہ اس کے تاجروں اور اس کی مصنوعات کیلئے وقف ہو۔۔۔۔ اسی لئے حملہ آوروں نے اپنے قوانین' اپنا نظام حیات ہم پر تھوپ دیا اور ہم کو یہ بھلاوا دیا کہ اسلام زندگی کیلئے ناقابل عمل ہے' وہ ہمارے سماج کی اصلاح نہیں کرسکتا' وہ کوئی حکومت نہیں چلا سکتا' اسلام ان کے نزدیک حیض کے مسائل' میاں بیوی کے ازدواجی رشتہ اور اس طرح کے چند مسائل کا نام ہے۔ (مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش۔۔۔ از سید ابوالحسن ندوی' ص 193)۔

بہرحال تصویر کا ایک رخ اور بھی ہے اور وہ ہے ہماری اپنی بالفعل' اپنی نالائقی اور اپنی کمزوری۔ اس وقت دنیا کی مجموعی آبادی کا تقریباً 25 فیصد سے زائد مسلمان ہیں لیکن مسلم ممالک کی کیفیت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی پر صرف ایک فیصد خرچ کرتے ہیں اور باقی کیلئے انہیں مغرب کا دست نگر بننا پڑتا ہے۔ لیکن مغرب یہ مدد اپنے پاس سے تو نہیں دیتا' بلکہ وہ اسی رقم سے قرض کی صورت میں دیتا ہے' جو مسلم دنیا نے سرکاری سطح پر یا اس کے بعض حکمرانوں' سیاست دانوں اور تاجروں نے اپنی غیر قانونی کالی دولت مغربی بینکوں میں جمع کرا رکھی ہے۔ یہ بھی کیا ستم ظریفی ہے کہ مسلمانوں کی دولت سے بھی وہی ممالک

فائدہ اٹھا رہے ہیں جو انہیں زیر بار کیے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ ویسے یہاں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ امریکہ یا دوسرے بڑے مغربی ممالک کو امت مسلمہ سے اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں دنیا میں تجدید و احیائے اسلام کا کام پھر نہ شروع ہوجائے اور اس طرح مسلمان اور پوری دنیا کے پسے ہوئے مظلوم انسان' مغرب کے معاشی' سیاسی' عسکری اور ثقافتی ظلم کے خلاف کہیں متحد نہ ہوجائیں۔ ورنہ اتنی بات تو مغرب کے مفاد میں ہے کہ مسلم دنیا کے غریب ممالک تھوڑی بہت مادی ترقی ضرور حاصل کرتے رہیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوگا تو ان کی پیداوار کا خریدار کون ہوگا؟ اس اہم نکتہ سے متعلق پاکستان کے ممتاز صنعتکار اور لاہور ایوان صنعت و تجارت کے سابق سربراہ شہزاد عالم منوں نے اپنے ایک انٹرویو میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

> ---- اس سلسلے میں' میں امریکہ کی مثال دوں گا کہ آج سے سو سال پہلے امریکہ نے فیصلہ کیا کہ ہمارا دنیا سے رابطہ ختم۔ مطلب یہ کہ جس نے ترقی کرنی ہے' خود ہی کرے' ہم نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ لیکن اسی زمانے میں امریکہ کے ایک صدر وڈرو ولسن نے منتخب ہوکر یہ پالیسی اپنائی کہ ہم دنیا کے ممالک کو پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں گے' کیونکہ اگر وہ "غریب" ہوں گے تو ہماری مصنوعات اور پیداوار کون خریدے گا؟
>
> (روزنامہ نوائے وقت لاہور' 22 نومبر 1991ء)۔

اصل میں مغرب ہمیں صرف اپنی مصنوعات کا خریدار ہی نہیں بناتا' بلکہ اس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نظام فکرو ثقافت کے ذریعے مسلمانوں میں تدریجاً" اعتقادی تزلزل اور دینی ارتداد پیدا کرکے اسے سب سے پہلے ثقافتی محاذ پر شکست دے۔ مغرب درحقیقت ہم پر بند نظام (Closed System) کی پھبتی کستا ہے اور ہمیں اپنے نظام تعلیم و تہذیب کے ذریعے یہ "سبق" دیتا ہے کہ اصل ترقی کھلے نظام (Open system) کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ یہ اصرار ہم سے اس کا مطالبہ اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ اپنے ثقافتی' تہذیبی اور فکری "افواج" کو آسانی سے ہمارے معاشرہ میں داخل کرسکے★۔۔۔۔ چنانچہ عالم اسلام

★ جہاد افغانستان کی وجہ سے روس میں تو بہت پہلے ہی شکست و ریخت کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ پھر امریکہ کے زیر اثر' روسی قیادت نے پرسترائیکا (Prestroika) یعنی معیشت کی تشکیل نو اور گلاس نوسٹ (مقابلے میں کھلے پن) کی پالیسی کو شروع تو کیا۔ لیکن اس "کھلے پن" کی فضاء بنتے ہی امریکہ نے بغیر کسی توقف کے اپنی "ثقافتی فوجیں" کھلے عام داخل کر دیں۔ یہ کام وہ پہلے چھپ چھپ کر سرانجام دیتا تھا۔۔۔۔ اب مسلم ریاستیں جنہوں نے آزادی کا اعلان کر دیا ہے' ان کا اگر عالم اسلام سے تعلیمی' ثقافتی' اخلاقی اور اقتصادی تعلق قائم نہ ہوا' تو امریکہ کا اصل ہدف ان مسلم ریاستوں کی نوجوان نسل ہوگی' جسے وہ اپنی تہذیب کے دام میں لانے کی کوشش کرے گا (جسے اشتراکی استعمار پہلے ہی تہذیبی نقصان پہنچا چکا ہے)۔ لیکن اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ جس طرح اس جغرافیائی خطے پر اشتراکی استعمار کو شکست ہوئی' کچھ بعید نہیں کہ اس استعمار کے "جڑواں بھائی" یعنی سرمایہ دارانہ استعمار کی شکست کا میدان بھی یہی ہو۔

میں بالعموم ایسی "عوامی" فضا تیار کی گئی جس کے نتیجہ میں مغرب کے تصور جمہوریت کے تحت ایسی قیادت سامنے آئی جس نے اسلام کو بحیثیت "دین" تسلیم نہ کیا اور اس طرح اسلام کو صرف "مذہب" کی حیثیت دے کر ایک تو اسلامی تصور قومیت کو پس پشت ڈالا اور دوسرے سیکولر نظام تعلیم کو اپنا کر بغیر تنقیدی شعور کے مغربی علوم اور مغربی ثقافت کی اندھا دھند نقالی کی۔ یوں ترقی پسند بننے کے شوق میں مسلمان مختلف نوع کی غلامیوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ ان غلامیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج امریکہ "نئے عالمی نظام" کی صورت میں پوری دنیا میں اپنا کلچر اور اپنا دبدبہ بڑے جارحانہ انداز میں مسلط کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت، پورا یورپ اور ایشیا اس استعمار کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن ہمیں اس وقت کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہئے بلکہ روشن مستقبل کی خاطر امت مسلمہ کے ہر فرد بالخصوص باشعور اساتذہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور درپیش مسائل کا صحیح ادراک کریں گے اور ان کا تنقیدی جائزہ لے کر کوئی موثر لائحہ عمل مرتب کریں گے۔ پھر نظام تعلیم کے نفاذ کی راہ میں حائل مزاحم قوتوں کا مطالعہ کر کے جہالت کے خلاف زبردست علمی تحریک چلائیں گے اور بالآخر اپنے نظام تعلیم کی اسلامی تعمیر کیلئے جرات سے اپنا کوئی مثبت طریق کار وضع کریں گے۔

مغربی تہذیب پر اقبال کی تنقید

استعمار کے اصل مقصد اور مغربی تہذیب کے اچھے برے پہلوؤں کے تناظر میں، ہمیں علامہ اقبال کا یہ رہنما اصول پیش نظر رکھنا چاہئے کہ انتہائی حکمت سے ہمیں اچھے رویے تو اپنا لینے چاہئیں لیکن برے رویوں سے اجتناب کرنا چاہئے۔ (ہر چند کہ یہ کام ہر کوئی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس مقصد کیلئے تو ایسے اساتذہ کی ضرورت ہو گی جو قرآن و سنت کے حوالے سے فکری اور عملی لحاظ سے پختہ مسلمان ہوں، اجتہادی صلاحیتوں کے مالک ہوں اور اپنے اپنے شعبہ میں بھی مہارت رکھتے ہوں)۔ اقبال کہتے ہیں:

طلسم علم حاضر را شکستم
ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانند براہیم
بہ نار او چہ بے پروا نشستم

ترجمہ: "میں نے دور جدید کے علم کا پول کھول دیا ہے۔ میں نے اس کی اچھی باتیں [illegible] باتوں سے بچ نکلا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ میں ابراہیمؑ کی سنت پر عمل

کرتے ہوئے دور جدید کے الاؤ میں بے خوف و خطر بیٹھا رہا ہوں اور کافرانہ نظام سے مرعوب نہیں ہوا اور ہمیشہ کلمہ حق ہی کہا۔" یعنی مسلمان اگر اپنی شاہ کلید۔۔ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کو اپنی تمام کاوشوں میں مرکزی مقام دیں گے تو وہ نہ صرف غیر اسلامی تہذیب کے اثرات سے بچیں گے بلکہ آگے بڑھ کر ایک مہذب قوم کی حیثیت سے دنیا پر غلبہ حاصل کریں گے۔

اس معیار ردو قبول کے ساتھ وہ نوجوان نسل کو ترقی کا یہ راز بتاتے ہیں کہ مرعوبیت سے بچنے کیلئے وہ اپنی تعلیم وتربیت جس کی اساس توحید و رسالت' ہے' سے رجوع کریں اور ایسی ثقافت جو اسلام کے منافی ہو اس سے قطعی طور پر دور رہیں۔ انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو تہذیب نو کی غلامی کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے یہ مشورہ دیا کہ:

زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلی دگرے درخور تقاضا نیست

ترجمہ : "ایسی آگ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ اپنی ہی مٹی سے پیدا کر' دوسروں کی روشنی ہمارے مسائل کا حل نہیں۔"

اقبال در حقیقت علمی غلامی کے خلاف تھے۔ وہ نوجوانوں کے لئے ایسی تعلیم پسند نہیں کرتے تھے جس سے ان کی قومی خودداری' ان کی منفرد تہذیب اوران کا مخصوص تشخص ختم ہوتا ہو۔ چنانچہ وہ نوجوانوں سے اس طرح مخاطب ہیں:

تاکجا در تہ بال دگراں می باشی
در ہوائے چمن آ پریدن آموز

ترجمہ: "یعنی کب تک دوسروں کے پروں تلے زندگی بسر کرو گے۔ تم باغ کی صاف ستھری فضا میں خود اپنے پروں سے اڑنا سیکھو۔"

معروف سکالر اور اقبالیات کے ماہر پروفیسر محمد منور مرزا' مغربی مادہ پرست تہذیب کے متعلق حکمت اقبال کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> علامہ اقبال یورپ کو شیطان کی کارگاہ اسی لئے کہتے ہیں کہ یورپ نے مادہ پرستی کے نظریات کو فروغ دے کر اور چھینا جھپٹی کو تہذیب و تمدن کی علامت بنا کر پورے عالم انسانیت کو بنیادی قدروں سے محروم کر دینے میں بڑا پر زور کردار ادا کیا ہے۔ بال جبریل میں علامہ اقبال نے لینن کی زبانی "بحضور خدا" جو فریاد کی ہے وہ یورپی تہذیب کے انسانیت کش مزاج کی بخوبی پردہ داری کرتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں،
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے، حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت!
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت!
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات!

(ایقان اقبال، ص ص 21-20)

علامہ اپنی خداداد بصیرت کی بنیاد پر یہ پیشین گوئی (Prediction) بہت پہلے کر چکے ہیں (اور اس کے مظاہر سامنے آ رہے ہیں) کہ مغربی تہذیب اپنے کمزور، غیر فطری اور غیر اخلاقی عناصر ترکیبی کی وجہ سے لازماً زوال پذیر ہوگی۔ ان کے خیال میں اسے طبعی موت بھی نصیب نہیں ہوگی بلکہ اپنے قلب و نظر کے فساد کی وجہ سے یہ تہذیب خود کشی کا ارتکاب کرے گی۔ اقبالؒ کے لفظوں میں:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اصل میں اقبال کے نزدیک عصر حاضر کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج مسلمان اپنا تہذیبی تشخص کھو بیٹھا ہے۔ اسے اس وابستگی کا علم نہیں رہا کہ وہ کس کا ہے، کس لئے ہے اور اس کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ آپ فرماتے ہیں:

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد
می شناسی عصر ما با ما چہ کرد
عصر ما ما را بیگانہ کرد
[illegible] جمال مصطفیٰ بیگانہ کرد

ترجمہ : "(اے مغرب کے پرستار) تم ذوق و شوق اور (روحانی) سوز و درد سے محروم ہو۔ تم نہیں جانتے کہ عصر حاضر نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ اس کی تہذیب نے ہمیں اپنے آپ سے بیگانہ کردیا اور (سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ) ہمیں جمال مصطفیٰ ﷺ کی برکات سے دور پھینک دیا۔" (ترجمہ : ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)۔

اس مسئلہ کے ساتھ ساتھ علامہ کے خیال میں ہمارے نظام تعلیم کی ایک اور اہم ترین خامی اور قباحت یہ ہے کہ وہ طلبہ اور اساتذہ میں فکری اجتہاد اور علمی تحقیق کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ چنانچہ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کیلئے ضروری ہے کہ وہ نصاب کی اسلامی تشکیل کیلئے قرآن و حدیث کو اصل سرچشمہ ہدایت مانیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید دور میں سائنسی اور تکنیکی علوم کی تعلیم بھی انتہائی ضروری ہے۔ لیکن علامہ کی نظر میں درسی کتب کی تیاری میں اسلامی زاویہ نگاہ کو لازماً پیش نظر رہنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملی تاریخ کو نصاب میں شامل کیا جائے اور اسلامی زاویہ نگاہ سے اس کی از سر نو تدوین کی جائے۔ علامہ کے نزدیک اسلامی تاریخ کی تدریس' مسلمانوں کے منفرد ملی شعور کو بیدار کرنے کیلئے ناگزیر ہے۔ علامہ کے خیال میں طلبہ میں ملی شعور بیدار کرنے اور مغرب کی بے خدا تہذیب کے خلاف نتیجہ خیز جدوجہد وہی معلم کرسکتا ہے جسے اسلام سے گہرا لگاؤ ہو۔ اس کے فکر و عمل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ اقبال کی حکمت تعلیم کے تناظر میں یہ بات واضح ہے کہ معلم کیلئے اپنے مضمون میں مہارت کے ساتھ' اسلام کی تہذیب اور بنیادی اسلامی قدروں کی تفہیم ضروری ہے۔ جس کے لئے مستقل سرچشمہ علم' قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موثر تدریس کیلئے ضروری ہے کہ معلم ادب عالیہ سے بھی دلچسپی رکھتا ہو۔ عربی' فارسی اور اردو زبانوں کا خاص ذوق رکھتا ہو۔ علامہ کی نظر میں معلم دنیا بھر کے علوم و فنون سے استفادہ کرے' لیکن تنقیدی شعور کےساتھ۔ پھر معلم میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ ان علوم کو وحی الٰہی اور اسوہ رسول ﷺ کی روشنی میں انسانیت کیلئے زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکے۔ علامہ یہ چاہتے تھے کہ معلم اپنے طلبہ کو اسلامی ثقافتی ورثہ سے آگاہ کرے اور انہیں اسلام کا آفاقی نقطہ نظر عطا کرے۔ اس لحاظ سے اساتذہ کے تربیتی نصاب میں بھی ایسی تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں جن کی روشنی میں اساتذہ الہامی علم (Rvealed Knowledge) اور اکتسابی علم (Acquired Knowledge) دونوں سے آگہی حاصل کریں' لیکن اکتسابی' عقلی اور تجربی علم کو لازماً برتر ذریعہ علم یعنی وحی الٰہی کے تابع رکھیں۔

بحیثیت مجموعی علامہ یہ سمجھتے تھے کہ مغربی نظام تعلیم (استعمار اور غیر اسلامی تحریکات کا ایجنٹ بن کر) مشرق بالخصوص مسلم امہ میں اپنے ملحدانہ اور لادینی افکار کے لئے فضا سازگار بناتا ہے جو بالاخر نوجوانوں میں ذہنی انتشار کا باعث بنتی ہے۔ اس فکری انتشار سے بچنے کیلئے اقبال یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے طلبہ اور اساتذہ مغربی علوم کا مطالعہ کریں لیکن الٰہی ہدایت کی روشنی میں اور غالب نقطہ نظر سے' نہ کہ مرعوب اور مغلوب ذہن سے۔چنانچہ ایک آفاقی مفکر کی حیثیت سے اقبال نے ایک تو تعلیم و تربیت کے ذریعے اسلامی تاریخ اور تہذیبی روایات کے احیاء کو اپنے فن کا اساسی نکتہ ٹھہرایا اور دوسرے دور حاضر کے بے خدا تصور علم کے خلاف اعلان جنگ کیا:

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

پھر "ارمغان حجاز" میں دعائیہ انداز میں' نوجوان نسل کو وحی الٰہی سے محروم علم و ثقافت اور نظام حیات کے خلاف جہاد کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

گہے افتم گہے مستانہ خیزم
چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہ التفاتے بر سر بام
کہ من با عصر خویش اندر ستیزم

ترجمہ: "کبھی میں گر پڑتا ہوں اور کبھی مستانہ وار اٹھ کھڑا ہوتا ہوں (اور اس تگ و دو میں) میں نے بغیر کسی تیغ و شمشیر کے دشمن کو لہولہان کر دیا ہے۔ حضور ﷺ توجہ فرمایئے' کرم کیجئے کہ میں اپنے (خدا دشمن) زمانے کے خلاف برسرپیکار ہوں" (ترجمہ: ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)۔

موجودہ صورتحال میں اساتذہ کی ذمہ داری

ہمارے ہاں یہ ایک عجیب اور دلچسپ صورت ہے کہ ہم مغرب کے مثبت پہلوؤں کی تو پرواہ نہیں کرتے لیکن منفی پہلوؤں کی طرف بڑے جلدی راغب ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ ان کی اچھی چیزوں کو اپنانے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن منفی نکات سے اپنے آپ کو بچانا انتہائی ضروری ہے۔ عالم اسلام کے ممتاز دانشور استاذ محمد قطب کا تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ ہماری "غلامانہ ذہنیت" ہی ہماری سیادت کی راہ میں حائل ہے۔ استاذ محمد قطب کے

ہمارے پاس نہ کوئی اسلامی خوبی ہے اور نہ اس مغرب کی کوئی خوبی ہے۔ جس کی ہم بندروں کی طرح نقل اتارتے اور غلاموں کی طرح اس کو اپنانے کیلئے لپکتے ہیں۔ ہم نے اخلاقی گراوٹوں' بدعتوں' فیشن ہاؤسوں اور غلط افکار میں تو ان کی تقلید کی مگر ہم نے عمل اور تنظیم میں ان کی تقلید نہیں کی۔ کیونکہ غلام اپنے آقاؤں کی ان امور میں تقلید نہیں کیا کرتے جن میں کچھ ہمت اور محنت کرنی پڑے۔ وہ تو بس ایسی ظاہری باتوں کی طرف لپکتے ہیں جو ان کے مناسب حال ہوں۔ (انسانی زندگی میں جمود و ارتقا' ص ص 334-335)۔

مغرب کی اندھا دھند نقالی سے بچنے کیلئے ہمیں بحیثیت استاد' خود اپنے اندر اور نئی نسل میں اسلام کے رہنما اصولوں کی روشنی میں اسلامی طرز فکر' منفرد ملی تشخص' محنت و مشقت اور تحقیق و اجتہاد کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ ہر چند کہ اس حوالے سے وہ تمام لوگ جو شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں' ذمہ دار ہیں لیکن تبدیلی کا اصل نمائندہ (Change Agent) تو استاد ہی ہے۔

اس تناظر میں تربیت اساتذہ کے ادارے جہاں زیر تربیت معلمین کو جدید علم و فن اور موثر طریقہ ہائے تدریس سے آگاہ کریں وہاں اس سے بھی زیادہ اہم ترین نقطہ آغاز یہ ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کی تربیت اس رخ پر کریں کہ ان میں تین خصوصیات کا خوبصورت امتزاج ضرور ہو۔ پہلی ایمان تقویٰ اور احسان' دوسری اپنے متعلقہ مضمون میں بھرپور اہلیت اور تیسری موثر حکمت تدریس۔۔۔۔ ان حوالوں سے یہ ادارے اپنے اساتذہ کی اسلامی اقدار کی روشنی میں اس طرح تربیت کریں کہ وہ جہاں نفس مضمون اور فن تدریس کا صحیح ادراک کریں وہاں اس فن کو اسلامی مقاصد کے حصول کیلئے بھی استعمال کرنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ اساتذہ کے تربیتی اداروں کو اس معاشرتی قانون کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اخلاقی تربیت سے عاری قوم چاہے مادی' عسکری اور معلوماتی تناظر میں کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو' شکست بالآخر اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ ہم مادی اور عسکری قوت سے بے نیاز ہوجائیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں فوقیت اسلامی تہذیب و اخلاق کو دیں اور فنی مہارت کو لازماً" اخلاقی معیارات کے تابع رکھیں۔

ہم درحقیقت ایک غالب امت ہیں اور ہمیں دنیا بھر کی قیادت کرنا ہے۔ ہم اس بات کے متحمل نہیں ہوسکتے کہ ہم اپنی قومی دولت خرچ کرکے یا تو استعمار کے ایجنٹ تیار کریں یا منتشر الافکار کی حامل نسل تیار کریں اور اس طرح مقصد زندگی سے بے خبر ایک مردہ قوم

بناتے چلے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم اپنی بقا کیلئے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کو بھی ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے جائز علوم کے حصول اور مثبت تہذیبی پہلوؤں کی اثر پذیری کے خلاف نہیں۔ البتہ مغربی ثقافتی استعماریت اور سیاسی غلبے کی پالیسی کو چیلنج کرنے کیلئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنے نظریاتی شعور' اپنے انسانی وسائل اور اپنی مادی قوت کے حوالے سے اپنے نظام تعلیم کی تہذیبی تعبیر کریں اور پھر اس تعبیر کی بنیاد پر تعلیمی عمل کے تمام عناصر مثلاً" مقاصد' نصاب' درسی کتب' تربیت اساتذہ' تعلیمی انتظامیات اور طریقہ ہائے امتحان وغیرہ کی تشکیل نو کریں۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ تینوں مطلوب قوتیں ہمارے پاس ہیں لیکن محض اپنی کوتاہی سے انہیں استعمال میں نہیں لارہے۔ بہرحال ان قوتوں کا شعور بھی تو استاد ہی کو دینا ہے۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ علم کے ہر شعبے میں ہم اسلامی ذہن سے دیکھیں' اسلامی ذہن سے پڑھیں اور اسلامی ذہن سے پڑھائیں۔ ہم مغرب کے فلاحی مملکت کے تصور کے بعض پہلوؤں کے خلاف نہیں لیکن ہمارے نزدیک اصل فلاح' ایمان کے بغیر ناقص ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر احمد سجاد اس واضح اور بنیادی حقیقت کی یاددہانی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "____ محض ایجادات اور اختراعات کی زیادتی سے ہمیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ خود اپنی معرفت حاصل کرے اور ان اسباب پر توجہ دے جو اس کے اخلاقی دیوالیہ پن اور فکری افلاس کے ذمہ دار ہیں۔ انسان کے آرام و آسائش میں ترقی اور تہذیب حاضر کی خیرہ کن چمک دمک سے کیا فائدہ۔ بقول علامہ اقبال:
>
> سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
> ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

(ڈاکٹر احمد سجاد باسلام کا روشن مستقبل)

اس مقصد کیلئے اسلامی نظام حیات کی داعی اساتذہ تحریکوں کو چاہئے کہ مغرب کی نت نئی "اصطلاحوں" مثلاً" ملائیت' قدامت پرستی' رجعت پسندی اور اب بنیاد پرستی (Fundamentalism) کی صورت میں عالمی "طعن و تشنیع" بھی برداشت کرنا پڑے' انہیں لازماً" اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ کا کام جرات سے کرنا ہوگا۔ نیم دلی یا بے دلی سے اسلامی نظام تعلیم نہیں آئے گا۔ اس لئے ایک بار پھر جہاد' قربانی اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے ساتھ پوری دنیا پر ہمیں ثقافتی برتری حاصل کرنا ہوگی۔ لیکن یہ کام بے [illegible]

اور بیدار مغز اہل اساتذہ سے ہی پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گا۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں جو افراد مختلف شعبوں میں مغربی جامعات سے اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرکے آتے ہیں ان میں بلا شبہ ایک قابل قدر تعداد ایسی ضرور ہوتی ہے جو اپنے ملک واپس آکر اپنے دین' اپنے ملک اور اپنے مضمون کے حوالے سے اپنے اپنے شعبہ میں بڑی محنت اور دلچسپی سے کام کرتے ہیں لیکن ایک تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جو بہتر آسائشوں اور ایک خاص کلچر کے تناظر میں حاصل کی گئی تعلیم کے حوالے سے پھر اسی ملک اور اسی ثقافتی ماحول میں واپس جانے کیلئے پریشاں رہتی ہے' جہاں اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح غیروں کی تیار کردہ "ذہانت" بالآخر پھر ان کے پاس "فرار" ہوکر پہنچ جاتی ہے۔ اگر ایسا "فرار" ممکن نہیں تو یہ "ذہانت" گو اپنے ملک میں ہی رہتی ہے لیکن ہر وقت شاکی اور پریشان۔ ظاہر ہے اس طرح کے شاکی اور پریشاں اساتذہ اپنے طلبہ کو خود اعتمادی' خود انحصاری اور خودداری کا کیا درس دیں گے۔ پھر پاکستان میں کئی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ قوم نے لاکھوں روپیہ خرچ کرکے ایک فرد کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کیلئے بھیجا۔ اس نے اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کرلی لیکن اس نے اپنے کنٹریکٹ کا کوئی پاس نہ کیا اور اس طرح یا تو وہ واپس ہی نہ آیا اور اگر آیا تو کسی بہانے پھر غیر ملک واپس چلا گیا۔ لیکن مغربی تمدن سے مرعوب ایسے افراد کا پھر بھی اپنے ملک سے شکوہ رہتا ہے کہ اس نے انہیں کیا دیا؟ یہاں کیا سہولتیں ہیں؟ جس کیلئے وہ اپنے ملک میں رہیں۔ اس طرح مادی آسائشوں اور مراعات کے لالچ میں وہ بالآخر "ذہانت کے شکاریوں" کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

حقیقت میں مغرب کے ادارے' علوم و فنون میں جس طرح کی تربیت دیتے ہیں اس کے حامل جب اپنے ملک واپس جاتے ہیں تو اس تربیت کے تناظر میں ویسا ہی ماحول' ویسی زبان' ویسی ٹیکنالوجی اور ویسی ہی سہولیات کا تقاضا کرتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی تعلیم و تربیت بے معنی ہے۔ چنانچہ یہ تربیت یافتہ افراد ایک بار پھر وہاں کی مصنوعات کی فراہمی کے حوالے سے فضا ہموار کرتے ہیں۔ اسی طرح پراجیکٹس اور ایکسچینج پروگرام بنتے ہیں۔ یوں سفر (Travel) تجارت (Trade) اور ٹیلی ویژن (Television) کے راستے مغربی ثقافت اپنا اثر ڈالنا شروع کرتی ہے۔ مغرب کے لئے یہ کام آسان اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس کی "علمی منڈی" کو کامیاب بنانے کیلئے اسے بعض بڑے مضبوط "مقامی ایجنٹ" مل جاتے ہیں جو درحقیقت اس کے اپنے ہی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو یہ تربیت یافتہ افراد اپنے ملک میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ واپس اسی دیس جانا چاہیں گے جہاں کے مزاج اور فلسفہ کے مطابق انہوں نے علمی اور تحقیقی تجربہ حاصل کیا تھا۔ اسی طرح ہم یہ صورت

ہو' مغربی ثقافت اور مغربی اقدار کی نقالی اور غلامی ان کی رگ و پے میں پیوست ہوتی رہتی ہے اور یوں اس مرعوبیت کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اپنی آل اولاد اور اپنے شاگردوں تک اسے منتقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

باطل فی الواقعہ بڑا منظم اور متحد ہے اور اس کے پاس مادی وسائل بھی بہت ہیں۔ لہٰذا مغرب کی ثقافتی استعماریت' اس کے اخلاقی دیوالیہ پن اور فکری افلاس سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہمارے ہر استاد کو پاکستان کے صحیح نصب العین کا شعور ہو اور اس کی تعمیر کیلئے جس طرح کے مشنری رضاکارانہ جذبات کی ضرورت ہے وہ کارفرما ہوں۔ یہ کام لازماً" تعلیم ہی کے ذریعے ہوگا۔ تعلیم کی نظریاتی تشکیل میں اساتذہ کو اس بات کا بھی گہرا شعور ہونا چاہئے کہ پاکستان مغربی فکر و ثقافت کی نقل درج کرنے کا چاک بورڈ نہیں ہے۔ ہم مغرب کے جائز سائنسی علم و فن کے خلاف نہیں' لیکن اس کے بے خدا تہذیب و ثقافت اور الہامی ہدایت سے محروم علم و فن کے بہرحال خلاف ہیں۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ پاکستان کی تعمیر و ترقی کے لئے بلاشبہ اقتصادی اور عسکری قوت ضروری ہے' لیکن اس سے بھی زیادہ ایمان' عمل صالح اور اخلاقی علو کی ضرورت ہے۔ ہمارا نظام تعلیم اگر ان قوتوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت احساس کمتری اور مغربی مرعوبیت سے ضرور نکلے گی اور بالآخر اساتذہ اور طلبہ کی یہی وہ تنظیمیں ہوں گی جو ثقافتی استعماریت کے چیلنج کا بھرپور جواب دے سکیں گی۔

اساتذہ کے تربیتی نصاب میں تبدیلی کی ضرورت

استاد چاہے کسی بھی سطح پر کوئی سا مضمون پڑھا رہا ہو اسے لازماً" خدا پرستی' وحدت انسانی' معروف و منکر کے احساس' صالح قیادت اور اخروی شعور جیسی آفاقی اقدار کو اپنے پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ان اقدار کے حوالے سے اسے جہاں نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ مہارت کی ضرورت ہے' وہاں اسے مربیانہ اور داعیانہ کردار بھی ادا کرنا ہے۔ اس کردار کی بجا آوری کیلئے اس میں علمی' پیشہ ورانہ اور اخلاقی صفات کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت سے براہ راست استفادہ کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس نظریہ حیات اور جس کلچر سے آگہی کے لئے استاد کو مقرر کیا جاتا ہے' اس نظریہ پر اس کا ایمان بنیادی شرط ہے۔ وہ علاقائی' لسانی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کی فکر آفاقی ہوتی ہے۔ بظاہر ان صفات کے حامل اساتذہ کی ہمارے تعلیمی اداروں میں انتہائی کمی ہے لیکن یہ امر خوش آئند ہے کہ اب ان اداروں میں بہرحال ایک تعداد ایسی ضرور موجود ہے جو علمی فضیلت کی بھی حامل ہے اور ان

کا نظریاتی شعور بھی پختہ ہے۔ البتہ یہ تعداد چونکہ اپنے زمانہ طالب علمی میں علوم کی اسلامی تشکیل کے حوالے سے تربیت نہ پاسکی' اس لئے اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل اور تنفیذ کے ضمن میں اسے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ اس تناظر میں اگر حکومت اور تربیت اساتذہ کے ادارے جہاں یہ انتظام کریں کہ اپنے تدریسی سٹاف کے معاشرتی و معاشی مقام کو بلند کریں اور مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کو ہر ممکن سہولتیں فراہم کریں وہاں درج ذیل موضوعات کے تناظر میں اپنے تربیتی نصاب کی از سرِ نو تشکیل کریں۔ پھر اس نصاب کی روشنی میں اپنے سٹاف کی فکری اور عملی تربیت کا بندوبست کریں۔ بلکہ قبل از ملازمت یا دوران ملازمت' کسی معلم کو اس وقت تک یورپی یا امریکی یونیورسٹی میں نہ بھیجیں۔ جب تک کہ اس کی ان موضوعات کے حوالے سے تربیت نہ کی گئی ہو۔

- حکمت اسلام: اسلامی افکار و مباحث
- نبی ﷺ کی سیرت اور حکمت انقلاب
- اسلامی ثقافت کے درخشاں پہلو
- عصر حاضر میں امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل
- استعمار کے مختلف ہتھکنڈے اور ان کا تدارک
- مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ
- اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ کی حکمت عملی
- مغربی معاشرہ میں مسلمان طلبہ کی ذمہ داریاں
- عالمی اسلامی تحریکیں: نصب العین' طریق کار' مزاحم و معاون قوتیں
- فکری اور عملی تربیت کے تقاضے
- تشکیل پاکستان: نظریہ' تحریک' تحفظ' تعمیر
- دعوت الی اللہ کا اسلوب
- جہاد فی سبیل اللہ: مفہوم' ضرورت' اہمیت

جہاں تک سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹی میں نئے آنیوالے اور پہلے سے موجود اساتذہ کا تعلق ہے تو انہیں بھی اپنے مضمون اور اس کی حکمت تدریس میں تربیت کے علاوہ درج بالا موضوعات پر خصوصی کورسز کرانے چاہئیں۔ اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ مقصد کی بہتر تکمیل کیلئے ہمیں ایسے اساتذہ میسر آجائیں جو نئی نسل کی تعلیم و تربیت اس رخ پر کریں کہ وہ اچھے مسلمان اور اچھے پاکستانی ہوں' داعیانہ کردار کے حامل ہوں اور اپنے اپنے شعبہ میں ماہر ہوں۔ نیز علوم جدیدہ پر [illegible] رکھنے والے ہوں اور

زمانے کے علوم، حالات، ضروریات اور سائنٹیفک تحقیقات سے پوری طرح واقف ہوں۔ ایسے اساتذہ سے ہی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہر طرح کے استعمار کا مقابلہ محض "نعروں" سے نہیں بلکہ پیہم جدوجہد اور حکیمانہ بصیرت سے کریں گے۔ بحیثیت استاد ہمیں سیادت عالم کے منصب کو دوبارہ حاصل کرنے کیلئے سید مودودیؒ کے اس بصیرت افروز رہنما اصول کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ:

> اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھادیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے طریق فکر و نظر پر آثار کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنیاد رکھیں جو خالص اسلامی فکر کا نتیجہ ہو۔ ایک نئی حکمت طبعی (Natural Science) کی عمارت اٹھائیں جو قرآن کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر اٹھے۔ ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں اور جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور دنیا میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔ (تنقیحات، ص 20)۔

اگر عمل تعلیم کے سارے عناصر بالخصوص اساتذہ کے تربیتی نصاب کی تشکیل میں اس رہنما اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ ہمارے پاس وہ مطلوب افراد کار تیار ہوجائیں جو دنیا میں اسلامی تہذیب کی جلوہ گری کا باعث ہوں۔

روشن مستقبل

اس وقت عالم اسلام میں پریشان کن کیفیت کے باوجود ہمارے لئے ایک امید افزاء صورت یہ ہے کہ قریب قریب ہر ملک میں اسلامی تحریک موجود ہے جس کی فکر اور دعوت سے مسلمان اپنے مستقبل کو اسلام کے حوالے سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ تحریکیں محض نظریاتی مباحث ہی پیش نہیں کررہیں بلکہ وہ ایک پیغام عمل بھی ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ جس طرح ان کے جذبہ جہاد نے اشتراکی استعمار کو شکست دی انشاء اللہ وہی جذبہ سرمایہ دارانہ اور دیگر [illegible] کے استعمار کو شکست دے گا اور قدرتی طور پر ایسے حالات اور امکانات بھی پیدا ہو رہے [illegible] امریکی استعمار [illegible]

ہیں کہ:

"____ امریکہ کے سامنے ایک پہاڑ کا پہاڑ دیکھتے دیکھتے راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اس واقعہ کو بچشم خود دیکھنے کے بعد امریکہ کو ایک نگاہ خود اپنے امکانی مستقبل پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ درخت الحاد کا جو ٹہنا سوشلزم کے نام سے برتر سمجھا جاتا تھا وہ تو ٹوٹ گرا۔ اب دوسرا ٹہنا سرمایہ داری کا بھی جلد ٹوٹنے والا ہے۔ کیونکہ اب الحاد اور مادہ پرستی کے خلاف جو بے زاری اور انحراف (Revolt) شروع ہوا ہے وہ بقیہ درخت پر بجلی بن کر گرنے والا ہے" (روزنامہ پاکستان لاہور 15 جنوری 1991ء)۔

.... لیکن استعمار کا اپنا نشہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں روس کی شکست کے بعد جو خلاء پیدا ہوگیا ہے اسے امریکہ "نیو ورلڈ آرڈر" کی صورت میں پر کرنا چاہتا ہے لیکن اس خطرے کو بھانپتے ہوئے پورا یورپ بڑی خاموشی سے امریکی استعمار کے خلاف متحد ہو رہا ہے۔ بلکہ حقیقتاً پوری دنیا میں اب امریکہ کا رتبہ اور اعتبار گھٹ رہا ہے۔ چنانچہ اب دنیا میں یہ تاثر عام ہے کہ امریکہ سوائے یہود و ہنود کے غالباً" کسی کے ساتھ بھی مخلص نہیں لیکن مسلم ممالک' خصوصیت سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ تو اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ پھر لوگوں کو یہ حقیقت بھی واضح ہو رہی ہے کہ امریکہ قطعاً" اتنی بڑی قوت نہیں۔ روس کے بارے میں بھی یہی پروپیگنڈہ تھا۔ ویت نام کی جنگ میں امریکہ کی اصل قوت کا اندازہ ہوچکا ہے۔ عراق میں حالیہ نام نہاد "فتح" کو بھی سارے جانتے ہیں۔ جناب خرم مراد کا تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ:

"امریکہ بھی معاشی طور پر کمزور ہو رہا ہے۔ اس کی بالادستی کو چیلنج کرنے والی قوتیں اٹھ رہی ہیں۔ خود امریکی اصحاب فکر' سنجیدگی کے ساتھ جاپان کے ساتھ ایک جنگ کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ یورپ بھی امریکہ کا حریف بننے کی راہ پر آگے بڑھ رہاہے۔ امریکہ ہی واحد قطب ہو' یہ امکان روز بروز کم ہوتا جارہا ہے۔ (ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور' اشارات' ص ص 19-20)۔

اس وقت جرمنی' فرانس اور ان کے زیر اثر ریاستوں میں امریکہ کے خلاف بہت شدید نفرت جنم لے رہی ہے۔ خود برطانیہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہے کہ امریکہ نمبرون (Number One) کیوں بنے؟ لیکن امریکہ اور یورپ کی تہذیب چونکہ ایک ہے اس لئے پوری انسانیت کے لئے اب ان میں کوئی کشش نہیں۔ اب اس مغربی تہذیب کے مقابلے

میں درحقیقت اصل نتیجہ خیز قوت مسلمانوں کی ہے۔ اگر مسلمان قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کی طرف رجوع کریں، اس سرچشمہ کی روشنی میں اپنے نظام تعلیم کو مرتب کریں اور اپنے تمام وسائل کو ملت اسلامیہ بلکہ پوری دنیا کے مظلوم اور پسماندہ اقوام کی بہبود کیلئے استعمال کریں تو مسلمان ایک بار پھر دنیا کی عظیم قوت بن سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر مسلم امہ کو اخوت اور اتحاد کی ضرورت ہے۔ اسے تہذیبی، تعلیمی اور اقتصادی حوالے سے لازماً ایک وحدت (One Unit) بن جانا چاہئے اور بحیثیت مجموعی اپنے خالص اسلامی تشخص کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ نیز اپنے اپنے ملک میں اسلام کو بحیثیت دین نافذ کرنا چاہئے۔

ہمیں اس کا احساس ہونا چاہئے کہ آج کے سیاسی اور جغرافیائی تناظر میں ہمارے حقیقی تحفظ اور سلامتی کا ضامن صرف ہمارا باہمی اتحاد ہے۔ مغرب کے ثقافتی استعمار کا مقابلہ ایک غالب مہذب قوم ہی کر سکتی ہے۔۔۔۔ اور یہ مہذب اور غالب قوم یقیناً ہماری ہے۔ پھر اس اہم نکتہ کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ شاید تنہا کوئی ایک مسلمان ملک مغربی تہذیبی یلغار کا مقابلہ موثر طور پر نہ کر سکے۔ اس کیلئے لازماً مسلم ممالک کو ہر شعبہ زندگی میں اپنی صلاحیتیں اور قوتیں یکجا (Pool) کرنا ہوں گی۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی نقطہ نظر سے ہمیں یہ اصول بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ہمارا نظام تعلیم نہ تو اشتراکیوں کی طرح کسی "قفس" اور نہ ہی مغربیوں یا امریکیوں کی طرح کسی "کلب" میں نشوونما پا سکتا ہے۔ یعنی ہم علمی آزادی (Academic Freedom) کے ہرگز خلاف نہیں لیکن تعلیم و تعلم کے عمل میں مادر پدر آزادی کے قائل نہیں۔ لہٰذا ہم "آزادی پابند" کے دائرہ کے اندر علمی آزادی، حریت فکر اور آزادانہ تعلیمی تحقیق کو تسلیم کرتے ہیں اور صرف اسی پابندی کو مانتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہے۔

ان کاوشوں کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کو اپنے ہی ان دانشوروں کی مزاحمت بھی کرنا ہوگی جو اسلام اور مغربی تہذیب کے درمیان ہم آہنگی چاہتے ہیں یا جو دین کو دشمنان اسلام کے اہداف کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں یا جو مغرب کے ساتھ "معذرت خواہانہ" اور "نیاز مندانہ" انداز اختیار کرتے ہیں۔ ہمیں ثقافتی محاذ پر ہر شعبہ زندگی میں بالخصوص تعلیمی اداروں اور ذرائع ابلاغ کے حوالے سے اس تعلیم کو عام کرنا ہوگا کہ اسلامی کلچر کا احیا ہی ہمارا تحفظ ہے اور ہماری تعمیر بھی۔ حقیقت میں چاہے امریکی نیو ورلڈ آرڈر کا غوغا ہو، یا استعمار کا کوئی اور انداز ۔۔۔۔ ان جبر و تعدی (Oppression) کے خلاف ہمارے پاس اگر کوئی بہترین آلہ [illegible] (Weapon) ہے تو وہ اسلامی ثقافت کا احیا ہی ہے اور ظاہر ہے اس کا سرچشمہ قرآن

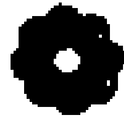
حکیم اور سنت رسول ﷺ ہی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

یا یھا الذین امنو اد خلوا فی السلم کافتہ ولا تتبعوا خطوت الشیطن انہ لکم علومبین (البقرہ 208)۔

ترجمہ و تفسیر: "اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے--- یعنی کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی کو اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات' تمہارے نظریات' تمہارے علوم' تمہارے طور طریقے' تمہارے معاملات اور تمہاری سعی و عمل کے راستے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کرکے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کرلو۔" (تفہیم القرآن' جلد اول' ص ص 160-159)۔

قرآن حکیم کی یہ دائمی ہدایت کہ "تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو" دراصل ہمارے نظریاتی' ثقافتی اور تعلیمی تشخص کی بقا کے لئے ہماری قطعی' مستقل اور کارگر دفاعی حکمت عملی ہے۔ اس کا شعور جتنا جلد امت مسلمہ کو ہوجائے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اس تعلیمی شعور کی بیداری کے لئے بلاشبہ استاد ہی سب سے زیادہ ذمہ دار اور مسئول ہے اور آج کی نئی عالمی ثقافتی جنگ کے حوالے سے نظریاتی دفاع کاری میں سالارِاعظم کا قائدانہ کردار بھی اسے ہی ادا کرنا ہے۔

(سہ ماہی مجلّہ تعلیمات لاہور' جلد 14' شمارہ 4' دسمبر 1991ء)



مغربی فلسفہ تعلیم

(چند اساسی اقدار پر تنقیدی نظر)

دنیا میں کوئی نظام تعلیم ایسا نہیں ہے جس کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی فلسفہ نہ ہو۔ یہ فلسفہ' زندگی سے متعلق چند دائمی نوعیت کے سوالات کے جوابات سے عبارت ہوتا ہے۔ ان سوالات میں سے ایک اہم سوال قدریات (Axiology) سے متعلق ہے۔ چنانچہ کسی معاشرہ کا بے خدا تعلیمی نظام ہو یا خدا پرستانہ نظام' یہ جن مقاصد کی روشنی میں تشکیل پاتا ہے' ان کا سرچشمہ وہی اقدار ہوتی ہیں' جن کو اس معاشرہ میں اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ذیل میں مغربی معاشرہ کی چند اہم اقدار دی جا رہی ہیں' جو پورے نظام زندگی بالخصوص تعلیمی نظام کو متاثر کرتی ہیں:

انکار مذہب' لادینیت یا سیکولرازم

مغربی معاشرہ میں انکار مذہب اور لادینیت معروف قدریں ہیں۔ اول تو مذہب کا انکار کیا جاتا ہے یا مذہب کو مانا تو جاتا ہے لیکن مذہب محض انفرادی زندگی تک ایک نجی معاملہ رہتا ہے اور نظام اجتماعی میں یہ عملی زندگی سے خارج ہوتا ہے۔ نیوٹن' گیلیلیو' خدا کے منکر نہ تھے۔ مگر یہ کائنات کے اسرار کی جستجو الٰہی نظریہ سے قطع نظر کرکے ان قوتوں کو تلاش کرنا چاہتے تھے' جو اس نظام کو چلا رہی ہے۔ حقیقت میں الٰہی نقطہ نظر سے قطع نظر کرنا ہی اس دہریت' نیچریت اور لادینیت کا تخم تھا۔

غیر جانبداریت یا نظریہ اضافیت

ہر شخص کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ خدا' کائنات' زندگی' اور آخرت کے متعلق اپنا نقطہ نظر خود وضع کرے۔ ان سوالات کے بارے میں وہ جو چاہے عقیدہ اختیار کرے' اس پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ تعلیمی ادارہ میں طلبہ کو کسی مخصوص مذہب اور اخلاق کی تعلیم نہ دی جائے۔ اس معاملے میں وہ غیر جانبدار رہے۔ طالب علم [illegible] نا مذہب اور اخلاق خود وضع کرسکتا ہے۔ حقیقت میں مغرب میں فلسفہ' آزاد خیالی (Free Th'nking) ہے۔ [illegible] متعارف کر دی [illegible]

آزادی یا لبرل ازم

مغربی نظام میں ماضی کی دائمی مذہبی روایات اور اقدار سے بغاوت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس حوالے سے اس نظام میں آزادی ایک بہت اہم قدر ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے افراد کو معاشرہ میں مکمل طور پر آزادی حاصل ہے۔ مذہب' اخلاق اور معاشرتی ضابطے (Social Checks) کو اس آزادی کی راہ میں قید' بندش اور رکاوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں تک تعلیمی نظام کا تعلق ہے' لبرل ازم مذہبی اخلاقیات کو تعلیمی نصابیات سے خارج کرتا ہے اور اس معاملے میں نام نہاد غیر جانب داریت کا درس دیتا ہے۔

حیاتیاتی تعلیم

فطرت کو ہی اصل حقیقت مانا گیا۔ چارلس ڈارون نے مسئلہ ارتقاء کے زیر اثر انسان کو ایک حیوان قرار دیا۔ کارل مارکس نے اس حیوان کے لئے سب سے زبردست محرک عمل' خواہش شکم پروری کو اور فرائیڈ نے جنس کو قرار دیا۔ چنانچہ انسان کی خواہشوں اور آرزوؤں کی تشریح اور تعبیر حیوانی زندگی کو معیار مان کر کی گئی۔ انسان کا مفہوم حیاتیاتی رہ گیا اور اس طرح زندگی میں ہوس پرستی نے توقیر حاصل کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو چیز حیوان کے ہاں ضروری ہے وہی انسان کے لئے ضروری قرار دی گئی۔ حالانکہ انسان اور حیوان میں فرق کرنے والی چیز صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حیوان کا کوئی مقصد زندگی نہیں اور انسان کا مقصد زندگی ہے۔ دور حاضر کا مغربی حیوانی نظریہ ازدواج اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

زمانہ پرستی' ترقی پسندیت یا نظریہ حرکت

مغربی نظام حیات کی ایک معروف قدر زمانہ پرستی ہے۔ یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ ہر جدت خیر ہے اور ہر قدامت شر ہے۔ دور جدید کی ہر شے کامیاب اور خیر ہے اور دور قدیم کی ہر شے ناکام اور شر ہے۔ خیر و شر کا یہ افلاطی پیمانہ' مغرب کے لادینی ذہن کی پیداوار ہے۔ ترقی پسندوں کے نزدیک کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے۔ کسی عقیدہ' کسی قدر' کسی نظریہ کو یہاں دوام حاصل نہیں ہے۔ ہر جدید' قدیم سے افضل ہے۔ قدیم ہونا ذلت اور رسوائی کی علامت ہے اور جدید ہونا خوبی اور کمال کی علامت ہے۔ ترقی کا ضامن نظریہ حرکت ہے۔ ترقی پسند ہونا قابل تعریف ہے اور رجعت پسند ہونا قابل مذمت ہے۔

قوم پرستی

وطن پرستی اور قوم پرستی مغربی نظام حیات کی بہت ہی طاقت ور قدریں ہیں۔ دھرتی یا زمین یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومیت کا تصور [illegible]

قومیت کا تصور تسلیم نہیں کیا جاتا۔

نظریہ افادیت

ہر وہ شے خیر ہے جو مادی لحاظ سے نافع اور مفید ہو اور ہر وہ شے شر ہے جو مادی لحاظ سے مضر اور نقصان دہ ہے۔ یہ مادی معیار خیر و شر' نظریہ افادیت (Pragmatism) کہلاتا ہے۔ انسان کو حیوان قرار دے کر اور اخروی زندگی کا انکار کرنے کے بعد' زندگی کا یہی مقصود ان کے نظام فکر سے ہم آہنگ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اب صرف مادی فوائد کے خواہاں ہیں اور بے لوثی اور اخروی اجر و ثواب سے قطعاً" نابلد۔ اس طرح زر پرستی نے تعلیم کا تعلق پیٹ اور نوکری سے جوڑا۔ اصل میں اس بنیادی فریضہ یعنی "انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے" نے مادہ پرستی' کے لئے بنیادی ستون کا کام کیا۔ معروف فرنچ فلاسفر ڈیکارٹ (Descartes) جو مغربی فلسفہ کا قائد سمجھا جاتا ہے' مذہب کا منکر نہ تھا۔ لیکن اس نے عالم طبعی کی توجیہہ میکانکی بالخصوص عقلی اور ریاضیاتی طریق پر کرنے کی ابتداء کی۔ بعد میں یہی طرز فکر' مادہ پرستی (Materialism) بن گیا۔

میکانکی اخلاقی صفات

مغربی نظام تعلیم کا اہم ترین مقصد بقائے ذات (Self-Preservation) ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے چند میکانکی اخلاقی صفات طلبہ میں پیدا کی جاتی ہیں تاکہ عملی زندگی میں وہ کام دیں۔ اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کسی مستقل نظام حیات یا کسی مذہب کی روشنی میں طلبہ کی تشکیل سیرت کی جائے۔ بلکہ ایک مادی معاشرے کے لئے جو میکانکی اخلاقی صفات مطلوب ہیں' ان میں جرات' جسارت' محنت' مستقل مزاجی' جدت' تاجرانہ اخلاقیات اور کچھ شہرت سے متعلق صفات اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ نظام تعلیم اپنے طلبہ کو ان صفات کی تعلیم' حصول رضائے الٰہی کے نہیں' بلکہ بقائے ذات کے لئے دیتا ہے' تاکہ اس حوالے سے "اچھے شہری" (Good Citizen) تیار کر سکے۔ چنانچہ اس میکانکی فلسفہ اخلاق میں کوئی مستقل معیار خیر و شر نہیں ہوتا۔ بلکہ بہترین انسان کے بجائے ایک بہتر شہری ہونے کے لئے وہ معاشرہ اپنے لئے کچھ معیارات خود متعین کر لیتا ہے۔

حسیاتی علم یا سائنسی تجربیت

ہابس (Hobbes) فوق الطبیات (Supernatural) کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے۔ وہ اس روحی قوت کا قائل نہیں جو اس مادی دنیا میں تصرف کرنے والی ہو۔ نیچری فلسفہ کے تحت حقائق اور صداقتیں بس وہی ہے جو تجربہ اور مشاہدہ میں آئی ہو۔ واقعات کی انتہائی

توجیہہ اس ذریعہ علم کے حوالے سے غیر حقیقی ہے۔ اس نقطہ نظر سے حسی تمدن (Sensate Culture) کو اہمیت حاصل ہوئی۔

طبعی، نفسیاتی، تاریخی اور سیاسی توجیہہ

○ طبعیات

یہ کائنات بس کچھ قوانین فطرت کے تحت بندھی ہوئی ہے۔ تمام چیزیں عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہیں۔ اصل حقیقت نیچر ہی ہے۔ یہ تصور ختم کیا گیا کہ کائنات کے پیچھے کوئی فعال اور قادر خدا ہے۔ اس کے برعکس بے خدا سائنس میں اس کلیہ کو بنیاد بنایا گیا کہ حیوان اور انسان سب مشینیں ہیں جو طبعی قوانین کے تحت چل رہی ہیں۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اس نیچریت اور مادیت کو استحکام بخشا اور اس نظریہ کو پروان چڑھایا کہ مظاہر فطرت کے لئے فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور علت کی حاجت نہیں۔

○ نفسیات

مذہب انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے۔ انسانی رویوں، ضرورتوں اور دلچسپیوں کی توجیہہ حیاتیاتی اور حیوانی نظریہ کے تحت کی گئی۔ یوں وحی الٰہی کو مستقل اور حتمی ذریعہ علم کے طور پر تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا اور اس طرح تعلیم کے انسانیاتی تصور کی نفی کی گئی۔

○ تاریخ

تاریخ کی تعبیر مادی حوالے سے کی گئی۔ کوئی مستقل عقیدہ یا اخلاقی نظریہ نہیں بلکہ وہ وقت کے اقتصادی حالات کی پیداوار ہیں۔ اس کے برعکس تاریخ کی اخلاقی تعبیر کے تحت ترقی کا اصل معیار مادیت سے زیادہ انسان کی اخلاقی اور روحانی ترقی ہے کیونکہ انسان کے اخلاقی کردار کی ترقی کے بغیر مادی ترقی بھی اپنے نتائج کے لحاظ سے ادھوری اور ناقص رہتی ہے۔

○ سیاست

مغربی نظام فکر حاکمیت جمہور کے فلسفہ کو ہی سیاسی قدر تسلیم کرتا ہے یعنی صداقت وہی ہے جس کا فیصلہ اکثریت کرے۔ کسی دائمی تصور صداقت کی پیروی کی ضرورت نہیں بلکہ لوگ جو چاہیں وہی کیا جائے۔

طبعیات، نفسیات، تاریخ اور سیاست کی اس تعبیر نے درحقیقت لامذہبیت اور لاوہنیت کو جنم دیا۔

(انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے

سکینڈری ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کے زیر اہتمام فلسفہ تعلیم کے حوالے سے ایم اے ایجوکیشن / ایم ایڈ کے طلبا و طالبات (سیشن 90-1988) کو ایک خصوصی لیکچر دیا گیا۔ اس لیکچر کی تیاری میں' پروفیسر سید محمد سلیم کی کتاب "مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ" سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ لیکچر کا خلاصہ سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 1' شمارہ 1' اپریل 1990ء میں شائع ہوا)۔



اسلامی فلسفہ تعلیم: ایک خاکہ

اسلامی فلسفہ حیات کے تناظر میں تعلیم وہ ہے جو انسان کو ہدایت الٰہی کی روشنی میں ذہنی، جسمانی اور طبعی قوتوں کے ذریعے اس طرح تصرف کے قابل بنائے کہ روحانی اور اخلاقی اقدار کا فروغ رضائے الٰہی کے حصول کا وسیلہ بنے اور بالآخر اخروی فوزوفلاح حاصل ہو۔ یہ اجمالی تعریف، تعلیم کی وہ فکری اساس (Philosophical Foundation) متعین کرتی ہے، جس پر اسلامی نظام تعلیم و تربیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ذیل میں اس عمارت سے متعلق چند اہم نکات پر مشتمل ایک خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

فکری اساس

○ فلسفہ تعلیم کے ضمن میں سب سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اسلام محض مذہبی عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ایک دین یعنی ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ وہ کسی مجرد علمی فکر یا فلسفہ تک محدود نہیں رہتا، بلکہ صالح فکر اور صالح عمل کے امتزاج سے زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی رہنمائی کے لئے ایک جامع، متوازن اور صحت مند تحریک برپا کرتا ہے۔

○ اسلامی فلسفہ تعلیم کا اساسی نکتہ یہ ہے کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی، بلکہ کائنات کی پیدائش ایک علیم و خبیر ہستی اللہ تعالیٰ کے منصوبے، ارادے اور علم کا تقاضا ہے۔ حقیقت اعلیٰ (Ultimate Reality) اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ علم کا حقیقی سرچشمہ بھی وہی ہے۔ سب سے برتر، قطعی اور دائمی سرچشمہ علم (Ultimate Source of Knowledge) وحی الٰہی ہے اور اس کی صورت قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بامقصد بنائی اور اس میں انسان کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے خلیفہ یا نائب کی ہے، جس کی زندگی کا اہم مقصد اللہ کی بندگی ہے۔ اس حوالے سے قدر اعلیٰ (Root Value) رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

○ تعلیم کی اسلامی تشکیل میں اصل فکری نقطہ یہی تصور قدر ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی امور میں اللہ کی رضا کے سامنے بلاچون و چرا سر تسلیم خم کر دے، اور خدا کا اطاعت شعار بن جائے۔ اس سلسلے میں مستقل کسوٹی خدا کا دین ہے، یعنی جو کچھ دین اسلام میں ہے، وہ [illegible] اور جو اس سے باہر ہے وہ شر، غیر نافع اور غیر پسندیدہ ہے۔ اس

ضمن میں تعلیم نہ غیر جانب دار ہے اور نہ اقدار سے بے نیاز۔
○ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی دائمی ہے' جہاں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی ہے۔ حقیقت میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل' تنفیذ اور تکمیل میں اصل قوت نافذہ اسلام کا تصور آخرت ہے۔ یہی اسلامی احتساب (Accountability) کے ماڈل کی اصل روح ہے' جو معاشرہ کے ہر فرد اور ہر ادارے کو صحت مند بناتی ہے۔
○ بحیثیت مجموعی' اسلام کے تعلیمی نظام فکر کا مستقل' اعلیٰ اور بالاتر ماخذ' قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہے۔ باقی تمام ذرائع علم چاہے وہ تعقلی (Rational) ہوں یا حسیاتی (Empirical)' وہ اسی برتر سرچشمہ علم یعنی وحی الٰہی کے تابع ہیں۔

مقاصد تعلیم

تعلیم کا سب سے اہم نصب العین ایسے انسان کی تیاری ہے جو خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریوں کو پورا کر سکے۔ اس تصور نیابت کی روشنی میں حصول تعلیم کا اصل مقصد' یہ حکمت وبصیرت حاصل کرنا ہے کہ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں' کون سا نقطہ نظر اور کون سا طریق عمل' دین کے مطابق ہے۔۔۔۔ اصل میں مقاصد تعلیم کی تشکیل میں قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے ماخوذ اقدار ہی سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ اس حوالے سے اسلامی نظام فکر' ایسی نافع تعلیم کا داعی ہے جو تعلیم حاصل کرنے والے کو اس کے اصل مقصود یعنی خلافت ارضی کے فرائض اور تقاضوں سے واقف کرائے۔ چنانچہ یہ نظام فکر ایسی مجرد تعلیم کا قائل نہیں' جو اسلامی تہذیب کی نمائندہ اور ترجمان نہ ہو۔۔۔۔ خلاصہ کے طور پر اس رہنما اصول کی روشنی میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل میں درج ذیل مقاصد کو اہمیت حاصل ہے:

○ ایمان کی استقامت اور عمل صالح کی تربیت
○ مقصد حیات اور ہدایت الٰہی کے علم کا حصول
○ قیادت عالم کے فرائض کی اہلیت
○ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے تیاری
○ امت واحدہ کی تشکیل
○ مادی اور عسکری قوت کا حصول
○ تحقیقی اور اجتہادی صلاحیتوں کی نشوونما
○ جہاد فی سبیل اللہ اور آخرت میں جواب دہی کے احساس کی پختگی

نصاب تعلیم

○ نصاب تعلیم کی اہم علمیاتی اساس "العلم" ہے' جو درحقیقت ایک جامع اور منفرد (Unique) نظریہ تعلیم ہے جو انسان کے مادی وجود اور روحانی وجود کی جائز ضرورتوں اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔۔۔۔ اور اس طرح بالآخر اس کے مادی یا حیاتیاتی وجود کو روحانی یا اخلاقی وجود کے تابع کرکے ایک متوازن شخصیت (Balanced Personality) تیار کرتا ہے۔ روحانی' اخلاقی یا اعتقادی وجود کی ضرورتوں سے نصاب تعلیم کو بے نیاز کرنا یا انہیں زندگی سے الگ کرکے ایک سیکولر انداز میں پیش کرنا' ایک ایسی منتشر شخصیت (Split Personality) تیار کرنے کا باعث ہوگا' جو اسلامی معاشرہ میں لازماً" عدم تسویہ (Mal-adjustment) کا شکار ہوگی۔

○ علم بلاشبہ ایک "اکائی" ہے۔ البتہ بعض مسلم مفکرین نے نصاب تعلیم کی وضاحت میں علوم کی درجہ بندی (Knowledge Classification) کی ہے' لیکن ان کا مقصود بہرحال یہ واضح کرنا تھا کہ انسانی تدبر و تفکر اور تجربہ و تحقیق ضروری ہیں' لیکن انہیں لازماً" دائمی اور برتر ذریعہ علم کے تابع مرتب ہونا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم مفکرین نے اس نصاب کو جامع اسلامی نصاب تسلیم نہیں کیا' جس میں اسلامیات کا مضمون محض ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہو' لیکن باقی مضامین اسلامی روح سے خالی ہوں۔ چنانچہ پہلی اسلامی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ المکرمہ نے جہاں علم کی دو صورتوں یعنی ہدایتی یا الہامی علم (Revealed Knowledge) اور وضعی یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کا حصول ضروری قرار دیا ہے' وہاں ہدایتی' الہامی یا دینی علم کو سب پر فوقیت دی ہے۔ اس طرح جب وضعی' اکتسابی یا دنیوی علم۔۔۔۔ ہدایتی یا دینی علم کے تابع ہوں گے' تو یہی "العلم" کی صورت ہوگی۔ چنانچہ امام غزالیؒ کی اصطلاح میں "فرض عین" کا جاننا ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے اور یہی وہ نصاب ہے جو ہر مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے۔ اس تناظر میں قرآن حکیم اور مطالعہ حدیث کو نصاب میں بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔

○ ہر سطح کے نصاب کی تشکیل میں رہنما اصول' دین و دنیا کی وحدت' تشکیل سیرت اور مسلم معاشرہ کی جائز ضروریات کی تکمیل ہیں۔ یوں اسلامی نصاب تعلیم' سیکولر اور ملحدانہ نظریات کی نفی کرتے ہوئے افراد معاشرہ کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دنیا کو اس راستے پر لائیں جو معروف ہے اور اس سے روکیں جو منکرات کی طرف لے جاتا ہے۔ نصاب تعلیم کا یہی وہ قائدانہ وظیفہ ہے جو افراد کو قیادت عالم کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل بناتا ہے۔

○ ہر سطح کے نصاب تعلیم کی تدوین' ہر مضمون کے تدریسی لوازمہ' غرض پورے نظام [illegible] میں درجہ بدرجہ الہامی عناصر کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ الہامی

عناصر وہ اہم نکات ہیں' جنہیں قرآن حکیم نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقاصد کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان مقاصد کے حوالے سے امت مسلمہ کے ہر فرد بالخصوص تعلیم و تعلم سے وابستہ افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تربیت افراد کے ضمن میں ان مقاصد کو پیش نظر رکھیں۔۔۔۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ ترجمہ: "جس طرح ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا' جو تمہیں ہماری آیات سناتے ہیں' تمہارا تزکیہ کرتے ہیں' تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں' اور تمہیں وہ کچھ سکھاتے ہیں جو تم نہیں جانتے" (البقرہ: 151)۔

ا۔ تلاوت آیات یعنی قرآن حکیم کی تعلیم

ب۔ تزکیہ یعنی اخلاقی تربیت

ج۔ تعلیم کتاب یعنی تفہیم قرآن

د۔ تعلیم حکمت یعنی خدا کی عطا کردہ قابلیتوں کو دعوت الی الخیر کے لئے بروئے کار لانا

ہ۔ ایسے امور کی تعلیم جو پہلے سے علم میں نہ تھی یعنی سمع و بصر اور فواد کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے تحقیق و اجتہاد کی قابلیت

○ نصاب تعلیم میں ترجیحات کے نقطہ نظر سے قرآن و سنت کی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ عمرانی اور طبعی علوم ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور عمرانی و طبعی علوم میں بھی۔۔۔۔ عمرانی علوم کو فوقیت دی جاتی ہے' کیونکہ ان علوم کے ذریعے انسانی زندگی کے مسائل اور تہذیبی معیارات سے بحث کی جاتی ہے۔ اس سے اصل مقصود یہ ہے کہ اسلامی نصابات کی ترجیحات اور لوازمات میں تعلیم کے تہذیبی شعور کو مادی شعور پر بالادستی حاصل ہو۔ نصاب تعلیم میں سائنس' ٹیکنالوجی اور جدید عصری مطلوب فنی علوم کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے' اور قیادت عالم کے لئے ان کا حصول اہمیت بھی رکھتا ہے' لیکن ان تمام علوم کی تحصیل' ترویج اور تحقیق میں اسلامی فکر کو لازمی حیثیت حاصل ہوگی۔ ورنہ اس کے بغیر اس بات کا خدشہ موجود رہتا ہے کہ انسان آفاقی قدروں بالخصوص ایثار' قربانی' عدل اور احسان سے دور ہو جائے اور بالآخر ظالمانہ روش اختیار کر لے۔

تربیت اساتذہ

○ اسلامی فلسفہ تعلیم میں استاد ایک واجب الاحترام شخصیت ہے۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے۔ اسلامی نظام تعلیم میں' استاد کی محوری حیثیت کے پیش نظر' اس کی تعلیم و تربیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تربیت اس بنیادی اصول پر تشکیل پاتی ہے کہ استاد کا فریضہ صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ

کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے۔

○ علم اور تربیت کے امتزاج سے تشکیل پایا ہوا نظام ہی اعلیٰ نظام ہے۔ تربیتی نقطہ نظر سے استاد کی شخصیت بڑی منفرد اور نمایاں ہے' جس سے طلبہ اچھائی کے معاملے میں بھی اور برائی کے معاملے میں اثر قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ استاد اپنی یہ ذمہ داری سمجھتا ہے کہ اس کا اپنا علمی اور اخلاقی تشخص بھی مثالی ہو اور اس کے طلبہ کا معیار علم اور معیار اخلاق بھی بلند ہو۔ اسی لئے اسلامی نظام تربیت میں استاد محض نفس مضمون اور طریقہ ہائے تدریس کا ماہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مربی' داعی' مزکی' اور مصلح بھی ہوتا ہے۔۔۔۔ اور حقیقت میں اس کا یہ داعیانہ کردار' اس کے دیگر وظائف (Roles) پر غالب ہوتا ہے۔ یہی وہ تناظر ہے جس میں تربیت اساتذہ کے سارے نصابی وہم نصابی عمل کی اسلامی تشکیل کی جاتی ہے۔

○ ہر سطح کے اداروں میں اساتذہ کے انتخاب (Selection) میں علمی اور فنی مہارت کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریہ حیات سے وابستگی اور سیرت و کردار کی پختگی کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ بلکہ ثانی الذکر کو اول الذکر پر فوقیت دی جاتی ہے۔

○ اسلامی ریاست کا کردار معلمانہ ہوتا ہے' وہ اس بات کی ذمہ دار ہوتی ہے کہ اساتذہ کا معاشرتی اور معاشی مقام و مرتبہ (Socio-Economic Status) بلند ہو۔ ان کو وہ تمام ضروری سہولتیں میسر ہوں جو ایک اسلامی فلاحی ریاست کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ اسلامی ریاست کے بجٹ میں اولیت' معلم اور متعلم کو ہی دی جاتی ہے اور حقیقت میں ان کو فوقیت دیئے بغیر ایک مہذب ریاست کا تصور ممکن نہیں۔

تعلیمی معیارات

○ اسلامی فلسفہ تعلیم میں جہاں تعلیم کا تصور وسیع ہے' اسی طرح تعلیمی معیار کا تصور بھی وسیع ہے یعنی معیار کی جانچ کرتے ہوئے طالب علم کی تعلیمی استعداد ہی نہیں' بلکہ اس کی شخصیت و کردار کو بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم میں عالم بے عمل کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔

○ دوران تعلیم' طلبہ کے اخلاق و کردار کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ تعلیمی معیار کو جانچنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ آیا ضروری معلومات کے ساتھ ساتھ طلبہ میں اسلامی فکر اور اسلامی طرز عمل بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں۔ چنانچہ طالب علم کے علمی معیار کے برتر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مضمون میں کامل [illegible] اخلاق و کردار میں بھی مثالی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اساتذہ

کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ طلبہ کی اصلاح و تعمیر اور ان کی ہمہ گیر نشوونما کے پیش نظر ان کا جامع علمی اور اخلاقی ریکارڈ مرتب کریں۔

○ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور روایات کے حوالے سے ہر چند کہ داخلی طرز امتحان (Internal System of Examination) کو اہمیت حاصل ہے' لیکن امتحانات کا اصل فلسفہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مقاصد کی تکمیل کس حد تک ہوئی؟ چنانچہ نظام امتحان چاہے داخلی (Internal) ہو یا خارجی (External) یا دونوں کا امتزاج' ان کا اصل مقصود یہی ہوتا ہے کہ اہداف کی تحصیل و تکمیل خوب سے خوب تر ہو۔ بہرحال اس کے لئے جہاں طریق امتحان کا موثر ہونا ضروری ہے' وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس نظام کو چلانے والے اساتذہ اور منتظمین بھی قابل' دیانت دار اور امین ہوں' اور اس حوالے سے ان کی تربیت بھی ہوئی ہو۔

○ نظام امتحان کے سلسلے میں سائنسی تحقیقات اور منضبط تجربات سے بھی استفادہ ضروری ہے' تاکہ جانچ پرکھ کے موثر معیارات تشکیل پا سکیں۔

چند دیگر نکات

○ علم مومن کی میراث ہے۔ اس کی تحصیل' ترویج اور اشاعت فرض اور عبادت ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام تعلیم' معاشرہ کی فلاح و ترقی کے لئے ہر شخص کے اندر حصول علم کی آرزو اور اشاعت علم کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ اس حوالے سے یہ ایک خود کار نظام تعلیم ہے۔

○ علم' انسان کی بنیادی فطری ضرورت ہے۔ اس کا حصول مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے۔

○ ملی یک جہتی اور وحدت اور امت کے لئے ہر سطح کے تعلیمی اداروں میں ممکنہ حد تک درج ذیل اہم صفات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

(ا) مفت اور لازمی تعلیم (ب) غیر طبقاتی تعلیم (ج) یکساں نصاب تعلیم

(د) یکساں طریق تربیت (ذ) یکساں سہولیات (ہ) یکساں طریق امتحان

○ اسلام کے سارے اہم ماخذ چونکہ عربی زبان میں ہیں۔ اس لئے اسلامی تہذیب کے تحفظ اور احیاء کے لئے اور اسلام کی روح کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کی تعلیم کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں اس زبان کی تعلیم و تدریس ابتدائی سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے نصاب میں بالعموم لازمی رہی ہے۔

○ طلبہ تک اسلامی ثقافتی ورثہ کی منتقلی کے لئے تعلیمی اداروں اور معاشرے کے تعلق کو ہمیشہ پیش [illegible]

نظر رکھا گیا۔۔۔ یہ روایت کم از کم دینی مدارس کی سطح تک آج بھی قائم ہے کہ جہاں مسجد ہے' اس کے ساتھ مدرسہ بھی قائم ہے' اور جہاں دینی مدرسہ ہے وہاں مسجد بھی قائم ہے۔ تعلیمی ادارہ میں علمی' روحانی' اخلاقی' ذہنی اور جسمانی صحت نیز جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے عسکری تربیت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ان سرگرمیوں کی تکمیل میں ریاست کے تمام معاشرتی اداروں (Social Institutions) کا کردار ہے' لیکن مسجد ایک ایسا معاشرتی ادارہ ہے' جس کو مرکزی مقام حاصل ہے۔

○ علم کا حصول مسلمان مردوں اور عورتوں دونوں پر فرض ہے۔ لہٰذا خواتین کی تعلیم کے لئے بھی پورے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔ تمام نصابی سرگرمیاں خواتین کی جائز ضرورتوں کی روشنی میں مرتب کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ تمام سرگرمیاں لازماً" حیادارانہ ماحول اور قانون حجاب کے دائرہ کے اندر ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام تعلیم میں مخلوط تعلیم کی گنجائش نہیں۔ خواتین اعلیٰ ترین تعلیم و تربیت بھی حاصل کر سکتی ہیں' لیکن اپنے الگ تعلیمی اداروں اور اپنے مخصوص تہذیبی ماحول اور موضوعات کے تناظر میں۔

○ درس گاہوں' قیام گاہوں' کھیل کے میدانوں' تعلیمی سیرو تفریح اور دیگر ہم نصابی سرگرمیوں کے سارے ماحول کو اسلامی اخلاقیات کے مطابق مرتب کیا جاتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر نصابی سرگرمی میں اصل معیار نقد' اسلامی تہذیب ہی ہوتا ہے۔

○ تعلیمی انتظامیہ کو ملی تقاضوں کے مطابق تیار کرنے کے لئے ان کی مناسب نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے' تاکہ اسلامی تشکیل و تنفیذ میں صالح قیادت اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ اس رخ پر تعلیمی انتظامیہ کی تربیت' اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

○ تعلیمی اداروں میں اساتذہ' طلبہ' طالبات' منتظمین اور دیگر سٹاف کا لباس سادہ اور ساتر ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی مجموعی فضاء میں اسلامی ثقافت کی فضاء غالب ہوتی ہے۔

○ اسلامی نظریہ تعلیم کی رو سے معلم اور متعلم دونوں قابل احترام ہیں۔ اسلام نافع علم کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو عبادت کہتا ہے۔ اس حوالے سے امت مسلمہ کے ہر فرد کو لازماً" تعلیم و تعلم کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ چاہے یہ گزر رسمی ہو یا غیر رسمی۔ اس تناظر میں تعلیم عامہ' عمومی خواندگی اور تعلیم مسلسل (Continuing Edutation) کا انتظام اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ تعلیم کے فروغ کے لئے سرکاری کوششوں کے علاوہ نجی کوششیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں' لیکن ان سب کاوشوں کی فکری اساس اسلامی نظریہ [illegible] اسلامی ریاست کی مادی سہولتیں اور ابلاغ کے تمام ذرائع' تعلیم

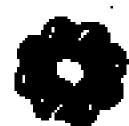
تربیت' تزکیہ اور تبلیغ کے لئے ہی وقف ہوتے ہیں۔ آج اسلامی ریاستوں میں مغرب کے زیر اثر جو خواندگی کی تحریکیں (Literacy Movements) اور دیگر نجی تعلیمی تنظیمیں (NGOs) کام کر رہی ہیں' وہ تہذیبی لحاظ سے اس لئے ناکام ہو رہی ہیں' کہ انہوں نے اپنی نصابی سرگرمیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات (جس نے ساری کائنات اور کائنات کی ہر شے پیدا کی) سے مربوط نہیں کیا۔ حالانکہ مسلمانوں کو پہلی ہدایت ہی یہ دی گئی کہ پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھو' لیکن اس کے لئے شرط یہ رکھی کہ پڑھنے اور لکھنے کا تعلق اپنے رب سے جوڑو' کیونکہ انسان کو جو کچھ حاصل ہوا' وہ اللہ ہی کی عنایت ہے۔ اس رشتہ و تعلق کے بغیر' تعلیم و تعلم کی تحریکیں' اسلامی معاشرہ کے مسائل کا حل نہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ ترجمہ: "پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا" (العلق) : 1)۔ "جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔" (العلق :4 - 5)۔ "قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھتے ہیں" (قلم : 2)۔

○ اسلامی ریاست کے تحفظ و دفاع' ہر نوع کے ظلم کے خلاف جہاد' صحت عامہ اور فلاحی خدمت کے لئے عسکری' جسمانی' اخلاقی اور تعلیمی تربیت ضروری ہے۔

○ ہر شعبہ زندگی' بالخصوص تعلیمی و انتظامی شعبہ میں قیادت (Leadership) کے منصب پر فائز افراد کی تربیت اور قابل افراد کا انتخاب اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ ایسے افراد کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ قابلیت کی اہمیت اپنی جگہ' لیکن اسلامی نظام فکر میں ان کی اخلاقی پاکیزگی اور ان کے مجموعی اسلامی تشخص کو فوقیت دی جاتی ہے۔ کیونکہ صالح علمی قیادت کے بغیر' تعمیری تعلیمی انقلاب ممکن نہیں۔

○ اسلامی ریاست کا مجموعی کردار معلمانہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔ قومی بجٹ میں تعلیم و تربیت کو اہمیت اور ترجیح دی جاتی ہے نیز سرکاری اور نجی سطح پر تمام لوگ اس کار خیر میں شریک ہوتے ہیں۔

(ماہنامہ تعلیمات لاہور' جلد 9' شمارہ 5-4' مئی 1986ء --- ماہنامہ شمس الاسلام' بھیرہ' (تعلیم نمبر)' شمارہ 5-4' جلد 62' اپریل مئی 1988ء)



حکمت تدریس

حکمت تدریس اور معلم انسانیت ﷺ

(چند اہم اساسی نکات)

عمل تعلیم کے مختلف عناصر کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے' لیکن اسلامی نظام تعلیم کے حوالے سے معلم اور اس کی حکمت تدریس کو مرکزی اور محوری حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں تدریسی عمل ایک بے جان اور میکانکی عمل کا نام نہیں' یہاں تو استاد کو نہایت ہی ارفع اور اعلیٰ مقام حاصل ہے جو ایک مقدس روحانی احساس کی مانند تعلیمی عمل کی باقی تمام چیزوں پر حاوی ہے۔۔۔۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نبی اکرم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ کا انتہائی مختصر لیکن مفہوم کے لحاظ سے جامع جواب یہ تھا کہ "نبی ﷺ کا اخلاق تو عین قرآن ہے۔" گویا معلم انسانیت ﷺ محض نصاب (قرآن حکیم) کی تفہیم ہی نہیں فرما رہے تھے' بلکہ خود اس نصاب کی تعلیمات کا عملی پیکر بھی تھے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ایک مسلم سوسائٹی کے استاد کو پورے تعلیمی عمل کا انتہائی موثر اور کارگر جزو بنا دیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ استاد کی شخصیت کی جامعیت میں حسن بیان کا پہلو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احترام' شفقت' محبت اور حکیمانہ انداز کے ساتھ ساتھ زبان کی شگفتگی' جملوں کی مناسب ساخت' اور لہجے کا اتار چڑھاؤ یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں۔ گویا استاد کا کام طلبہ کی تربیت و اصلاح' معلومات کے انتقال اور اپنے مثالی کردار کا تاثر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق کو بے رنگ انداز میں بیان نہ کر ڈالے بلکہ اپنی شیریں مقالی سے اپنے درس کو دلچسپ اور پرکشش بنائے۔۔۔۔ معلم انسانیت ﷺ کی حکمت تدریس میں شیریں بیانی ایک بنیادی وصف کا درجہ رکھتی تھی۔ آپؐ نے الہامی بصیرت سے کام لیتے ہوئے تدریس کی اس حکمت عملی کو اپنایا جو خود خالق کائنات نے اپنی آخری الہامی کتاب میں ملحوظ رکھی۔ یعنی حقائق کا اظہار' مواد کی تنظیم' گزشتہ اقوام نیز مختلف مظاہر کائنات کی مثالیں' روز مرہ زندگی سے تعلق رکھنے والی تشبیہات' بلیغ استعارے' اسلوب کی کشش اور اس کے ساتھ ساتھ باخبر رکھنے کیلئے وعید۔ حقیقت میں نبی اکرم ﷺ کا طریق دعوت و تعلیم وہی تھا جو قرآن حکیم کا تھا۔ اسی کتاب عظیم کی روشنی میں آپؐ کی حکمت ابلاغ ہی وہ موثر اور کامیاب طریق تھا جس نے دنیا کو جہالت کے اندھیرے سے نکالا اور اسے علم کی روشنی بخشی۔ حقیقت میں رسول اکرم ﷺ کی حکمت تدریس کے لاتعداد منور پہلو ہیں جن کا احاطہ

ممکن نہیں، تاہم ان میں سے چند اہم نکات کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ نکات دراصل اہم تدریسی اصول ہیں جو ایک مسلمان معلم اور تعلیمی قائد کے لئے مشعل راہ ہیں۔ (ان نکات کی تیاری میں سیرت النبیؐ مولفہ شبلی نعمانیؒ، سیرت سرور عالمؐ مولفہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، انسان کاملؐ مولفہ پروفیسر خالد علوی، اور بالخصوص محسن انسانیتؐ مولفہ نعیم صدیقی سے استفادہ کیا گیا)۔

انسانی نفسیات کا مطالعہ

رسول اللہ ﷺ موثر ابلاغ کیلئے فطرت انسانی کے اہم تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے۔ اس کے ساتھ مبتدی اور منتہی طلبہ کی طبعی اور ذہنی استعداد کو بھی پیش نظر رکھتے اور وقت، حالات اور ماحول کے مطابق اپنے انداز تعلیم اور اسلوب خطابت کو مرتب فرماتے تھے۔ پھر آپؐ نے طالب علم کیلئے طلبہ میں ذہنی فضا کی موجودگی کو بھی ضروری قرار دیا۔ آپؐ بالعموم صبح کی نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرماتے کیونکہ صبح کی نماز کے بعد انسانی قویٰ بالعموم قبول مضمون کیلئے زیادہ مستعد ہوتے ہیں۔ آپؐ نے وعظ و تقریر کی کثرت سے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر قوت خطابت کو انتہائی اعتدال سے استعمال کیا۔ آپؐ دعوت و تعلیم میں تدریج کا خیال فرماتے تھے، یعنی کون سی چیز پہلے اور کون سی بعد۔ آپؐ درج ذیل پانچ شعبوں کی مخصوص نصابی ضروریات، لوگوں کی نفسیات، مخصوص ماحول اور علاقائی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے طریق تعلیم میں بھی تبدیلی فرماتے اور الفاظ و تراکیب کے انتخاب میں بھی ان عوامل کو پیش نظر رکھتے۔ یہ تنوع صرف اس لئے تھا کہ دعوت موثر ہو اور مطلوب تعلیمی نصب العین کا حصول ممکن ہو۔

الف۔ عمومی تعلیم کا شعبہ : اس میں مسلمانوں کو بنیادی ضروری نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

ب۔ خصوصی تعلیم کا شعبہ : اس میں معیاری علماء اور قراء تیار ہوتے تھے۔

ج۔ خواتین کی تعلیم کا شعبہ : اس میں خواتین کو ضروری نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی۔

د۔ انفرادی تعلیم کا شعبہ : اس میں خاص خاص موقعوں پر خاص افراد کو انفرادی توجہ سے تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔

ہ۔ بیرونی وفود کی تعلیم کا شعبہ : اس میں باہر سے آنے والے وفود کو تعلیم دی جاتی اور پھر یہ لوگ قبائل میں واپس جاتے اور تعلیم دیتے۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا مجموعی اسلوب، قرآن حکیم کی ان آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔

ترجمہ: "میں نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں میری آیات

سناتا ہے' تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے' تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو اور کفران نعمت نہ کرو۔" (البقرہ : 151'152)۔

رسول اکرم ﷺ جو معلم کامل تھے ان کے اسوۂ معلمی کی روشنی میں استاد کا کام صرف ترسیل علم نہیں بلکہ تربیت و تزکیہ بھی ہے اور اس کیلئے ضروری ہے کہ معلم کو جہاں تعلیمی غایت کا شعور ہو' نصاب سے آگاہی ہو' وہاں انسانی نفسیات کا بھی گہرا ادراک ہو' تاکہ درج بالا ربانی تعلیمی اصول اور نصاب تعلیم کی تکمیل احسن انداز سے ہو سکے۔

خطابت

تعلیم کے بنیادی اجزاء میں سے ایک اہم جزو تکلم ہے اور تکلم کا ایک اہم جزو خطابت ہے۔ دعوت کو اچھے پیرائے میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کیلئے ضروری ہے کہ داعی مختلف ضروری صفات کے ساتھ ساتھ خطابت کے جوہر سے بھی آراستہ ہو۔ معلم کامل ﷺ حمد و ثناء کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز فرماتے۔ انداز بیان انتہائی صاف اور شستہ ہوتا۔ نرم خوئی' خیر خواہی اور لطافت آمیز طرز تعلیم آپ کی حکمت تعلیم کے بنیادی اوصاف تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپ کو "جوامع الکلم" عطا کئے گئے تھے۔ یہ نبی ﷺ کے وہ مختصر ترین جملے یا کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں معلم آخر الزماں ﷺ اپنی مثال آپ تھے اور اسے آپؐ نے خصوصی عطیات رب میں شمار کیا۔

رحمتہ للعالمین ﷺ کو فصاحت و جامعیت اور زور استدلال کے ساتھ ساتھ یہ منفرد امتیاز بھی حاصل تھا کہ آپؐ جو چیز کہتے تھے اس پر خود عمل بھی فرماتے تھے۔ آپؐ کی دعوت و تعلیم محض لفظی دعوت نہ تھی' بلکہ اس کے ساتھ عظیم اخلاقی قوت بھی موجود تھی۔ آپؐ نے الفاظ کی تاثیر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے ساتھ اخلاص' اخلاقی علو اور عمل کی شہادت شامل تھی۔ یعنی قول کے ساتھ ساتھ عمل صالح کی قوت متحرکہ نے آپؐ کو معلم عظیم کے منصب پر سرفراز فرما دیا تھا۔ صاحب خلق عظیم ﷺ جب مسجد میں خطاب فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدان جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگا کر۔ کبھی کبھی سواری پر سے خطاب کیا۔ تقریر میں جسم مبارک جامد نہیں رہتا تھا' بلکہ مضمون کی مناسبت سے بعض اوقات جسم دائیں بائیں جھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسب ضرورت حرکت دیتے۔ آپؐ کے لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ آپؐ کے خطاب میں دلچسپی اور کشش آخر تک رہتی تھی۔ جملے مختصر لیکن جامع

ہوتے تھے۔احادیث میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حکمت اور خوبصورت پیرائے میں اسلام کی دعوت کو عام لوگوں تک پہنچایا اور اس طرح انسانوں کی ایسی عظیم المرتبت جماعت تیار کی جس کی کوئی اور مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپؐ کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا۔ الفاظ نہ ضرورت سے زیادہ اور نہ کم۔ تاکید' تفہیم اور تحفیظ کیلئے خاص الفاظ اور کلمات کو دو تین بار دہراتے تھے۔ سرور عالم ﷺ کی شخصیت میں موجود حیا کی خوبی' آپؐ کے طرز کلام میں بھی رچی بسی تھی۔ آواز میں توازن تھا۔ دوران گفتگو ایک ہلکا سا تبسم آپ کے لبوں پر رہتا۔ آپؐ کی یہ رحمت و شفقت سے بھرپور مسکراہٹ طلبہ اور رفقاء کیلئے وجہ جاذبیت ہوتی۔ حضور ﷺ کے خطاب کا جہاں ادبی معیار انتہائی بلند تھا وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی پر تکلف یا تصنع آمیز زبان استعمال نہ فرمائی۔ اس طرح آپؐ اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے۔ جس موضوع سے اہل مجلس کے چہروں سے اکتاہٹ کا اثر محسوس ہوتا' اسے بدل دیتے۔ ایک ایک شریک مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپؐ نے فوقیت دی ہے۔ دوران تکلم کوئی غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کرکے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پورا کرکے پھر اس کی طرف متوجہ ہوجاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے۔ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ براہ راست نام لیکر ذکر نہ کرتے بلکہ عمومی انداز میں اشارہ کرنے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ مجلس میں ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "محسن انسانیت ﷺ" مولفہ نعیم صدیقی)

رسول اکرم ﷺ کے خطاب' لیکچر یا انداز گفتگو کو اگر کوئی عنوان دیا جاسکتا ہے تو قرآن حکیم کے اس جملے سے کہ وقولو للناس حسنا (البقرہ : 83) اور لوگوں سے خوش اسلوبی کے ساتھ بات کیا کرو' حضور ﷺ اس آیت مبارکہ کی تفسیر مجسم تھے۔ آپؐ نے شیریں کلامی اور حکمت سے لوگوں کو تدبر و تفکر کی دعوت دی۔ کہیں لطیف انداز میں دلوں کو پگھلایا' کہیں استفہام کا اسلوب اختیار کیا اور کہیں استعجاب کا اصول استعمال کیا۔ غرض آپؐ نے مختلف اسالیب سے انسانی ذہنوں کو متاثر کیا۔ قرآن حکیم نے یہ واضح ہدایت دی:

"اے نبی ﷺ' نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کیے جاؤ' اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے" (الاعراف : 199 - 200)۔

ترجمہ: "اے نبی ﷺ' اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو" (النحل : 125)-

ترجمہ: "اور اے محمد ﷺ' میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو" (بنی اسرائیل : 53)

شخصی اوصاف

کامیاب تدریس' نتیجہ خیز دعوت اور موثر قیادت کا ایک اہم عامل (Factor) معلم' داعی اور قائد کے شخصی اوصاف ہیں۔ قرآن حکیم اور سیرت سرور عالم ﷺ سے ہمیں مطلوب اوصاف حمیدہ کی ایک جامع فہرست ملتی ہے' جس کی پیروی ہر مسلم معلم کے لئے لازمی لوازمہ نصاب (Essential Curricular Content) ہے۔ ذیل میں قرآن حکیم کی سورہ الاعراف کی صرف دو آیات کے حوالے سے جس دعوتی اسلوب کی تلقین کی گئی ہے' اس کے چند اہم تفسیری نکات "تفہیم القرآن" سے پیش کئے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ الاعراف میں نبی اکرم ﷺ سے دعوتی اسلوب کے بارے میں فرمایا:

ترجمہ: "اے نبی ﷺ' نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کیے جاؤ' اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو' وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔" (الاعراف : 199-200)-

سورہ الاعراف کی ان آیات کی تفسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ "ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصد صرف حضور ﷺ ہی کو تعلیم دینا نہیں بلکہ حضور ﷺ کے ذریعہ سے ان سب لوگوں کو ہی حکمت سکھانا ہے جو حضور ﷺ کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اٹھیں۔" (تفہیم القرآن جلد دوم' ص 111)- سید مودودی کے لفظوں میں حق کی دعوت دینے والے ایک کامیاب معلم' داعی اور قائد کے لئے درج ذیل صفات کا حامل ہونا انتہائی ضروری ہے:

○ اسے نرم خو' متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق' عامتہ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے' نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہئے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی' بہتان تراشی' ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو' اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔

سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعال طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں۔ اسی چیز کو نبی ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا' دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں' جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں' جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اس کا حق دوں' جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں" اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو کرتے تھے جنہیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بشروا ولا تنفروا ویسروا ولا تعسروا" یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لیے مژدہ جانفزا ہو نہ کہ باعث نفرت' اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔"

(تفہیم القرآن' جلد دوم' ص 111)

○ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقل عام(Common-sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعی حق کا اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتا ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتا ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان' خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں' جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں' تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعی حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن' جلد دوم' ص ص 111 - 112)

○ دعوت کے کام میں جہاں یہ بات ضروری ہے کہ طالبین خیر کو معروف کی تلقین کی جائے وہاں یہ بات بھی اتنی ہی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ الجھا جائے خواہ وہ الجھنے اور الجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اتر آئے اور حجت بازی' جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔

(تفہیم القرآن' جلد دوم ص 112)

○ جب کبھی داعی حق مخالفین کے ظلم اور ان کے شرارتوں اور ان کے جاہلانہ

اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً" سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغ شیطانی (یعنی شیطان کی اکساہٹ) ہے اور اسی وقت خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوت حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوت حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے۔

(تفہیم القرآن، جلد دوم، ص 112)

آج ہمارے تعلیمی منتظمین اور ٹیچر ایجوکیٹرز جو تربیت اساتذہ کے نصابات کی تشکیل اور اس حوالے سے تعلیم و تدریس کے ذمہ دار ہیں، وہ تربیتی عمل میں نئی فنی میکانیات اور جدید تحقیقات سے ضرور فائدہ اٹھائیں، لیکن اس دائمی اصول کو ضرور پیش نظر رکھیں کہ اسلامی ریاست کے لئے داعیانہ کردار رکھنے والا معلم اور قائد صرف اسی صورت تیار ہوگا، جب وہ تعلیمی عمل کے سارے عناصر میں قرآن و حدیث کی رہنمائی کو دل و جان سے حتمی اور دائمی اساس تسلیم کریں۔ کیونکہ یہی وہ قطعی سرچشمہ ہے، جس سے وابستگی اساتذہ کو اپنا منفرد تشخص عطا کرے گی۔

سوال و جواب یا مکالمہ

علم التعلیم کے مسلمہ قوانین میں یہ بات شامل ہے کہ مسئلہ کی تفہیم کیلئے سوال و جواب کا طریقہ انتہائی موثر ہے۔ کیونکہ بسا اوقات جو بات صرف لیکچر سے واضح نہیں ہوتی، وہ سوال و جواب اور بحث و تمحیص کے امتزاج سے زیادہ واضح ہوجاتی ہے اور مسئلہ سے متعلق، متعلم کے ذہن میں جو اشکال موجود ہوتا ہے۔ وہ اس سے دور ہوجاتا ہے۔ پھر سوال و جواب کے اس طریق کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ معلم، طالب علم کو بے جان سامع نہیں بناتا بلکہ ایک متحرک شخصیت میں ڈھالتا ہے۔ اسے معلومات اور تربیت کے ساتھ ساتھ ناقدانہ شعور بھی دیتا ہے اور اس طرح متعلم کو اس کی ذہانت کی دہلیز پر لاکھڑا کرتا ہے۔ کامیاب معلم درحقیقت وہی شمار ہوتا ہے جو اس طریق تدریس کو حکمت سے استعمال کرنے کا سلیقہ رکھتا ہو اور جانتا ہو کہ اصل تعلیمی نصب العین کیا ہے؟ جو اسے حاصل کرنا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ معلمی سے یہ بات ہمیں معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کی خدمت میں سوال مخالفین کی طرف سے بھی آتے تھے۔ مناظرانہ انداز میں بھی مختلف سوالات اور شکوک اٹھائے جاتے تھے۔ آپؐ ان کا دلیل سے جواب دیتے۔ بعض امور کی تفہیم کیلئے صحابہ کرامؓ کو سوال پوچھتے تھے۔ آپؐ خود بھی تجسس کو تحریک دینے کیلئے بعض دفعہ عام

معلومات کیلئے سوالات کیا کرتے تھے۔ کبھی آپؐ خود امتحان کے طرز پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے مثلاً" صحابہؓ کی ایک مجلس میں آپؐ نے فرمایا:

ترجمہ: "ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے اور وہ مومن کی مثال ہے۔ بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔"

اس سوال سے آپؐ نے سامعین میں جذبہ اشتیاق ابھارا اور اس طرح تمام لوگ سوچ میں پڑ گئے اور مختلف جوابات دیئے لیکن وہ کسی ایک درخت کا نام نہ بتا سکے جو مومن کی مثال ہو۔ بالآخر سب نے کہا "اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔" آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"وہ درخت کھجور کا درخت ہے۔" اس بلیغ استعارے اور سوال و جواب کے طریق سے آپؐ نے مومن کی خصوصیات واضح کیں۔

معلم انسانیت ﷺ نے مناظرانہ اسلوب کو پسند نہیں فرمایا۔ بالخصوص جب لایعنی سوالات اٹھائے جائیں۔ اسی طرح اگر کبھی غیر متعلق سوال آیا تو بات ختم کرنے کے بعد علیحدہ سے جواب ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے جہاں تفکر' تدبر' بحث و تمحیص' سوال و جواب' انکشاف' مشاہدہ' استدلال اور تنقید کیلئے لوگوں کو تحریک دی۔ وہاں آپؐ نے علم اور دماغی قوتوں کے غلط استعمال سے پرہیز کی بھی تاکید کی۔ بعض سوالات کے جواب میں قرآن کی کوئی مختصر سورت یا چند آیات تلاوت فرمائیں مثلاً" ایک اجتماع میں حضور رسالت مآب ﷺ کے سامنے بعض لوگوں نے یہ سوال رکھا کہ خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ آنحضور ﷺ نے اس سوال کا بہت ہی سیدھے اور دو ٹوک طریق سے جواب دیا۔ آپؐ نے سورۃ اخلاص کی تلاوت فرمائی۔جو متعدد سوالات مشرکین اور اہل کتاب نے حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں کئے تھے' ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کا یہ دو ٹوک اور غیر مبہم انداز اپنے اندر کتنے معانی رکھتا ہے۔ یعنی اسلام کے اولین بنیادی عقیدے کو مختصر فقروں میں اس طرح بیان کر دیا گیا ہے جو فوری طور پر انسان کے ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔

اشارات و تمثیلات

محسن انسانیت ﷺ کی حکمت تدریس کا ایک اور منور گوشہ یہ تھا کہ آپؐ وضاحت کیلئے اشارات و تمثیلات استعمال فرماتے تھے۔ حسن تمثیل کی بے شمار مثالیں آپؐ کے کلام میں محفوظ ہیں' جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپؐ نے عام لوگوں کو ذہن نشین کرا دیے۔ بات کی وضاحت کیلئے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات سے بھی مدد لیتے مثلاً دو چیزوں کا

اکٹھاہونا واضح کرنے کیلئے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے۔ کبھی تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے۔ کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے اور کبھی سر کی جنبش سے کام لیتے۔ تفہیم کے نقطہ نظر سے حضور ﷺ بعض اوقات خاکہ یا ڈایا گرام بناتے مثلاً لکیریں کھینچ کر جنت اور دوزخ کی مثال دی۔

رسول اللہ ﷺ کے تمثیلی اور استعاراتی اسلوب سے جو رہنما اصول ہمیں ملتا ہے' وہ یہ ہے کہ معلم کو جہاں ایک اچھا عملی مسلمان ہونا چاہئے' وہاں اسے نفس مضمون پر بھی عبور حاصل ہو اور طلبہ تک اس مضمون کی منتقلی کیلئے موثر طریق دعوت و تدریس سے بھی واقف ہو۔ طریق تدریس کے موثر ہونے کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ جو چیز طلبہ کو فراہم کرنا مقصود ہو' وہ احسن انداز سے منتقل ہوجائے۔ تاکہ طلبہ کے طرز فکر و عمل میں مطلوبہ تبدیلی رونما ہوجائے اور خیر کی تمام صلاحیتیں بالفعل ڈھل جائیں۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے جہاں استاد کیلئے فنی اور عملی مہارت ضروری ہے' وہاں اسے اپنی گفتگو کو بھی ادب کے سانچوں میں ڈھالنا ہوگا اور ایسے الفاظ' تراکیب' تمثیلات اور اشارات استعمال کرنا ہوں گے جو فصیح' انتہائی موثر اور موقع و محل کی مناسبت سے ہوں اور عامیانہ پن سے پاک ہوں۔ حقیقت میں ایک استاد چاہے کوئی سا مضمون پڑھا رہا ہو اسے ادب پسند ضرور ہونا چاہئے اور اسے زبان و بیان پر عبور حاصل کرنے کیلئے ہمیشہ کوشاں رہنا چاہئے۔ البتہ اس بات کا خصوصی خیال رکھا جانا چاہئے کہ استاد ادبی مطالعہ کے ساتھ ساتھ اپنے فکرو کردار میں بھی مثالی ہو۔ کیونکہ طلبہ استاد کی محض لسانی خوبیوں اور ادیبانہ گفتگو سے متاثر نہیں ہوں گے۔ بے مقصد' اخلاص سے عاری' اور بناوٹی کلام چاہے کتنا ہی مرصع کیوں نہ ہو' اس کا کوئی مستقل اثر نہیں ہوتا۔

رسول اکرم ﷺ کی یہ حدیث معلمین کیلئے ہمیشہ مشعل راہ رہنی چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا:

ترجمہ: "تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے' باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔"

مختصر یہ کہ استاد کو چونکہ صرف معلومات ہی فراہم نہیں کرنا' اسے طلبہ کی زندگیوں کو سنوارنا بھی ہے۔ اس لئے اسے جس ماڈل کو پیش نظر رکھنا ہے وہ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ اس لئے زندگی کے کسی شعبے میں بھی کامرانی کی اہم کلید یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی پیروی کریں اور ان کی سنت کا احیاء کریں۔

لطیف ذوق مزاح

درس و تعلیم معلم کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ معلم لطیف ذوق مزاح رکھتا ہو۔ لیکن

مزاحیہ انداز' حق کے خلاف نہ ہو۔ خندہ روئی کی صفت دراصل سنت نبوی ﷺ ہے۔ آپ' نے فرمایا:

ترجمہ: "تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کار خیر ہے۔"

معلم انسانیت ﷺ کا اسلوب تعلیم و تربیت اتنا موثر اور شگفتہ ہوتا تھا کہ رفقاء کے دلوں میں آپ' کی محبت رچ بس جاتی تھی۔ آپ' اپنی مبارک گفتگو سے مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کردیتے' مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی' نہ کسی کی دلازاری کی جاتی' نہ قہقہے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ حقیقت میں قدرت نے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ مسکرانے کی جبلت بھی رکھی ہے۔ چنانچہ یہ مسکراہٹ اس کی زندگی کو خوشگوار بناتی ہے۔

موثر تدریس کے لئے یہ ضروری ہے کہ معلم لطیف اسلوب بیان کو اپنائے' کیونکہ اس کا واسطہ مشینوں سے نہیں بلکہ زندہ انسانوں سے ہوتا ہے۔ معلم کا لطیف ذوق مزاح طلبہ کو خوشی فراہم کرکے بڑا مثبت کردار ادا کرسکتا ہے۔ البتہ معلم کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ مزاح کا مقصد کسی پر چوٹ کرکے اسے دکھ پہنچانا نہیں ہوتا۔ اصل غایت تو انداز بیان کی شگفتگی ہے لیکن اس شگفتگی میں بھی صداقت کا دامن چھوٹنا نہیں چاہئے۔ اور استاد کو اپنی گفتگو میں کوئی عامیانہ اور اخلاق سے گرا ہوا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہئے۔

تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ استاد بسا اوقات علم و فضیلت میں تو اعلیٰ مقام پر ہوتا ہے' لیکن محض مزاج کی خشکی اور اس کے ماتھے کی سلوٹیں اسے موثر استاد بننے نہیں دیتیں۔ خصوصیت سے کرۂ جماعت میں مسلسل ایک ہی قسم کا تفو-بنی کام اور ایک ہی طرح کے اسلوب تدریس کی وجہ سے طلبہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں اور اکثر اوقات اعصابی' ذہنی اور جسمانی تھکان کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس تھکان کو رفع کرنے کے کئی طریقے ہیں' لیکن ان میں ایک اہم طریقہ شگفتہ انداز بیان ہے' جس کی مدد سے طلبہ بوریت بھی محسوس نہ کریں اور علمی مہارتوں پر بھی کامل عبور حاصل کرلیں۔

تفریحات اور علمی و ادبی مشاغل

متوازن زندگی کا ایک لازمی جزو جائز حدود میں تفریحات بھی ہیں۔ حضور ﷺ کو بھی بعض تفریحات اور ادبی سرگرمیاں پسند تھیں۔ آپ' کو باغوں کی سیر کا شوق تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی رفقاء کے ساتھ باغوں کی سیر کو چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہوجاتی۔ تیرنے کا شوق بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑے بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑے کے ساتھ دور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف

آتے۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے اپنا ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پسند فرمایا۔ دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کرائے جاتے۔ حضور ﷺ نے شعر سے بھی دلچسپی ظاہر کی۔ تاہم عرب میں زمانہ جاہلیت کی جو شعر پرستی رائج تھی، آپؐ نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ آپؐ اچھے شعر کو بلحاظ مقصد قدر فرماتے اور حقیقت میں رسول اکرم ﷺ نے شعر و ادب کے معاملے میں ایک نیا ذوق اور نیا معیار نقد معاشرے کو دیا اور وہ تھا اللہ کی رضا کا حصول۔ دشمنان اسلام کے ہجویہ اشعار کے مقابلے میں حضرت حسانؓ اور کعب بن مالکؓ سے شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسانؓ کو منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور فرماتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں۔" یہ بھی فرمایا کہ: "مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔" (نعیم صدیقی: محسن انسانیتؐ)

غرض رسول اللہ ﷺ نے متعین نصب العین کے حصول کیلئے سیرو تفریح اور دیگر جائز ہم نصابی سرگرمیوں کی اجازت مرحمت فرمائی اور اس طرح تعلیم کو انسانوں کی جائز فطری ضرورتوں کی روشنی میں مرتب کیا۔ حقیقت میں موثر تعلیم و تعلم اور طلبہ میں ذوق تجسس و تفکر کو ابھارنے کیلئے ضروری ہے کہ طلبہ کو متعین درسی سرگرمیوں کے ساتھ سیرو تفریح اور علم و ادب کی سرگرمیوں میں بھی شریک کیا جائے۔ لیکن اس میں یہ احتیاط بہرحال پیش نظر رہنی چاہئے کہ اصل تعلیمی غایت مجروح نہ ہو اور کوئی تعلیمی سرگرمی شریعت محمدی ﷺ کے خلاف نہ ہو۔

معلم کی ظاہری وضع قطع

موثر تدریس کے لئے ایک اہم عنصر معلم کی شخصیت کا ظاہری پہلو بھی ہے۔ یعنی اس کا لباس اور ظاہری وضع قطع۔ معلم کو حقیقت میں ہر لحاظ سے ایک نمونہ ہونا چاہئے اور جہاں اسے اپنے اخلاق و کردار میں انتہائی بلند مقام پر ہونا چاہئے وہاں ظاہری طور پر بھی نفاست کا پیکر ہونا چاہئے۔ کیونکہ آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی وضع قطع، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ حضور ﷺ نے لباس کے بارے میں قرآن حکیم کی اس آیت کی عملی تشریح فرمائی ہے کہ:

ترجمہ "اے اولاد آدم! ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے کہ تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمہارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، شاید کہ لوگ اس سے

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں: "اول یہ کہ لباس انسان کے لیے مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسانی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔۔۔۔ دوم یہ کہ اس فطری الہام کی رو سے انسان کے لئے' لباس کی اخلاقی ضرورت مقدم ہے۔۔۔۔ سوم یہ کہ انسان کے لیے لباس کا صرف ذریعہ ستر پوشی اور وسیلہ زینت و حفاظت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو' یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو' زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو' فخرو غرور اور تکبرو ریا کی شان لیے ہوئے بھی نہ ہو' اور پھر ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں' عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی ہیں۔۔۔۔ چہارم یہ کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں۔ بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔۔۔۔" (تفہیم القرآن' جلد دوم' ص ص 19-20)

حضور ﷺ کا لباس تقویٰ تھا۔ مکمل ساتر اور صاف ستھرا۔ لباس میں موسمی تحفظ' ستر' سادگی' نفاست اور وقار کا حضور ﷺ کو خاص لحاظ تھا۔ لوگوں کو لباس کبر سے منع فرمایا اور لباس تقویٰ اختیار کرنے کو کہا۔ آپؐ نے لباس کے معاملے میں انتہا پسندی سے امت کو بچایا۔ حضور ﷺ کی چال' عظمت' وقار' شرافت اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ غرض آپؐ ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے طہارت اور پاکیزگی کا عظیم پیکر تھے۔ اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں معلم کیلئے یہ ضروری ہے کہ جسم اور روح دونوں کی پاکیزگی کا خیال رکھے۔

طلبہ اور معاشرے کے افراد سے شخصی رابطہ

متعلم کی مکمل اور ہمہ گیر نشوونما اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کلی تغیر کے لئے ضروری ہے کہ معلم محض کمرۂ جماعت تک محدود نہ رہے' بلکہ متعین قانونی و اخلاقی ضوابط کے اندر رہتے ہوئے معاشرہ کے عوامی حلقوں بالخصوص طلبہ کے والدین اور اپنے رفقائے کار سے بھی اسلامی اخوت کی بنیاد پر اپنا رابطہ رکھے۔ عام زندگی میں یہ دیکھا گیا کہ بعض معلمین میں خلوت پسندی اور مزاج کی خشکی پیدا ہوجاتی ہے اور اس طرح کبر کا شکار ہوکر اپنے لئے ایک الگ دنیا بنا لیتے ہیں' جو بالآخر تدریسی عمل کو غیر موثر بنانے کا باعث بنتے ہیں۔

معلم اعظم ﷺ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہوکر بھی افراد معاشرہ سے پوری طرح رابطہ رکھتے تھے۔ حقیقت میں آپؐ جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ آپؐ نے جس نظام اخوت کی بنیاد رکھی تھی یہ اس کا اہم تقاضا کہ لوگ باہم

دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ آپ طلبہ سے نہ صرف شفقت و محبت فرماتے تھے بلکہ ان کا احترام بھی فرماتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کرنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے مصافحہ اور معانقہ بھی۔ بیماروں کی عیادت کے لئے اہتمام سے جاتے۔ عیادت کیلئے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تو تشریف لے جاتے۔ تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔ کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے۔ بچوں سے بہت محبت و شفقت فرماتے۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے' پیار کرتے' دعا فرماتے' ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ فرماتے: "یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں۔" بوڑھوں کا بے حد احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر' حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ضعیف العمر والد جو بینائی سے محروم ہو چکے تھے' بیعت اسلام کے لئے آپ کی خدمت میں لائے۔ آپ نے فرمایا: "کیوں تکلیف دی' میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔" میل جول کی زندگی میں آپ کے حسن کردار کی تصویر حضرت عائشہؓ نے خوب کھینچی ہے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ ازواج اور خادموں میں سے نہ کسی کو کبھی مارا' نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا۔ بجز اس کے کہ آپ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانون الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کیلئے کارروائی کریں۔

یہ بات یقینی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کے آئینے میں اگر معلم طلبہ سے شفقت سے پیش آئے' ان کا احترام کرے' تحکم کی صورت میں بھی جذبہ رحمت کو پیش نظر رکھے' طلبہ کے والدین اور معاشرے کے دوسرے افراد سے خیر خواہی اور اخوت کی بنیاد پر تعلقات استوار کرے' تو عام مجموعی تعلیمی فضا خیر و حسنات سے ضرور بھر جائے گی اور بالآخر اس کے اثرات طلبہ کی تعلیم و تربیت پر بھی بہت گہرے ہوں گے۔

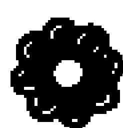
عملی تربیت

حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کی محض نظری تعلیم پر اکتفا نہ کیا بلکہ سلیم الفطرت اور پارسا لوگوں کو ایک تنظیم میں جمع کیا اور پھر ان کی فکری سیاسی اور بالآخر میدان جہاد میں بھی اخلاقی تربیت کی۔ یعنی محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام کو ہی اصل نہ سمجھا بلکہ امامت عالم کیلئے بھی فعال لوگوں کو ایک تنظیم میں پرو دیا۔ آپ نے ایسے افراد تیار کئے جنہوں نے محض احقاق حق پر اکتفا نہ کیا بلکہ ابطال باطل کیلئے عملی جدوجہد کو بھی ضروری جانا۔ اس

طرح انہیں بے خدا نظریات اور الہامی ہدایت سے محروم افکار و معتقدات پر کڑی تنقید کا سلیقہ بھی سکھایا اور اسلامی نظریہ حیات کو قائم کرنے' چلانے اور زمین پر وسعت دینے کے لئے ایک تحریک برپا کرنے پر بھی لوگوں کو تیار کیا۔ معلم انسانیت ﷺ کے اسوہ مبارکہ کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ معلم کو صرف فراہمی معلومات ہی نہیں کرنا ہوتیں بلکہ وہ ایک مربی' مزکی اور داعی بھی ہوتا ہے جس کا کام بندگی رب کے اصول پر افراد کی تربیت کرنا ہے' تاکہ یہ قوت بالآخر قیادت عالم کے اہل بن سکے۔ اس مقصد کیلئے ہمیں تعلیمی اداروں کے پورے ماحول کو بھی اسلامی رخ پر ڈھالنا ہوگا۔ جہاں پر ہر فرد حسنات کا طالب ہو اور اسی معیار کی روشنی میں ساری تعلیمی سرگرمیوں کو مرتب کرنے کا ذمہ دار ہو۔ ظاہر ہے' اس ذمہ داری کا مرکزی کردار یقیناً خود استاد ہے۔

خلاصہ کے طور پر موثر حکمت تدریس کا اصل راز اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی زندگی کی مکمل پیروی ہے اور اس ہدایت و اسلوب کو اپنانا ہے' جو قرآن حکیم اور رسول اکرم ﷺ نے دعوت و اصلاح کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس ضمن میں بہترین ماڈل معلم انسانیت ﷺ کا ہی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے : "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوة حسنة" "بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے پیروی کا بہترین نمونہ ہے۔" (الاحزاب: 21)۔

(ماہنامہ تعلیمات لاہور' جلد 8' شمارہ 3' جنوری 1986ء)



نبی اکرم ﷺ کی حکمت تدریس کا ایک منور گوشہ

(تمثیلی و استعاراتی اسلوب)

وہ لوگ بے حد خوش نصیب ہیں جنہیں معلمانہ منصب ملا۔ یہ وہ منصب جلیلہ ہے جس پر خداوند حکیم و علیم نے انسانیت کی تعمیر و تربیت کے لئے انبیاءؑ کی مقدس شخصیتوں کو مامور فرمایا۔ یہ انبیاءؑ تاریخ کے مختلف ادوار میں بنی نوع انسان کو بھلائی کی تعلیم دیتے اور انہیں لازوال صداقتوں کی طرف بلاتے رہے۔ ان عظیم معلمین انسانیت کی آخری کڑی حضور اکرم حضرت محمد ﷺ ہیں' جنہوں نے انسانیت کو نیکی اور راستی کی تعلیم دی' انسان کے کردار کو جلا بخشی اور اس کی فکری سطح کو عظیم رفعتوں سے ہم کنار کیا۔ بلاشبہ حضور ﷺ انسانیت کے معلم ہیں اور آج امت مسلمہ کا جو بھی فرد اسلامی نظام فکر و عمل کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے میدان میں سرگرم عمل ہے' درحقیقت وہ انبیاءؑ کا وارث ہے اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیمی تحریک کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔

تعلیم کا عمل اپنی اہمیت و افادیت کے اعتبار سے نہایت ہی موثر معاشرتی عمل ہے اور اسی وجہ سے ہر دور کے مفکرین اس عمل کو زیادہ جامع اور مفید نتائج کا حامل بنانے کے لئے اپنے افکار پیش کرتے رہے۔ کیونکہ یہ عمل درحقیقت انسان کی ذہنی اور اخلاقی تدریج کا عمل ہے اور اس کے پیدا کردہ نتائج ہی خود انسان کی ترقی کا پیمانہ قرار پاتے ہیں۔ آج کا دور مختلف نظریاتی لہروں اور فکری سمتوں کی باہمی آویزش اور ٹکراؤ کا دور ہے۔ تصادم اور کشمکش کی اس فضا میں کمزور نظریاتی بنیادوں پر کھڑی اقوام زبردست خطرے میں ہیں۔ طاقتور اقوام کی طرف سے تمدنی اور تہذیبی یلغار نے بھرپور حملے کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ ان پر آشوب حالات میں کوئی ایسی قوم ابھر ہی نہیں سکتی جو دوسروں کے ذہنی افکار کی دریوزہ گری کرتی پھرے اور جس کے پاس ایک مضبوط فکری انقلاب بپا کرنے کے لئے الہامی ہدایت پر مبنی کوئی نظریاتی سرمایہ نہ ہو۔

ایک آزاد اسلامی ملک کے باشندے اور مسلم سوسائٹی کے فرد کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو ایک ایسی نسل کی تعمیر کا ذریعہ بنائیں جو اسلامی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھلی ہو' جو الحاد' مادہ پرستی' منافقت' خیانت اور ظلم کے خلاف جہاد کے عظیم جذبے سے سرشار ہو۔ گویا ہماری درسگاہوں کو ایسے انسانیت ساز اداروں کا روپ اختیار کرلینا چاہئے جو ہر شعبہ زندگی میں اسلامی طرز فکر و عمل کو جاری و ساری کر سکیں۔ اساتذہ اس عظیم

تحریک کا مرکز و محور ہے اور اسے موجودہ عہد میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لئے معلم اعظم ﷺ کے اسوہ تعلیمی کو مشعل راہ بنانا پڑے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی تصور تعلیم کی عمارت تین ستونوں پر استوار ہوتی ہے۔ یعنی (الف) مقاصد کا تعین (ب) نصاب تعلیم' اور (ج) حکمت تدریس۔ ان میں سے پہلے دو اجزا یعنی مقاصد اور نصاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے' لیکن ان دونوں کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار معلم کی حکمت تدریس پر ہے۔ہمارے ہاں تدریسی عمل ایک بے حس' جامد اور میکانکی عمل کا نام نہیں' جو ریڈیو' ٹی وی' یا ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے مطلوبہ معلومات کا انتقال کرتا رہے بلکہ استاد کو نہایت ہی اہم اور ارفع مقام حاصل ہے اور صحیح طور پر تجزیہ کیاجائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے معلم ایک مقدس روحانی احساس کی مانند تعلیمی عمل کی باقی تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ گویا آسان لفظوں میں ہم یہ بات اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معلم' مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے پہلو بہ پہلو محض ایک تیسری اکائی کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ایسے انداز فکر و عمل کا حامل ہوتا ہے جس میں مطلوبہ مقاصد کا رنگ جھلکتا اور زیر بحث نصاب کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔
حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور ﷺ کے اخلاق مبارکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کا اخلاق تو عین قرآن ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ محض قرآن حکیم کی تعلیم نہیں دے رہے تھے بلکہ خود قرآن حکیم کی تعلیمات کا مکمل عملی نمونہ تھے۔ یہی وہ اساسی اصول ہے جو استاد کو انتہائی موثر منفرد بنا دیتا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس نکتہ کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> انسان کی فطرت کچھ اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ وہ مجرد کتابی تعلیم سے کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کو علم کے ساتھ ایک انسانی معلم اور رہنما کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ جو اپنی تعلیم سے اس علم کو دلوں میں بٹھا دے اور اس کا مجسمہ بن کر اپنے عمل سے لوگوں میں روح پھونک دے جو اس تعلیم کا حقیقی منشا ہے۔ آپ کو پوری انسانی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہ مل سکے گی کہ تنہا کسی کتاب نے انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں انقلاب پیدا کیا ہو۔ جن رہنماؤں نے قوموں کے افکار و اعمال میں زبردست انقلابات پیدا کئے ہیں' اگر وہ خود اپنی تعلیم کے مکمل عملی نمونے بن کر نہ پیدا ہوتے اور صرف ان کی تعلیمات اور ان کے اصول کسی کتاب کی شکل میں شائع ہوجاتے تو انسانی فطرت کا کوئی راز دان یہ دعویٰ کرنے کی جرات نہیں

کر سکتا کہ محض اس کتاب سے وہی انقلابات رونما ہوئے جو ان رہنماؤں کی عملی تعلیم سے ہوئے" (اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی' ص 229)

نبی اکرم ﷺ کی معلمانہ حیثیت اور آپؐ کی حکمت تدریس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ یقیناً آپؐ کے طرز تعلیم کا ایک ایک نکتہ ہمارے لئے منارہ نور ہے۔ لیکن زیر نظر مضمون میں صرف حضور ﷺ کی حکمت تدریس کے ایک خاص گوشے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور وہ ہے آپؐ کا زندگی بخش ادیبانہ اسلوب اور تشبیہات و استعارات نیز امثلہ کی مدد سے نفس مضمون کو زیادہ پرکشش اور بامعنی بناکر پیش کرنا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ استاد کی شخصیت کی جامعیت میں حسن بیان کا پہلو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احترام' شفقت' محبت اور حکیمانہ انداز کے ساتھ ساتھ زبان کی شگفتگی' جملوں کی مناسب ساخت' انداز بیان کا بانک پن' لہجے کا اتار چڑھاؤ اور گفتگو کا شعری آہنگ' یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں۔ استاد کا کام' طلبہ کی تربیت و اصلاح' معلومات کے انتقال اور اپنے مثالی کردار کا تاثر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق کو بے رنگ انداز میں بیان نہ کرڈالے بلکہ اپنی شگفتہ بیانی اور شیریں مقالی سے اپنے درس کو دلچسپ اور پرکشش بنائے۔ حضور ﷺ کی حکمت تدریس میں شیریں بیانی ایک بنیادی وصف کا درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے الہامی بصیرت سے کام لیتے ہوئے تدریس کی اسی حکمت عملی کو اپنایا جو خود خالق کائنات نے اپنی آخری الہامی کتاب میں ملحوظ رکھی یعنی حقائق کا اظہار' بیان کی شگفتگی' گزشتہ اقوام نیز مختلف مظاہر کائنات کی مثالیں' روزمرہ زندگی سے تعلق رکھنے والی تشبیہات' بلیغ استعارے' اسلوب کی کشش اور اس کے ساتھ ساتھ باخبر رکھنے کے لئے بشارت و وعید کا انداز۔ اس پہلو کے بارے میں جناب نعیم صدیقی نے اپنے مقالہ "رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم" میں ان نکات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے جو حضور ﷺ نے ایک ہمہ گیر تہذیبی انقلاب اور تعلیمی تحریک کے لئے اپنے پیش نظر رکھے۔ بقول نعیم صدیقی "قرآن میں حضور ﷺ کے لئے معلمانہ ذمہ داری کو بلاغ مبین تک محدود کردیا گیا ہے۔ یعنی وضاحت سے بات پہنچا دینا اور تفہیم کا حق ادا کردینا ہر سچے معلم کی ذمہ داری ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے مخاطب گروہ کی توجہات کو اپنی بات کی طرف مرکز کرنے کے لئے مختلف موثر صورتیں اختیار فرمائیں مثلاً" کبھی چونکا دینے والی کسی بات سے آغاز کلام کیا گیا' کبھی سوال سے گفتگو شروع فرمائی کبھی کوئی حیرت زا منظر ذہنوں کے سامنے آراستہ فرما دیتے۔"

حکمت اور حسن صحبت کا اسلوب' حضور ﷺ کے انداز تدریس کا بنیادی نکتہ تھی۔ اس

ضمن میں قرآن حکیم نے مختلف مقامات پر دعوت و تبلیغ کے ضمن میں آپؐ کے ذریعے دائمی ہدایت دی۔ فرمایا:

ترجمہ: "بھلائی اور برائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو' تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی وہ ایسا ہو گا جیسے گرم جوش دوست ہے" (حٰم السجدہ : 34)۔

ترجمہ: "تم بدی کو اچھے ہی طریقہ سے دفع کرو' ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں" (المومنون : 96)۔

ترجمہ: "درگزر کی روش اختیار کرو' بھلائی کی تلقین کرو اور جاہلوں کے منہ نہ لگو' اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو"

(الاعراف : 199-200)۔

ترجمہ: "دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ۔ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقے پر جو بہترین ہو" (النحل : 125)

سورہ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت کو ایک اور پیرائے میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔ ترجمہ: "اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے۔۔۔۔ سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں۔۔۔۔ " (العنکبوت : 46)۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کا مفہوم اس طرح واضح کرتے ہیں:

"مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ مہذب و شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کی اسپرٹ میں ہونا چاہئے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہئے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہئے جس کا مقصد اپنے مد مقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے (بلکہ) اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ نہ بڑھ جائے اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے' مگر یہ اہل کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تبلیغ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی (تفہیم القرآن' جلد سوم' حاشیہ 81'ص ص 708-709)۔

"الا الذین ظلموا منھم" کی توضیح کرتے ہوئے سید مودودی مزید فرماتے ہیں کہ

"جو لوگ ظلم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف رویہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اور ہر طرح کے لوگوں کے مقابلہ میں نرم و شیریں ہی نہ بنے رہنا چاہئے کہ دنیا داعی حق کی شرافت کو کمزوری اور مسکنت سمجھ بیٹھے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو شائستگی' شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی و مسکینی نہیں سکھاتا کہ وہ ہر ظالم کے لیے نرم چارہ بن کر رہیں" (تفہیم القرآن' جلد سوم' حاشیہ 82' ص 709)۔

پس موثر تدریس کے لیے یہ ضروری ہے کہ استاد ایسے اسلوب کو اپنائے جو درج بالا اساسی اصولوں کا حامل ہو۔ اس کے بغیر اعلیٰ نصب العین کا حصول ممکن نہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب "قرآن مجید" کا مخصوص اسلوب اسلام کی ترویج و ترقی میں بیحد موثر ثابت ہوا۔ چنانچہ حضور ﷺ کا اسلوب دعوت بھی ان ہی نکات سے آراستہ تھا اور حکیم مطلق نے جو طریق ہدایت اپنی عظیم کتاب میں اختیار کیا تھا' اسی کی پیروی سیدنا محمد ﷺ بھی کرتے تھے۔ آپؐ کی گفتگو' ادبی لطافتوں' بلیغ استعاروں اور خوبصورت مثالوں سے اس انداز میں گلے ملتی تھی کہ مخاطب اس کا اثر لئے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ مثلاً" خشیت الٰہی کے نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

ترجمہ: "جب اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندہ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں تو اس وقت اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے کسی پرانے سوکھے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں" (بزار)--- (زیر نظر مضمون میں احادیث نبوی ﷺ کا اردو ترجمہ دیا جارہا ہے۔ ہر چند کہ اس ترجمہ سے بھی ایک خاص ادبی حسن اور قلبی تاثر ابھرتا ہے' لیکن فصاحت و بلاغت درحقیقت ان مبارک الفاظ میں ہی اپنے عروج پر ہے' جو نبی ﷺ نے ادا فرمائے۔ اس کی تحسین وہی اساتذہ کر سکتے ہیں' جن کو عربی زبان و ادب سے گہرا تعلق ہو------ کاش ہمارے نظام تعلیم میں ہر سطح پر قرآن و حدیث کی تفہیم کے حوالے سے عربی زبان کی مناسب تدریس کا انتظام ہو' تاکہ نئی نسل اپنے بنیادی سرچشمہ علم سے بہتر طور پر استفادہ کے قابل ہوسکے)۔

رسول اللہ ﷺ اس بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے کہ تعلیم و تدریس کا رسمی یا غیر رسمی عمل سننے والوں کے لیے بیزاری یا اکتاہٹ کا باعث نہ بن جائے۔ آپؐ کی گفتگو ہمیشہ سننے والوں کے ذہنی اپج اور ان کے فکری معیار کے مطابق ہوتی تھی۔ آپؐ عظیم اخلاقی نکتے بالکل سادہ' عام فہم اور روزمرہ زندگی سے گہری قربت رکھنے والے حوالوں کی مدد سے بیان [illegible] بے مثال ہے۔ آپؐ نے کبھی اونچے لہجے میں بات نہ

کی۔ آج کے معلم کو بھی یہ اصول پیش نظر رکھنا چاہئے کہ لہجے کی کرختگی اس کے مقام کو مجروح کرتی اور تعلیمی عمل کو نقصان پہنچاتی ہے۔

ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ سے پوچھا کہ تم پہلوان کسے کہتے ہو؟ صحابہؓ نے کہا کہ جسے لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا نہیں۔ یہ پہلوان نہیں ہے۔ پہلوان وہ ہے جو غصے میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ (مسلم۔ بخاری)

ایک اور موقع پر استاد کے لیے باعمل اور صاحب کردار ہونے کی اہمیت اس بلیغ تشبیہ کے ذریعے واضح فرمائی۔

"عالم بے عمل چراغ کی مانند ہے' جو دوسروں کو تو روشنی پہنچاتا ہے لیکن خود کو جلاتا رہتا ہے" (احمد)

اس طرح کا تشبیہاتی انداز' درج ذیل چند احادیث سے مزید اجاگر ہوتا ہے۔

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے عمارت کی طرح ہونا چاہئے اور ایک دوسرے کے لیے اس طرح مضبوطی اور قوت کا باعث ہونا چاہئے جیسے مکان کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لیے"۔ اس کے بعد آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال لیں (بخاری۔ مسلم۔ مشکوٰۃ)

"اللہ کے خوف اور ہیبت سے کسی بندہ مومن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں اگرچہ وہ مقدار میں کم مثلاً" مکھی کے سر کے برابر' یعنی ایک قطرہ کے بقدر ہو پھر وہ بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اس چہرہ پر آتش دوزخ کو حرام کر دے گا"۔ (سنن ابن ماجہ)

"غصہ کا تعلق شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہیے کہ وضو کرے"(احمد۔ ابوداؤد)

"غیبت اور چغل خوری ایمان کو اس طرح جھاڑ کر رکھ دیتی ہیں جس طرح چرواہا پتوں والی ٹہنی کو جھاڑ دیتا ہے۔" (ابوداؤد)

"اللہ کی قسم دنیا آخرت کے مقابلے ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈالے اور اس کے بعد یہ دیکھے کہ وہ کتنا پانی لے کر لوٹتی ہے۔" (مسلم)

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور پھر اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں ادا کی تو اس کا یہ مال قیامت کے دن نہایت زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا جس کے سر پر دو سیاہ نقطے ہوں گے (یہ انتہائی زہریلے ہونے کی علامت [illegible]

جائے گا۔ پھر اس کے دونوں جبڑوں کو یہ سانپ پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں میں تیرا خزانہ ہوں" (بخاری)

"جو شخص (کسی ناجائز معاملہ میں) اپنی قوم کی مدد کرتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کوئی اونٹ کنوئیں میں گر رہا ہو اور یہ اس کی دم پکڑ کر لٹک گیا ہو تو یہ بھی اس کے ساتھ جا گرا"۔ (ابوداؤد۔ ابن مسعود)

"اپنے کو حسد سے بچاؤ اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح بھسم کرتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو بھسم کر ڈالتی ہے"۔ (ابوداؤد)

"جس طرح بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہے اور اپنے ریوڑ سے الگ ہونے والی بکریوں کو بہ آسانی شکار کر لیتا ہے۔ اسی طرح شیطان ان کا بھیڑیا ہے۔ اگر جماعت بن کر نہ رہیں تو یہ الگ الگ نہایت آسانی سے شکار کر لیتا ہے"۔ (مسند احمد۔ مشکوٰۃ)

"خدا کو دو قطرے بہت ہی زیادہ پسند ہیں۔ ایک آنسو کا وہ قطرہ جو خدا کے خوف سے نکلے اور دوسرے خون کا وہ قطرہ جو جہاد میں کسی زخم سے ٹپکے"۔ (ترمذی)

"ایک ایسا وقت آجائے گا جس میں اہل دین کے لیے دین پر جمے رہنا انگارے کو ہاتھ میں لینے کی طرح ہوگا"۔ (ترمذی۔ مشکوٰۃ)

"قلوب زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ پوچھا گیا کہ دلوں کے زنگ کو دور کرنے والی کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا دل کا زنگ اس طرح دور ہوتا ہے کہ آدمی موت کو کثرت سے یاد کرے اور دوسرے یہ کہ قرآن پاک کی تلاوت کرے"۔ (مشکوٰۃ)

"اس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے' اس شخص کی سی ہے جس کے اندر زندگی پائی جاتی ہے اور اس شخص کی مثال جو اللہ کو یاد نہیں رکھتا ایسی ہے جیسے کہ کوئی میت"۔ (بخاری۔ مسلم)

"وہ (ایک گروہ کے لوگ) قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکل جاتا ہے۔" (بخاری)

"جو پاؤں خدا کے راستے میں گرد آلود ہوئے ان کو جہنم کی آگ مس نہیں کر سکتی"۔ (بخاری)

"جو شخص اللہ کے راستے میں زخمی ہوا' وہ قیامت کے دن اس شان سے اٹھے گا کہ اس کا خون ٹپکتا ہوگا۔ خون کی رنگت زعفران کے مشابہ ہوگی اور خون میں مشک کی خوشبو آتی ہوگی"۔ (ابوداؤد)

[illegible] ان چیونٹیوں کی شکل ہوں گے۔ ان کو اہل محشر روندتے ہوں

گے۔ آگ ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی۔ جہنم کے ایک خاص قید خانے میں ان کو عذاب دیا جائے گا"۔(ترمذی)

"میری مثال ایسی ہے کہ ایک شخص نے آگ جلائی اس کے آس پاس کا ماحول آگ کی روشنی سے چمک اٹھا تو یہ کیڑے پتنگے اس پر گرنے لگے اور وہ شخص پوری قوت سے ان کیڑوں پتنگوں کو روک دیتا ہے۔ لیکن پتنگے ہیں کہ اس کی کوشش ناکام بنائے دے رہے ہیں اور آگ میں گھسے پڑ رہے ہیں۔ اسی طرح میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ سے روک رہا ہوں' اور تم ہو کہ آگ میں گرے پڑ رہے ہو"۔ (مشکوٰۃ)

"بندہ گناہ کے بعد معافی مانگنے کے لئے اللہ کی طرف پلٹتا ہے' تو اللہ کو اپنے بندے کو پلٹنے پر اس شخص کے مقابلے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے' جس نے اپنی اونٹنی جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار تھا' کسی بیابان میں کھودی۔ پھر اس نے اچانک اسے پالیا تو وہ اس اونٹنی کو پاکر جتنا خوش ہوتا ہے' اس کا اندازہ نہیں کیاجاسکتا۔ ایسے ہی آدمی کی توبہ سے اللہ خوش ہوتا ہے بلکہ خدا کی خوشی اس کے مقابلے میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ وہ رحم و کرم کا سرچشمہ ہے"۔ (بخاری۔ مسلم)

یہ تشبیہاتی انداز ہمارے سامنے ایسی موجود اور مقرون شکلوں کو لاتا ہے جن سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ہمارے ذہن کی لوح پر ایک خاص منظر کی تصویر ابھرتی ہے۔ ہم اپنے تجربہ و مشاہدہ کی وجہ سے اس "منظر" کے تمام پہلوؤں سے کما حقہ واقف ہوتے ہیں' چنانچہ "معلوم سے نا معلوم" کا تعلیمی اصول روبہ عمل آتا ہے اور ہم تجرباتی حوالے سے اس نکتے کا فہم حاصل کرتے ہیں' جو نصاب کا حصہ ہوتا ہے۔ آیئے حضور ﷺ کی اس حکمت تدریس کی ایک اور مثال دیکھیں۔

ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

"جس طرح زمین تین قسم کی ہوتی ہے' ویسے ہی آدمی بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم زمین کی وہ ہے کہ بارش سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ سرسبز ہوجاتی ہے اور خدا کی مخلوق اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ انسان بھی اور جانور بھی۔ یہ زمین انسانوں کے لئے اناج اور جانوروں کے لئے گھاس کا ذخیرہ بن جاتی ہے۔ دوسری قسم کی زمین وہ ہے جہاں روئیدگی تو نہیں ہوتی لیکن پانی جمع ہوجاتا ہے۔ لیکن زمین کی تیسری قسم وہ ہے کہ نہ اس سے کسی کو فائدہ پہنچتا ہے نہ خود بارش سے کوئی فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کی ایک قسم ہے' جو ہدایت، اور علم کو قبول کرتے ہیں' اسے یاد رکھتے ہیں' اس پر عمل کرتے ہیں' دوسروں کو سکھلاتے اور فائدہ پہنچاتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو

ہدایت اور علم سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے"۔ (بخاری، مسلم)

اس اسلوب تدریس کی واضح جھلک حضور ﷺ کے اس بیان میں بھی ملتی ہے۔ آپؐ نے ایک مجلس میں نماز کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا:

"تم میں سے کوئی یہ بتائے کہ اگر کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ اس میں روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو تو اس کے جسم پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ اس کے بدن پر ایسی حالت میں میل نہیں رہے گا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نماز کی یہی کیفیت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے آدمی کے صغیرہ گناہ معاف فرما دیتا ہے"۔ (بخاری، مسلم)

شعر و ادب کا بنیادی وصف یہ ہے کہ بات عمومی انداز سے ذرا ہٹ کر اچھوتے پن کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں الفاظ کو ذرا منفرد انداز سے برتا جاتا ہے اور ایک ایک لفظ کے اندر معنی و مفہوم کی کتنی ہی پرتیں چھپا دی جاتی ہیں۔ سپاٹ اور بے رنگ انداز گفتگو بالکل غیر موثر ہو جاتا ہے، بالخصوص اگر لفظ و معنی کا رشتہ لگے بندھے خام فرسودہ طریق کے مطابق مرتب کیا گیا ہو۔ اسی ضمن میں دیکھا گیا ہے کہ "استفہامیہ" انداز، قاری یا سامع کی توجہ کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے لاتعداد مواقع پر اس استفہامیہ انداز سے کام لیا۔ مثلاً کیا میں تم کو بھلائی کا راستہ بتاؤں؟ کیا تم فلاں بات جاننا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں معلوم ہے؟ یہ کونسا شہر ہے؟ یہ کونسا مہینہ ہے؟ یہ کون سا دن ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس استفہامیہ انداز کو تعلیمی و تدریسی میدان میں ہم بلاشبہ ایک ایسے کارگر اور موثر طریقے کا نام دے سکتے ہیں جس میں شعری و ادبی حسن بھی ہے اور طالب علم کی خود سپردگی کی تحریک اور بھرپور ذہنی آمادگی بھی۔ اس ضمن میں حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے اس واقعے سے بھی بڑی رہنمائی ملتی ہے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ اکرم نے صحابہ کرامؓ کی مجلس میں اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ بھلا وہ کون سا درخت ہے، جس کے پتے جھڑتے نہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے؟ مجلس میں جتنے لوگ بیٹھے تھے وہ مختلف جنگلی درختوں کے بارے میں سوچنے لگے، کسی نے کوئی درخت بتایا اور کسی اور نے دوسرا۔ مگر آپؐ نے ان سب سے انکار کیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! آپ ہی بتادیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ اس تمثیلی سوال سے آپؐ یہ بتانا چاہتے تھے کہ کھجور کا درخت ایک ایسا درخت ہے جس میں سراسر بھلائی ہی بھلائی ہے۔ وہ سایہ بھی دیتا ہے، اس کا پھل بھی کھایا جاتا ہے، گٹھلیاں [illegible] کے کام آتی ہیں، پتوں سے چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ تنہ اور شاخیں مکان کی تعمیر وغیرہ

کے کام آتے ہیں' اور انہیں ایندھن کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ درخت ہر پہلو سے نفع ہی کا باعث ہے' پھر اس کی ضروریات بھی محدود ہیں۔ نسبتاً" ناموافق آب و ہوا اور نامساعد حالت میں بھی نشوونما پاتا اور پھلتا پھولتا ہے اور کبھی عریاں نہیں ہوتا۔ یہی حال مسلمان کا ہے۔ اس کی زندگی اور شخصیت' اس کے اقوال و افعال' کوئی بیکار اور بے معنی نہیں۔ وہ دوسروں کا مددگار اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ دنیا کے لیے اس کا وجود سراسر رحمت کا باعث ہوتا ہے' زحمت کا نہیں۔ غرض اس بلیغ مثال میں حضور ﷺ نے تعلیمی نصب العین' نصاب اور طریق تعلیم کی بڑے احسن اور لطیف انداز میں وضاحت کی ہے۔

چند اور مثالیں :

"قرآن پڑھنے والے مومن کی مثال اترج (شیریں پھل) کی طرح ہے' جس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے اور ذائقہ بھی اچھا ہوتا ہے اور جو مومن قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال اس پھل کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی ہوتی ہے لیکن ذائقہ کڑوا ہوتا ہے' اور منافق قرآن نہ پڑھتا ہو' اس کی مثال ایلوا کی طرح ہے جن میں خوشبو نہیں ہوتی اور اس کا ذائقہ بھی کڑوا ہوتا ہے"۔ (بخاری' مسلم' ابوداؤد' ترمذی' نسائی)

"تم میں سے جو شخص اپنی قیام گاہ میں امن و امان کے ساتھ ہو اور جسم بیماری سے محفوظ ہو اور اس کے پاس دن کی روزی ہو تو گویا اسے دنیا کی ساری نعمتیں دے دی گئی ہیں۔" (ترمذی)

"اگر ابن آدم کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ چاہے گا کہ اسے تیسری وادی مل جائے اور ابن آدم کے پیٹ کو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے' اور اللہ تعالیٰ جس کی طرف چاہتے ہیں متوجہ ہوتے ہیں"۔ (بخاری' مسلم' ترمذی)

"بے شک دنیا شیریں اور سرسبز ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا کا وارث بنانے والا ہے پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا عمل کرتے ہو' لہٰذا دنیا سے بچو اور عورتوں سے بچو' کیونکہ بنی اسرائیل کا پہلا فتنہ عورتوں ہی میں ابتلاء کا تھا"۔ (مسلم)

"کیا تم لوگ جانتے ہو مفلس کون شخص ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا ہم اپنے میں مفلس اس شخص کو سمجھتے ہیں' جس کے پاس نہ درہم ہو نہ سامان ہو۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا' میری امت میں سے مفلس وہ لوگ ہوں گے' جو قیامت کے دن نماز روزہ اور زکوٰۃ لے کر حاضر ہوں گے' لیکن انہوں نے کسی کو برا بھلا کہا ہوگا' کسی پر بہتان تراشی کی ہوگی' کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا' کسی کا خون ناحق بہایا ہوگا' اور کسی کو مارا پیٹا ہوگا' ان لوگوں کو

اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی' اگر ان مظلومین کا حق پورا ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو ان کے گناہ لے کر اس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے' پھر وہ جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔" (مسلم)

"بے شک اللہ اور اس کے فرشتے اور آسمانوں اور زمینوں والے حتیٰ کہ چیونٹی اپنے سوراخ میں اور مچھلی سب کے سب اس شخص کے لئے دعا کرتے ہیں جو لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دیتا ہے"۔ (ترمذی)

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سات قسم کے لوگوں کا ذکر کیا' جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں رکھے گا' جس دن اس کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہو گا' ان سات قسم کے لوگوں میں سے ایک قسم یہ ہے۔ دو ایسے انسان جنہوں نے اللہ کے لئے باہم محبت کی' دونوں اللہ ہی کے نام پر جمع ہوئے اور اسی کے نام پر علیحدہ"۔ (بخاری' مسلم ترمذی' نسائی)

.... لوگوں کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے کرتے ہو تو (کامل) مسلمان ہو جاؤ گے" (ترمذی' مسند احمد)

"تمام مسلمان باہمی محبت و الفت' ہمدردی و رحمت میں ایک جسم کے مثل ہیں کہ جب کسی عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" (بخاری' مسلم)

"ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو قوت پہنچاتی ہے۔۔۔۔" (مسند احمد)

"اچھے ہم نشیں اور برے ہم نشیں کی مثال مشک والے شخص اور لوہار کی طرح ہے۔ مشک والا ہم نشیں یا تم کو مشک عطا کرے گا' یا تم اس سے مشک خریدو گے یا کم از کم اس کے پاس بیٹھنے سے تمہیں اچھی خوشبو ہی ملے گی اور بھٹی دھونکنے والے کے پاس بیٹھنے یا تو تمہارے کپڑے جل جائیں گے یا تمہیں بدبو محسوس ہوگی۔" (بخاری' مسلم)

"جس نے کسی مسلمان کا حق مارا' اللہ نے اس پر آگ واجب کر دی اور جنت حرام کر دی۔ ایک آدمی نے پوچھا اگرچہ کوئی بالکل معمولی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں اگرچہ ایک پیلو کی لکڑی ہو"۔ (مسلم)۔

"جب کوئی شخص پاک مال صدقہ کرتا ہے (اور اللہ تعالیٰ پاک مال ہی قبول فرماتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ اسے دائے ہاتھ میں لیتے ہیں' اگرچہ ایک کھجور ہی ہو' پھر یہ صدقہ اللہ کی ہتھیلی میں [illegible] پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے' جس طرح تم میں سے کوئی اپنے [illegible]

گھوڑے کے بچہ یا اونٹ کے بچہ کو پالتا ہے"۔ (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی)

"عالم کی فضیلت عابد پر اسی طرح ہے جس طرح تمام ستاروں پر چاند کی فضیلت۔ اور علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء کی وراثت دینار و درہم نہیں ہے بلکہ علم انبیاء کی وراثت ہے۔ لہٰذا جس نے علم حاصل کیا اس نے بڑا حصہ پایا۔" (ابوداؤد' ترمذی)

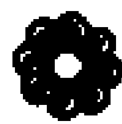
یہ خوبصورت تمثیلی انداز' استعاراتی لہجے میں حکمتوں کے دریچے وا کرتا چلا جاتا ہے اور شاید اسی انداز تدریس کے لیے مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کہا تھا۔

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

یہ اشاراتی' تشبیہاتی' استعاراتی یا تمثیلی انداز' معلم کو محض ایک آلہ تدریس نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک پر تاثیر' شیریں اور دلکش انداز گفتگو کا حامل قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ لطیف اور دلنشین اسلوب تدریس اختیار کرنے کی ذمہ داری صرف ادبیات یا زبان کے استاد پر ہی عائد نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی مضمون کے معلم کے لیے بنیادی وصف قرار پاتی ہے۔ یعنی یہ ہر اس فرد کی بنیادی مہارت ہے جسے وہ تدریسی عمل کے دوران استعمال کرتا ہے۔ سماعت پر گراں گزرنے والا لہجہ' ناہموار الفاظ کا کھردراپن' زیر بحث نصاب کا بے رنگ' سپاٹ اور خشک معروضی جائزہ اور طلبہ میں بیزار کن اکتاہٹ پیدا کرنے والا میکانکی انداز استاد کی شخصیت کے لیے بھی ضرر رساں ہے اور تعلیمی مقاصد کے لئے بھی۔

المختصر آج کے معلم کے لیے حضور اکرم ﷺ کے اسوہ تعلیمی کے دیگر پہلوؤں کے علاوہ' آپؐ کا لطیف ادبی انداز' تمثیلی اور استعاراتی اسلوب' قلب کی درد مندی' اخلاص کی قوت' موثر حکمت ابلاغ' شائستہ زبان اور انسانی نفسیات سے ہم آہنگ لطیف لہجہ' جو آپؐ کی حکمت تدریس کا ایک منور گوشہ ہے' یقیناً مشعل راہ ہے۔

(سہ ماہی مجلّہ علم کی دستک اسلام آباد' جلد 3' شمارہ 1' 1983)



فن تدریس: چند رہنما خطوط

استاد کے بارے میں بالعموم تین حیثیات بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک اس کی صاحب علم کی حیثیت' دوسرے طریق تدریس کے ماہر کی حیثیت' تیسرے منفرد شخصیت کی حیثیت۔ ماہر مضمون کی حیثیت سے ایک اچھے استاد کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ وہ نفس مضمون پر عبور رکھتا ہو اور ایک وسیع المطالعہ سکالر شخص ہو۔ اس کے لیے طریقہ ہائے تدریس میں مہارت ضروری نہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامل فلسفیوں کا خیال ہے کہ اگر معلم اپنے مضمون کا علم رکھتا ہے اور اس مضمون کے بارے میں اس کے پاس ضروری صلاحیت (Scholorship) ہے تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تدریس بھی موثر ہوگی۔ عام طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر اسی نظریہ کی حکمرانی ہے۔استاد کی دوسری حیثیت ماہر فن تدریس (Pedagogical Expert) کی ہے۔ اس نقطہ نظر کے حامل اس اصول کو نہیں مانتے کہ محض صاحب علم ہونا موثر تدریس کی علامت ہے۔ ان کے نزدیک علم رکھنا ایک بات ہے اور علم کو منتقل کرنا دوسری بات۔ چنانچہ وہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ فن تدریس میں میکانکی مہارت بھی ضروری ہے۔ اس فکر کے حامل بعض فلسفی تو تربیت اساتذہ کے نصابات میں نفس مضمون کے مقابلے میں طریق تدریس کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ البتہ اس مکتبہ فکر کے حامل اساتذہ کی متوازن رائے یہی ہے کہ نفس مضمون پر عبور (Excellence) اور طریقہ تدریس میں مہارت (Competance) دونوں ضروری ہیں۔ استاد کی تیسری حیثیت اس کی منفرد شخصیت (Unique Personality) کے حوالے سے ہے۔اس مکتبہ فکر کے حامی فلسفیوں کے نزدیک ہر چند کہ استاد کا نفس مضمون اور طریق تدریس پر عبور ضروری ہے لیکن استاد کا اپنا ذاتی تشخص بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ استاد کی انفرادیت اور شخصی عادات و اوصاف کو موثر تدریس سے الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ استاد کی شخصیت' طلبہ کی تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس فلسفہ میں ایک اچھا استاد بنیادی طور پر ایک منفرد شخصیت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں متوازن نقطہ نظر یہی ہے کہ استاد نفس مضمون اور طریقہ تدریس کے سائنسی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ خلاق' متحرک' ادب شناس اور مقصد حیات سے باخبر منفرد شخصیت کا حامل شخص بھی ہو۔

تدریس: سائنس، کرافٹ یا آرٹ

...تدریس کو ایک وحدت کے طور پر لیا جانا چاہیے۔ یعنی استاد اپنے تدریسی عمل

(Teaching Process) میں "سائنس" کے نظریات و تجربات اور "نفسیات و تعلیمات" کی تحقیقات سے ضرور استفادہ کرے' لیکن "آرٹ" چونکہ کلیت اور جامعیت کا متقاضی ہے' اور انسانی زندگی کے معنی اور داخلی پہلو سے بحث کرتا ہے' اس لئے استاد کے پیش نظر' انسانیاتی' ادبی' اور تہذیبی تناظر بھی رہنا چاہئے۔ بلکہ طالب علم کی ہمہ گیر نشوونما کے لئے فوقیت اسی تہذیبی شعور اور مقصدحیات کو ہی دینی چاہئے' جس سے انسانیت آموزی اور انسان سازی کے مشن کی تکمیل ممکن ہوتی ہو۔ بہرحال تدریسی عمل میں سائنس اور آرٹ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اہمیت اور افادیت ہے' لیکن دونوں کے مزاج' طریق کار' اور اسلوب میں درج ذیل نکات کے حوالے سے فرق ہے:

○ تدریس ایک سائنس ہے' جب استاد اپنے طریقہ تدریس کو عقل و تجربہ کی بنیاد پر مرتب کرتا ہے اور یوں متعین لوازمہ علم (Prescribed Content) کو میکانکی (Mechanical)' ریاضیاتی (Mathematical)' تجربی (Empirical)' استقرائی (Inductive)' اور معروضی (Objective) حوالے سے بیان کرتا ہے۔ یوں یہ عمل' مشینی اور میکانکی ہونے کی بنا پر ترسیل معلومات کی حد تک تو مفید ہوتا ہے' لیکن انسانی جذبات و احساسات سے بالعموم عاری ہوتا ہے۔ لیکن تدریس ایک آرٹ بھی ہے' جب استاد تدریس کی سائنسی میکانیت میں اپنی زندہ شخصیت کو شریک (Involve) کرتا ہے اور طلبہ کے لطیف جذبات و احساسات (Subtle Feelings) اور ان کی جائز خواہشات اور دلچسپیوں کو اہمیت دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے استاد کا فنی اسلوب (Artistic Style)--- وجدانی (Intuitive)' جذباتی (Emotive)' استخراجی (Deductive)' موضوعی (Subjective)' روحانی تحرک (Inspirational)' اور ادبی (Literary) حکمت تدریس کا تقاضا کرتا ہے۔ یوں استاد کی تدریس کا سائنسی اور مشینی پہلو اس کا "تدریسی طریقہ" (Teaching Method) ہے۔ جس کے لئے باقاعدہ سبقی منصوبہ بندی (Lesson Planning) کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اسلوب تدریس اپنا نظام العمل (Time-Table) از خود بنالیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں طریقہ تدریس کسی حد تک "آورد" ہے اور اسلوب تدریس "آمد" ہے۔ بہر حال طریقہ و اسلوب کی متناسب ہم آہنگی (Harmony) ہی موثر تدریس کی ضامن ہے۔

○ تدریس کی سائنسی حیثیت مسلمہ ہے' کیونکہ وہ باضابطہ اور منظم اصولوں کی روشنی میں ترتیب پاتی ہے۔ استاد ان ریاضیاتی اور فنی فارمولوں کی اساس پر اپنے تدریسی طریقے کی تشکیل کرکے طلبہ کو متعلقہ معلومات (Informations) اور مہارتیں (Skills) منتقل کرتا

ہے۔ بلاشبہ ان معلومات و مہارات کی اہمیت ہے' لیکن تعلیم تو حقیقت میں انسانی جسم' ذہن اور روح کی جامع اور متوازن نشوونما (Harmonious Development) کا نام ہے' جس کا اہم نصب العین انسانی شخصیت کے تمام انفرادی اور اجتماعی امور کی ہمہ جہت (Multi-dimensional) تیاری ہے۔ اس حوالے سے تعلیم کا کلیدی ہدف انسان سازی ہے۔ اس ہدف کی تکمیل کے لئے استاد کا ذاتی منفرد تشخص اور اس کا جمالیاتی اسلوب (Aesthetic Style) یعنی اعلیٰ مذہبی اقدار' مقصد اعلیٰ' اور ادبیات عالیہ سے گہری وابستگی ہی اس کی وہ اہم قوت ہوتی ہے' جس سے وہ دلوں کو فتح کرتا ہے۔ آرٹ کے اس پہلو کے تناظر میں معروف استاد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے اپنی حکمت تدریس کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "---- My approach has always been emotional and aesthetic---- with this approach, I tried to penetrate into the hearts of my pupils, and concentrated on purification of emotions through poetry, humour and noble sentiments----" (Stray thoughts on Education in Pakistan, p. 174)"

حقیقت میں جذب و کیف کا یہی وہ ادبی اسلوب ہے' جس سے تعلیم و تدریس میں ایک حسن پیدا ہوتا ہے' جو آرٹ کی اہم قدروں------ توازن' تناسب اور تسویہ سے ہی عبارت ہے۔ اگر تدریس میں "حسن" کا یہ عنصر نہیں ہوگا' تو طالب علم فکری' نفسیاتی اور معاشرتی حوالے سے عدم تسویہ (Mal-adjustment) کا شکار ہوکر ایک منتشر شخصیت (Split Personality) کی صورت میں ڈھل جائے گا۔

○ سائنس علم کی جزوی (Partial) انداز میں تنظیم کرتی ہے۔ اس حوالے سے تدریس ایک ایسی سائنس ہے' جو اس بنیادی نکتہ سے بحث کرتی ہے کہ وہ تدریسی ٹیکنالوجی کے ذریعے مختلف اجزاء اور ماڈیولز (Modules) کی صورت میں طے شدہ معلوماتی لوازمہ کو کس خوبی سے طلبہ تک منتقل کرے. کہ وہ ان کے دماغوں میں راسخ ہو جائے۔ سائنس حقیقت میں خارجی تبدیلی اور باہر کے طبعی انسان کو پیش نظر رکھتی ہے اور اس طرح نفس مضمون کی مناسبت سے انہیں ایک ماہر کارکن (Skilled Worker) کے طور پر سدھاتی ہے۔ اس کے برعکس آرٹ خارج میں تبدیلی کے خلاف نہیں' لیکن وہ خارجی تبدیلی سے پہلے داخلی تبدیلی کا قائل ہے۔ اس طرح وہ علم کو کلی طور پر (In Totality) منظم کرتا ہے اور زندگی کے بارے میں ایک آفاقی نقطہ نظر (Cosmic Vision) مرتب کرتا ہے------ خلاصہ کے [illegible] کا علم دیتی ہے اور آرٹ ہمیں داخلی کیفیات [illegible] سے

آشنا کرتا ہے۔ یعنی سائنس، تعلیمی عمل میں انسان کے حیوانیاتی یا حیاتیاتی وجود (Biological Being) کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اور تعمیری آرٹ انسانیاتی یا روحانی وجود (Spiritual Being) کو برتر اور بالاتر سمجھتا ہے۔ لیکن اسلامی تناظر میں مادہ و روح کی ثنویت (Duality) کا تصور صحیح نہیں، بلکہ دونوں ایک وحدت کی صورت میں ہی اہم ہیں۔ البتہ اخلاقی و روحانی نشوونما کے بغیر حیاتیاتی یا جسمانی ضروریات اور دلچسپیوں کی صالح تہذیب نہیں ہو سکتی۔

○ تدریس اس حوالے سے سائنس ہے کہ وہ طلبہ کے اذہان کو تعلیم کے معلوماتی تصور کے تحت صرف متعین علم سے پُر کرتی ہے، لیکن اس لحاظ سے وہ ایک آرٹ ہے کہ وہ نہ صرف ذہنی اشکال کو دور کرتا ہے، بلکہ قلوب کو بھی متاثر کرتا ہے۔ آرٹ کی یہی وہ تاثیر قلبی ہے، جو علامہ اقبال کی زبان میں "خون جگر" اور "فیضان نظر" ہے، جس کے بغیر سب نقش نا تمام ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزہ فن کی ہے خون جگر سے نمود

○

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

○

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

گویا تدریس کا سائنسی پہلو معاملہ دماغ ہے اور اس کا آرٹ والا پہلو معاملہ دل ہے۔ اس لئے موثر تدریس میں ان دونوں پہلوؤں کا خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ البتہ جس طرح دل کو پورے جسم میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، بالکل اسی طرح عمل تدریس میں، احساسات و جذبات اور ذاتی تشخص کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ تدریس کا یہی وہ اساسی نکتہ ہے، جو اسے زندہ بناتا ہے، ورنہ محض انتقال معلومات تو ایک تدریسی مشین بھی کر سکتی ہے۔

حقیقت میں ایک اچھا اور موثر استاد جہاں نفس مضمون اور فن تدریس کا ماہر ہوتا ہے،

وہاں وہ ایک منفرد شخصیت بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر استاد کا اپنا ایک منفرد اسلوب اور ایک منضبط طریق کار ہوتا ہے۔ ایک اچھا استاد وہ نہیں ہے جو میکانکی راستہ پر چلتا ہے یا کسی کی کاربن کاپی بن جاتا ہے بلکہ اس کا اپنا ایک تخلیقی انداز ہوتا ہے۔ وہ ہر اس چیز کو قبول کرلیتا ہے جو موثر تدریس کے لیے ضروری ہے لیکن اندھا دھند نقالی کا قائل نہیں ہوتا۔ تربیت اساتذہ کے ادارے اپنے طلبہ کو بلاشبہ کچھ معلومات' تعلیم کے مختلف عناصر سے واقفیت' مختلف طریقہ ہائے تدریس سے متعلق مہارات' کچھ وسائل اور دیگر تعلیمی اور تربیتی سرگرمیاں تو دیتے ہیں اور فی الواقعہ یہ ضروری لوازمات بھی ہیں' لیکن تربیت اساتذہ کے اداروں کو یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ زیر تربیت استاد ایک ذی روح شخصیت کا مالک بھی ہے۔ جس کا اپنا ذاتی اسلوب بھی ہے اور اس کی اپنی تخلیقی حکمت عملی بھی۔ اس کی تدریس میں تاثیر' جذبہ اور چیلنج درحقیقت اس کی خلاقی میں ہی مضمر ہے۔ لہٰذا "علم التعلیم" میں اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جدید تدریسی ٹیکنالوجی کی تعلیم کے ساتھ طالب علم (زیر تربیت استاد) کی تخلیقی' ادبی' لسانی' اور تنقیدی صلاحیتیں مجروح نہ ہوں۔ اس مقصد کے لئے آرٹ اور سائنس کے حسین امتزاج سے ہی موثر اور کارگر حکمت تدریس جنم لے سکتی ہے۔

فن تدریس: میکانکی تناظر

انتقال معلومات اور موثر ابلاغ کے لیے ضروری ہے کہ معلم' موثر تدریسی حکمت سے بھی آگاہ ہو۔ فن تدریس سے آگہی کے لیے معلم کو فلسفہ تعلیم' تعلیمی نفسیات' تعلیمی عمرانیات اور عمل تعلیم کے تمام عناصر بالخصوص طریقہ تدریس سے متعلق مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اصل میں کوئی ایک طریقہ تدریس فی نفسہ نہ موثر ہے اور نہ غیر موثر' نہ بہترین ہے نہ بدترین۔ بلکہ ہر طریقہ تدریس کو بعض مقاصد تدریس کے حصول کے تناظر میں ہی موثر یا غیر موثر کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مقاصد کے حوالے سے اور کمرہ جماعت کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر کسی طریق تدریس کا مناسب اور بروقت استعمال ہی اسے اچھا یا برا ثابت کرے گا۔ دراصل ہر تعلیمی اصول پہلے پہل نظری ہوتا ہے' عملی قانون نہیں ہوتا۔ نظری اصول اسی وقت علمی شہادت یا علمی قانون کا درجہ حاصل کرسکتا ہے جب تجربہ کے ذریعے اس کی صحت کو ثابت کیا جائے۔ بہر حال تمام طریقہ ہائے تدریس کو دو عمومی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ طریقے جن میں استاد مرکز عمل ہوتا ہے اور دوسرے وہ [illegible] ہوتا ہے۔ ان دو عمومی اقسام کے حوالے سے درج ذیل

چند اہم طریقہ ہائے تدریس بڑی اہمیت رکھتے ہیں ان طریقوں میں مقاصد کی روشنی میں استاد اور شاگرد دونوں کی شرکت، تعلیم و تعلم کو موثر بنا سکتی ہے۔

- ○ لیکچر، مشق کا طریقہ ○ مکالمہ، سوالات، بحث و مذاکرہ کا طریقہ
- ○ منصوبی، مسلی، تحقیق و مشاہدہ کا طریقہ ○ استخراجی، استقرائی، سائنسی طریقہ
- ○ جدید تدریسی ٹیکنالوجی کا طریقہ ○ سیمینار، ورکشاپ، کانفرنس کا طریقہ

فن تدریس: تہذیبی تناظر

تہذیبی نقطہ نظر سے فن تدریس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ تعلیم و تعلم کے سارے عمل میں طالب علم اور استاد دونوں اہم ہیں، لیکن مرکزیت استاد کو ہی حاصل ہے۔ استاد محض معلم ہی نہیں ہوتا وہ مربی، داعی اور مزکی بھی ہوتا ہے۔ حقیقت میں تہذیبی حوالے سے تدریس، محض ایک پیشہ (Profession) نہیں بلکہ ایک فریضہ (Moral Obligation) ہے اور اس مقصد کی بجا آوری میں معلم ذمہ دار اور مسئول ہے۔ لہٰذا موثر تدریس کے نقطہ نظر سے یہ ضروری ہے کہ ایک مسلم استاد بیک وقت صحیح معنوں میں فکری اور عملی لحاظ سے اسلام کا پیروکار بھی ہو اور ساتھ ہی ساتھ نفس مضمون اور اس کی تدریس میں بھی ماہر ہو۔ چنانچہ درج بالا اہم سائنسی طریقہ ہائے تدریس کے موثر اور برمحل استعمال کے ساتھ ساتھ معلم کو تہذیبی حوالے سے درج ذیل چند اہم رہنما خطوط بھی پیش نظر رکھنے چاہیں۔ یہی وہ روشن خطوط ہیں جو اس کی حکمت تدریس کو بھی موثر بنائیں گے اور زندہ و حسین بھی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے "حدیث التعلیم" تالیف از ڈاکٹر سعید اللہ قاضی)

- ○ معلم کے سامنے ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نصب العین ہونا چاہئے اور تعلیم و تعلم میں رضائے الٰہی کا حصول ہی قدر اعلیٰ ہونی چاہئے۔
- ○ حمد و ثنا کے بعد تدریس کی ابتدا کی جائے۔ معلم کا مجموعی اسلوب بیان صاف، شستہ اور باوقار ہو۔ خیر خواہی اور اچھا طرز کلام اس کی شخصیت کا بنیادی وصف ہو۔
- ○ معلم کی گفتگو اچھے ادبی الفاظ و تراکیب کی حامل ہو۔ لیکن محض خوبصورت جملے بے معنی ہوں گے اگر معلم کی شخصیت میں اخلاص، انکسار اور اخلاق حلو نہ ہو۔ کامیاب اور موثر تدریس کے لئے علم و عمل کا امتزاج اور قول و فعل میں مطابقت ضروری ہے۔
- ○ معلم کا دماغ معلومات سے پُر ہو، [illegible]

قوت بھی ہو۔

- موثر ابلاغ کے لیے فطرت انسانی کے اہم تقاضوں کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ ان تقاضوں کی بہتر تفہیم قرآن حکیم کے متعین کردہ تین خطوط۔۔۔۔ نفس امارہ، نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی روشنی میں ہی ہو سکتی ہے۔
- معلم کو دینی امور میں سمجھ بوجھ ہو اور نیک نیتی اس کا تدریسی وصف ہو۔
- استاد کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ نیکی کی طرف دعوت دینے والے استاد کو دعوت کے ثواب کے ساتھ ساتھ اس کے شاگرد کے اجر کے برابر بھی اجر ملے گا جس نے اس نیک کام کی پیروی کی اور جس استاد نے گمراہی کی طرف دعوت دی تو اس کو گناہ کی طرف دعوت دینے کے گناہ کے ساتھ ساتھ اس شاگرد کے گناہ کے برابر بھی گناہ ملے گا۔
- تعلیم و تدریس کے دوران اگر کوئی خلاف شرع بات کی جائے تو معلم کو اس بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار دوران تدریس کرنا چاہئے تاکہ شاگردوں پر اس کی اصل حقیقت واضح ہو جائے۔
- طالب علموں کی تعلیم و تربیت میں اسلامی خطوط پر مختلف طریقوں سے کام لینا باعث ثواب ہے اور ان کو الحاد کے بھنور میں دھکیلنے کے لیے مختلف حربوں سے کام لینا باعث ذلت و عتاب ہے۔
- اچھا استاد' ذوق مطالعہ و تحقیق رکھتا ہے۔ پوری زندگی طالب علم رہتا ہے اور ہمیشہ حصول علم کا شائق ہوتا ہے۔ اس ضمن میں روحانی فیض اور تحرک (Inspiration) کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم و سنت رسول ﷺ کو تسلیم کرتا ہے اور اسی سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔
- معلم اور متعلم دونوں قابل احترام ہیں یعنی معلم کو متعلم کا اور متعلم کو معلم کا احترام کرنا چاہئے۔ معلم تربیت کی خاطر اگر سختی بھی کرے تو اسے جذبہ رحمت کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ معلم کو اس تدریسی اصول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ معلم اور متعلم کے درمیان باہمی احترام کی فضا بحال کئے بغیر بہتر تعلم اور خوش گوار تعلیمی ماحول ممکن نہیں۔
- استاد کمرہ جماعت کے اندر اور باہر غیر شرعی اور لایعنی باتوں میں اپنا وقت ضائع نہ کرے' اس لیے کہ اس کی زندگی' اس کا علم اور اس کو اللہ کی عطا کردہ سمع' بصر اور فواد کی صلاحیتیں سب امانت ہیں' اور ان کے لئے وہ خدا کے سامنے مسئول ہے۔

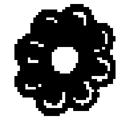
- ایک دینی جذبہ رکھنے والا دین دار اور دعوت دین کے لیے متحرک شاگرد استاد کے لیے بہترین سرمایہ آخرت ہے۔ اس لیے استاد کا یہ فرض ہے کہ وہ طلبہ میں متعلقہ مضمون میں مہارت کے ساتھ ساتھ انہیں دعوت دین کے لیے بھی تیار کرے اور اسی نقطہ نظر سے ان کی تربیت کرے۔ وہ یہ بات پیش نظر رکھے کہ وہ درحقیقت باقی تمام افراد کی نسبت سب سے زیادہ مسئول اور جواب دہ ہے۔ اس سے اس کے طلبہ کے طرز فکر اور طرز عمل کے بارے میں بھی باز پرس ہوگی۔
- استاد کا لباس ساتر' حیا دارانہ اور صاف ستھرا ہونا چاہئے۔ استاد کی ظاہری شخصیت کا پہلو تدریس کو موثر یا غیر موثر بنا سکتا ہے۔
- استاد کو اگر کسی مسئلہ کے بارے میں علم نہ ہو تو وہ اس مسئلہ کے بارے میں اس کو ایسے استاد کے پاس بھیجے جسے اس سوال کا بہتر جواب معلوم ہو۔ یہی صاحب علم اساتذہ کا طریقہ ہوتا ہے اور یہ ثواب کا کام ہے۔
- جس استاد کو کسی سوال کا جواب نہ آئے اور بغیر جانے جواب دینے کی کوشش کرے تو وہ درحقیقت جاہل ہے۔ اور وہ اس لیے کہ ایک طرف وہ غلط جواب دینے کے لیے جواب دہ ہے اور دوسری طرف اس کے غلط جواب سے طلبہ کے عمل کرنے کے لیے۔
- سوال اٹھانا اور سوالات کا خیر مقدم کرنا بھی منصب معلم کا لازمہ ہے۔ لیکن لایعنی سوالات سے اجتناب کرنا بہتر ہے۔ بہرحال سوالات اور دیگر تعلیمی امور کے بارے میں طلبہ کی عزت نفس کو مجروح کرنا اور ان کی تضحیک کرنا "تدریسی گناہ" کے مترادف ہے۔
- معلم کو بعض اہم مسائل بار بار دہرانا چاہئیں' تاکہ وہ شاگردوں کے اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔ بہر حال اس تکرار کے طریق میں استاد کو ایک ہی مسئلہ کو بار بار بیان کرنے میں مختلف الفاظ' تراکیب اور دلچسپ اسالیب کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ طلبہ بوریت یا بیزاری (Boredom) کا شکار نہ ہوں۔
- استاد کو تشکیک اور ارتیابیت (Scepticism) سے بچنا چاہئے۔ اس کے برعکس اپنے تدریسی اسلوب میں تاکیدی اور یقینی انداز بیان اختیار کرنا چاہئے۔ نیز مضمون کی وضاحت اور تاثیر کے لیے مثالوں' اشارات' عمدہ اشعار اور تدریسی معاونات سے کام لینا چاہئے۔
- معلم لطیف ذوق مزاح رکھتا ہو۔ لیکن [illegible]

ہو اس میں نہ تو خلاف حق کوئی بات شامل ہو نہ کسی کی دل آزاری ہو اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنے کا انداز ہو۔

○ معلم کا کام صرف نظری تعلیم ہی نہیں بلکہ طلبہ کو تحریک اقامت دین کا فعال سپاہی بھی بنانا ہے۔

مجموعی نقطہ نظر سے ایک استاد کے لئے ضروری ہے کہ اس کا نفس مضمون پر عبور ہو اور وہ علم التعلیم کے حوالے سے موثر طریقہ ہائے تدریس کے استعمال کی تربیت رکھتا ہو۔ لیکن نظریاتی تناظر میں موثر حکمت تدریس وہی ہوگی' جس میں استاد بنیادی مہارتوں کے ساتھ ساتھ' قرآن حکیم اور اسوہ رسول ﷺ کے حوالے سے بھی اپنا تدریسی اسلوب مرتب کرے اور اس طرح اپنے افکار و کردار میں صالحیت پیدا کرے۔ کیونکہ استاد کی علمی وجاہت بے معنی ہوگی اگر اس کے ساتھ اخلاقی قوت شامل نہیں۔

(شش ماہی مجلہ ابتدائی تعلیم' جامعہ پنجاب لاہور' شمارہ 3' مارچ 1987ء)



تعلیم کا انسانیاتی تصور اور استاد

انسان' اللہ تعالٰی کی واحد جاندار مخلوق ہے جسے زندگی گزارنے کیلئے گرد و پیش کے غیر منظم اور غیر مربوط ماحول کے تقاضوں کی نذر نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی وہ اس طرح کے بے نظم ماحول کی آلودگی میں پروان چڑھتے ہوئے ان ارفع مقاصد کی طرف کوئی پیش رفت کرسکتا ہے جو "انسان" سے منسوب کئے جاسکتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اپنی ذات کے عرفان اور اپنی صلاحیتوں کے ادراک سے بھی محروم رہے گا اور اس کے شب و روز' حیوان کے سے غیر تخلیقی اور غیر تعمیری انداز میں گزرتے رہیں گے۔ دراصل میری اس بات کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تمام حیوان اپنے مخصوص ماحول کے اندر رہتے ہیں۔ جبلی انداز میں اپنی زندگی کے قرینے اور سلیقے سیکھ جاتے ہیں اور ان سرگرمیوں کا ادراک و شعور حاصل کرلیتے ہیں جو ان کی زندگی کی بقا کیلئے ضروری ہوتی ہیں۔ ان کی زندگی کسی آدرش' کسی مقصد' کسی اصول یا کسی نظریئے سے منسلک نہیں ہوتی بلکہ پہلی سانس سے آخری سانس تک پھیلے ہوئے طویل یا مختصر وقفے ہی کو کامل اور بھرپور زندگی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی جدوجہد ہر حیوان کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔

انسان کی صورت حال بڑی حد تک مختلف ہے۔ اس کیلئے زندگی پہلی اور آخری سانس کے درمیان پھیلے ہوئے ماہ و سال کا نام ضرور ہے لیکن ان ماہ و سال کو صرف پیمانہ امروز و فردا کے حوالے سے نہیں ماپا جاتا۔ ان کی جانچ پرکھ کے اور بھی کئی معیارات ہیں اور بھی کئی کسوٹیاں ہیں۔ انسان کی زندگی کے ان ہی قرینوں اور سلیقوں کو اس کی سیرت و کردار کے مختلف زاویئے خیال کیا جاتا ہے اور ان ہی صد رنگ زاویوں سے عبارت' انسان اپنی منفرد خصوصیات یا کارناموں یا انداز زیست کے باعث انسانوں کی اس بستی میں اپنی پہچان اور اپنے تشخص کا حوالہ بنتا ہے۔

اس ابتدائی گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ حیوان کو اپنی زندگی کیلئے محض جبلت کے آزادانہ بے مہار ماحول میں چھوڑ دینا کافی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش کے تقاضوں ہی سے بقائے حیات کا اہتمام کرلیتا ہے لیکن انسان کو ایسے بے ہنگم ماحول کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ وہ مٹی ہے جسے مطلوب ظرف میں ڈھالنے کیلئے دست ہنر مند کی ضرورت ہے۔ ایسا دست ہنر مند جو فکر رسا بھی رکھتا ہو' زندگی کی اعلٰی اقدار کے شعور سے بھی بہرہ مند ہو' [illegible] سے بھی آشنا ہو' انسان کے مقصد تخلیق سے بھی آگاہ ہو اور

اس کی بے کراں صلاحیتوں اور لا محدود قوت تسخیر سے بھی باخبر ہو۔

استاد کا مرتبہ و مقام ایک ایسے ہی ماہر ظروف ساز کا ہے جو گل خام کو مطلوبہ سانچوں میں ڈھالتا اور ان سانچوں کو عصر نو کے تقاضوں کا شعور دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جدید مشینی آلات نے تعلیمی سرگرمیوں میں انقلاب برپا کردیا ہے اور مشین درس و تدریس کے عمل میں اس قدر دخیل ہوچکی ہے کہ استاد پس منظر میں جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن مشین انسان سازی کا وہ عظیم وظیفہ سرانجام دینے سے بہرحال قاصر ہے جو صرف ایک استاد ہی سرانجام دے سکتا ہے کیونکہ اپنے طلبہ کے جداگانہ پس منظر اور منفرد عادات و خصائل کے باعث ہر ایک کے مثبت و منفی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے فکر و احساس کی تراش خراش کرنا اور اسے باوقار قد و قامت عطا کرنا صرف استاد ہی کا کام ہے---- اور یہ کام آنے والے کئی برسوں تک استاد ہی کو کرنا پڑے گا۔ حقیقت میں تعلیم کا یہی وہ انسانیاتی تصور ہے جس کی روشنی میں ہمیں استاد کے کردار کو دیکھنا ہوگا۔ استاد کا یہ کردار تعلیم کے حیوانی یا حیاتیاتی تعبیر کے بجائے انسانیاتی یا تہذیبی تعبیر کے حوالے سے ہی متعین ہوگا۔ تعلیم کی اس انسانیاتی یا تہذیبی تعبیر کا اساسی نکتہ یہی ہے کہ انسان کائنات میں اشرف المخلوقات ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کا نائب ہے---- تعلیم و تدریس کا سارا حسن دراصل زندگی کی اسی روحانی اور اخلاقی توجیہہ سے وابستہ ہے۔

اہل نظر اساتذہ بخوبی واقف ہیں کہ تربیت اساتذہ کے ضمن میں تعمیر سیرت کے کن پہلوؤں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اور ان کے بارے میں کیا دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ میں ان باتوں کو دھرانا مناسب خیال نہیں کرتا' کیونکہ روایتی طور پر پچھلے کئی برسوں سے ان کا تذکرہ ہوتا چلا آیا ہے۔ البتہ میں محسوس کرتا ہوں کہ تعمیر سیرت کے ضمن میں سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کی اسی انسانیاتی تصور' جذبے یا احساس کو دی جانی چاہئے جسے وفاداری یا یقین یا ایمان کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ایک بچے کے قلب و ذہن میں ایسی اقدار سے وابستگی یا ان پر کاربند رہنے یا ان کے بقاء کیلئے جدوجہد کرنے کی امنگ پیدا نہیں کی جاسکتی جن اقدار کے بارے میں استاد کا اپنا یقین ناپختہ' اس کا اپنا ایمان متزلزل اور ان کی اپنی وفاداری (Conviction) مشکوک ہے۔ اقبال نے جب مغلوب گماں ہونے کا طعنہ دیا اور یقین پیدا کرنے کی تلقین کی تو اس کے پیش نظر یہی حکیمانہ نکتہ تھا کہ جب تک ہم یقین کی دولت سے مالا مال نہیں ہوتے اور ایمان کی متاع گم گشتہ کو پھر سے حاصل نہیں کرلیتے۔ اس وقت تک ہمارے اندر وہ جوہر نمو نہیں پا سکتا جو ہمیں انسانی عظمت سے ہمکنار کرسکے۔

میں اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس امر کی [illegible]

جب تک ہم اپنے طلبہ کو، اپنے دین، اپنی تہذیبی اقدار، اپنی ملت، اپنے وطن یا اپنی سوسائٹی کے بارے میں ایک توانا، ٹھوس اور بے حد مضبوط تصور نہیں دیتے، اس وقت تک ان کے اندر وہ قوت پیدا نہیں ہوگی جو ان کے تحفظ کیلئے عشق و جنون کا روپ دھار لیتی ہے۔ سو اصل مسئلہ محض مذہبی عقائد کا شعور دینا، اپنی تہذیبی و معاشرتی اقدار کے بارے میں معلومات فراہم کرنا یا انسان مطلوب کی صفات و خصوصیات گنوانا نہیں۔ اصل اور اہم کام یہ ہے کہ علم کی ترویج و منتقلی کے ساتھ ساتھ ان تمام آفاقی و زمینی حقائق کے ساتھ طلبہ کے دل میں گہری اور اٹوٹ وابستگی (Commitment) پیدا کی جائے۔ یہی وہ موڑ ہے جس پر آموزش کے کٹھن سفر میں استاد کی حکمت ودانش داخل ہوتی ہے۔ اسی سنگ میل سے کمپیوٹر کا کام ختم ہوتا اور ایک معلم کا فریضہ شروع ہوتا ہے۔ کسی بھی اصول و نظریہ یا مقصد حیات کے ساتھ والہانہ وابستگی پیدا کرنے کیلئے استاد کی شخصیت کی جامعیت سے بڑھ کر کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ اس کیلئے کوئی لگے بندھے پیمانے بھی نہیں ہیں۔ کوئی ریاضیاتی فارمولے بھی نہیں ہیں۔ یہ وہ جولانگاہ ہے جس کے اندر استاد کا طرز عمل، اس کے الفاظ کی ساخت، اس کے جملوں کی نشست و برخاست، اس کے لباس کی تراش خراش، اس کی چال ڈھال، اس کا علم، اس کا قلب درد مند، اس کا اخلاص، اس کی حرکات و سکنات، اس کے وجود کا ایک ایک انگ اور اس کے انداز تدریس کا ایک ایک رنگ اپنے طلبہ کے دلوں پر دستک دیتا اور ذہنوں کی کھڑکیاں واکرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کسی ڈاکٹر کی کلینک میں لگنے والا انجکشن ہے نہ آپریشن تھیٹر میں کیا جانے والا آپریشن۔۔۔۔ اس میں کسی طرح کی مشینی حرکات کا سرے سے کوئی عمل دخل ہی نہیں۔ یہ مکمل طور پر ایک غیر میکانکی عمل ہے جس کی مثال اس ٹھنڈی پھوار سے دی جاسکتی ہے جو اجلے آسمانوں سے اترتی اور لطیف خوشبوؤں سے ہم آغوش ہوتی ہوئی اپنے دامن تلے آنیوالوں کو بھگوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بارش اپنا افق خود ہی تلاش کرتی ہے۔ استاد اپنی بات کو موثر بنانے اور اسے اپنے طلبہ کے دلوں میں ہمیشہ کیلئے جاگزیں کرنے کیلئے کسی درسی کتاب، کسی سمعی و بصری آلے یا کسی جدید فنی تکنیک سے اتنا بھرپور استفادہ نہیں کرسکتا جتنا وہ اپنی سحر طراز شخصیت کے ذریعے کرسکتا ہے۔ استاد کی شخصیت میں ایک طلسم پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس طلسم کو دریافت کر لینے اور اسے موثر و کارگر طور پر استعمال کرنے والے استاد کی بات، فکر و خیال کی لوح پر اس طرح نقش ہوجاتی ہے کہ اسے صدیوں بھلایا نہیں جاسکتا۔ طالب علم درس گاہوں کی چار دیواری سے نکل کر زندگی کی متنوع راہوں پر نکل جاتے ہیں لیکن وہ عمر بھر استاد کی شخصیت کی جادو نگری سے باہر نہیں نکل سکتے۔ [illegible] حکیم الامت کی اصطلاح میں "خون جگر" کے بغیر ناممکن ہے۔

ظاہر ہے ہمارے تہذیبی نظریہ کے تناظر میں اس خونِ جگر کا اصل سرچشمہ قرآن حکیم اور اسوۂ رسول ﷺ ہے اور یہی وہ دائمی ماخذ ہے جس سے معلم تخلیقی' وجدانی اور روحانی تحریک (Inspiration) حاصل کرتا ہے۔

تعلیم کے انسانیاتی تصور کے تناظر میں ہم جن صفات و خصوصیات کا تقاضا کرتے ہیں' ان میں تہذیبی اقدار اور انسانی حوالے سے اچھے خصائل کا حامل ہونا بنیادی باتیں ہیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم اسلامی ملک میں آباد ہیں۔ ہمارے طالب علم اسلامی گھرانوں سے آتے ہیں۔ اسلامی عقائد اور مبادیات کے بارے میں انہیں بنیادی معلومات بھی ہوتی ہیں۔ ہم نے ایک عرصے سے اسلامیات کو گریجوایشن کی سطح تک لازمی مضمون کی حیثیت بھی دے رکھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ شکایت عام رہتی ہے کہ ہماری نئی نسل کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلامی شعائر سے بالعموم بے بہرہ ہے اور اس کی اپنے دین یا دینی اقدار کے ساتھ عملی وابستگی بے حد کمزور ہے۔ اس کا ایک اہم سبب یہی ہے کہ ہم یعنی اساتذہ مختلف مضامین پڑھانے کے ہنر (Pedagogy) یا علم التعلیم (Science of Teaching) سے تو شاید واقف ہیں لیکن اس "اسم اعظم" یا "خونِ جگر" سے واقف نہیں جو ان پڑھائی جانے والی حقیقتوں کے ساتھ لازوال عشق بھی پیدا کرے۔ جب ایک بار ہم عشق و جنون کی کیفیت پیدا کرلیں گے تو وہ انسان مطلوب میسر آجائے گا جو اپنے اساسی نظریات کیلئے لڑنے مرنے اور قربانی دینے کیلئے ہر لمحے آمادہ و تیار ہوگا۔ غازی علم الدین شہید نے جب نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو جہنم رسید کیا تو علامہ اقبال نے روتے ہوئے یہ تاریخی جملہ کہا تھا۔۔۔۔ "اسیں گلاں کردے رہے تے لوہاراں دا منڈا بازی لے گیا" (ہم باتیں کرتے رہ گئے اور لوہاروں کا بیٹا بازی لے گیا۔) میری اس بات کا ہرگز یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم محض ایک جذباتی تعلیمی فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ البتہ میرے نزدیک سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہم نے لاکھوں جانوں کی قربانی دے کر ایک خطہ ارضی صرف اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے تو یہ اس خطہ ارضی کے تحفظ کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی نئی نسل کو اپنے اساسی نظریئے سے اٹوٹ وفاداری اور یقین کامل کا درس دیتے رہیں اور بالآخر اسے بہترین خلق سے آراستہ کریں تاکہ وہ ساری دنیا میں معلم انسانیت ﷺ کی لائی ہوئی روشنی کو پھیلا دینے کی ذمہ داری پوری کرنے کی اہل بن سکے۔۔۔۔ اگر ہم اسلام پر واقعی غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں اسی ایمانی قوت سے نئی نسل کو بھی سرشار کرنا ہوگا ورنہ وہ اس قلعے کی پاسبانی کے اہل نہیں بن سکیں گے۔

تعمیر سیرت کے حوالے سے [illegible] خصوصیات [illegible]

اولیٰ ہے۔ ایک تعلیم یافتہ انسان اور ایک جاہل شخص میں صرف یہی بات وجہ امتیاز نہیں ہونی چاہئے کہ ایک کے پاس کاغذ کی ڈگری ہے اور دوسرا اس سے محروم ہے بلکہ دونوں کا طرز عمل' دونوں کا انداز گفتگو اور زندگی کے بارے میں دونوں کا رویہ' انکے علم یا جہالت کی تصویر ہونا چاہئے۔ اخلاق سازی کیلئے اگر محض وعظ اور پند و نصیحت کافی ہوتے تو ہمارے ملک کے بے شمار اساتذہ کی دلنشیں و دلپذیر تقریریں' سیرت و کردار کو مثالی سانچوں میں ڈھال چکی ہوتیں لیکن اس مقصد کیلئے حرف رنگین سے کہیں زیادہ ادائے دلبرانہ کی ضرورت ہے۔۔۔۔ استاد کی شخصیت اگر اعلیٰ اخلاقی معیار کی حامل ہے اور وہ خود معمولات حیات میں ایک قابل رشک مثال قائم کرتا ہے تو طلبہ کے لئے وہ زیادہ قابل تقلید نمونہ ہے جس کے اثرات ساری زندگی برقرار رہ سکتے ہیں۔

تعمیر سیرت کے لوازمات پر نظر رکھنے والے استاد کو اپنے عصری تقاضوں سے بھی ضرور آگاہ ہونا چاہئے۔ اس کی انگلیاں اپنے عہد کی نبض پر ہونی چاہئیں اور اسے اس بات کا کامل ادراک ہونا چاہئے کہ آنے والے دنوں میں وطن عزیز کو یا امت مسلمہ کو کس نوع کے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ نظریاتی' علمی' فنی' تحقیقی' سائنسی' عسکری یا دفاعی ضروریات کا تعین کرنے کے بعد اسے مطلوبہ ہدف کو مرکز توجہ بنانا چاہئے۔ اگر اس کی کاوشیں لگے بندھے راستوں تک محدود رہیں گی تو عین ممکن ہے کہ سیرت کے حوالے سے بہت مضبوط و توانا نسل بھی عصری تقاضوں کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے۔

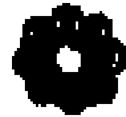
میں ان صفات یا لوازمات کی فہرست گنوانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جن کے مرقع کو حسن سیرت و کردار کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ صفات بڑی حد تک معروف ہیں۔۔۔۔ میں نے اس مختصر گفتگو میں جس نکتے کو بنیاد بنایا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مثالی استاد' طالب علم کے دل و دماغ میں وفاداری بشرط استواری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرے' کیونکہ درحقیقت یہی جواز حیات ہے۔ اسی وفاداری سے ہم اس "جوان مطلوب" کو پا سکیں گے جو اپنی نظریاتی و تہذیبی اقدار کے بارے میں کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار نہ ہو' جو کارگاہ حیات میں پوری توانائی سے اپنا کردار ادا کر سکے اور جو اخلاقی حوالے سے بھی ہماری روشن اقدار کا امین ہو۔

میں اپنے نظام تعلیم کی ان خامیوں سے بھی اچھی طرح آگاہ ہوں جو استاد کو نصاب کے شکنجے میں کسا رکھتی اور اس کے فاضلانہ کردار کو بے حد محدود کر دیتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایک استاد کی کارکردگی کا معیار محض امتحانی نتائج کو قرار دیا جاتا ہے اور تعلیمیات میں ایسا کوئی جامع [illegible] ابھی تک [illegible] جس کے ذریعے ہم سیرت و کردار کے جوہر کو بھی پرکھ سکیں

اور اسے استاد کی کارکردگی کے پلڑے میں ڈال سکیں۔ نصاب کے قدغنوں کا شکار' امتحانی تقاضوں کی جکڑ بندیوں میں جکڑا ہوا اور اپنے طالب علم کو زیادہ سے زیادہ نمبر دلانے کے جنون میں مبتلا استاد کو ہم نے اس قدر بے بس کرکے رکھ دیا ہے کہ وہ سیرت سازی کے اہم فریضے پر کما حقہ توجہ نہیں دے سکتا۔ یہ ہمارے موجودہ سسٹم کا ایک انتہائی منفی پہلو ہے اور تربیت اساتذہ سے تعلق رکھنے والے تمام اداروں اور اساتذہ کی تنظیموں کیلئے لمحہ فکریہ بھی ہے۔ ہم جہاں تعلیم کے عمل میں میکانکی انقلابات لانے کے متمنی ہیں وہاں اس پہلو پر بھی اہل علم کو سر جوڑ کر بیٹھنا چاہئے اور وقت کے اس انتہائی اہم سوال کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔

میں ان تمام باتوں کے باوجود تدریسی عمل میں تعمیر سیرت کے حوالے سے استاد کے کردار کی اہمیت کو بنیادی مقام دیتا ہوں۔ میرا پختہ یقین ہے کہ حسن کردار و عمل سے آراستہ استاد کے بغیر ہم کسی صورت بھی سیرت و کردار کے اچھے نمونے تخلیق نہیں کرسکتے۔ لارڈ برٹرینڈرسل نے کہا تھا کہ استاد کے ہاتھ میں محض درسی کتاب تھما دینا اس کی توہین ہے۔ اسے مکمل طور پر آزاد چھوڑ دینا چاہئے کہ وہ اپنے طلبہ کو کیا بنانا چاہتا ہے۔ میں شاید اس قول کے مضمرات سے کلی اتفاق نہ کر سکوں لیکن اس سے استاد کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔۔۔۔ حقیقت میں جس قوم کا استاد ایک لافانی نظریہ حیات کا حامل ہو' جاودانی حقائق کا شعور رکھتاہو' اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کی میراث کا حامل ہو' اپنے مضمون پر کامل عبور رکھتا ہو اور موثر حکمت ابلاغ سے شناسا ہو' وہ یقیناً انسان سازی کے وظیفے سے بہترین انداز میں عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔۔۔۔ خلاصہ کے طور پر تعلیم کا یہی وہ انسانیاتی تصور ہے' جس کی روشنی میں ہمیں عمل تعلیم کے تمام عناصر کی توجیہہ و تعبیر کرنا ہوگی اور یہی وہ اساسی نکتہ ہے' جس کے گرد تربیت اساتذہ کے سارے پروگرام کو مرتب کرنا ہوگا۔

(انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ' پنجاب یونیورسٹی' قائداعظم کیمپس' لاہور کی فیلٹی کے ایک اجلاس منعقدہ جولائی 1993 میں پڑھا گیا۔۔۔۔ سہ ماہی مجلّہ تعلیمی زاویے' جلد 4' شمارہ 3' اکتوبر 1993ء)



معلم: تدریس کا محوری نکتہ

(جامعات کے تناظر میں)

جس طرح سائنس کی ہنگامہ خیز پیش رفت، مشین کی کارفرمائی اور ایجادات کی ہمہ گیری کے باوجود کائنات میں انسان کے منصب و مقام کی اپنی اہمیت ہے، اسی طرح تعلیم و تدریس کے عمل میں نئی فنی میکانیات اور سائنسی آلات کی ہمہ گیری کے باوصف، استاد کی انفرادیت و اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ دراصل تدریس کو کسی طور بھی ایک میکانکی عمل قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کا سب سے بڑا وظیفہ انسان سازی ہے۔ اس اعتبار سے تدریس، معلم کو ایک انجینئر سے کہیں زیادہ ایک فن کار کا درجہ دیتی ہے جو اپنی فکر، اپنے جذبہ و احساس اور اپنی تخلیقی اپج کو بروئے کار لاتا اور اپنی شخصیت کے سحر سے ابلاغ کے عمل کو زیادہ جامع اور موثر بناتا ہے۔ نصاب، کتاب، ٹائم ٹیبل، ڈیٹ شیٹ، طریقہ امتحان اور اس نوع کے جو معمولات تعلیم و تدریس کے عمل میں خاصے نمایاں اور اہم دکھائی دیتے ہیں، دراصل استاد کے مقام اور اس کی شخصیت کے حوالے سے محض ضمنی اور ذیلی عوامل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ذہنوں کی بند کھڑکیاں کھولنے اور دلوں کے دریچوں پر دستک دینے والا علم ان معمولات و عوامل سے ماورا، صرف استاد کے تخلیقی فن سے جنم لیتا ہے اور شاید اسی لئے علامہ اقبالؒ نے بھی مکتب کی کرامت کی نفی کرتے ہوئے اسے فیضانِ نظر کا نام دیا تھا۔

اس طرح کی ہمہ گیر تدریس کے لئے بلاشبہ کوئی متعین سائنسی فارمولا تو نہیں، لیکن ایک متوازن نقطہ نظر یہی بنتا ہے کہ تدریس، سائنس اور آرٹ کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ اس میں جہاں ذہنی یا عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں قلبی یا وجدانی کیفیت بھی ضروری ہے۔ تدریسی اسلوب، درحقیقت استاد کی شخصیت، نفس مضمون میں مہارت اور طریقہ ہائے تدریس پر عبور کا مرکب ہے۔ اس حوالے سے تدریس جہاں ایک اطلاقی سائنس ہے کیونکہ یہ نفسیات (Psychology)، معاشریات (Sociology)، بشریات (Anthropology) اور اعصابیات (Neurology) میں کی گئی سائنسی تحقیقات کے نتائج سے استفادہ کرتی ہے اور اپنے سائنسی طریقہ تدریس کی بنیاد علت و معلول کے باہمی تعلق (Cause-Effect Relationship) کو ٹھہراتی ہے، وہاں جب استاد اپنی زندہ شخصیت،

اپنی طرز فکر اور اپنی وجدانی صلاحیتوں کو' اس سائنسی عمل میں شامل کرتا ہے تو تدریس ایک آرٹ کا روپ دھار لیتی ہے اور یہی درحقیقت تدریس کی جان ہوتی ہے۔ استاد کا یہی جذبہ و احساس' اس کا فلسفہ و کردار' اور اس کا علم و مشاہدہ ہی وہ اصل قوت محرکہ (Motive Force) ہوتے ہیں' جس سے وہ اپنی بات کو موثر بناتا ہے۔ گویا تدریس انسانی تعقل' سائنسی نتائج اور وجدانی صلاحیتوں کی ہم آہنگی کا نام ہے۔۔۔۔۔ لیکن بحیثیت مجموعی استاد کے تدریسی عمل میں جب تک محبت کی نمی نہیں ہوگی اس وقت تک ساری تدریسی مشقیں بے کار ہیں۔ بقول ملا نظیری:

درس ادیب گر بود زمزمہ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

یعنی اگر استاد کا سبق' محبت اور خیر خواہی کا حامل ہے تو مدرسے سے بھاگ جانے والا طالب علم جمعہ یعنی چھٹی والے دن بھی مدرسے آجاتا ہے۔۔۔۔۔ اس طرح درحقیقت مثالی تدریس' حسن ابلاغ اور تاثیر ابلاغ کا نام ہے۔ یعنی استاد اپنی بات کو اس طرح موثر اور خوبصورت انداز سے ادا کرتا ہے' کہ طالب علم اس کا بھرپور اثر قبول کرتا ہے اور استاد جو کچھ چاہتا ہے' اسی طرح کا اثر ڈالتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو تمام مثالی اساتذہ میں بالعموم ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ انہیں اپنے مضمون سے گہرا قلبی لگاؤ ہوتا ہے۔ انہیں عشق کی حد تک مطالعہ و تحقیق کا ذوق و شوق ہوتا ہے۔ ان کی حکمت تدریس انتہائی دلچسپ اور موثر ہوتی ہے۔ احترام و شفقت کی بنیاد پر ان کا طلبہ سے ایک شخصی تعلق ہوتا ہے اور اس طرح "زمزمہ محبتے" پر مبنی اس اسلوب کے ساتھ وہ بالآخر طلبہ کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہتے ہیں کہ جو کچھ انہیں پڑھایا جا رہا ہے وہ فی الواقعہ بڑا اہم ہے۔

اس حوالے سے اگر آپ جامعہ میں کسی ماہر اور موثر استاد کا نقشہ کھینچنا چاہیں تو آپ کے ذہن میں کئی تصاویر مرتب ہوں گی۔۔۔۔۔ مثلاً ایک تصویر اس طرح کی ہوگی کہ ایک صاحب علم شخص اپنے پورے فکری فیض اور اپنی تحرک انگیز شخصیت کے ساتھ کمرہ جماعت میں طلبہ کو پڑھانے میں محو ہے۔ طلبہ بھی اپنے پورے انہماک سے اپنے استاد کے ہر لفظ اور تاثر کو وصول کر رہے ہیں۔ ایک اور تصویر اس طرح کی ابھرے گی کہ ایک سرگرم' پرجوش اور پختہ کار استاد سیمینار ٹیبل کے گرد بیٹھے طلبہ کے مذاکرہ یا مباحثہ میں بڑی حکمت سے زندگی بخش رہنمائی فراہم کر رہا ہے۔ وہ اپنی عالمانہ اور اپنی منکسرالمزاج شخصیت سے' طلبہ میں بصیرت و آگہی' خود اعتمادی اور تنقیدی شعور کی صلاحیت پیدا کر رہا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک اور تصویر ایسے استاد کی ملتی ہے جو سنجیدہ انداز میں بھی ایک [illegible]

ساتھ تعلیمی مباحث کی تفہیم و تعبیر میں شریک ہوتا ہے۔ کبھی لیبارٹری میں، کبھی کمرہ جماعت کے باہر برآمدہ میں، کبھی لائبریری میں، بس وہ ایک چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہوتا ہے۔ غرض اس طرح کا استاد طالب علم کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ بے تکلف لیکن مودب انداز میں اپنے استاد سے متنوع سوالات کرے اور یہ دیکھے کہ اس کا استاد کس طرح سوچتا ہے اور کس طرح اپنے علم اور اپنے نظریات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ان تمام خاکوں میں استاد کا اسلوب ہرچند مختلف ہے لیکن ان میں یکساں پہلو یہ ہے کہ وہ تعلیم و تعلم کے عمل میں اور علمی مباحث کی تشریح و توضیح میں اپنے طلبہ کے ساتھ مصروف ہے۔ ان تینوں تصوراتی خاکوں میں استاد کا اپنے طلبہ پر بڑا گہرا اثر ہے۔ اس کے طالب علم بھی تدریسی عمل میں بالعموم وہی مسرت، کیف اور زندگی محسوس کرتے ہیں، جو استاد محسوس کرتا ہے۔

ہمارے قومی پریس میں "تعلیمی معیارات" کا موضوع اکثر زیر بحث رہتا ہے۔ اس ضمن میں اگر آپ یونیورسٹی طلبہ سے رائے لیں تو وہ غالباً یہ کہیں گے کہ بہتر تعلیمی معیار کے لئے جامعات میں آپ اچھے اساتذہ کی تقرری کریں جو فی الواقعہ فاضل اساتذہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر آپ یونیورسٹی اساتذہ سے رائے لیں تو وہ شاید یہ کہیں کہ جامعات میں داخلہ صرف ان طلبہ کو دیا جائے جو بہتر علمی کارکردگی کے حامل ہوں اور جن میں علمی ذوق و شوق ہو۔ اس میں کس کی رائے زیادہ وقیع ہے، اس پر بحث ہوسکتی ہے لیکن بظاہر دونوں کی آراء میں وزن ہے۔ اس وقت جو صورت حال ہے، اس میں اساتذہ اپنے طلبہ کی علمی کارکردگی کے حوالے سے کتنے ذمہ دار ہیں؟ اس پر جامعہ کی سطح پر کوئی منضبط تحقیق کی جاسکتی ہے، البتہ ایک عام تاثر یہ ہے کہ طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد محض اپنے معاشرتی اور معاشی رتبے کی خاطر جامعات میں داخلہ لیتی ہے تاکہ وہ کسی نہ کسی طرح ڈگری کے حامل بنے اور پھر تلاش روزگار کے لئے نکل کھڑی ہو۔ لیکن ان طلبہ کا ذمہ دار کون ہوتا ہے جو فی الحقیقت اپنی پڑھائی میں بہت ہی سنجیدہ ہوتے ہیں۔ تعلیمی امور پر گہری نگاہ رکھتے ہیں اور ان کا مقصد سوائے حصول علم کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اساتذہ کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ وہ یہ سوچیں کہ طلبہ کو کس طرح سیکھنے کے عمل میں موثر انداز میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت میں ہر طالب علم ہر مضمون کو ایک خاص رفتار سے اور ایک خاص ماحول میں سیکھتا ہے اور پھر مختلف سطحوں پر اس کا ادراک کرتا ہے۔ یونیورسٹی اساتذہ، بعض طلبہ کی ذہانت اور بعض طلبہ کی کوڑھ مغزی پر حیران ہوتے ہیں۔ نفسیات سے متعلق بعض تحقیقات اور خود یونیورسٹی اساتذہ کا اپنا مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ طلبہ کی ذہانت اور اس کا معاشرتی ماحول ان کی کارکردگی میں اہم عوامل ہیں۔ اساتذہ بلاشبہ اس بات کے ذمہ دار نہیں کہ طلبہ

اپنے ساتھ کیا متنوع قابلیتیں لاتے ہیں۔ البتہ وہ اس بات کے ذمہ دار ضرور ہیں کہ وہ ہر طالب علم کی جائز ضرورتوں' دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا ادراک کریں اور اس کی روشنی میں ایک ایسا تحرک انگیز اور دلچسپ اسلوب تدریس اختیار کریں کہ ہر طالب علم پورے تدریسی عمل میں دلچسپی لے اور چاہے وہ فطین ہو یا ذہین یا متوسط' محنت و مشقت اور ذوق و شوق سے اپنا تفویض کار ختم کرے۔

اس ضمن میں اگر آپ طلبہ سے پوچھیں کہ وہ اپنی یادداشت اور تجربہ کی بنا پر یہ بتائیں کہ آج تک جن اساتذہ سے انہوں نے پڑھا ہے ان میں کوئی ایسا ہے جس کی تدریس انتہائی دلچسپ' زندگی بخش اور روح پرور تھی' یا جو اپنی حکمت تعلیم کے حوالے سے اپنے رفقائے کار سے ممتاز اور منفرد تھا تو وہ یقیناً انہی مثالی اساتذہ کا ذکر کریں گے جن کے فکر انگیز لیکچرز سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ ایک سحر انگیز کیفیت محسوس کرتے تھے۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ کب پیریڈ ختم ہوا۔ طلبہ کے نزدیک ہرچند کہ اس طرح کے قابل اساتذہ کی تعداد بہت کم ہے لیکن ان لوگوں کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ اپنی تدریسی ذمہ داریوں کو انتہائی سنجیدگی اور محنت سے سرانجام دیتے ہیں۔ تعلیم و تعلم سے گویا انہیں عشق ہے۔ جس ذوق و شوق سے وہ پڑھاتے ہیں وہی ذوق و شوق وہ طلبہ میں چاہتے ہیں۔ ایسے اساتذہ کے چہروں پر ایک خاص قسم کی چمک ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں سے تاثیر کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور اس طرح خود انہیں اور اساتذہ ہر دو کو ایک گونہ اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔

اساتذہ سے متعلق طلبہ کی پسند و ناپسند کا اپنا ایک معیار ہے۔ مثلاً" ہو سکتا ہے کہ بعض طلبہ کے نزدیک استاد اس لئے پسندیدہ ہے کہ اس کی جسمانی شخصیت بڑی پرکشش ہے' بذلہ سنج ہے' وہ گریڈ یا نمبر دینے میں بڑا "کشادہ دل" ہے۔ وہ طلبہ سے بے تکلف ہے۔ سیرو تفریح کا دلدادہ ہے۔ عام طور پر تفریحی انداز میں گپ شپ لگانے والا (Entertainer) ہے ـــــ لیکن جامعات میں طلبہ کا ایک طبقہ' چاہے تعداد میں قلیل ہی ہو' ایسا بھی ہے جو ہم نصابی سرگرمیوں کو اہمیت تو دیتا ہے لیکن اس کی نظر میں بلند مقام انہی منفرد شخصیت کے حامل اساتذہ کو حاصل ہے جو صاحب علم' صاحب تحقیق' صاحب تصنیف اور موثر حکمت ابلاغ کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ ان اساتذہ کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں' جو عمل تعلیم میں ایک خاص قسم کا قلبی لگاؤ اور فضیلت علمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ گویا اچھے معلم اور اچھے طالب علم کے لئے علمی امور میں محبت کی کیفیت شرط اول ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ موثر اسلوب تدریس کے حوالے سے دو پہلوؤں میں کامل توازن کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ استاد صاحب علم [illegible]

ہو۔۔۔۔ دوسرے طلبہ سے اخلاص اور احترام کی بنیاد پر مثبت اور تعمیری رابطہ بھی رکھتا ہو۔ کیونکہ خشک مزاج صاحب علم استاد چاہے کتنی ہی انسائیکلوپیڈیائی معلومات رکھتا ہو' لیکن وہ مردم بیزار اور یاسیت پسند ہے تو طلبہ کی ہمہ جہت اور صحت مند نشوونما نہیں کر پائے گا۔ اصل میں ایک ایسا استاد جو علمی وجاہت اور پاکیزہ سیرت و کردار کا حامل ہو اور طلبہ سے عدل و اخلاص کی بنیاد پر مشفقانہ روابط رکھتا ہو' وہ بالعموم ہر کلاس میں ممتاز اور افضل ہوتا ہے۔

استاد کی علمی فضیلت

موثر تدریسی ماحول کی تخلیق کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو جو مواد طلبہ کو دیا جارہا ہو وہ بالکل صحیح اور واضح ہو۔ دوسرے اس مواد کی منتقلی کے لئے بڑا منطقی اور غیر مبہم اسلوب تدریس ہو۔ لیکن یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ بعض اساتذہ کے پاس مضمون سے متعلق جدید ترین معلومات بھی ہوتی ہیں انہیں نفس مضمون پر کلی مہارت بھی ہوتی ہے۔ لیکن فن تدریس میں انہیں کمال حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ علم رکھنا ایک بات ہے اور اسے منتقل کرنا دوسری بات۔ دوسرے لفظوں میں ایک موثر استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت علمی فضیلت کا بھی حامل ہو اور موثر حکمت ابلاغ کا گہرا ادراک بھی رکھے۔ حقیقت میں کلاس روم ایک ایسا سٹیج ہے جہاں استاد کا ایک مرکزی کردار ہے۔ طلبہ اس کے وجود کی ہر ادا سے متاثر ہوتے ہیں۔ مضمون میں دلچسپی اور عدم دلچسپی دونوں پہلوؤں سے۔۔۔۔ یعنی کبھی تو استاد علمی لحاظ سے اتنا متاثر کرتا ہے کہ طلبہ موضوع میں انتہائی محو ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ بالکل اچاٹ سے ہو جاتے ہیں۔ ویسے معلم چاہے علمی فضیلت کے لحاظ سے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو' یہ ضروری نہیں کہ کلاس کے سارے لمحات اثر اندازی میں ایک جیسے ہوتے ہوں۔ البتہ طلبہ لیکچر کا ایک مجموعی تاثر ضرور لیتے ہیں۔ جامعات میں اساتذہ کی ایک تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جو تدریسی کام میں اتنا اطمینان محسوس نہیں کرتی جتنا اطمینان وہ دیگر سرگرمیوں میں محسوس کرتی ہے۔ مثلاً مقالات اور درسی کتب کی تیاری' سیمینارز' ورکشاپس' کانفرنسوں' بالخصوص بیرون ملک دوروں میں دلچسپی اور کسی ایجنسی سے ٹھیکے پر حاصل کئے گئے تحقیقی پراجیکٹس' جن میں مالی منفعت بھی اور اپنے "علمی تفاخر" کے اظہار کا بھی سامان ہوتا ہے' کیونکہ ان ہی کاموں سے اسکی شہرت' ترقی اور تنخواہ میں بہتر مراعات کا دارومدار ہوتا ہے۔ بہر حال اساتذہ کی ایک قابل قدر تعداد ایسی ضرور ہے جو اہل پیشہ ورانہ تحقیق و تصنیف میں بھی دلچسپی لیتی ہے لیکن [illegible] کمل کر رہی ہے اور اسی میں وہ قلبی طمانیت

حاصل کرتی ہے۔

استاد کا ذاتی تشخص

جامعات میں کمرہ جماعت کی فضا بالعموم علمی (Intellectual) ہوتی ہے اور وہاں استدلال کی قوت سے نقطہ نظر کو پیش کیا جاتا ہے۔ یوں بادی النظر میں یہ ایک میکانکی عمل معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ایک اور پہلو بھی بڑا نمایاں ہے۔ وہ ہے کلاس میں ایک خاص قسم کی جذباتی اور نفسیاتی فضاء۔ اسے بیان کرنا تو شاید مشکل ہو لیکن یہ پہلو ہوتا بڑا اہم ہے۔ مثلاً" ہوسکتا ہے طلبہ کلاس میں بظاہر تو بڑے مؤدب بیٹھے ہوں لیکن ان کا علمی ذوق و شوق اس وقت ماند پڑ جاتا ہو جب اشارے کنائے میں طلبہ کو یہ احساس ہو جائے کہ استاد انہیں ناپسند کرتا ہے یا ہمہ وقت تحکم اور گرفت کا اسلوب لیے ہوئے ہے یا اس کے ماتھے کی "شکنیں" کچھ زیادہ ہی ہیں۔ استاد بلاشبہ صاحب علم ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس اسلوب کو پسند نہیں کرتے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض طلبہ اپنے ساتھی طلبہ کے مقابلے میں بڑے خلاق ذہن کے مالک ہوتے ہیں لیکن استاد کے جلے کٹے ریمارکس' اسکی طعن و تشنیع' تضحیک اور غلط گریڈنگ' یہ سب چیزیں طلبہ کی پریشانی میں اضافہ کا باعث بنتی ہیں۔

اصل میں استاد کا نفس مضمون اور طریق تدریس پر عبور ضروری ہے لیکن استاد کا اپنا ذاتی تشخص بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ استاد کی انفرادیت اور شخصی عادات و اوصاف کو موثر تدریس سے الگ نہیں رکھا جاسکتا۔ استاد کی شخصیت طلبہ کی تعلیم و تربیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس فلسفہ میں استاد ہو یا طالبعلم وہ بنیادی طور پر ایک منفرد شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ نفس مضمون پر مہارت اور طریق تدریس میں تربیت سے انکار ممکن نہیں' لیکن پڑھانا ایک آرٹ بھی ہے اور اس کا تعلق ادب اور اقدار حیات سے ہے۔ ایک اچھا استاد اگر اپنے آپ کو دریافت نہیں کرسکتا۔ اگر وہ اپنے آپ کو موثر طور پر تعلیم و تعلم کے عمل میں مصروف نہیں رکھ سکتا' تو وہ ایک میکانکی استاد تو ہو سکتا ہے اور شاید مروجہ امتحانی نقطہ نظر سے کامیاب بھی ہو۔ لیکن تعلیم و تربیت کے زاویہ نظر سے طالب علم کی متوازن' صحت مند اور جامع نشوونما نہیں کرسکتا۔ اس جامع اور متوازن نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ استاد نفس مضمون اور طریق تدریس کے سائنسی پہلوؤں کے ساتھ ایک خلاق' ادب شناس' متحرک اور مقصد حیات سے باخبر شخص بھی ہو۔ اس طرح ہر طالب علم بھی ایک منفرد شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی [illegible]

سمجھے بغیر ابلاغ بہتر نہیں ہو سکتا۔

مثالی استاد کی چند اہم خصوصیات

درج بالا مباحث کی روشنی میں ایک مثالی استاد' تدریسی مواد کو طے شدہ وقت کی مناسبت سے احسن انداز میں مرتب اور منظم کرتا ہے۔ اس کی پیش کش بھی بڑی واضح زبان میں ہوتی ہے اور مختلف تصورات و نظریات کا اطلاقی پہلو تنقیدی انداز سے نمایاں کرتا ہے۔ اس کا نہ صرف نفس مضمون پر عبور ہوتا ہے بلکہ اس کا معیار اتنا اعلیٰ ہوتا ہے کہ طلبہ اہم نکات اور غیر اہم نکات میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ انہیں استاد کی تشریحات و تصریحات میں کوئی ابہام محسوس نہیں ہوتا۔ اس طرح کے زندہ استاد کی تدریس میں بھی زندگی ہوتی ہے۔ فلم' کمپیوٹر' پروجیکٹر' تدریسی مشینوں سے وہ استفادہ تو کرتا ہے لیکن سمعی بصری معلومات اس کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ عام طور پر طالب علم اسی طرح کے زندہ استاد کی تدریس میں دلچسپی لیتے ہیں اور اس کے لیکچر میں ایک طرح کی قلبی مسرت محسوس کرتے ہیں۔

اس علمی وجاہت کے ساتھ ساتھ یہ استاد' طلبہ سے انتہائی خندہ پیشانی' گرم جوشی اور ہمدردی کا بھی مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ طلبہ کی منفرد شخصیت کو تسلیم کرتا ہے۔ ان کا احترام کرتا ہے۔ کلاس میں تفویضی کام (Assignments) سے متعلق طلبہ کے احساسات اور تاثرات کی قدر کرتا ہے۔ ان کی مشاورت سے بعض اوقات مناسب رد و بدل بھی کرلیتا ہے۔ وہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ موضوع سے متعلق تخلیقی سوالات کریں اور اپنے نقطہ نظر کو بلا جھجک بیان کریں۔ اس اسلوب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے استاد کو ان کی فکر ہے اور وہ اپنے طلبہ کی طبائع سے شناسا ہے۔ طلبہ بھی اپنے استاد کے بارے میں اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ انہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ استاد کو ان پر اعتماد ہے۔ وہ ان کی صلاحیت کی قدر کرتا ہے۔ انہیں تنقیدی شعور اور غالب ذہن کے ساتھ دوسروں کے نظریات کو پرکھنے اور جانچنے کی تربیت دیتا ہے۔ اس طرح کے علمی ماحول میں طلبہ کو جو کام بھی تفویض کیا جاتا ہے وہ اسے مکمل کرنے میں بڑے پرجوش ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ بڑی دلجمعی سے محنت کرتے ہیں تاکہ استاد کو ان سے جو توقعات ہیں انہیں ٹھیس نہ پہنچے۔

اساتذہ میں ایک تعداد ایسی بھی ہوتی ہے جو ہر چند کہ اس بلند علمی مقام پر فائز نہیں [illegible] مخصوص ہے۔ تاہم وہ محنت و جانفشانی سے اپنا فرض ادا کرکے

ہے۔ وہ کلاس میں مضمون سے متعلق تصورات و حقائق کو بڑی وضاحت سے پیش کرتی ہے۔ ان کی تدریس میں ضروری حد تک سرگرمی بھی ہوتی ہے۔ طلبہ لیکچر نوٹس بھی بہتر تیار کر لیتے ہیں اور ان کی تفہیم مضمون بھی بہتر ہوتی ہے۔ چنانچہ وقت کی پابندی' موضوع کو منطقی انداز میں پیش کرنا' امتحانی تقاضوں کو ملحوظ رکھنا' یہ سب چیزیں طلبہ کے لئے بے حد مفید ہوتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں وہ کلیت' جامعیت' تحرک' تموج اور' زندگی نہیں ہوتی جو مثالی ماڈل کی شخصیت میں پائی جاتی ہے۔ تاہم تجربہ' پر خلوص محنت اور وسیع مطالعہ و تحقیق کے بل بوتے پر ایسے اساتذہ کبھی نہ کبھی اس مقام عالیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اسلامی زاویہ نگاہ

اسلامی تناظر میں' ہمیں یہ اہم نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ طریقہ ہائے تدریس کی سائنس (Pedagogy) اور تعلیمی تحقیق (Educational Research) کے حوالے سے جو اصول یا تعمیمی نتیجہ (Generalization) ہمارے تعلیمی مقاصد کے حصول کے ضمن میں مفید ہو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ـــــ البتہ یہ نکتہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ طریقہ تدریس (Method of Instruction) کا فی نفسہ تو شاید کوئی "مذہب" نہ ہو لیکن فن کار' ادیب یا معلم کا تو کوئی مذہب' فلسفہ یا نقطہ نظر (Point of view) ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے معلم کا محض فن تدریس یا تدریسی ٹیکنالوجی کا ماہر ہونا ہمارے کسی کام کا نہیں' جب تک کہ وہ بنیادی طور پر پکا مسلمان نہ ہو اور داعیانہ مزاج نہ رکھتا ہو۔ اس لئے مثالی استاد کا جو ماڈل پیش کیا گیا ہے اس میں اگر ایمان' عمل صالح' مقصد حیات' اعلیٰ کردار' اخلاص' اسلامی نظریاتی لگاؤ' اور جواب دہی کے حوالے سے اسلام کے تصور آخرت پر پختہ یقین شامل کر دیا جائے تو وہ اسلام کا مطلوبہ ماڈل ہوگا۔ ایک مسلمان مثالی استاد کی اس اضافی خصوصیت سے متعلق عالم اسلام کے ممتاز مفکر تعلیم سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے گراں قدر مقالہ "مسلمانوں کے لئے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" میں بڑا فکر انگیز تبصرہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "... اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل پر ہے جو معلم خود اس روح سے خالی ہیں' بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالف ہیں ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ ـــــ اصل معمارِ تعلیم [illegible]

معماروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز تعمیر پر عمارت بنائیں گے، کریلے کی بیل سے خوشہ انگور کی امید رکھنا ہے۔۔۔۔ لہٰذا خواہ کوئی فن ہو، فلسفہ ہو یا سائنس، معاشیات ہو یا قانون، تاریخ ہو یا کوئی اور علم، مسلم یونیورسٹی میں اس کی پروفیسری کے لئے کسی شخص کا محض ماہر فن ہونا کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔ اگر مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات حاصل کرنی پڑیں تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن عام قاعدہ یہی ہونا چاہیے کہ ہمارے یونیورسٹی کے پروفیسر وہ لوگ ہوں جو اپنے فن میں ماہر ہونے کے علاوہ یونیورسٹی کے اساسی مقصد یعنی اسلامی کلچر کے لئے خیالات اور اعمال دونوں کے لحاظ سے مفید ہوں۔۔۔۔" (تنقیحات، ص ص 280-281)۔

اصل میں فکری لحاظ سے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ دنیا کا کوئی نظام تعلیم ایسا نہیں جس کے پس منظر میں چند اساسی سوالات نہ ہوں۔ یہ سوالات خدا، کائنات، انسان، آخرت، علم اور اقدار سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے حوالے سے جو نقطہ نظر تشکیل پاتا ہے وہی درحقیقت اس کا فلسفہ حیات ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی نظام فکر کے حوالے سے اسلامی تعلیم درحقیقت وحدت انسانی کی قائل ہے اور تربیت طلبہ کے ضمن میں اس کا زاویہ نگاہ کلیت بیں ہے۔ اس لحاظ سے ایک مسلمان انفرادی اور اجتماعی امور کی بجا آوری میں حقیقی اور ابدی سرچشمہ علم، ایمان کو ہی ٹھہراتا ہے۔ اصل میں صداقت اور حقیقت تو اسلام ہی ہے۔ لہٰذا جب تک تعلیم و تدریس کی تنظیم و ترتیب، فطرت انسانی، آفاقیت اور انسانیت کے اسلامی تصور کے تناظر میں نہیں ہوتی وہ ہمہ گیر اور جامع نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اسلامی نظام تعلیم کے حوالے سے ہر سطح پر اور بالخصوص جامعات میں تعلیم کا اساسی مقصد یہ ہوگا کہ اسلامی تناظر میں روحانی بصیرت، ذہنی صلاحیت اور تنقیدی شعور کو زندہ کیا جائے۔ طلبہ میں تفقہ فی الدین، حق و باطل کی تمیز، حقیقت اشیاء کی تفہیم، مظاہر فطرت کا مطالعہ، اسلامی ثقافت کے احیاء اور علم و عرفان کے حصول کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے لئے اخلاقی، ذہنی، روحانی اور جسمانی صلاحیتوں کی متوازن اور صحت مند نشوونما کی ضرورت ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ متعلقہ مضمون میں مہارت، ذوق مطالعہ اور تحقیق و جستجو کا شوق بڑی اہم قدریں ہوں گی۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ہماری جامعات میں ایک علمی اور روحانی فضا ہو جو اسلامی [illegible] کے نقطہ نظر سے مرتب ہو۔ اس طرح کی فضاء کے بغیر تعلیم و

تربیت بے اثر ہوگی کیونکہ ہمارے ہاں مطلوب علمی اور سائنسی ترقی نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ خود ہمارا اسلامی ثقافت سے دور ہونا ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علمی ترقی دراصل اس بات کی مرہون منت ہے کہ اساتذہ اسلامی اقدار کی روشنی میں طلبہ کے اذہان و قلوب کی اس طرح آبیاری کریں کہ وہ بیک وقت صالح شعور و فکر کے بھی مالک ہوں اور تنقیدی معیار کے ساتھ مغربی علوم و فنون کے صحیح اجزاء کو جذب کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔۔۔۔ اس نصب العین کے حصول سے متعلق ممتاز محقق اور فلسفہ تعلیم کے استاد پروفیسر سید محمد سلیم، اساتذہ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے طلبہ میں تحقیق و تنقید کا ملکہ پیدا کریں تاکہ وہ مستقل معیار رد و قبول کے آئینہ میں خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز کر سکیں۔ پروفیسر سید محمد سلیم کی رائے میں:

> "۔۔۔مقصد حیات اور مقصد تعلیم متعین ہو جانے کے بعد سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ طالب علموں کے اذہان کی آبیاری کی جائے ان کے اندر فکر و فہم، شعور و ادراک کا ملکہ اور استعداد پیدا کی جائے۔ ان کے عقل و خرد کا استعمال سکھایا جائے۔ ان کے اندر تحقیق و تنقید کا ملکہ پیدا کیا جائے۔ ہر چیز کو وہ بلا سوچے سمجھے آمنا و صدقنا نہ کہہ دیں بلکہ اس کو اپنی عقل کے اور اپنے علم کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اس کا غلط اور صحیح ہونا معلوم کریں۔ تنقید سے یہ معلوم کریں کہ کس قدر صحیح ہے کس قدر باطل کی آمیزش ہے۔ وہ کھلے دماغ سے اور کھلی آنکھوں سے تعلیم حاصل کریں۔۔۔۔ فکر و فہم کی ان صلاحیتوں کو پیدا کرنے میں مضامین سے زیادہ طریق تدریس کو دخل حاصل ہے۔"

(ہمارا نظام تعلیم: تاثرات و تجاویز، ص ص 14-15)۔

حقیقت میں مسلمانوں کے لئے حصول علم ایک مقدس فریضہ ہے اور جو لوگ بھی اس سے متعلق ہیں انہیں سیرت و کردار میں بڑا روشن مثال ہونا پڑتا ہے۔ معلم اور متعلم دونوں کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لازمی طور پر تحصیل علم میں مخلص، محنتی اور دیانت دار ہوں کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو اس بات کا قوی امکان رہے گا کہ وہ اپنے علم کا غلط استعمال کریں گے اور اپنے علم سے جو غلط توجیہات اور تعبیرات کریں گے اُس سے اپنے شاگردوں کو اصل راستہ سے بھٹکا دیں گے۔ اسلامی تعلیم کا یہ بنیادی نکتہ ہے کہ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ علم منتقل کرتے ہیں، ان میں اخلاص لازمی صفت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ سارے تعلیمی عمل میں اس قدر اعلیٰ [illegible]

میں اللہ کی رضا کے سامنے ہی بلاچون و چرا سر تسلیم خم کیا جائے۔ معلم میں ترقی کی خواہش اور مادی سہولیات کے حصول کی تگ و دو بلاشبہ فطری جذبے ہیں لیکن انہیں فرائض منصبی پر اولیت دینا اصل مقصد زندگی سے انحراف ہے۔

علم کا تقدس اور وقار یہ تقاضا کرتا ہے کہ جامعات میں ایسی علمی سرگرمیاں منظم کی جائیں اور ایسا علمی اور اخلاقی ماحول تشکیل دیا جائے جس میں ہر طالب علم اور ہر معلم اس قابل ہو کہ وہ اپنی بنیادی روحانی اقدار اور حسن سیرت کی نشوونما کرے۔ اسلام میں علم اور حسن سیرت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک صاحب کردار استاد درحقیقت کلی صداقت ہی کہ تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اسلامی جامعات میں بے خدا افکار کی حکمرانی نہیں ہوتی۔ ہرچند کہ اساتذہ اور طلبہ تقابلی تناظر میں ان افکار کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن تنقیدی شعور اور غالب ذہن کے ساتھ۔ اصل میں استاد چاہے ابتدائی جماعتوں کو پڑھاتا ہو یا اعلیٰ جماعتوں کو' اس کا بنیادی فرض تو دعوت و تعلیم ہی ہے۔ لہٰذا استاد کو انتہائی حکمت و بصیرت سے اپنی بات کو منتقل کرنا ہوتا ہے۔ استاد کے اسی داعیانہ فریضہ کے بارے میں ممتاز دانشور جناب خرم مراد اساتذہ کو ان کا اصل کام یاد دلاتے ہیں:

"..... آپ تعلیم و تدریس کے منصب پر فائز ہیں۔ آپ کا کام ہی دعوت اور تعلیم ہے۔ بچہ خود بخود آپ سے اخلاق' حق اور فن سیکھنے کے لئے آپ کے پاس آجاتا ہے جب کہ دوسری جگہ سکھانے کے لئے داعی خود بخود جاتا ہے مگر لوگ سیکھنے کے لیۓ تیار نہیں ہوتے۔ اب اگر آپ اس کو وہ نہ سکھائیں جو زندگی کو باثمر اور نتیجہ خیز بنائے' تو اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔" (مسائل و افکار' ص 203)۔

اب اس "باثمر اور نتیجہ خیز" تدریس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے اساتذہ اسلامی فکر کے بارے میں واضح ذہن رکھتے ہوں۔ خاص طور پر اس دور میں جب ہماری جامعات میں ایک گروہ سیکولرازم' لبرل ازم اور اکیڈمک فریڈم کے نام پر ایک مخصوص "دانش ورانہ" ماحول لانے کے درپے ہے' وہاں دعوت الی اللہ اور اسلامی اقدار کی حکمرانی کے لئے وہی اساتذہ کامیاب ہوں گے جو تقویٰ' علمی مہارت اور موثر حکمت تدریس کے ساتھ ساتھ فکری اور اخلاقی لحاظ سے بھی بڑی مضبوط شخصیت کے مالک ہوں گے---- اور پھر اپنے اپنے علمی شعبہ کو وہ زاویہ نظر اور وہ اساسی اصول دینے کے قابل ہوں گے جو قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ نے انہیں عطا کئے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اسلامی حوالے سے معلم درحقیقت پورے تعلیمی عمل کا

مرکز و محور ہے۔ وہ ایک قابل احترام شخصیت ہے۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے۔ چنانچہ اساتذہ کی شخصیت اس حوالے سے بڑی اہم ہے کہ اس کا کام صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ عالم بے عمل کو تسلیم نہیں کرتا۔ کردار کی اہمیت ہمیشہ اساسی رہی ہے۔ چنانچہ اسلامی میزان کے تناظر میں فکر و عمل اور سیرت و کردار میں پختہ، اپنے مضمون میں ماہر، موثر طریق تدریس پر عبور رکھنے والا اور طلبہ سے شفقت و احترام سے پیش آنے والا استاد ہی طلبہ کی جامع اور ہمہ گیر تربیت کر سکتا ہے۔

جامعہ کے ایک فعال استاد کی تصویر

مضمون کی مناسبت سے میں اپنے ایک ایسے فعال یونیورسٹی پروفیسر کا ذکر کرنا پسند کروں گا جس نے مجھے ایم اے۔ ایجوکیشن (سیشن 68-1966) کی تعلیم کے دوران انتہائی متاثر کیا اور سچی بات یہ ہے کہ "علم التعلیم" کے شعبہ میں جن اساتذہ پر فخر کیا جاسکتا ہے وہ ان میں یقیناً سرفہرست ہیں۔ کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر دین محمد ملک مرحوم کی آواز، لہجہ، تمثیلات، ان کے علمی اشارات، ان کا ذوق ادب، ان کی خوبصورت شخصیت اور ان کی تھپکیوں کا لطف آج بھی اک سرور و کیف طاری کرتا ہے۔ تعلیم، ادب، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، ثقافت، معاشرتی، معاشی، سیاسی نظریات سے متعلق وسیع مطالعہ، غرض علم کا ایک سمندر تھے۔ ان کی تدریس زندہ تھی۔ کلاس کو بور نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کی شگفتہ مزاجی، اپنی ذاتی زندگی کی مثالیں، حقیقی زندگی (Real Life) کو کمرہ جماعت کے ماحول (Classroom Environment) سے مربوط کرنا، ایک ایک طالب علم سے شخصی رابطہ، پھر کبھی کبھار تحکم بھی، لیکن وہ بھی اپنے اندر جذبہ رحمت لئے ہوئے ـــــــ ان کا یہی وہ اسلوب تدریس تھا، جو انہیں منفرد بناتا تھا۔ دقیق سے دقیق فلسفیانہ نکتہ کو ایسے لطیف اور حسین انداز میں پیش کرتے تھے کہ طلبہ کوئی بوجھ یا تنگی محسوس کئے بغیر اس کا اثر قبول کرلیتے تھے۔ وہ بہترین الفاظ، عمدہ اسالیب بیان، شستہ تراکیب، پختگی فکر، استدلال، استغنا، درویشی، قلبی کشادگی، روحانی سرور، بلند نظری اور اخلاص ـــــــ ان سب قوتوں اور صلاحیتوں کے امتزاج سے طلبہ کی شخصیت گری کا کام کرتے تھے ـــــــ
مجھے یاد ہے کہ ایک کورس میں آزادی وطن کی تحریک کے حوالے سے جب وہ سلطان فتح علی ٹیپو شہید کے ساتھ اپنوں کی غداریوں اور انگریزوں کی سازشوں سے متعلق لیکچر دے رہے تھے تو ان کی آنکھوں کی چمک اور آنکھوں میں ہلکا سا نم [illegible]

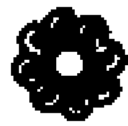
تاثیر اور اشعاعیت (Radiation) طلبہ تک منتقل ہوگئی اس کا دور حاضر کی ماڈرن تدریسی ٹیکنالوجی کے پاس ہرگز کوئی بدل نہیں۔ بہرحال بحیثیت مجموعی میں جب بھی ان کی معلّمانہ شخصیت کا مطالعہ کرتا ہوں تو چند پہلو بڑے نمایاں معلوم ہوتے ہیں مثلاً" ایک تو یہ کہ وہ نہایت ہی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ خوش گفتار اور خوش پوشاک تھے۔ ان کا قلب بڑا درد مند تھا۔ وہ بڑے پاک نفس انسان تھے۔ وہ جو کچھ بھی تھے اس میں ریا اور نمود نہ تھا۔ عفت نظران کے کردار کا جزو تھی۔ وہ ایسی نسل کے نمائندہ تھے جو اخلاص اور بے نیازی کی قوت کی حامل تھی اور حقیقت میں ان کی حکمت تدریس کی اصل اساس "زمزمہ محبت" ہی تھی۔ اب اساتذہ کی ایسی نسل یا تو ناپید ہوچکی ہے یا خال خال اس کے نقوش ملتے ہیں ــــــ دوسرے ان کا دماغ معلومات سے پر تھا۔ جو مضمون پڑھاتے تھے اس پر مکمل عبور تھا۔ علمی فضیلت اپنے عروج پر' لیکن انتہائی منکسرالمزاج' نہ اشتہار پسند اسلوب نہ کبر پسند طبیعت ــــــ تیسری بات یہ کہ موثر حکمت تدریس اور نوجوان نسل کی نفسیات سے بخوبی شناسا تھے۔ محبت و اپنائیت کے جذبات کا خوبصورت پیکر اور طلبہ کے ساتھ بالکل ایک شفیق باپ جیسا انس' ہر ایک طالب علم کا خیال۔ پھر تدریسی عمل کو وہ اپنے اور طلبہ کے درمیان ایک مشترکہ کاوش سمجھتے تھے۔ ایک ہی موضوع کو متنوع انداز میں واضح کرنا انہیں خوب آتا تھا۔ علمی و عقلی دلائل اور دینی ایقان کی بنیاد پر مختلف فلسفیانہ مباحث سے متعلق اذہان و قلوب کو خوب مطمئن کرتے تھے۔ تدریس سے تو انہیں گویا عشق تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ استاد مرحوم کا کوئی سچا شاگرد ہو اور وہ پیشہ معلمی سے نفرت کرے۔ انہوں نے تو اپنی ہر ادا سے ہم میں یہ احساس جاگزیں کیا کہ تدریس عبادت ہے۔ مجلہ تعلیم و تحقیق لاہور کی انگریزی سیکشن کے ایڈیٹر جناب مشتاق احمد گورایا کو انٹرویو دیتے ہوئے آپ نے فریضہ تدریس (Teaching Profession) سے متعلق کتنا خوبصورت تبصرہ کیا ہے:

> "----I must tell you that teaching is really a great profession. I have developed strong sentiments about it. If I were to choose again, I would certainly opt for teaching. Teaching is no less than a spiritual love affair for me." (Taleem-o-Tahqeeq, 1969, p.12)

ــــــ چوتھی لیکن انتہائی اہم خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ اسلام اور پاکستان کے پرجوش سپاہی [illegible] کے مالک تھے اور نوجوان نسل کو صالح سوچ عطا کرتے تھے۔ حقیقت

میں انکی اصل اساسی قوت (Power Base) یہی نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ خصوصیات تھیں' جن کی روشنی میں وہ نوجوان نسل بالخصوص مستقبل کے اساتذہ کی شخصیت گری کا عظیم کام سرانجام دیتے تھے۔۔۔۔۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ' مرحوم کے درجات بلند کرے اور ان کے شاگردوں میں اسلام' پاکستان اور فریضہ تدریس سے وہی عشق و محبت پیدا کرے' جس کے لئے استاد مرحوم نے تازیست جدوجہد کی۔

(سہ ماہی تعلیمی زاویئے اسلام آباد' جلد 2 شمارہ 4 جنوری 1992ء)



معلم: معمار قلب و نظر

(چند اہم حیثیات کے آئینہ میں)

معلم' معمار قلب و نظر ہے۔ وہ معاشرہ کا ایسا زندہ اور روشن ضمیر فرد ہے جو اپنے ارد گرد کے ماحول' اپنے زمانے کے تقاضوں اور علمی نظریات کا گہرا شعور رکھتا ہے۔ وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زندگی کا عمیق مطالعہ کرتا ہے اور اس طرح زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک کلیت بیں اور جامعیت پسند نقطہ نظر مرتب کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں اخلاص ہوتا ہے' اس کا قلب دردمند اور شفیق ہوتا ہے اور اس کا دماغ علمی معلومات سے پُر ہوتا ہے۔ اس کا فن کسی فارمولے کی مدد سے تشکیل نہیں پاتا بلکہ اس کے لئے اسے خون جگر کی آبیاری درکار ہوتی ہے۔ وہ اس بات کا گہرا شعور رکھتا ہے کہ خدا کے حوالے کے بغیر علم' دراصل گمراہی ہے۔

حقیقت میں تعلیم و تعلم انسانی معاشرت کی بنیادی فطری ضرورت ہے۔ جس کی اہم غرض و غایت فکری اور تہذیبی تسلسل ہے۔ مقصد حیات جتنا بلند اور پاکیزہ ہوگا' اتنی ہی پاکیزہ خوبیاں انسان کے اندر ابھریں گی۔ اس مقصد کی تکمیل کی ذمہ داری معلم ہی کی ہے۔ وہ معمار قوم ہے۔ اس کی فکر آفاقی ہوتی ہے۔ وہ ایک کردار ساز شخصیت ہے' جس کا کام محض اتنا نہیں کہ وہ طلبہ کو صرف چند معلومات فراہم کرتا ہے بلکہ اس کے علاوہ اس کی کچھ اور حیثیات بھی ہیں جو اس کی تدریسی حکمت کو موثر بناتی ہیں اور اس طرح نتیجتہ" تعلیمی مقاصد کا حصول سہل ہو جاتا ہے۔ معلم کی یہ چند حیثیات درج ذیل ہیں:

بحیثیت داعی و مربی

اسلام کے تعلیمی نظریہ کے حوالے سے معلم کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ خدا' رسول اللہ ﷺ اور پوری امت کے سامنے مسئول ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کا سفیر ہے اور اس کا کام صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے۔ اس حوالے سے معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے طلبہ تیار کرے جو دنیا بھر کی قیادت کریں اور دنیا کو اس راستہ پر لائیں جو معروف ہے اور اس سے روکیں جو منکرات کی طرف لے جاتا ہے۔ معلم کی ذمہ داری ہے کہ علمی سرگرمیوں کے ساتھ طلبہ کا رشتہ عبودیت لے خالق سے جوڑے' انھیں رسالت کے تابع بنائے اور ان میں آخرت کی

جواب دہی کا احساس پیدا کرے۔۔۔۔ اسلامی نظام تعلیم میں پورے تعلیمی عمل کا مرکز و محور معلم ہی ہے۔ وہ ایک واجب الاحترام شخصیت ہے۔ اس کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے۔ استاد محض نفس مضمون اور طریقہ ہائے تدریس کا ماہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ مربی' مزکی اور مصلح بھی ہوتا ہے۔ یعنی فکر و عمل اور سیرت و کردار میں پختہ استاد ہی طلبہ کی متوازن تربیت کرسکتا ہے۔ وہ طلبہ کو محض معلومات منتقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ سلیم الفطرت طلبہ کو ایک فکری وحدت میں پروتا ہے۔ پھر ان کی اخلاقی تربیت کرتا ہے۔ انہیں احقاق حق پر ہی اکتفا کرنے کی تربیت نہیں دیتا بلکہ ابطال باطل کے لئے بھی عملی جدوجہد کو ضروری قرار دیتا ہے۔ وہ طلبہ کو بے خدا نظریات اور الہامی ہدایت سے محروم افکار پر کڑی تنقید کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے اور اس طرح انہیں اسلامی نظریہ حیات کو قائم کرنے' اسے چلانے اور زمین پر وسعت دینے کے لئے اپنے تدریسی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے حکمت و دانائی سے ایک علمی تحریک برپا کرنے کے لئے بھی تیار کرتا ہے۔ حقیقت میں استاد کا کام بندگئ رب کے اصول پر افراد کی تربیت کرنا ہے تاکہ یہ قوت بالاخر قیادت عالم کے اہل بن سکے۔ اس مقصد کے لئے وہ اپنے آپ کو صرف کمرہ جماعت تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ تعلیمی ادارے کے پورے ماحول کو بھی اسلامی رخ پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔
معروف ماہر تعلیم پروفیسر سید محمد سلیم کے بقول اساتذہ' معاشرہ کی جان ہیں۔ وہ صرف مدرس ہی نہیں بلکہ معلم اخلاق اور عوام الناس کے مربی بھی ہیں۔ وہ سب سے اعلیٰ اور افضل کردار ادا کرتے ہیں' استاد کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے معاشرہ کی اصلاح ہوتی ہے۔ افراد کی زندگیاں سنورتی ہیں۔ اس کی کوشش سے دلوں کی دنیا تبدیل ہو جاتی ہے' اس کی لائی ہوئی اصلاح دیرپا ہوتی ہے' معاشرہ کی اصلاح اور استحکام میں استاد کا کردار بہت اہم ہے' اس لحاظ سے مجاہدین کی سرفروشانہ جدوجہد سے استاد کی تعلیمی جدوجہد افضل ہے۔۔۔۔ معلم کو داعی کی حیثیت سے علمی و فنی تعلیم کے ساتھ اسلوب دعوت سے گہری واقفیت بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ دعوت دراصل دوسرے لفظوں میں تربیت ہی کا دوسرا نام ہے بقول ڈاکٹر یوسف قرضاوی دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی طالب علم کے اندر کچھ خاص افکار و خیالات کا بیج بویا جائے اور اس کے جذبات و میلانات کو ایک خاص رخ عطا کیا جائے۔ اس طور پر کہ اس کے اندر کچھ مخصوص رجحانات کی آبیاری ہوسکے اور اس کے اخلاق و کردار ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جائیں۔ اس نقطہ نظر سے امت مسلمہ کے ہر فرد بالخصوص معلم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد میں شرکت کرے اور اپنی زندگی کا اصل مقصد دنیا کمانے کو نہیں بلکہ دین قائم کرنے کو قرار دے

ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے دریغ نہ کرے۔

بحیثیت قائد

معلم کی ایک ذمہ داری قیادت کی ہے۔ قیادت درحقیقت علمی فضیلت کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک معلم جب قائد کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرتا ہے تو وہ جہاں دین اسلام کا گہرا شعور حاصل کرتا ہے، وہاں اپنے وقت کے مخالف اسلامی نظریات اور نظاموں سے واقفیت بھی حاصل کرتا ہے۔ اس کے بغیر نہ وہ ان غیر اسلامی نظریات کی تردید کا حق ادا کر سکتا ہے اور نہ اپنے طلبہ کو دین اسلام کی صداقت کا قائل کر سکتا ہے۔ ایک قائد کے لئے یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے مختلف شعبوں، اس دائرے میں کی گئی تحقیقات اور فن تعلیم کے تجربات سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن طلبہ کی علمی قیادت اس طرح کرے کہ وہ تمام متعلقہ علوم اور نظریات کو اسلام کے نقطہ نظر سے چھان پھٹک کر سکیں اور ان میں یہ فیصلہ کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے کہ انہیں کون سی علمی حکمت اخذ کرنی ہے اور کون سے نظریات سے دامن بچا کر چلنا ہے۔بقول ڈاکٹر خالد علوی، تعلیمی قائد صرف نفع بخش علوم پر ہی نظر نہیں رکھتا بلکہ قائدانہ بصیرت بھی رکھتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بنیادی دینی علم کے ساتھ ساتھ جدید علوم، جدید معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظریات اور تحریکات سے بھی آگاہ ہو۔ ایک قائد کے لئے سب سے زیادہ اہمیت اس کے اپنے عمل و کردار کی ہے۔ علم و عمل کی ہم آہنگی، قوت فکر کی اٹھان، جذبے کی تڑپ اور صلاحیت کار وہ اوصاف ہیں جو سب کو پسند ہیں۔ معلم کا مطلوبہ مقصد کے لئے نمونہ و مثال بن جانا سب سے اہم اور مقدم ہے۔ قائد کی بے داغ زندگی اور اس کا بے لوث جذبہ ایثار ہی اسے مقام قیادت پر فائز کرتا ہے۔علامہ یوسف قرضاوی بھی اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ ایک قائد کی ان علوم سے بھی یک گونہ واقفیت ضروری ہے جنہیں انسانیات یا سماجی علوم کے نام سے جانا جاتا ہے، مثلاً" نفسیات، معاشیات، فلسفہ، علم الاخلاق، تاریخ وغیرہ۔ بہر حال مجموعی طور پر تعلیمی قائد، اسلامی تعلیم و تہذیب کے اساسی نظریہ پر ایمان رکھنے والا، وسعت قلب و نظر کا مالک اور متعلقہ مضمون اور اس سے متعلق موثر حکمت ابلاغ کا ماہر ہوتا ہے۔

بحیثیت استاد

تدریس محض الفاظ اور جملوں کی قرات کو نہیں کہتے بلکہ موثر تدریس اس کو کہتے ہیں کہ طلبہ کو جس حقیقت کا فہم مطلوب ہے، استاد اس کے بارے میں شبہات کو صاف کرے، اس کے [illegible] سوالات کو حل کرے اور موضوع سے متعلق توضیح و

تصریح کو طلبہ کے دلوں میں اتار دینے کی تمام ضروری تدابیر عمل میں لائے۔ وہ جزیات کی تفہیم کے خواہاں ہوں تو استاد ان کی راہنمائی کرے اور اس جزو کے اندر مضمر نکتہ کو واضح کرکے بیان کرے۔ ایک اچھا استاد مختلف حقائق کا تجزیہ کرتا ہے۔ واقعات کو ترتیب دے کر اور ان کا جائزہ لے کر بالآخر ایک نقطہ نظر قائم کرتا ہے۔ وہ سوال و جواب کا انداز اختیار کرتا ہے۔ صرف طلبہ سے ہی سوال نہیں کرتا بلکہ طلبہ کے سوالات کو بھی غور سے سنتا ہے اور ان کے جوابات دیتا ہے۔ طلبہ میں اعتماد بحال کرتا ہے۔ درسی کتب کے مختلف اسباق کے ساتھ ساتھ طلبہ کو دیگر متعلقہ علمی مواد سے متعارف کراتا ہے۔ موقع و محل کی مناسبت سے اپنے طریقہ ہائے تدریس کو مرتب کرتا ہے۔ نیز موضوع کے حوالے سے جوش و جذبے کے لہجے کو اختیار کرتا ہے۔ لیکن احتیاط یہ کرتا ہے کہ ہوش کا دامن نہ چھوڑے اور کوئی بات خلاف حق نہ کہے۔ اس ضمن میں استاد کے بعض مخصوص شخصی رویے ہوتے ہیں۔ یہ شخصی رویے دو طرح کے ہوتے ہیں:

(الف) موثر رویے (ب) غیر موثر رویے

استاد کا شخصی رویہ اگر موثر ہوگا تو اس کی تدریس میں بھی تاثیر ہوگی۔ اس کے برعکس اگر استاد کا شخصی رویہ غیر موثر ہوگا تو اس کی تدریس بھی غیر موثر ہوگی۔ ذیل میں استاد کے چند موثر رویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے:

- تعلیمی عمل کو بروئے کار لانے میں مستعد' سرگرم اور پرجوش ہوتا ہے اور اسے سرد مہری' کاہلی' افسردگی اور بیزاری سے نفرت ہوتی ہے۔
- طلبہ کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ نیز مقصدیت کا گہرا شعور رکھتا ہے۔
- خوش مزاج' روح پرور اور حقیقت پسند ہوتا ہے۔ قنوطیت کو اپنی زندگی کا جزو نہیں بناتا۔
- ناسازگار حالات میں بھی اپنے اوپر ضبط رکھتا ہے۔ بالعموم پریشانی اور الجھن کا شکار نہیں ہوتا۔
- لطیف ذوق مزاح کا مالک ہوتا ہے' کسی کی دل آزاری نہیں کرتا' نہ ہی غیر معمولی اور غیر ضروری سنجیدگی اختیار کرتا ہے اور نہ ہی ذوق مزاح سے عاری ہوتا ہے۔
- اپنی غلطیوں کو پہچاننے' انہیں تسلیم کرنے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرنے والا ہوتا ہے۔

- طلبہ سے برتاؤ میں انتہائی مہذب، عادل، اور عفو و درگذر سے کام لینے والا ہوتا ہے۔
- بردبار، متحمل اور مستقل مزاج ہوتا ہے۔ نیز علاقائی لسانی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوتا ہے۔
- طلبہ سے ہمدردی، احترام اور اخلاق پر مبنی گفتگو کرنے والا اور ان کی نفسیات کا گہرا شعور رکھنے والا ہوتا ہے۔ وہ طلبہ سے طنزیہ اور جلی کٹی گفتگو نہیں کرتا۔
- مشفق، مہربان، خیر خواہ اور پیکر اخلاص ہوتا ہے۔ وہ سخت مزاج، تنہائی پسند اور الگ تھلگ نہیں رہتا۔
- طلبہ کی علمی کاوشوں کی جائز تعریف میں کشادہ دل ہوتا ہے۔ وہ طلبہ کے کام کی بے جا نکتہ چینی کرنے والا اور تعریف میں بخیل نہیں ہوتا بلکہ ان کا احترام کرتا ہے۔
- طلبہ کے ذوق مطالعہ کو ابھارنے والا اور محنت کے ضمن میں ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا ہوتا ہے۔
- اپنی علمی معلومات کو اسلامی نظریہ زندگی کی روشنی میں مرتب کرتا ہے وہ معلومات برائے معلومات کا قائل نہیں ہوتا بلکہ علمی حقائق کی تعبیر، الٰہی ہدایت کے حوالے سے تیار کرتا ہے۔
- طلبہ کے رویوں، ضرورتوں، احساسات اور مشکلات کو سمجھنے والا ہوتا ہے۔ وہ ایک مشینی، میکانکی اور احساسات و جذبات سے عاری شخصیت کا مالک نہیں ہوتا۔
- تدریس کو انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے اور طلبہ کو علمی لحاظ سے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ وہ تدریس کو بے کار نہیں سمجھتا بلکہ اسے عبادت سمجھتا ہے۔
- نظم و ضبط کے لئے تحکم کی ضرورت ہو تو اسے جذبہ رحمت سے اور احسن انداز میں استعمال کرتا ہے۔ نیز طلبہ کو سخت سزا دینے والا اور منتقم مزاج نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت کلام نرم و شیریں کا مالک ہوتا ہے۔
- تعلیمی ادارہ سے دلچسپی ملازمانہ نوعیت کی نہیں ہوتی بلکہ ادارہ سے قلبی وابستگی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں وہ اوقات تدریس کی پابندی کرتا ہے، اپنے ادارہ میں نظم و ضبط کو قائم رکھتا ہے اور بحیثیت مجموعی اوقات، عادات اور بود و باش میں کامل نظم و ضبط کا پابند ہوتا ہے۔

سید مودودی انٹرنیشنل ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ لاہور کے ڈائریکٹر جناب محمد شریف قریشی کے
ایک انٹرویو کے [illegible]

- طلبہ کی نادانیوں اور حماقتوں پر مکمل صبر۔
- طلبہ سے انتہائی شفقت اور نرمی کا برتاؤ۔
- طلبہ سے خندہ روئی کے ساتھ انتہائی دلاویز اور واضح انداز میں گفتگو۔
- حصول علم میں طلبہ کی ہمیشہ حوصلہ افزائی اور آگے بڑھنے کی تلقین کرنا۔
- اپنے کردار اور اپنی خوبصورت مختصر گفتار سے طلبہ کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ امور کا اظہار کرنا۔

قریشی صاحب کی رائے میں استاد کے چند غیر موثر رویے یہ ہیں:

- طلبہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا' زجر و توبیخ کرنا۔
- نالائقی کا بار بار احساس دلانا' اکثر سزا سے کام لینا اور مختلف طریقوں سے عزت نفس کو مجروح کرنا۔
- طلبہ کی بے وقوفی کو نمایاں کرنا' اغلاط کی تشہیر کرنا اور سزا کے طور پر انہیں نظر انداز کرنا۔
- طلبہ سے کاروباری رویہ اپنانا اور ایسا انداز اختیار کرنا جس سے کوئی تعلق خاطر ظاہر نہ ہو۔
- طلبہ کے بیکار مشاغل کی حوصلہ افزائی کرنا اور ملی و قومی مقاصد کو پس پشت ڈال دینا۔

پروفیسر سید محمد سلیم نے اپنی کتاب "ابتدائی تعلیم کا نصاب" میں استاد کی بعض اہم حیثیات اور رویوں پر بڑی خوبصورت بحث کی ہے۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "---- ایک غلطی جس میں استاد عموماً مبتلا ہو جاتا ہے اس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ کسی ایک طالب علم پر زائد نظر کرم فتنہ کا سبب بن جاتی ہے۔ وہ طالب علم دوسرے طلبہ میں محسود بن جاتا ہے۔ دوسرے طلبہ اس سے جلنے لگتے ہیں اور خود اس طالب علم میں کبر پیدا ہوجاتا ہے۔ بہر کیف زائد شفقت کے نتائج اچھے نہیں نکلتے' یہی بہتر ہے کہ تمام طلبہ کو ایک نظر سے دیکھے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔"

بحیثیت روشن مثال

معلم اپنے طلبہ کے لئے ماڈل یا مثالی کردار ہوتا ہے۔ ہرچند کہ ایک معلم کے لئے روشن مثال بننا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ وہ بھی معاشرے کا ایک فرد ہے لیکن معاشرہ توقع ضرور رکھتا ہے کہ معلم واقعی طلبہ کے لئے ایک [illegible]

میں بھی اور برائی کے معاملے میں بھی معلم سے متاثر ہوتے ہیں' عام طور پر طلبہ درج ذیل امور میں اپنے اساتذہ سے متاثر ہوتے ہیں:

○ سیرت و کردار ○ علمی فضیلت ○ موثر صلاحیت ابلاغ

○ زندگی کے اساسی سوالات مثلاً" انسان' کائنات' خدا' زندگی بعد الموت' حلال و حرام' صحیح و غلط' خیر و شر' حق و باطل' محبت و نفرت' کامیابی و ناکامی' مقصد زندگی' استغنا' مادہ پرستی وغیرہ سے متعلق نقطہ نظر۔

○ اسلوب گفتار' ذوق علمی' الفاظ' تراکیب' امثال' اشعار' لطائف' اشارات اور استعارات کی پیش کش کا انداز۔

○ علمی اور انتظامی کام کرنے کی عادات یعنی وہ اسالیب جس کی روشنی میں روز مرہ کے کام سرانجام پاتے ہیں۔

○ ظاہری لباس' وضع قطع اور نشست و برخاست کا اسلوب۔

○ باہمی انسانی روابط کا اسلوب' خاص طور پر غصے یا پریشانی کے عالم میں استاد کا رویہ۔ مثلاً" استاد کا طرز عمل جب طالب علم کوئی گستاخی کرتا ہے یا بے معنی سوالات کرتا ہے یا اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لئے عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے۔

○ ترجیحات اقدار کا نظام یعنی زندگی کے مختلف امور میں استاد کا پسند اور ناپسند کا معیار۔

○ استاد جب متفرق قسم کے مسائل میں گھرا ہوتا ہے تو اس کا ذہن کیسے کام کرتا ہے اور اس وقت اس کا عام رویہ کیا ہوتا ہے؟ اس طرح کے لمحات اس کی مستقل مزاجی کا امتحان ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب اس کے اپنے رفقائے کار میں سے ہی اس پر تنقید و تنقیص کرنے والے تو بہت ہوں لیکن اس کے حق میں کلمہ خیر کہنے والے بہت کم ہوں یا بالکل ہی نہ ہوں۔

○ مختلف النوع حالات میں قوت فیصلہ کا صحیح استعمال۔ نیز اپنے طلبہ اور رفقائے کار کی صلاحیتوں کا صحیح ادراک۔

○ استاد کی جسمانی' ذہنی اور روحانی صحت۔

پروفیسر سید محمد سلیم' معلم کی مثالی حیثیت کے بارے میں اپنی کتاب "مسلمان مثالی اساتذہ اور طلبہ" میں لکھتے ہیں:

> "استاد طلبہ کے لئے ایک مثالی انسان ہوتا ہے۔ طلبہ شعوری طور پر معلم کو ایک مثالی ہستی تصور کرکے اس کی عادات و اطوار سے متاثر ہوتے [illegible] جیسا ہی بننے کی کوشش کرتے ہیں' اس حقیقت

کے پیش نظر استاد پر عظیم الشان ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ واقعی اس کو طلبہ کے سامنے ایک معیاری کردار اور مثالی نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ وہ بہترین اخلاق اور بہترین کردار کا مظاہرہ کرے۔ استاد کا کردار جتنا بلند اور بے داغ ہوگا' اسی قدر وہ طلبہ میں ہر دل عزیز ہوگا۔ اسی قدر وہ بہتر انداز میں طلبہ کی تربیت کر سکے گا۔ شکل و صورت' وضع قطع' لباس' نشست و برخاست اور کردار و گفتار میں استاد کو بہترین نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ نیم ساتر' غیر سنجیدہ لباس' لغو و بیہودہ گفتگو' نامعقول اور ناپسندیدہ رویہ ایک استاد کو زیب نہیں دیتا۔"

بحیثیت محقق

معلم کی ایک اور حیثیت صاحب علم و تحقیق کی ہے۔ وہ مطالعہ و تحقیق کا ذوق رکھتا ہے۔ اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ چونکہ وہ استاد ہے اس لئے اسے مزید علم یا تحقیقی کاوشوں کی ضرورت نہیں۔ معلم بننا ایک اعزاز ہے۔ لیکن اس اعزاز کو نبھانے کے لئے بڑی محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ صرف سند یافتہ ہونا کافی نہیں' اس کے لئے تحقیق' تصنیف اور تالیف کی صلاحیتیں بھی درکار ہوتی ہیں۔ طلبہ اسی استاد کی عزت کرتے ہیں جو علم و بصیرت میں نمایاں اور ہمیشہ علم کا متلاشی ہو۔ اس کے برعکس ایک میکانکی استاد درحقیقت ایک بے روح استاد ہوتا ہے۔ زندہ تدریس کے لئے ضروری ہے کہ استاد اپنے مطالعہ و تحقیق میں سنجیدگی اور وسعت پیدا کرے۔ لیکن یہ مطالعہ لازما" تنقیدی شعور اور غالب ذہن کے ساتھ ہونا چاہئے۔ حقیقت میں علم کی طلب وہیں ہوتی ہے جہاں یہ احساس پیدا ہو کہ وہ ابھی کم علم ہے۔ علم کے سمندر تک پہنچنے کے لئے معلم کو طویل سفر طے کرنا ہوتا ہے۔ تھوڑے علم کے ساتھ کبر علم نمودار ہوتا ہے اور یہ بڑا خطرناک نشہ ہے۔

بحیثیت مشیر

معلم صرف درسی کتب کی تدریس تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ طالب علم کی متوازن اور جامع نشوونما کے حوالے سے تعلیمی مشیر (Counsellor) کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ وہ مقاصد کی روشنی میں طلبہ کے لئے جامع تعلیمی منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ طلبہ کے لئے مختلف تعلیمی سرگرمیاں مرتب کرتا ہے۔ اگر معلم تعلیمی مشیر کی حیثیت سے باقاعدہ تربیت یافتہ نہ بھی ہو' تو پھر بھی معلم کا منصب اس سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ مشیر کا کردار بھی ادا کرے۔ طلبہ کی شخصیت کی ذہنی' اخلاقی' روحانی' جسمانی' انفرادی' معاشی اور معاشرتی امور کی

مند نشوونما اور ان امور سے متعلق ضروری رہنمائی فراہم کرنا معلم کا فرض ہے۔ معلم کا بحیثیت مشیر کردار بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ انسانی شخصیت بڑی پیچیدہ (Complex) ہوتی ہے اور اس کے لئے انسانی نفسیات کا علم یعنی انسانی رویوں کی تفہیم بڑی ضروری ہے۔

بحیثیت متعلم

عام طور پر یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ایک سند یافتہ معلم کو کیا ضرورت ہے، کہ وہ معلم کا منصب چھوڑ کر متعلم بھی بنے۔ آخر وہ کمرہ جماعت میں یا کمرہ جماعت کے باہر مزید کیا سیکھ سکتا ہے؟۔۔۔۔ حقیقت میں عمل تعلیم میں جس طرح طالب علم کی پوری شخصیت مصروف عمل ہوتی ہے۔ اس طرح معلم کی پوری شخصیت بھی بیک وقت طلبہ کو درس بھی دے رہی ہوتی ہے اور سیکھ بھی رہی ہوتی ہے۔ طالب علم، استاد کو ذرا مختلف انداز میں، کبھی خاموش اور کبھی اشارات و کنایات میں، کبھی اپنے جذبات و احساسات کی صورت میں، کبھی آنکھوں کی چمک سے، کبھی اپنے ماتھے کی شکنوں سے اور کبھی اپنی واضح گفتگو کی صورت میں درس دیتا ہے کہ وہ طلبہ کے مخفی جذبات اور مسائل کا گہرا شعور حاصل کرے۔ بہتر ابلاغ کے لئے ضروری ہے کہ استاد اپنے مضمون کے بارے میں بھی مہارت حاصل کرے اور اپنے طلباء کو بھی سمجھنے کی کوشش کرے۔ استاد کا یہ طالب علمانہ کردار اسے بلند مقام کا حامل بناتا ہے۔ کتب، رسائل، دوسرے اساتذہ کا اسلوب، مطالعہ و تحقیق اور طلبہ، یہ سب استاد کے تربیتی ذرائع ہیں۔ کلاس میں جہاں طالب علم استاد کے علم سے استفادہ کرتا ہے، وہاں استاد بھی یہ سیکھتا ہے کہ تعلم بعض طلبہ کے لئے آسان کیوں ہے اور بعض کے لئے مشکل کیوں؟ بعض طلبہ، علم کے پیاسے ہوتے ہیں اور بعض طلبہ سرے سے کمرہ جماعت میں بیٹھنا ہی نہیں چاہتے۔ بعض طلبہ کے نزدیک استاد کے لیکچرز انہیں کوئی چیلنج مہیا نہیں کرتے اور بعض کے لئے ایسی صورت حال نہیں ہوتی۔ موزوں تدریسی حکمت عملی کے لئے ان تمام صورتوں کی بہتر تفہیم بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موثر معلم اچھا متعلم بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اپنے آپ کو متعلم کے مقام پر لاکر ہی معلم، متعلم کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے۔

بحیثیت مستند شخصیت

معلم طلبہ کے لئے ایک اتھارٹی یا ایک مستند شخصیت ہوتا ہے۔ اسے موضوع سے متعلق بہت کچھ جاننا ہوتا ہے۔ ہرچند کہ ضروری نہیں کہ استاد تمام علوم کا واقف ہو اور یہ [illegible] ات پیش نظر رکھنا ہوتی ہے کہ طلبہ کمرہ جماعت کے اندر

اور کمرہ جماعت کے باہر اس سے طرح طرح کے سوالات پوچھتے ہیں۔ چنانچہ ضروری علم استاد کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ آوارہ خوانی کبھی مطلوب نہیں ہوتی لیکن استاد کا وسیع المطالعہ ہونا اس کی ایک اہم خوبی ہے۔ بہر حال اگر استاد کو کسی موضوع سے متعلق مطلوبہ معلومات حاصل نہیں تو اس کے پاس یہ کہنے کی اخلاقی جرات ہونی چاہیے کہ "میں نہیں جانتا"۔ اس طرح کا استاد ہی صحیح معنوں میں عزت کا مستحق ہوتا ہے۔ ہر چند کہ استاد کلیہ جملہ کہ "میں نہیں جانتا" اس کے لئے ایک عجیب اضطرابی کیفیت پیدا کرے گا' لیکن اس کے مثبت اثرات یہ نکلیں گے کہ وہ اور طالب علم دونوں مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

بحیثیت تموج انگیز شخصیت

طلبہ کے اندر خیر کی صلاحیتوں کی نشاندہی کرنا' انہیں اجاگر کرنا اور پھر انہیں عمل میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ معلم اپنی نظری' علمی اور فنی علم کے ساتھ ساتھ صاحب بصیرت بھی ہو اور اس کے لیکچرز فی الواقعہ روح پرور بھی ہوں۔ معلم درحقیقت طلبہ کو جذب و کیف اور فیض نظر عطا کرتا ہے۔ اس لئے وہی استاد' بصیرت' جذب دروں کا پیکر اور تحرک انگیز شخصیت کا مالک ہوسکتا ہے جو درویش صفت' مخلص اور صاحب کردار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مضمون اور فریضہ تدریس سے لگاؤ بھی رکھتا ہے۔ نیز اپنے طلبہ سے کسی طمع و لالچ کا طالب نہیں ہوتا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ روز مرہ کی روٹین یا معمول کی تدریس کا معلم جو تخلیقی ذوق سے محروم ہے وہ اپنے طلبہ کو ہرگز اس روحانی تحریک (Inspiration) سے مستفیض نہیں کرسکتاجو موثر تدریس کے لئے ضروری ہے۔ جذب دروں اور بصیرت کے حصول کے لئے کوئی حسابی فارمولا تو موجود نہیں البتہ قرآن و حدیث سے گہری وابستگی اور عملی کردار کے ساتھ ساتھ اچھے اور پاکیزہ لٹریچر کا مطالعہ' صاحب علم اور صالح افراد کی رفاقت' نیز اپنے مضمون سے متعلق مطالعہ و تحقیق وہ بنیادی ذرائع ہیں جو انتہائی مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ ان ذرائع کے علاوہ معلم کا کسی ایسی اساتذہ تنظیم سے تعلق بھی مفید ثابت ہوسکتا ہے جو اپنے پروگرام میں نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کے مقاصد کو اولیت دیتی ہے۔

بحیثیت انسان دوست

انسان دوستی یا عظمت انسان اہم قدر ہے اور آج کل مغربی فلسفہ میں اس کا بڑا چرچا بھی ہے لیکن عملاً یہ محض سلوگن ہی رہا۔ اس لئے کہ [illegible]

العظمت للانسان کا نظریہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ انسان دوستی اور انسانی عظمت کا آخر معیار کیا ہے؟ جب تک اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ ابدی معیار و ہدایت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور وہی اس کائنات کا خالق ہے اور انسان اس کا بندہ ہے اور جس کا اہم مقصد بندگی رب ہے۔ اس وقت تک انسان دوستی کے فلسفیانہ اور سیاسی نعرے بے معنی ہوں گے۔ حقیقت میں ایک مسلم معلم ہی صحیح معنوں میں انسان دوست ہے۔ وہ معاشرے کا ایک اہم فرد ہوتا ہے' وہ علمی جزیرہ نہیں ہوتا' جہاں طلبہ صرف معلومات کے حصول کے لئے جاتے ہیں۔ معلم کی تدریس' اس کا انداز' اس کی شخصیت صرف کلاس روم تک محدود نہیں ہوتی بلکہ طلبہ کے ذریعے وہ معاشرے کے دیگر افراد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ معلم کی گفتگو' لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا' اس کا مجموعی کردار' اس کا علم' یہ تمام چیزیں اسے ممتاز شخصیت بناتی ہیں۔ استاد کا یہ تشخص معاشرے کی صحت مند تشکیل و تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ معلم کی موثر تدریس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاشرے سے آئے ہوئے مختلف طبقوں کے طلبہ کا دل سے ادب و احترام کرے۔ کمرہ جماعت کے اندر یا باہر' معلم کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مجموعی اسلوب غیر طبقاتی ہو۔ استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کمرہ جماعت میں معاشرتی اور سیاسی نظریات کے تجزیہ میں بڑا منطقی' محتاط' ذمہ دار' دانش مند' صاحب علم اور طلبہ و معاشرہ دونوں کا بہی خواہ ہو۔ طلبہ کے ساتھ یہ رویہ بحیثیت مجموعی معاشرہ میں اخوت کی فضا پیدا کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ معلم کا یہ فرض بھی ہے کہ طلبہ کے والدین اور معاشرے کے دوسرے افراد سے خیر خواہی اور اخوت کی بنیاد پر روابط استوار کرے تاکہ عام مجموعی تعلیمی فضا اچھائیوں سے بھر جائے اور بالآخر اس کے مثبت گہرے اثرات طلبہ کی تعلیم و تربیت پر بھی پڑیں۔

بحیثیت منفرد شخصیت

موثر حکمت تدریس کے حوالے سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ معلم کی بحیثیت فرد ایک منفرد شخصیت بھی ہے۔ ہر استاد کا اپنا ایک مخصوص اسلوب تدریس اور ایک منفرد طریق کار ہوتا ہے۔ اس کی اپنی تخلیقی حکمت عملی ہوتی ہے۔ جس میں تاثیر' جذبہ' افتاد طبع اور طرز فکر و احساس جیسے عوامل مل جل کر حصہ لیتے ہیں۔ لہٰذا "علم التعلیم" میں اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ جدید تدریسی ٹیکنالوجی سے بلاشبہ استفادہ کیا جائے لیکن معلم اور متعلم دونوں کی تخلیقی صلاحیتیں مجروح نہ ہوں۔ دنیا کے معروف اساتذہ کی زندگیوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ انہوں نے اپنی ذمہ دار زندگی اور اپنی شخصیت کو عمل تدریس میں جذب کرلیا تھا ایسے اساتذہ سے' طلبہ متعین درسی کتاب (Textbook

Prescribed) میں شامل معلومات سے کہیں زیادہ علم بھی حاصل کرتے تھے اور اپنے اساتذہ کے اخلاقی وجود کی ہر ادا سے روحانی تربیت کا سامان بھی حاصل کرتے تھے۔ ہرچند کہ موثر اساتذہ کے شخصی اسلوب میں فرق ملے گا لیکن تدریسی روح دراصل استاد کا مجموعہ کردار ہے' جو اسے انفرادیت بخشتا ہے۔ استاد کا ذاتی تاثر اور احساس بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ حقیقت میں استاد کا مخصوص اسلوب' اس کی شخصیت کا پرتو ہوتا ہے۔ اس کا ماضی اور حال' اس کی خوبیاں' خامیاں' اس کی ذاتی زندگی غرض تمام امور تدریس کو موثر بھی بناتے ہیں اور غیر موثر بھی۔۔۔۔ اصل میں تدریس بنیادی طور پر تخلیقی عمل اور ایک لطیف فن ہے' جس کی ہیئت نہ اقلیدس پر مبنی ہے اور نہ ریاضی کے فارمولے پر۔ اس کا تعلق جمالیاتی قدروں سے ہے' جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے لیکن سائنسی انداز سے بیان کرنا مشکل ہے۔ اس نقطہ نظر سے تدریس آرٹ ہے اور اسی آرٹ میں معلم کی انفرادیت مخفی ہے۔ معلم اپنی تدریس کو کتنا ہی سائنسی قوانین کے تحت منضبط اور مرتب کرتا چلا جائے لیکن ضروری نہیں کہ یہ معروضیت اسے موثر بنادے۔ اس نظریہ کے تحت تدریس ایک ایسا فن ہے جو مختلف عوامل مثلاً" علم' ہنر' شخصی وصف اور سیرت و کردار میں کامل توازن کا تقاضا کرتا ہے اور یہی کامل توازن معلم کی انفرادیت ہے۔

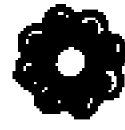
بحیثیت ممتحن

پورے تعلیمی عمل میں طلبہ کی تعلیمی استعداد کی جانچ پرکھ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ تدریس فی نفسہ بڑا دلچسپ کام ہے لیکن اس کا امتحانی پہلو تدریس کو خشک بنا دیتا ہے۔ معلم و متعلم دونوں کے لئے اس میں دلچسپی ذرا کم ہی ہے۔ بہر حال چونکہ امتحان سے فرار بھی ممکن نہیں اور عمل تعلیم کا یہ ضروری جزو ہے اس لئے معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ جانچ پرکھ کا ایسا طریقہ اختیار کرے جس سے امتحانی تقاضے بھی پورے ہوں اور طلبہ کی شخصیت بھی مجروح نہ ہو۔ طلبہ کو گریڈ یا نمبر دینے میں جہاں استاد کو معروضی معیار پیش نظر رکھنا ہوتا ہے وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دیانت دار بھی ہو۔ امتحانات کے ضمن میں فنی تربیت اور دیانت سے عاری استاد بحیثیت ممتحن بہتر کردار ادا نہیں کرسکتا۔

مسلم استاد حقیقت میں ایک جامع الحیثیات شخصیت ہے اور اس کی یہ مختلف حیثیات بالآخر ایک فکری وحدت میں ضم ہو جاتی ہیں جس کی اساس کلمہ طیبہ ہے۔ معلم کی یہ جامعیت' طلبہ کی ہمہ گیر تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس تناظر میں تربیت اساتذہ کے اداروں کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کہ کیا ان کا تربیتی نصاب طلبہ کی جامع تعلیم و تربیت کا ضامن بن رہا ہے؟ کیا مستقبل کے اساتذہ کی تربیت' معلم کی ان حیثیات کے حوالے سے

ہو رہی ہے؟ کیا خود تربیتی اداروں کے اساتذہ کی اپنی تربیت اس نہج پر ہے؟ غرض موثر حکمت تدریس سے متعلق کئی سوالات ہیں جن پر باقاعدہ اور منضبط مطالعہ و تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ نتائج کی روشنی میں تربیت اساتذہ کی تشکیل نو کا کام بہتر انداز پر ہو سکے۔

(سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 5' شمارہ 4' جنوری 1995ء)



مثالی استاد کے اوصاف

(زیر تربیت اساتذہ کے لئے چند رہنما اشارات)

انسانوں کے اس ہجوم میں وہ لوگ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے پیشہ معلمی اختیار کیا یا جو اسے اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس وقت غالباً" تمام باوقار اور مستند پیشوں میں اہم ترین پیشہ "تدریس" کا ہی ہے۔ پھر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ دیگر تمام پیشوں کے لیے تیار کیے جانے والے افراد بھی ان ہی اساتذہ کے مرہون منت ہیں جنہوں نے انہیں کسی نہ کسی سطح پر پڑھایا ہوا ہوتا ہے۔

علمی دنیا میں استاد کو جتنا چیلنج آج ہے' اتنا پہلے کبھی نہ تھا۔ آج لوگ' معاشرہ کے باقی اداروں کے افراد سے اتنی توقع نہیں رکھتے جتنی رسمی تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے انہیں توقع ہوتی ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے والدین' طلبہ' ذرائع ابلاغ اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کا دباؤ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کس انداز سے کی جائے کہ ان کی تدریس انتہائی موثر اور نتیجہ خیز ہو تاکہ طلبہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سیکھ سکیں اور ان کی روحانی' اخلاقی' ذہنی' جسمانی' لسانی اور ادبی صلاحیتوں کی متوازن نشوونما ہو۔

یہ امر خوش آئند ہے کہ آج ہمارے ہاں تربیت اساتذہ کے اعلیٰ اداروں میں اسناد اور حاصل کردہ نمبروں کے حوالے سے بالعموم بہتر طلبہ و طالبات داخلہ لے رہے ہیں اس کے نتیجے میں توقع کی جانی چاہیے کہ تربیت اساتذہ کے ادارے انہیں وہ علمی ماحول فراہم کریں گے جس میں زیر تربیت اساتذہ کی صلاحیتوں کو مزید جلا ملے۔ محض حالات و واقعات' سہولیات کی کمی اور مختلف مشکلات کا رونا اور نوجوان نسل سے شکایات کا دفتر کھول دینے سے اصلاح ممکن نہیں۔ آج اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ اساتذہ کے تربیتی اداروں میں جہاں ضروری سہولتیں ہوں وہاں پڑھانے والا سٹاف بھی ایسا ہو جسے پختہ نظریاتی شعور بھی حاصل ہو اور "علم التعلیم" کے تقاضوں سے مکمل آگہی بھی ہو۔

حقیقت میں زیر تربیت استاد کو جہاں علم التعلیم سے متعلق پورے تعلیمی عمل کا گہرا

مطالعہ کرنا ہوتا ہے وہاں اس کے لئے اہم ترین تربیتی نکتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کامیاب معلم بنے۔ وہ کون سی تدریسی مہارتیں اور شخصی خصوصیات ہیں جن کا جاننا اس کے لئے ضروری ہے۔ اس ضمن میں تربیت اساتذہ کے اداروں میں ٹیچنگ میتھڈز کے کورسز میں جدید طریقے تو سکھائے ہی جاتے ہیں لیکن ایک اور آسان ترین مشق یہ بھی کرائی جاسکتی ہے کہ ہر طالب علم سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے تعلیمی کیریئر میں ان اچھے اساتذہ کی خصوصیات کا جائزہ لے اور پھر اس بات کی توجیہہ کرے کہ استاد کے بعض مخصوص رویوں کو اس نے خصوصیات کے زمرے میں کیوں شامل کیا ہے؟ ہر طالب علم، کلاس سیمینار کی صورت میں اپنی اپنی فہرست کو زیر بحث لائے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ بعض اساتذہ کی خصوصیات فی الواقعہ پسندیدہ تھیں۔ لیکن ہر استاد کی شخصیت ایک جیسی نہ تھی۔ مثلاً" بعض اساتذہ خاموش، نرم خو اور بعض باتونی اور کسی حد تک تحکم آمیز لہجہ رکھنے والے۔ بہر حال فرق کسی نوع کا بھی ہو، یہ کہنا نہایت مشکل ہوگا کہ موثر تدریس کے لیے اچھا استاد، کسی اور اچھے استاد کی صرف کاربن کاپی ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی مشکل ہوگا کہ مختلف حالات اور کمرہ جماعت کے ماحول میں تضاد کی بنا پر ہر جگہ اور ہر موقعہ پر استاد یکساں موثر ہے۔ اصل میں اچھے اساتذہ کی جہاں منفرد شخصیت ہوتی ہے وہاں ان کا منفرد طریقہ تدریس بھی ہوتا ہے جو وہ کمرہ جماعت کے احوال و واقعات کی مناسبت سے مرتب کرتے ہیں۔

بلاشبہ متعین اور لگے بندھے طریقہ ہائے تدریس میں مہارت، استاد کے لئے ضرور مددگار ہوتی ہے، لیکن اس مہارت کے باوجود یہ پیشین گوئی (Predict) کرنا ایک مشکل امر ہے کہ تدریس لازماً" موثر ہوگی۔ محض فنی مہارت شاید معلومات کو طلبہ تک منتقل کرنے میں مدد تو دے، لیکن کیا واقعی مقاصد کی بہتر تکمیل ہوئی؟ یہ کہنا خاصا مشکل ہوگا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اساتذہ کو دنیا میں جس پیچیدہ اور گنجلک (Complex) چیز سے واسطہ ہوتا ہے وہ انسانی رویہ (Behaviour) ہے۔ چنانچہ ایک کامیاب استاد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے وہ اس "انسان" کی معرفت حاصل کرے جو طالب علم کی صورت میں اس کے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ وہ طالب علم کے رویوں میں متوقع تبدیلیوں کا ادراک حاصل کرتا ہے اور طالبعلم کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ وہ علمی مسائل میں غور و فکر کرے اور بامعنی نتائج تک پہنچے۔ اصل میں دوسرے مضامین کے مقابلے میں "علم التعلیم" ایک بڑا جامع مضمون ہے اور پھر اس میں "تدریس" ایک مشکل ترین کام ہے کیونکہ ایک طرف یہ جامعیت کا اور دوسری طرف جزئیات اور باریک بینی کا تقاضا کرتی ہے۔

حکومت کی سطح پر زیر تربیت اساتذہ کے لئے مختلف مضامین اور تدریسی طریقہ عمل

سرگرمیاں ہر چند کہ پہلے سے طے شدہ ہیں' لیکن اس نصاب کے ساتھ ساتھ زیر تربیت استاد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اچھے اساتذہ اور اچھی تدریس سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرتا رہے۔ یہ مطالعہ اسے مستقبل میں موثر اور ایک کامیاب استاد بننے میں مدد دے سکتا ہے۔ اس حوالے سے ذیل میں چند رہنما اشارات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

تربیت اساتذہ سے متعلق سٹڈی رپورٹس کا مطالعہ

تربیت اساتذہ کے اداروں کی لائبریریوں میں تدریس سے متعلق کئی سٹڈی رپورٹس اور تحقیقی مقالات موجود ہوتے ہیں جن میں یہ مباحث ملتی ہیں کہ وہ کون سے کامیاب شخصی رویے' امتیازی اوصاف اور موثر پیشہ ورانہ مہارتیں ہیں جو ایک اچھے معلم کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے ساتھ ان رپورٹس کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کون سی خامیاں ہیں جو اچھا معلم بننے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ چنانچہ ان تحقیقات کے نتائج کے تناظر میں استاد اپنے شخصی رویوں اور تدریسی اسالیب کا خود تنقیدی جائزہ لے سکتا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ استاد کی موثر تدریس راتوں رات تشکیل نہیں پاتی اس کے لئے وقت' تجربہ' مطالعہ' تحقیق اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

تربیت اساتذہ کے بارے میں لٹریچر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے موثر اور غیر موثر رویوں اور طرز عمل سے متعلق کئی اہم سٹڈیز ہوئی ہیں جن میں ریانز (Ryans) کی سٹڈی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس سٹڈی میں ٹیچر سپروائزر' ٹیچر ایجوکیٹرز' سکولوں کے پرنسپلوں' عام سکول اساتذہ' سٹوڈنٹ ٹیچرز اور ٹیچنگ میتھڈز کے کورسز کے طلبہ سے مختلف حالات میں اساتذہ کے ایسے مخصوص رویوں کے بارے میں پوچھا گیا جو ایک کامیاب اور ایک ناکام تدریسی کاوش میں واضح فرق ظاہر کرتے ہوں۔ اس سٹڈی کے نتائج تربیت اساتذہ کے نصاب بالخصوص میتھڈز کے کورسز کی تشکیل نو میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ یہ ایک طویل سٹڈی ہے جس کا مطالعہ علم التعلیم کے طالب علم کے لیے انتہائی مفید ہو سکتا ہے۔ البتہ ذیل میں مختصر طور پر اس سٹڈی کے حوالے سے ممتاز اساتذہ کی نمایاں اور موثر خصوصیات پیش کی جارہی ہیں:

- مستعد' پرجوش' خوش مزاج اور سرگرم عمل۔
- طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں سے قلبی چاہت اور دلچسپی۔
- ناسازگار حالات اور مخالفانہ فضا میں بھی اپنے اوپر کنٹرول رکھنے والا۔
- [illegible] کرنے والا اور لطیف ذوق مزاح کا حامل۔

- طلبہ سے برتاؤ میں انتہائی مہذب' بااخلاق' عادل اور متواضع۔
- اپنی خامیوں اور غلطیوں کا اعتراف کرنے والا۔
- مختلف علمی امور اور طلبہ کی تفویض کار سے متعلق بڑی شفقت اور ہمدردی سے سمجھانے کا انداز۔
- صابر' بردبار اور مستقل مزاج۔
- طلبہ کی ذاتی ضرورتوں اور دلچسپیوں' تعلیمی مسائل اور مستقبل کی علمی اور معاشی منصوبہ بندی سے متعلق طلبہ کی رہنمائی کرنے والا۔
- طلبہ کی تدریسی کاوشوں کی تحسین کرنے والا' اچھا کام کرنے پر بھرپور شاباش دینے والا اور ایسی نکتہ چینی سے اجتناب کرنے والا جس سے طلبہ کی حوصلہ شکنی ہوتی ہو۔
- طلبہ اور تعلیمی ادارے کی بھلائی سے متعلق مزاحم قوتوں کا قبل از وقت ادراک کرنے والا اور پھر ان کا بروقت حکمت و دانائی سے حل کرنے کا سلیقہ رکھنے والا۔
- طلبہ کے علمی و ادبی ذوق اور ان کے مطالعہ و تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنے والا۔
- کمرہ جماعت میں پیش کی گئی تمام سرگرمیوں کی انتہائی مناسب منصوبہ بندی اور موثر تنظیم و ترتیب کرنے والا۔
- کمرہ جماعت میں روز مرہ کے تدریسی کام میں حالات و واقعات کی مناسبت سے جزوی تبدیلی کرنے کا قائل۔
- تدریسی حوالے سے مضمون کا ماہر۔ اس کے ساتھ ساتھ دلچسپ تدریسی طریقوں' موزوں استعاراتی اور تمثیلاتی اسلوب' تجربات و مشاہدات اور مناسب تصریحات و توضیحات کے ذریعے طلبہ کو تعلیم کی طرف مائل کرنے والا۔
- تفویض کار اور اس ضمن میں عام ہدایات دینے میں بڑا واضح۔
- تخلیقی صلاحیتوں کا مالک' محنت و مشقت کا عادی اور وقت کا پابند۔
- بحیثیت مجموعی اپنے مضمون اور موثر ابلاغ کا ماہر اور انسان دوست۔

ریانز کی سٹڈی کے یہ چند نکات اور اسی طرح دیگر سٹڈیز کے نتائج کو کلاسز میں زیر بحث لایا جاسکتا ہے اور پھر اپنے تہذیبی پس منظر میں اسی موضوع پر طلبہ کو مختلف پراجیکٹس تفویض کیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت میں منضبط مطالعہ و تحقیق ہی وہ معروف طریقہ ہے جس سے استاد کا علمی جمود ٹوٹ سکتا ہے اور وہ اپنی تدریس کو فی الواقعہ کامیاب اور تموج انگیز بنا سکتا ہے۔

زیر تربیت اساتذہ سے ان کے اپنے اساتذہ سے متعلق آراء کا مطالعہ

ایک اور معروف طریقہ یہ ہے کہ خود زیر تربیت اساتذہ [illegible]

کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ کیونکہ جن طلبہ نے اپنے اساتذہ کے ساتھ علمی فضا میں ایک وقت گزارا ہے وہ اپنے استاد کو بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی آراء بہت حد تک قابل اعتماد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً وٹی (Witty) نے اپنے ایک مطالعہ میں امریکہ میں مختلف سکولوں میں پڑھنے والے تقریباً بارہ ہزار طلبہ سے صرف ایک سوال پوچھا کہ' جس استاد سے وہ بہت متاثر ہیں اس کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟' چنانچہ اس سٹڈی کے نتائج کے مطابق استاد کی درج ذیل خصوصیات سامنے آئیں۔

- معاون' مددگار اور جمہوری رویہ کا حامل۔
- شفیق' ہمدرد' بردبار اور خوش خصال۔
- ہم نصابی سرگرمیوں میں شوق و رغبت۔
- ظاہری وضع قطع باوقار اور پرکشش۔
- لطیف ذوق مزاح۔
- طلبہ کے مسائل سے متعلق متفکر اور ان مسائل کے حل میں دلچسپی لینے والا۔
- بحیثیت مجموعی مضمون کی تدریس میں غیر معمولی قابلیت' استعداد' فنی مہارت اور طریق تدریس پر عبور۔

اس طرح کی ایک اور سٹڈی میں ولیم سن (Williamson) نے دو ہزار طلبہ سے یہ معلوم کیا کہ ان کے سکول کے زمانے میں جو اساتذہ موثر یا غیر موثر تھے ان کے الگ الگ خواص کیا تھے؟ اس سٹڈی کے مطابق موثر اساتذہ میں درج ذیل خصوصیات نمایاں تھیں۔

- طالب علم سے شفقت اور ہمدردی کا احترام اور تحصیل علم کے حوالے سے اس کی کارکردگی سے خصوصی دلچسپی۔
- کلاس کے نظم و ضبط میں تحکم اور آمرانہ دبدبہ نہیں بلکہ ایک مہربان دوست اور جمہوریت پسند استاد کی حیثیت سے کلاس میں مثالی نظم و ضبط۔
- مواد تدریس کی منطقی ترتیب' اسلوب تدریس پر جوش' اور موثر۔
- طلبہ کو تعلیمی عمل میں بڑی حکمت سے شریک کرنا اور ان سے دلچسپ انداز میں بھرپور علمی کام کرانا۔
- طلبہ سے عزت و توقیر سے پیش آنا اور مختلف ٹیسٹوں میں گریڈنگ کے حوالے سے انتہائی معروضی اور غیر جانبدارانہ رویہ۔
- پورے عمل تعلیم میں طالب علم کی مثبت رائے کی اہمیت اور اسے محوری حیثیت دینے

ہوئے تمام نصابی سرگرمیوں کی از سر نو تشکیل و تنظیم کرنا۔

اس طرح اس سٹڈی کے مطابق غیر موثر اساتذہ میں درج ذیل نکات بڑے اہم تھے۔

- کلاس کا نظم و ضبط انتہائی کمزور۔ استاد ہر وقت غصہ اور تحکم کا انداز لیے ہوئے۔ پھر بعض صورتوں میں کلاس بظاہر تو خاموش لیکن در حقیقت بیخ پا۔
- بعض طلبہ کے لیے بغیر کسی وجہ کے واضح پاسداری اور جانب داری اور بعض کے لیے بلاوجہ نفرت، بخل اور بغض۔
- طلبہ سے بالعموم بے تعلق، بس ایک میکانکی انداز تعلیم۔ انسانی جذبات و احساسات سے عاری۔
- استاد اول تو نہ ہی اپنے نفس مضمون کا ماہر اور نہ ہی طریق تدریس سے باخبر۔ دوسری صورت میں اگر نفس مضمون کا ماہر ہے تو طریق تدریس سے بے خبر۔ تیسری صورت میں اگر نفس مضمون اور طریق تدریس دونوں میں ماہر ہے تو طلبہ سے رابطے اور اپنے شخصی رویوں کے حوالے سے انتہائی کمزور۔
- طلبہ کی شخصیت اور ان کی آراء کا نہ احترام اور نہ کوئی خیال۔
- بحیثیت مجموعی معلم کو پیشہ تدریس سے نہ ہی کوئی ذوق و شوق اور نہ ہی تدریسی کاوشوں میں محنت اور مشقت کی عادت۔

اس طرح کے تحقیقی مطالعہ جات کی ہمارے ہاں بھی بڑی ضرورت ہے۔ خاص طور پر مختلف جامعات کے ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق یا شعبہ ہائے تعلیم کو اس ضمن میں کوئی باقاعدہ منضبط تحقیق کرانی چاہیے۔ اس طرح کی اسٹڈیز اساتذہ کو رہنما خطوط فراہم کرنے میں انتہائی معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

عظیم اساتذہ کی سوانح عمریاں اور دیگر علمی و ادبی نگارشات کا مطالعہ

زیر تربیت اساتذہ کو اپنی تدریس بہتر رخ پر ڈھالنے کے لئے عظیم اساتذہ کی سوانح عمریاں، ان اساتذہ کی دیگر تحریروں، اساتذہ سے متعلق دوسروں کی نگارشات اور دیگر پیشہ ورانہ کتب کا تنقیدی مطالعہ بھی انتہائی مفید ہو سکتا ہے۔ اس طرح اگر بعض سفرناموں، افسانوں، ناولوں، تاریخی کتب، شعرا کی کلیات، ادبی اور علمی رسائل، اخبارات میں شامل مضامین، مقالات، اشارات اور فکاہیہ کالموں جن میں اساتذہ یا بحیثیت مجموعی تعلیم و معلم کی بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا جائزہ لیا جائے تو یہ مطالعہ ایک معلم مطلوب کے خدوخال مرتب کرنے میں بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ہمارے ہاں بعض کتب مثلاً" سید ابوالاعلیٰ مودودی کی "تعلیمات" اور "تصریحات" ڈاکٹر سید عبداللہ کے "تعلیمی خطبات" ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب "ایجوکیشن ان پاکستان" پروفیسر سید محمد سلیم کی کتب "مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ" اور "عصر حاضر کا چیلنج اور مسلمان استاد" جناب خرم مراد کی کتاب "احیائے اسلام اور معلم" پروفیسر محمد منور مرزا کی کتاب "ایقان اقبال" جناب نعیم صدیقی کی کتب "رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم" اور "تعمیر سیرت کے لوازم" اور دیگر مصنفین کی اچھی تحریریں اس ضمن میں انتہائی مفید ہیں۔

تربیت اساتذہ کے اداروں کو چاہیے کہ اپنے "میتھڈز آف ٹیچنگ" کے کورسز میں اس طرح کی کتابوں میں اساتذہ سے متعلق درج نکات پر بحث و تمحیص کرائیں۔ خاص طور پر ان سوالات سے متعلق مباحث پر گفتگو ہونی چاہئے کہ نظریاتی تناظر میں نامور مسلمان اساتذہ کی تدریسی حکمت کیا تھی اور انہوں نے فریضہ معلمی کو کیوں اختیار کیا؟ اور کیسے نبھایا؟

تجربہ کار اساتذہ کی تدریسی مہارتوں کا مطالعہ

بعض ماہرین تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ نے اپنے مشاہدات' تجربات' اور تاثرات کی روشنی میں موثر تدریس کے لیے ضروری مہارتوں کی فہرستیں تیار کی ہیں۔ ان فہرستوں کے حوالے سے ہر استاد اپنی اور دیگر اساتذہ کی تدریس کو پرکھ سکتا ہے۔ اس ضمن میں ریٹنگ سکیل (Rating Scale) بھی بنائے جاتے ہیں۔ اساتذہ ان سکیلز کی مدد سے بھی معیار تدریس کی جانچ پرکھ کرسکتے ہیں۔ عام طور پر یہ سکیلز چار پہلوؤں سے مرتب کیے جاتے ہیں۔

(الف) استاد کی ذاتی شخصی خصوصیات۔

(ب) لوازمہ نصاب کی ترتیب' تدریسی طریق کار اور اسلوب۔

(ج) استاد کا اپنا فلسفہ حیات اور زندگی کے اساسی سوالات سے متعلق نقطہ نظر۔

(د) استاد کا دوسروں کی ذات سے متعلق زاویہ نگاہ۔

حقیقت میں آج کے استاد کو طالب علم کی ہمہ جہت نشوونما سے متعلق بڑی بھرپور تعلیم کی ضرورت ہے۔ چنانچہ موثر تدریس کے لئے صرف رسمی میتھڈز کے کورسز اور درج بالا حوالوں سے مطالعہ ہی کافی نہیں بلکہ تربیت کے چند اور انداز بھی ایسے ہیں جن کی مدد سے موثر ابلاغ اور قائدانہ صلاحیت کی تربیت بہتر ہو سکتی ہے۔

تربیت ابلاغ

[illegible] اساتذہ کا انداز گفتگو خوشگوار ہوتا ہے وہ کمرہ جماعت میں

بھی بعض پہلوؤں سے بالعموم موثر ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ اکثر اساتذہ کی آواز اور بولنے کا انداز قابل قبول ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی مشق کے ذریعے اس میں مزید اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اگر تربیت اساتذہ کے اداروں میں زبان و بیان سے متعلق کورسز ہوں تو بہت ہی اچھا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر انفرادی طور پر بھی استاد ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ یا بے تکلف احباب کی مجالس میں اپنی آواز اور بولنے کے انداز کو بہتر بنا سکتا ہے۔ مثلاً" آواز کا انداز' لب و لہجہ' تلفظ' رفتار' جملوں کی ادائیگی اور جملوں میں رموز اوقاف کی مناسبت سے اصلاح کی جاسکتی ہے۔ پھر مشق کے ذریعہ مزید یہ چیک کیا جاسکتا ہے کہ کیسٹ سننے کے بعد اسے خود اپنی آواز کیسے لگی؟ کیا آواز بہت اونچی یا نیچی تو نہیں ہے؟ بولنے کے انداز اور لہجے میں یکسانیت تو نہیں۔ کیا یہ ایک ہی طرح کا انداز اکتا دینے والا تو نہیں؟ کیا الفاظ کی ادائیگی میں کوئی اضطراب اور گھبراہٹ تو نہیں؟ کیا بلا وجہ الفاظ کی تکرار یا غیر ضروری وقفہ تو نہیں؟ کیا بولنے کی رفتار بہت تیز ہے یا آہستہ؟ بولنے میں کوئی جھجک تو نہیں؟ کیا موضوع کی مناسبت سے آواز کا اتار چڑھاؤ ٹھیک ہے؟ کیا بولنے میں گرامر کا خیال رکھا گیا؟ کیا کوئی الفاظ یا جملے تکیہ کلام کے طور پر جا بجا تو نہیں بولے جا رہے؟ ـــــ اسی طرح اگر تربیت اساتذہ کے اداروں میں یا ذاتی حیثیت میں وڈیو کیسٹ کا بندوبست ہو تو جسمانی اشارات اور چہرے کے تاثرات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے اور ان میں اصلاح کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں تربیت اساتذہ کے ادارے مائیکرو ٹیچنگ (Micro-Teaching) کے ذریعے اپنے زیر تربیت طلبہ کو بہتر انداز میں موثر تدریسی مہارتیں سکھا سکتے ہیں۔ ان معلومات کے ذریعے اساتذہ اپنے سٹائل کو خاصا بہتر بناسکتے ہیں۔

غیر رسمی علمی گروپوں میں شرکت

استاد کی زندگی کا بڑا حصہ اپنے رفقائے کار' گھر اور اپنے محلے یا گاؤں میں بسر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک استاد جہاں رسمی تربیتی اداروں میں مل جل کر کام کرنا سیکھتا ہے وہاں غیر رسمی طور پر بھی مختلف سماجی' علمی اور پیشہ ورانہ کاموں میں شریک ہوکر اپنی تربیت کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں علاقے کے سماجی' علمی اور ادبی حلقوں میں شریک ہوکر اپنے معاشرتی روابط کو بھی بہتر بنا سکتا ہے اور علمی مقام کو بھی۔ اسی طرح اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیمیں' بالخصوص وہ تنظیمیں جن کو اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ' تعلیمی تحقیق اور تعلیمی مسائل کے حل سے دلچسپی ہو' ان میں فعال شرکت' اساتذہ کی صحت مند نشوونما میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پھر معاشرتی نقطہ نظر سے بھی ان کی یہ شرکت [illegible]

کریں گے بلکہ ان میں اپنے رفقائے کار کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

قائدانہ صلاحیتوں کی نشوونما سے متعلق تربیت

استاد کو کسی نہ کسی طور' تقریباً" ہر روز طلبہ کے مسائل سے متعلق کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ ان فیصلوں کا طلبہ' ان کے والدین اور خود ادارہ کی پالیسی پر اثر پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں تربیت اساتذہ کے اداروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے "ایجوکیشنل ایڈمنسٹریشن" کے ایریا میں "لیڈر شپ ٹریننگ کورس" کرائیں۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ دیگر عام کورسز میں بھی طلبہ کو مختلف منصوبوں (Projects) اور ہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے ایسے کام تفویض کئے جائیں جن سے ان میں قیادت کی صلاحیت پروان چڑھے اور انہیں فیصلہ سازی کے ضمن میں مہارت حاصل ہو تاکہ وہ درج ذیل حوالوں سے یہ پرکھ سکیں کہ وہ کس حد تک تعلیمی قیادت کے لئے موزوں ہیں۔

- نظریاتی شعور
- قیادت کے اسالیب
- علمی اور پیشہ ورانہ فضیلت
- مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق
- صحت و تندرستی
- جذباتی استحکام
- مثبت شخصی رویے
- معاشرتی خدمت اور انسانی فلاح کا جذبہ

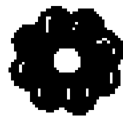
ان نکات کے حوالے سے اگر تربیت اساتذہ کے ادارے اپنے سٹوڈنٹ ٹیچرز کی مطلوب تربیت نہ کرپائیں تو دوران ملازمت' اساتذہ یہ کام اپنے ذاتی مطالعہ' ریفریشر کورسز' اساتذہ کی فعال پیشہ ورانہ تنظیموں اور دیگر سماجی کاموں میں حصہ لے کر کسی حد تک از خود کر سکتے ہیں۔

وقت کی مناسب منصوبہ بندی سے متعلق تربیت

اللہ تعالٰی نے انسان کو جو زندگی دی ہے اس کا بہترین استعمال ہی عبادت ہے۔ چنانچہ اس کا ہر لمحہ قیمتی ہے جسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ خاص طور پر استاد کی دنیا بڑی منفرد اور ممتاز ہوتی ہے۔ وہ عام دنیا سے الگ تھلگ تو نہیں لیکن پھر بھی نئی نسل کی تربیت کے حوالے سے وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی مسئول ہے۔ اس حوالے سے اس کی جہاں اور بے شمار ذمہ داریاں ہیں وہاں اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے وقت کی بہتر تنظیم اور منصوبہ بندی (Time-Management) کرے۔ اس میں باقاعدہ ٹریننگ حاصل

کرے۔ اپنے آپ کو ایک شیڈول (Schedule) کا پابند بنائے۔ چنانچہ کمرہ جماعت کے حوالے سے اپنے تدریسی یونٹ کو باقاعدہ وقت کی مناسبت سے ہر روز تیار کرے۔ یہ کام صرف سٹوڈنٹ ٹیچنگ کے روایتی "ماڈل اسباق" کے دوران ہی مختص نہیں ہے' بلکہ یہ اس کی زندگی کا حصہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح کمرہ جماعت کے باہر کے پروگراموں' ہم نصابی سرگرمیوں' غرض تمام امور میں وقت کے بہترین اور موثر استعمال کا سلیقہ سیکھنا چاہیے۔ مثلاً" اگر استاد نے اپنے طالب علم کو علمی امور سے متعلق وقت دے رکھا ہے اور طالب علم بار بار جاتا ہے لیکن استاد کو وہاں نہیں پاتا تو طالب علم یقیناً منفی اثر لے گا۔ حقیقت میں استاد کو ہر روز اپنی ڈائری مرتب کرنی چاہیے کیونکہ مصروفیت کے اس ہجوم میں اب صرف یادداشتوں سے کام نہیں چلتا۔ بحیثیت مجموعی وقت کی مناسب تنظیم اور منصوبہ بندی کی عادت خود استاد کی مجموعی شخصیت کو نکھارے گی اور طالب علم بھی استاد کی "پابندی وقت" کی قدر کریں گے اور نتیجے کے طور پر طلبہ میں بھی مثبت تبدیلی آئے گی۔

(سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 3' شمارہ 3' اکتوبر 1991ء)



موثر اور کامیاب تدریس

(چند رکاوٹیں اور ان کا حل)

"جائے استاد خالی است" ایک پرانی فارسی کہاوت ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ استاد کا مقام مسلمہ ہے اور اس کا کوئی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ جدید دور میں لاتعداد سمعی و بصری اعانات اور میکانکی آلات کی ایجادات نے تعلیم و تدریس کے عمل کو ایک سائنس بنا دیا ہے اور اس میں بظاہر استاد کسی حد تک "نفی" ہو کر رہ گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی استاد' عمل تدریس کا مرکز و محور ہے اور اس کے وجود کا کوئی نعم البدل دریافت نہیں کیا جاسکا۔

مشرق میں تدریس کا عمل خصوصی مزاج کا حامل ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کے ہاں تعلیم و تعلم کے تمام تر سلسلوں کا مرکزی نکتہ استاد ہے اور یہ بات اسلامی نظام تعلیم کا خاصا بن چکی ہے کہ استاد کے بغیر ہم کسی حرف تدریس کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔ جدید عہد کی ایجادات کے باوصف یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آنے والے عہد میں بھی سالہا سال تک کوئی شے استاد کے منصب کو چیلنج نہیں کرسکے گی۔

ایک خیال یہ ہے کہ شاید ابتدائی جماعتوں میں استاد کا کردار (Role) زیادہ اہم ہوتا ہے اور جوں جوں طلباء بالائی جماعتوں کی طرف بڑھتے ہیں' اس کے "استاد مرکز" کردار میں کمی ہوتی چلی جاتی ہے اور بالآخر جامعات کی سطح پر استاد کا وظیفہ محض مخصوص مسائل کے ضمن میں اہم نکات کی توضیح و تشریح رہ جاتا ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے' کیونکہ ذہنی و فکری بلوغت کے باوصف' جامعات کے طلباء و طالبات بھی بڑی حد تک استاد کے انداز تدریس' اس کی شخصیت اور اس کے تبحر علمی کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس کی ایک قابل فہم وجہ یہ ہے کہ جہاں طالبان علم کا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے وہاں جامعات کی سطح پر حاصل کئے جانے والے علوم بھی دقیق اور وسیع ہوتے ہیں جن کے لئے استاد کا وجود لازم ٹھہرتا ہے۔ البتہ یہ پہلو نہایت اہم ہے کہ جامعات کے استاد سے وابستہ توقعات چونکہ ذرا مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں اس لئے ان توقعات کی مناسبت سے اسلوب تدریس میں بھی بڑا تنوع ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو چاہے ابتدائی تعلیمی درجہ ہو یا اعلیٰ تعلیمی درجہ' طالب علم کی جامع نشوونما کے لئے معلم کی اپنی جامع نشوونما بڑی اہم ہے۔ اس تناظر میں مطلوب صحت مند مسلمان معلم وہ ہو گا جو زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نقطہ نظر رکھتا ہو اور جو علم کو حسن و خوبی سے منتقل کر سکتا ہو۔ اس ضمن میں مروجہ جدید تدریسی ٹیکنالوجی میں تعلیم و تربیت بلاشبہ بڑی اہمیت کی حامل ہے لیکن ہر سطح کے استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل تعلیم کے ہر عنصر کی تعبیر و توضیح اسلامی زاویہ نگاہ سے کرے اور وہ ان رکاوٹوں سے بھی اپنے آپ کو بچائے' جو اس کی موثر تدریس کے راستہ میں ایک دیوار بن سکتی ہیں۔

ذیل میں ان چند اہم رکاوٹوں کی نشاندہی کی جاتی ہے جو استاد کی موثر' جامع اور تحرک انگیز تدریس کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرتی ہیں۔ ایک اچھے استاد کو ان رکاوٹوں اور انہیں دور کرنے کے لئے مناسب حکمت عملی کا ادراک ہونا چاہئے۔

فکری تربیت کی کمی

اسلامی نقطہ نظر سے کامیاب تدریس کی پہلی اور اہم رکاوٹ' استاد کی فکری تربیت کی کمی ہے۔ کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ فکری تضادات رکھنے والا استاد طلبہ کی صحیح تربیت ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں پہلے تو یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ تعلیم درحقیقت "دماغ" سے زیادہ "دل" کا معاملہ ہے۔ مقصد اعلیٰ سے محبت اور دل آگاہ کے بغیر طالب علم کی نہ فکری و تخلیقی قوتیں نشوونما پاسکتی ہیں اور نہ اعتقادی و روحانی صلاحیتیں پروان چڑھ سکتی ہیں۔ جامع نشوونما' الگ الگ خانوں میں نہیں' بلکہ پوری انسانی تہذیب کے تناظر میں ہوتی ہے۔ آج مادی افراتفری کے اس دور میں تربیت کا اساسی معاشرتی ادارہ یعنی "گھر" جو کسی دور میں بڑا مستحکم تھا' اب اس کی محفوظ دیواریں بھی بڑی تیزی سے منہدم ہو رہی ہیں۔ چنانچہ "بغیر دیواروں کے ان گھروں" کے اندر' دور حاضر کا ذریعہ ابلاغ بڑے موثر انداز میں والدین اور بچوں کو میٹھی گولیاں (Lollipop) دے کے بہلائے رکھتا ہے' اور یوں بڑے "بھولپن" میں والدین اور بچے سب کے سب کسی نہ کسی صورت' فکری انتشار کا شکار ہو رہے ہیں ــــــ اصل میں بچے کی کردار سازی کی آئیڈیل درسگاہ جہاں اسے فطری اور پرخلوص محبت ملتی ہے وہ تو اس کا گھر ہی ہے اور بدقسمتی سے اگر ایسا ماحول نہیں ہے تو پھر سکول کو ویسا ہی یا اس کے قریب تر ماحول فراہم کرنا ہوگا کیونکہ سیکھنے کے عمل میں بچے کو اگر فطری مسرت و انبساط کی کیفیت نہیں مل رہی' تو تعلیم کا اصل مقصد ختم ہو جائے گا۔

حقیقت میں تعلیم کا کام' مقصد حیات سے متعلق رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ اس لئے

رہنمائی فراہم کرنے والے افراد کے لئے علمی اور فنی تربیت سے بڑھ کر نظریاتی اور اخلاقی تربیت ضروری ہے۔ اس لئے مسئلہ صرف طلبہ کی تشکیل سیرت ہی کا نہیں، بڑوں کی تشکیل سیرت کا بھی ہے اور ان بڑوں میں خصوصیت سے اساتذہ کی اسلامی نظریہ حیات کی روشنی میں فکری تربیت انتہائی اہم ہے۔ لیکن استاد بھی تو بہرحال اسی معاشرہ کا حصہ ہے اور پھر بدقسمتی سے سکول کا سارا نظام جس کے تحت خود آج کے استاد نے اپنے زمانہ طالب علمی میں تربیت پائی تھی، وہاں کی اکثر نصابی سرگرمیاں بالکل الٹی ترتیب سے چلائی جا رہی ہیں۔ بچوں کے لئے پڑھنا، لکھنا، حساب کتاب، بلاشبہ ضروری ہے، لیکن ابتدائی پانچ چھ سال کی عمر میں اس سے کہیں زیادہ، ان اسلامی اخلاقی عادات و اطوار کے حوالے سے تربیت ضروری ہے جو مستقبل میں طلبہ کی اصل اساسی اور مستقل قوت بنی ہوتی ہے۔ بالخصوص تعلیمی عمل کے سارے عناصر میں جب تک مادی پہلو کے مقابلے میں اخلاقی پہلو کو فوقیت (Dominance) حاصل نہیں ہوگی، اس وقت تک انسان مطلوب کا خواب پورا نہیں ہو گا۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے تربیت اساتذہ کے اداروں میں، زیر تربیت معلمین کو زیادہ تر صرف ان تکنیکی طریقہ ہائے تدریس کی تربیت دی جاتی ہے، جن کی مدد سے وہ آئندہ اپنی ملازمت کے دوران بہتر میکانکی استاد ثابت ہوں۔ لیکن ان طریقوں سے بچوں کے دماغ میں مغرب کے "معاشرتی جانور" کے تقاضوں کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ معلومات تو انڈیلنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اسلام کے "خلیفتہ اللہ" کے تقاضوں کی روشنی میں بچوں کے دل کی دنیا سے متعلق کوئی فکر نہیں کی جاتی یا اگر کبھی سوچا بھی جاتا ہے تو بس اتنا کہ نصاب کے وسیع و عریض دائرہ میں ایک "نقطہ" مذہب کو بھی الاٹ کر دیا جائے۔ یعنی اسلام کو بحیثیت دین اور ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک جامد اور باقی نصابی دائرہ سے کٹا ہوا الگ تھلگ، اسلامیات کے ایک مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب کر لیا جائے۔ یوں طلبہ کی شخصیت ابتدا سے ہی فکری لادینیت (Intellectual Secularism) کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لادینیت کی ایک اہم وجہ، خود استاد کی اپنی فکری تربیت کی کمی ہے کیونکہ اسلامی زاویہ نظر سے اتنا کافی نہیں کہ استاد کو بس نفس مضمون پر عبور ہو، اور وہ طریقہ تدریس سے شناسا ہو، اسے تو سب سے پہلے فکری اور عملی ہر لحاظ سے پختہ مسلمان بننا ہو گا۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک تو ابتدائی سطح سے لے کر اعلیٰ سطح تک کے نصابات کی تشکیل و تنفیذ میں ترجیحات کو بدلا جائے اور اس میں محوری حیثیت حقیقی معنوں میں اسلام کو دی جائے۔ دوسرے خاص طور پر اساتذہ کے تربیتی نظام کو، [illegible] طلبہ کے پورے ماحول کو مثبت اور تعمیری رخ پر ڈھالا جائے۔ ان

اداروں کے نصاب، داخلے کے معیارات، اساتذہ کا انتخاب، طریق امتحان، غرض ان اداروں کے پورے علمی اور انتظامی مزاج میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں، پنجاب یونیورسٹی کے ادارہ تعلیم و تحقیق، لاہور نے ایک اہم پیش رفت کی ہے۔ ادارہ نے اپنے مختلف پروگراموں میں اسلامک کلچر، آئیڈیالوجی آف پاکستان، اور اسلامک سسٹم آف ایجوکیشن کو لازمی کورسز کی حیثیت دی ہے اور اعلیٰ سطح پر اساتذہ کی تربیت کے لئے ایم۔اے اسلامک ایجوکیشن کی دو سالہ ڈگری کا اجراء کیا ہے۔ جس کے نصاب میں علوم کی اسلامی تشکیل سے متعلق مختلف کورسز اور دیگر ضروری علمی، دعوتی اور پیشہ ورانہ مباحث کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہرچند کہ جامعہ کے مخلوط، بالعموم سیکولر اور کسی حد تک "بیمار" علمی ماحول کی وجہ سے شاید مطلوب نتائج تو سامنے نہ آئیں لیکن پھر بھی یہ کوشش اپنی جگہ قابل تعریف ضرور ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے کسی جامعہ نے تو اس ڈگری کی ابتدا کی۔

یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم سے متعلق اردو زبان میں انتہائی وقیع لٹریچر موجود ہے۔ لہٰذا دین اسلام اور پھر اس حوالے سے نظام تعلیم کو سمجھنے کے لئے ضروری اور بنیادی لٹریچر کی کمی نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اساتذہ اپنے ادارے کی لائبریروں میں اچھے لٹریچر کا اضافہ کریں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مطالعاتی مراکز (Study Circles) بنائیں، ان کی اپنی ذاتی لائبریری ہو، اور اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے قائم اساتذہ کی تنظیموں میں سرگرمی سے شریک ہوں۔ اس طرح علمی اور پیشہ ورانہ نقطہ نظر سے نظری و عملی تربیت، مشنری جذبہ، اور بحیثیت مجموعی عفت فکر۔۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں مل کر استاد کی تاثیر اور کامیابی میں ضرور معاون ثابت ہوں گی۔ کیونکہ صالح فکر و عمل کے بغیر استاد، طالب علم کی جامع اور کلی نشوونما کی راہ میں خود ایک بڑی رکاوٹ بن جائے گا۔ چاہے وہ اعلیٰ ترین ڈگری کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔

پیشہ تدریس سے نفرت

کامیاب تدریس کے راستے کی ایک اور رکاوٹ استاد کی پیشہ تدریس سے نفرت ہے۔ کیونکہ بعض اساتذہ کسی نہ کسی طرح پیشہ تدریس میں آ تو جاتے ہیں، لیکن دل سے وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ نتیجے کے طور پر ایسے اساتذہ کی تدریس میں بے دلی اور بے لطفی پائی جاتی ہے۔ ان کے اکثر تدریسی لمحات افراتفری، الجھن، پراگندگی اور ابتری کا شکار ہوتے ہیں۔ پیشہ تدریس سے نفرت کرنے والا استاد اپنے پورے وجود [illegible]

تدریس سے نفرت ہے اور وہ اس تعلیمی عمل سے بے زار ہے۔ اس طرح کے تدریسی عمل میں طالب علم کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہوتا کہ استاد کیا پڑھا رہا ہے؟ اس لمحہ کہاں اور دوسرے لمحے کہاں؟ کبھی کوئی رٹا رٹایا علمی نکتہ' کبھی اپنی ملازمت کے شکوے' کبھی اپنی "محرومی" کا رونا' کبھی کسی رفیق کار کی "خوش قسمتی" پر کڑھنا' کبھی کوئی سیاسی تقریر' کبھی اپنے ساتھی اساتذہ کی باتیں' کبھی زمانے سے اور کبھی طلبہ سے شکائتیں۔۔۔۔ یہ سب باتیں طلبہ کی الجھن میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ چنانچہ ان کے لئے کلاس میں وقت گزاری ایک مشکل امر بن جاتا ہے۔ اس طرح علم اور تدریسی دلچسپی سے محروم کلاسوں میں طلبہ بالعموم غصے' مایوسی' نفرت اور بیزاری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس نفرت سے بچنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اساتذہ کے تربیتی نصاب کو اسلامی تناظر میں از سر نو مرتب کیا جائے۔ ان کی نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کو بہتر بنایا جائے۔ دوسرے' اساتذہ کے معاشرتی اور معاشی مقام کو دوسرے تمام پیشوں کے مقابلے میں بلند تر کیا جائے۔ تیسرے "علم التعلیم" میں داخلہ لینے والوں کی جہاں علمی قابلیت دیکھی جائے' وہاں ان کے تدریسی ذوق و شوق کو بھی پرکھا جائے۔ چوتھے' دوران ملازمت اساتذہ کو تمام ضروری سہولتیں' ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی فراہم کئے جائیں تاکہ یہ پیشہ ذہین' محنتی' ذمہ دار اور اہل افراد کے لئے باعث کشش ہو۔ ان تدابیر سے بہت حد تک ممکن ہے کہ اس پیشے میں آنے والا شخص' ایک ذمہ دار اور فریضہ تدریس سے محبت رکھنے والا معلم ثابت ہو۔

خود اعتمادی کا فقدان

بعض اساتذہ' تعلیمی عمل میں اپنی اساسی قوت (Power base) اپنی علمی اور پیشہ ورانہ مہارت کو نہیں سمجھتے بلکہ اس کے برعکس اپنی قوت کا سرچشمہ مختلف نوع کی لابیوں (Lobbies) کو قرار دیتے ہیں۔ جو ان کے کیریئر پر کسی نہ کسی طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کی پوری شخصیت میں علمی حوالے سے خود اعتمادی کا عنصر غائب ہو جاتا ہے اور یوں ان کی زندگی "بیساکھیوں" کے سہارے بسر ہوتی ہے۔ حقیقت میں آج' کامیاب تدریس کی راہ میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ استاد خواہ مخواہ اپنی علمی نخوت میں مبتلا ہو کر ہر کسی سے لڑتا جھگڑتا رہے بلکہ وہ ان لابیوں میں شامل طلبہ' اساتذہ' والدین' سیاست دانوں' منتظمین اور دیگر ٹریڈ یونین تنظیموں سے متعلق افراد کی جائز [illegible] اخلاقی اقدار کی روشنی میں اخلاص و انکسار پر مبنی رویہ بھی اختیار

کرے اور اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے پیشہ تدریس سے متعلق تنظیموں میں تعمیری شرکت بھی کرے' لیکن اسے بہر حال اس اساسی نکتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اصل اور نتیجہ خیز لابی' اس کی صلاحیت' محنت' مشقت' دیانت' اس کا علمی ذوق و شوق' اس کا حسن سلوک اور اپنے ادارہ سے وفاداری ہے ـــــ اگر یہ چیزیں نہیں تو علمی حوالے سے اس میں اعتماد کا فقدان ہوگا۔ پھر ان "مخصوص لابیوں" کے سہارے چلنے والا استاد' نہ طلبہ میں عزو وقار حاصل کرتا ہے اور نہ اپنے رفقائے کار میں۔ یہ صورت حال موثر اور کامیاب تدریس میں یقیناً ایک اہم ترین رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ مروجہ ٹریڈ یونین ازم کی یہ بات درست نہیں کہ ایک مرتبہ پیشہ معلمی میں آنے والا شخص' بعد میں خواہ معیار سے گر جائے یا کام چور ہو جائے' ملازمت اس کا حق ہے۔ اس کے برعکس ایک اچھے استاد کو مسلسل معیار اور اہلیت کا حامل ہونا چاہئے۔ اگر ایسا ہے تو اس کے بعد اسے نہ کسی لابی کی ضرورت رہتی ہے نہ خوشامد کی۔ حقیقت میں' استاد کی اصل قوت جو اسے کامل اعتماد فراہم کرے گی وہ اس کا علم' اس علم کو منتقل کرنے کا سلیقہ' اور اس کا مجموعی اخلاق و کردار ہے۔ اسی قوت سے وہ معاشرہ میں اپنا مقام اور مرتبہ بنا سکتا ہے۔

تشکیک' تحکم اور استہزاء کا اسلوب

کامیاب تدریس میں ایک اور اہم رکاوٹ استاد کی تنگ مزاجی' چڑچڑاپن' خود سری' خشک مزاجی' یاس' تشکیک' تحکم اور استہزاء کا اسلوب ہے ـــــ یہ سب پہلو اس کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ عام طور پر اس رویے کے حامل استاد کو آہستہ آہستہ نہ تو اپنے اوپر اعتماد رہتا ہے' نہ رفقائے کار پر اور نہ ہی اپنے طلبہ پر۔ ہر ایک کو شک سے دیکھتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ بالآخر ایک سطحی سی شخصیت بن جاتا ہے۔ صداقت' ایثار' قربانی' احترام یہ سب صفات اس کے نزدیک بے معنی ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس طرح کی "مایوس" اور "شاکی" شخصیت کا ایک اور خاصا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے رفقائے کار کی محنت و ریاضت میں بھی کیڑے نکالتا ہے' ان کے ذوق و شوق کا مذاق اڑاتا ہے۔ نئے آنے والے معلمین (New Entrants) میں مایوسی پھیلاتا ہے کہ ٹھیک ہے' نئی نئی سروس ہے' نئی نئی ڈگری ہے۔ ایک دو دن کام کرے گا تو خود "ٹھیک" ہو جائے گا۔ پھر خود "ٹھیک" نہیں ہوگا' تو اسے مایوس کرنے کے لئے اپنے چند "مخصوص طلبہ" (Elite) کا سہارا لیا جاتا ہے' جو اپنی "حرکات و سکنات" سے محنتی استاد کو بددل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے ـــــ پھر یہ مایوس اور [illegible]

نہیں بلکہ اپنے بعض طلبہ کی بھی چن چن کر خامیاں تلاش کرتا ہے۔ انہیں سٹاف رومز اور کمرہ جات میں برسرعام زیر بحث لاتا ہے' ان کا مذاق اڑاتا ہے اور اس طرح ان کی انا (Ego) مجروح کرتا ہے۔ حتیٰ کہ استاد کی یہ "بیماری" جب اپنے عروج پر ہوتی ہے تو اسے اپنے آپ پر بھی کوئی اعتماد نہیں رہتا' بلکہ ہر بات میں وہ تشکیک اور غیر یقینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح یقین اور اعتماد کی دولت سے محروم استاد' درحقیقت کامیاب تدریس سے کوسوں دور ہو جاتا ہے۔۔۔۔ اب ایک نوجوان استاد جب اپنی اعلیٰ سند کے ساتھ پیشہ معلمی اختیار کرتا ہے تو وہ اس پیشہ کے بارے میں بلاشبہ بڑی اعلیٰ توقعات رکھتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی مایوس' بے زار اور غیر فعال استاد کی رفاقت میں تشکیک' یاس' تنگ مزاجی اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے بے زاری کا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس رجحان سے بچنے کا ایک اہم اور نتیجہ خیز مثبت راستہ تو یہی ہے کہ استاد کا جہاں حلقہ احباب اچھا ہو' جہاں وہ تعمیری اور مثبت اقدار کا امین ہو' وہاں اس کا اپنا علمی اور پیشہ ورانہ مطالعہ' اس میں ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس اور ضابطہ اخلاق کی پابندی کا جذبہ موجود ہو۔ حقیقت میں اسے کسی صورت اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ اگر وہ داعیانہ مزاج رکھتا ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں انسانی نفسیات کو سمجھتا ہے' تو وہ نہ خود یاسیت کا شکار ہوگا' اور نہ دوسروں کو شکار ہونے دے گا بلکہ اسلامی اسلوب دعوت کی حکمت کو سمجھتے ہوئے اپنے "بیمار" ساتھی کو بھی دھیرے دھیرے ایک "صحت مند" شخص بنا دے گا۔ اخلاقی اور روحانی عوارض سے بچنے اور جمود سے نکل کر تحرک کی طرف منتقل ہونے کے لئے سوائے اسلامی تعلیمات کے اور کوئی علاج نہیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کا مطالعہ اور دعوت و تبلیغ کے حوالے سے تربیتی پروگرام' ایک متوازن شخصیت کی تشکیل میں لازماً" مددگار ثابت ہوگا۔

محدود اور سطحی علم

عصر حاضر میں علمی دنیا میں یہ رجحان پروان چڑھ رہا ہے کہ علم کے کسی ایک شعبے کی جزئیات' پھر ان میں سے بھی کسی ایک جزو پر تخصص (Specialization) کی سند حاصل کی جائے اور اس جزوی علم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانا جائے۔ سائنسی نقطہ نظر سے اس جزوی مطالعہ کا اپنا ایک فائدہ ضرور ہے لیکن عمرانی علوم کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ انسانی زندگی اور اقدار حیات کلیت (Totality) اور جامعیت کا تقاضا کرتی ہیں۔ خاص طور پر "علم التعلیم" کا تعلق تو براہ

راست اقدار حیات سے ہے۔ علم کو بہت ہی محدود کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کئی اور اہم متعلق چیزیں درخور اعتنا نہیں سمجھی جاتیں۔ پھر علم النفسیات میں اس فلسفہ کرداریت (Behaviourism) نے کہ "انسان کا کردار جوابی حرکت کے عمل پر مبنی ہے' لہٰذا ہر انسان کے کردار کا تجزیہ نفسیاتی طور پر کیا جاسکتا ہے اور اس کے عمل کے متعلق پیشین گوئی کی جاسکتی ہے" (انگریزی اردو ڈکشنری' فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور) تربیت اساتذہ کے ماڈل پر یہ اثر ڈالا ہے کہ کرداری مقاصد (Behavioural Objectives) کے "سلوگن" تلے علم چھوٹے چھوٹے خانوں یعنی ماڈیولز (Modules)' تدریسی یونٹس (Instructional Units) اور مختلف النوع کورسز (Courses) میں تقسیم کر دیا گیا۔ یوں جامعیت اور کلیت کے حوالے سے "العلم" سے رشتہ بہت حد تک منقطع ہوگیا۔

اس طرح جدید علم کا ایک انداز یہ سامنے آیا ہے کہ علم کی بہت سی شاخیں بن گئیں اور پھر ہر شاخ کا ہر پتہ ایک الگ مضمون بنتا چلا گیا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ عملاً یہ ضرورت بھی سامنے آئی کہ کوئی مضمون علیحدہ نہ رہے بلکہ کسی مسئلہ کی تفہیم کے لئے بین المضامین زاویہ نگاہ کی نشوونما ضروری سمجھی گئی کیونکہ اس کے بغیر مطالعہ ناقص' ادھورا اور یک رخا ٹھہرایا گیا۔ بلاشبہ مستقبل میں انڈسٹریل' بزنس' ٹیکنالوجی' کمپیوٹر' اور میڈیکل سائنس کے حوالے سے اس طرح کی سپشلائزیشن کی اہمیت اور بڑھ جائے گی لیکن معاشرتی حوالے سے بہر حال کچھ مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ آج استاد اور طلبہ دونوں یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارا علم بہت محدود ہے۔ ہم اپنی تاریخ' ادب' زبان' ثقافت اور اپنے علوم سے بے خبر ہیں۔ ہم اپنے اس محدود علم کی بنا پر کچھ "بے تعلق" سے استاد ہیں۔ ہمیں کوئی علم نہیں کہ دنیا میں کہاں کہاں مختلف اسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں اور کس کس انداز سے ان کی مزاحمت ہو رہی ہے۔ چنانچہ آج کا طالب علم جب کمرہ جماعت میں اچانک سنٹرل ایشیاء کی کسی ریاست یا امریکیوں کے نئے ورلڈ آرڈر کی خواہشات یا مغرب کی ثقافتی استعماریت' یا افغانستان اور کشمیر کے جہاد میں مصروف تحریکوں کے بارے میں پوچھتا ہے تو استاد کی بے خبری' اسے غیر موثر بنا دیتی ہے۔ چاہے میکانکی نقطہ نظر سے اس سوال کا متعین مضمون سے کوئی تعلق نہ بھی ہو۔ جناب مشتاق احمد گورایا نے اپنے ایک مقالہ میں استاد کے اس محدود مطالعہ سے متعلق بڑا خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہماری قومی تعلیم کا یہی المیہ ہے کہ علوم و فنون سے ہمارا سرسری سا متعارف" تو ہو جاتا ہے مگر ان سے [illegible]
تعلق عارضی اور [illegible]

پر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا مطالعہ محدود اور ناقص رہتا ہے اور ہم میں علمی آراء سے اختلاف کرنے کی ہمت پیدا نہیں ہوتی۔ جواب دینا تو کجا ہمارا کسی علمی بات پر سوال اٹھانا ہی ہمارے لئے ایک سوال بن جاتا ہے" (مجلّہ تعلیم و تحقیق' 1966' ص 35)۔

تعلیم و تعلم کی دنیا میں دیکھا جائے تو آج علم التعلیم (Education) کے ڈسپلن میں کئی شاخیں ہیں اور ہر ایک شاخ میں مزید شاخیں' جن میں سپشلائزیشن کے حوالے سے اعلیٰ سطح پر ایم اے' ایم۔ ایڈ' ایم ایس ایڈ' ایم بی ای' ایم ٹی ای' ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے "ایجوکیشن" کو سائنس بنا کر جزیات کا مطالعہ تو ضرور کیا' لیکن اس پہلو سے بے خبر ہوتے چلے گئے کہ "ایجوکیشن" کا تعلق پوری زندگی سے ہے اور زندگی بنتی ہے چند دائمی اساسی سوالات کے جوابات سے۔ اس لئے چاہے کوئی سی بھی سپشلائزیشن ہو' کتنا ہی جدید نصاب کیوں نہ ہو' فن تعلیم کے طالب علم کو لازماً" دینی علم' ادب اور تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا محدود علم اسے کلاس میں بے وقعت بنا کر چھوڑے گا۔۔۔۔ میں مستقبل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی تو نہیں کر رہا' لیکن ایک بات واضح ہے کہ اگر اساتذہ کی تربیت کے موجود نصابی روش میں میکانکی اور مشینی کورسز کا غلبہ ضرورت سے زیادہ جاری رہا' تو مستقبل کا استاد تہذیبی لحاظ سے فی الواقع بڑا "بدقسمت" ہوگا۔ جسے یہ بھی خبر نہ ہوگی کہ رومی' سعدی' حالی' اسماعیل میرٹھی' اکبر الہ آبادی' اقبال' شبلی کون تھے؟ ان کا اصل کارنامہ کیا تھا؟ حقیقت میں برصغیر کا مسلمان استاد اگر عربی' فارسی اور اردو ادب توڑ پھر خود اپنی تاریخ سے بے گانہ ہوگا تو وہ طلبہ کی جامع تربیت ہرگز نہیں کر پائے گا۔ پھر ہم پر غیر ملکی ماہرین تعلیم کی وساطت سے ایک اور قیامت یہ ڈھائی گئی کہ ہمیں تاریخ جغرافیہ سے لاتعلق کیا گیا اور اس کی جگہ چند میکانکی اقدار پر مبنی "اچھا شہری" تیار کرنے کے لئے "سوشل اسٹڈیز" (Social Studies) کا مضمون رائج کیا گیا جس نے اخلاقی نقطہ نظر (Moralistic view) کی جگہ مادی نقطہ نظر (Materialistic view) کو اہمیت دی۔ اس طرح بالآخر جو معلم تیار ہوا' وہ بہت حد تک یک رخا اور ادھورا تھا۔ کیونکہ علم کا اصل مقصود تو بہرحال اخلاقی وجود کی تیاری ہی ہے۔ استاد بے شک مختلف موضوعات میں سپشلائزیشن کرے' لیکن بحیثیت مجموعی اسے کلیت بیں ہونا پڑے گا۔ اس مقصد کے لئے درج ذیل نکات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان نکات کے حوالے سے [illegible] معلومات میں اضافہ ہوگا' وہاں وہ معاشرتی مسائل سے بھی باخبر ہوگا [illegible] سکے گا"

الف - اپنے مضمون اور سپیشل ایریا سے باہر دیگر مضامین بالخصوص دین اسلام' فلسفہ' تاریخ اور زبان و ادب کا مطالعہ۔

ب - اپنے مضمون اور اپنے کلاؤر سے متعلق اساتذہ کے ساتھ ساتھ دیگر مضامین اور کلاؤرز کے اساتذہ سے بھی معاشرتی اور علمی روابط۔

ج - ایسی علمی' ادبی اور تفریحی تقریبات میں شرکت' جہاں پروگراموں کا انعقاد تہذیبی دائرہ کے اندر ہو۔

د - اساتذہ کی ایسی ملک گیر تنظیم سے تعلق' جو غیر طبقاتی ہو اور جس کا مقصد اول اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ کے لئے جدوجہد کرنا ہو۔

مقاصد تعلیم سے بے خبری

استاد کی کامیابی کا بڑا انحصار اس بات پر بھی ہے کہ اسے مقصد علم کا گہرا شعور حاصل ہو۔ اگر اس کے نزدیک حصول علم کا مقصد محض معاش یا شکم پروری ہے' تو اس سے شاید "معیار زندگی" تو بہتر ہو جائے لیکن "معیار انسانیت" نہ بڑھ پائے گا۔ لیکن مقصد علم اگر رضائے الٰہی کا حصول ہے تو زندگی میں توازن آئے گا۔ ظاہر ہے کہ محض معاش کو مقصد بنانے والا استاد شاید کچھ امتحانی معلومات تو طلبہ تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن "فیضان نظر" والی بات نظروں سے یقیناً اوجھل ہو جائے گی۔ اسی طرح استاد اگر زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے بارے میں ابہام اور الجھن کا شکار ہے اور اسے یہ واضح نہیں کہ قطعیت کے ساتھ اسے کرنا کیا ہے؟ تو وہ طالب علم کی جامع اور صحت مند نشوونما نہیں کر پائے گا۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ علمی اور پیشہ ورانہ حوالے سے کمزور استاد اپنے پیشہ معلمی کے اصل معانی اور اس کی نوعیت سے واقف نہیں ہوتا' بلکہ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ تعلیم کے ملی اور قومی مقاصد کیا ہیں اور وہ جو مضمون پڑھا رہا ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد کی تکمیل کے لئے کون سی نصابی سرگرمیاں ضروری ہیں؟ اور کون سی غیر ضروری؟ اسے تو بس اتنا معلوم ہے کہ ٹائم ٹیبل کے مطابق اسے کس کلاس کو کون سا مضمون پڑھانا ہے۔ روزمرہ کی روٹین کی طرح درسی کتاب کو "اصل نسخہ" سمجھتے ہوئے ایک ہی طریقہ تدریس یعنی "بولو اور بورڈ پر لکھو" (Talk and Chalk) کو دہراتا رہتا ہے اور یوں مقاصد سے بے خبری اسے بے اثر بنا کے چھوڑتی ہے۔

حقیقت میں کامیاب استاد وہ ہے جو اصل مقصد [illegible] حصول رضائے الٰہی کی روشنی میں تعلیم و تدریس کے [illegible]

شعور اور واضح مفہوم رکھتا ہے۔ مقاصد کی بہتر تفہیم اور مقاصد کے حصول کے لئے اساتذہ کے قبل از ملازمت اور دوران ملازمت تربیتی نصاب میں ضروری تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ نیز پاکستان میں خصوصیت سے تین اداروں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد' ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور اور پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد کے تعلیمی لٹریچر کا مطالعہ بھی اساتذہ کو یقیناً ایک واضح نصب العین دے سکتا ہے۔ اس طرح کے لٹریچر کے علاوہ "علم التعلیم" سے متعلق درج ذیل چند معیاری اردو جرائد بھی استاد کی علمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

- ماہنامہ "افکار معلم" تنظیم اساتذہ پاکستان' 27 ایبک پارک' مزنگ' لاہور۔
- ماہنامہ "تعلیمات" انجمن فاضلین' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب لاہور۔
- سہ ماہی "تعلیمی زاویے" اسلام آباد' پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن' 12/8 آصف بلاک' علامہ اقبال ٹاؤن' لاہور۔
- ششماہی "ثانوی تعلیم" بیورو آف ایجوکیشن' حکومت پنجاب' لاہور۔
- ششماہی "تعلیم اسلامی تناظر میں" انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد۔
- سالانہ مجلہ "تعلیم و تحقیق" ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور۔
- سالانہ مجلہ "محور" (تعلیم نمبر) جامعہ پنجاب' لاہور۔
- سہ ماہی مجلہ "العلم" اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ' آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس' ناظم آباد' کراچی۔

فطرت انسانی کی غلط تعبیر

استاد اگر انسانی فطرت کے بارے میں غلط تعبیر کرتا ہے تو یہ اس کی کامیاب اور جامع تدریس کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہوگی۔ دور حاضر کے مغربی تعلیمی فلسفیوں نے جتنا لفظ فطرت (Nature) کا استحصال کیا ہے' اتنا شاید ہی کسی اور لفظ کا کیا ہو۔ اس کی تعبیر بیشتر حیاتیاتی (Biological) حوالے سے کی گئی۔ بندگی رب کے تصور کو خارج کیا گیا۔ ضرورتوں اور دلچسپیوں کی تفسیر حیوانی حوالوں سے کی گئی اور یوں انسان کو محض ایک معاشرتی جانور (Social Animal) سمجھا گیا' اس حیوانیت (Animalism) کے تناظر میں علوم کی تشکیل کی گئی اور اسے ہی ترقی پسندیت (Progressivism) کہا گیا۔ خلیفۃ اللہ کے منصب اور [illegible] کا تصور جب معلم کی آنکھوں سے اوجھل ہوا اور اس کا کام تشکیل اخلاق [illegible] انتقال علم ہی ٹھہرا' تو پھر نصاب تعلیم [illegible]

محدود "فطری ضروریات اور خواہشات" کی تکمیل کے کچھ نہ رہا۔ یوں فطرت انسانی کے متعلق اس انتہائی ناقص اور مسخ شدہ تصور نے خود استاد کی شخصیت کو مسخ کر دیا۔

فطرت کی اس غلط تعبیر کے برعکس، قرآن حکیم انسان سے جس طرز عمل کا تقاضا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس فطرت پر قائم ہو جائے جس پر اللہ نے اسے پیدا کیا ہے۔ یعنی اس دین حنیف کی پیروی کرے، جو انسان کی بنیادی فطری ضرورت ہے۔ آج دنیا میں ہر شعبہ زندگی کے اندر انفرادی اور اجتماعی بگاڑ کی حقیقی وجہ اسی فطری ضرورت کی تکمیل سے اجتناب ہے۔ یہی ضرورت درحقیقت انسان کا اصل بنیادی حق (Basic Human Right) ہے، جس سے انسانوں کو محروم کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ امت مسلمہ کو اپنے نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل میں اسی بدیہی صداقت کو پیش نظر رکھنا ہوگا، ورنہ اس کا نظام اپنے طور پر چاہے کتنا ہی "ماڈرن" ہوتا چلا جائے، اس کا تیار کردہ فرد لازماً" انتشار اور عدم تسویہ کا شکار ہوگا۔۔۔۔ فطرت انسانی کے بارے میں قرآن حکیم کی یہ بڑی واضح ہدایت ہے کہ:

> ترجمہ: "پس (اے نبی ﷺ، اور نبی ﷺ کے پیروؤ) یک سو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جما دو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"
>
> (الروم: 30)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔یعنی تمام انسان اس فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں کہ ان کا کوئی خالق اور کوئی رب اور کوئی معبود اور مطاع حقیقی ایک اللہ کے سوا نہیں ہے۔ اسی فطرت پر تم کو قائم ہوجانا چاہیے۔ اگر خود مختاری کا رویہ اختیار کرو گے تب بھی فطرت کے خلاف چلو گے اور اگر بندگی غیر کا طوق اپنے گلے میں ڈالو گے تب بھی اپنی فطرت کے خلاف کام کرو گے۔۔۔۔۔"

(تفہیم القرآن، جلد سوم، ص 752)۔

اسلام کے اس نقطہ نظر کی روشنی میں استاد کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس کا واسطہ اینٹوں اور پتھروں سے نہیں ہوتا بلکہ زندہ انسانوں سے ہوتا ہے جن کے کچھ احتیاجات ہوتے ہیں۔ چنانچہ استاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا، کائنات، انسان اور پھر ان تینوں کے باہمی تعلق سے متعلق اسلامی تصور کو سمجھے۔ ان اساسی حقائق کے بارے میں اگر اس نے قرآن حکیم اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے حاصل [illegible]

انسانیت' ایثار اور رحمت کے جذبات پروان چڑھیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ان سوالات کی توضیح اگر بے خدا فلسفیوں کے حوالے سے کی گئی تو اس سے فطرت انسانی کا صحیح شعور انسان کو نہ مل سکے گا اور بدقسمتی سے اگر یہ غلط شعور استاد کو منتقل ہو جائے تو اس کی شخصیت' طالب علم کی اخلاقی' روحانی' تہذیبی' ذہنی' جسمانی غرض جامع نشوونما کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن جائے گی۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ تعلیم بے تعلق اور غیر جانب دار (Neutral) نہیں ہے۔ بلکہ اپنے وسیع تہذیبی پس منظر کے ساتھ اپنا مخصوص نقطہ نظر طلبہ کو منتقل کرنے کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ فطرت انسانی کا صحیح شعور اور اس حوالے سے زندگی کا واضح نقطہ نظر اگر ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ سوائے قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کے اور کسی سے نہیں ملے گا۔ استاد علم نفسیات سے متعلق جدید لٹریچر کا ضرور مطالعہ کرے جو اسے انسانی ذہن' اس کے رویوں' اس کی عادات اور اس کی جبلتوں سے متعلق آگاہ کرے۔ لیکن فکری لحاظ سے استاد کو یہ امتیاز پیش نظر رکھنا ہوگا کہ اسلامی نظام فکر' انسان کو "خلیفۃ اللہ" کہتا ہے اور بے خدا نظام فکر انسان کو "حیاتیاتی جانور" کہتا ہے۔ لہٰذا استاد فطرت انسانی سے متعلق غلط تعبیر کرے گا تو اس کی نہ صرف تدریس جامعیت کے حوالے سے انتہائی ناقص ہوگی بلکہ زیر تربیت طالب علم بھی عدم تسویہ (Mal-adjustment) کا شکار ہوگا۔

علمی خود نمائی اور اشتہار پسند طبیعت

بعض اساتذہ خود نمائی کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اپنے صاحب علم اور صاحب معلومات ہونے کا فخریہ طور پر جا و بے جا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ بس ایک "اشتہار پسند" طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ پھر کلاس میں زیادہ وقت اپنا مضمون پڑھانے سے زیادہ اپنی "علمیت" جتانے میں صرف کرتے ہیں۔ ان کا یہ ادعائے فضیلت اور نمود طم' طلبہ کو ذرا نہیں بھاتا۔ اپنے منہ میاں مٹھو والی بات ہوتی ہے۔ لہٰذا استاد کا یہ انداز بعض اوقات علمی کبر میں ڈھل جاتا ہے اور اس طرح یہ کامیاب تدریس میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ حقیقت میں موثر تعلیم کے لئے استاد کو کبر پسند اور اشتہار پسند رویے سے اجتناب کرنا ہوگا۔ اس کے بجائے اخلاص پر مبنی انکسار پسند رویے کا حامل ہوتے ہوئے تعلیم و تعلم کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ استاد بہت کچھ جانتے ہوئے بھی یہ سمجھے کہ علم تو درحقیقت ایک [illegible] ہے۔ اس لئے حصول علم میں اجتناب کبر' اچھے استاد کی ایک بہت بڑی خصوصیت

غیر معمولی اضافہ علم

دور جدید کے تاجرانہ نظریہ تعلیم (Mercantile Concept of Education) کا ایک خاصا ہے کہ لوگ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات اور زیادہ سے زیادہ مادی سہولیات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عجلت اور تکاثر کی یہ خواہش زندگی کی ہر چیز کو متاثر کرتی ہے حتیٰ کہ تعلیم کی دنیا کو بھی۔ ہر روز طالب علم کو یہ بتایا جاتا ہے کہ علم میں بڑی تیزی سے اضافہ (Knowledge Explosion) ہو رہا ہے۔ اب ظاہر ہے سارے علم کو نصاب میں کیسے شامل کیا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ زمانے کی اس تیزی سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہے' لیکن انسانی استعداد' وقت اور سہولیات محدود ہیں۔ یہ سب کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ایک حل یہ ہوسکتا ہے کہ ہر تعلیمی ادارے میں جدید تدریسی مشینیں ہوں۔ کورسز' مضامین' ان کا تدریسی لوازمہ اور اس مناسبت سے پیریڈز بھی زیادہ ہوں۔ بلاشبہ ان چیزوں سے کسی حد تک فائدہ تو ہوسکتا ہے لیکن عملاً یہ خاصا مشکل ہے۔۔۔۔ اب استاد کو یہ سوچنا ہوگا کہ اس سارے ہجوم میں سے وہ کون سا علم ہے جو واقعی مفید اور کار آمد ہے۔ لہٰذا پُر ہجوم ذخیرہ معلومات میں سے نصابی کمیٹیوں اور بورڈز آف اسٹڈیز کو جہاں انتخاب کرنا ہوگا' وہاں استاد کو بھی مفید مطلوب علم چھانٹ پرکھ کر طلبہ کو منتقل کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو اس غیر معمولی اضافہ معلومات میں معلم کھو جائے گا اور اس طرح انتخاب مواد اور انتقال علم' دونوں کو گنجلک اور مبہم بنا دے گا۔

تدریسی عمل میں روٹین اور یکسانیت

موثر اور کامیاب تدریس کی راہ میں ایک اور رکاوٹ استاد کی روٹین (Routine) اور یکسانیت ہے۔ آپ کسی طالب علم سے پوچھیں کہ فلاں کورس یا مضمون کیسا جا رہا ہے؟ تو ہوسکتا ہے وہ یہ جواب دے کہ بڑا ہی ناگوار بلکہ وبال جان۔ آپ پھر سوال کریں کہ آخر استاد میں کیا غلطی ہے؟ پچھلے سمسٹر یا پچھلے سال تو اس نے اسی استاد کو قابل تعریف سمجھا تھا۔ وہ قابل" یہ جواب دے کہ ہاں پچھلے سال تو استاد واقعی منفرد' خلاق اور متحرک تھا۔ لیکن اب اس میں نہ وہ دلچسپی' نہ ذوق و شوق اور نہ غور و فکر۔ ان ہی نوٹس کی بار بار تکرار' یکساں اور سپاٹ اسلوب' نہ کوئی مزید مطالعہ نہ تحقیق' یہ سب [illegible] طلبہ کو بیزار (Bore) کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اگر ان آراء کا تجزیہ کیا جائے [illegible]

میں استاد کی یکسانیت اور سالہا سال سے ایک ہی مخصوص ذخیرہ الفاظ' تدریسی پیش کش میں تنوع نہیں پیدا کرسکتا۔ بہرحال اس تنوع میں ایک خطرہ بھی ہے کہ جوش و خروش اور تخیل و تنوع کی تلاش میں استاد اپنے اصل مقصد تدریس کو نظر سے اوجھل نہ کردے۔ لیکن اگر تھوڑی سی شعوری کوشش کی جائے تو تخیل کی آبیاری کی جاسکتی ہے۔ تعلیمی مواد کی تنظیم و ترتیب میں تھوڑے سے رد و بدل سے' روٹین کی تبدیلی سے' وسعت مطالعہ سے' نئے اسلوب بیاں سے—— یہ سارے انداز طلبہ کو بیزاری (Boredom) سے بچاسکتے ہیں۔

حقیقت میں استاد کی موثر تدریس میں' اس کی غیر ضروری یکسانیت یقیناً ایک بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ استاد کے سال بہ سال وہی لفظ' وہی نکات' وہی انداز' وہی ترتیب' وہی اشعار' وہی قصے' وہی واقعات' وہی لطیفے' طلبہ کے لئے بوریت کا باعث بنتے ہیں خاص طور پر آج کے دور میں' جب فوٹو سٹیٹ پرنٹ ٹیکنالوجی عام ہوچکی ہے' طلبہ کے پاس اساتذہ کے نوٹس پہلے سے ہی موجود ہوتے ہیں۔ اب اگر اساتذہ کی حکمت تدریس میں تنوع اور نیاپن نہیں ہوگا یا کم از کم ان "مستقل کلاس نوٹس" کی تشریحات کا کوئی نیا اسلوب نہیں ہوگا تو طلبہ' رتی برابر کوئی کشش محسوس نہیں کریں گے بلکہ استاد الٹا تضحیک کا نشانہ بنے گا۔

جسمانی' ذہنی' روحانی عوارض

جسم' ذہن اور روح کی صحت' اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے اور ان تینوں کی صحت مند نشوونما ہی درحقیقت "تعلیم" ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے استاد کی محنت شاقہ اور اپنے ادارہ کی علمی انتظامی امور کے لئے متعین وقت سے زیادہ وقت دینا بلاشبہ ایک بڑی تعمیری قدر ہے' لیکن صحت کی حفاظت بھی ضروری ہے کیونکہ فرائض منصبی کو پورا کرنے کے لئے مجموعی صحت ایک نعمت ہے اور اس صحت میں کسی نوع کی بھی خرابی معلم کی تدریسی' تربیتی اور جملہ صلاحیتوں کو متاثر کرے گی۔ اس لئے جسمانی' ذہنی اور روحانی صحت کے لئے استاد کو ایسی صحت مند سرگرمیوں میں شرکت کرنی چاہئے جن سے ان کی شخصیت پر خوشگوار اثر پڑے۔

اصل میں انسان ایک خاص حد تک مشقت کرسکتا ہے اگر وہ اپنی استطاعت سے زیادہ محنت و مشقت کرے گا تو اس کی صحت متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔ پھر بعض اوقات استاد جس ماحول میں ہوتا ہے' اس میں اساتذہ کی باہمی چپقلش' ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مرئی اور غیر مرئی کوششیں' علمی اور پیشہ ورانہ امور میں حسد' غیبت' بہتان' بغض' ناچاقی کی فضاء' [illegible] کاموں میں انتظامی مزاحمت' بعض طلبہ کا منفی طرز عمل' غیر صحت مند سیاست اور

اس حوالے سے اساتذہ کی ایسوسی ایشنوں کے انتخابات۔ یہ ساری چیزیں بعض اوقات معلم کو تھکان' پژمردگی اور ذہنی تناؤ کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ پھر بعض جسمانی بیماریاں بھی ایک فعال اور متحرک استاد کو جامد اور بے اثر بنا دیتی ہیں۔ یہ ساری صورت حال بالاخر کمرہ جماعت کے سارے علمی ماحول کو متاثر کرنے کا باعث بنتی ہے۔

حقیقت میں عصر حاضر کے انسان کا ایک بڑا مسئلہ تنہائی ہے۔ مذہب سے عملی دوری اور مادیت کے غلبہ نے معلم کو بھی انسانوں کے اس ہجوم میں بالکل "تنہا" بنا دیا ہے۔ وہ تعلیمی ادارہ میں اپنے رفقائے کار سے ملتا ہے لیکن استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر اکثر اس کے باہمی روابط اور مراسم' میکانکی اور اخلاص سے عاری ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جوں ہی کبھی باہمی مفادات کا ہلکا سا بھی ٹکراؤ یا مستقبل میں اس ٹکراؤ کا کوئی "خطرہ" ہو' تو پھر ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس سارے منفی رجحانات سے بچنے کا طریقہ یقیناً معلم کی اسلامی تربیت ہے۔ اس کے بغیر متوازن شخصیت کی تشکیل ایک ناممکن عمل ہے۔

ایک اور حل یہ ہو سکتا ہے کہ استاد ہر وقت علمی انسائیکلو پیڈیا نہ بنا رہے اور نہ ہی ہمہ وقت خشک علمی مباحث میں ہی مصروف رہے بلکہ احباب کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ' کبھی کبھار چائے کھانے کی دعوت' سیر و تفریح' رفقائے کار کے ساتھ اخلاص' ایثار اور ہمدردی کے جذبہ پر مبنی روابط' سپورٹس میں تھوڑی بہت شرکت' اچھے ادب کا مطالعہ' اور خاص طور پر ادارہ کی رسمی اور میکانکی فضاء سے ہٹ کر اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیموں کے علمی امور میں رضاکارانہ شرکت ضروری ہے۔ یہ حکمت عملی' کسی حد تک اس سے تھکاوٹ اور بیزاری سے بچائے گی اور اس طرح وہ اپنے فرائض منصبی کو بہتر طور پر ادا کرنے کے قابل ہو گا۔ تکان' پژمردگی' آزردگی' اداسی' یقیناً تدریسی امور کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا علاج بلاشبہ کسی حد تک میڈیکل سائنس کے پاس بھی ہے۔ لیکن متوازن صحت کے حوالے سے پانچ وقت کی نماز' تہجد کی نماز' اسلام کے نظام طہارت کی پابندی' سحر خیزی' روزانہ قرآن حکیم کی تلاوت' سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ' انفاق فی سبیل اللہ' حلال روزی کے لئے محنت اور دیگر شعائر اسلامی کی پابندی' یہ سب صورتیں استاد کو سکون قلب دیں گی اور یہ سکون بالاخر استاد کی فعال اور بامقصد تدریس کی ضمانت بنے گا۔ حقیقت میں استاد کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ خدا اور رسول ﷺ کے حوالے کے بغیر علم و آگہی' گمراہی ہے اس لئے استاد کے لئے قرآن حکیم کی یہ ہدایت ہمیشہ مشعل راہ رہنی چاہئے:

الذین امنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب ۝

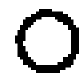
الذین امنوا وعملوا الصلحت طوبی لھم وحسن [illegible] (28,29)

"ایسے ہی لوگ ہیں وہ جنھوں نے (اس نبی کی دعوت کو) مان لیا ہے اور ان کے دلوں کو اللہ کی یاد سے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ خبردار رہو! اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے دعوت حق کو مانا اور نیک عمل کئے وہ خوش نصیب ہیں اور ان کے لئے اچھا انجام ہے۔" (ترجمہ : تفہیم القرآن' جلد دوم 1967ء ' ص 459)۔

(انجمن فاضلین' آئی-ای آر' جامعہ پنجاب لاہور کے زیر اہتمام اساتذہ کے ایک اجتماع میں پڑھا گیا۔۔۔۔ سہ ماہی مجلہ تعلیمات لاہور' جلد 14' شمارہ 3' جولائی - ستمبر 1991ء)

منصب استاد کے بنیادی تقاضے

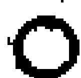
صوبہ سرحد کے شہر پشاور میں' افغان مہاجرین کی خدمت پر مامور ایک رضا کار علمی ادارہ کی طرف سے اپریل 1986ء میں ایک تعلیمی تقریب کا انعقاد کیا گیا' جس کا اہم مقصد پاکستان میں مقیم افغان مہاجرین اور شہداء کے بچوں کی مناسب تعلیم کے لئے اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت تھا۔ اس مقصد کے لیے اس ادارہ نے مہاجرین میں سے ہی ایسے پڑھے لکھے اور موزوں افراد کا انتخاب کیا' جنہیں ضروری تدریسی تربیت کے بعد' اسی ادارہ کی زیر نگرانی کیمپ سکولوں میں مجاہد استاد کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالنی تھیں۔ یہ درحقیقت ان مجاہد اساتذہ کے لیے مختصر دورانیہ کا ٹریننگ پروگرام تھا' جو سوڈان کے ڈاکٹر محمد ابراہیم اور ڈاکٹر رحمان اور جامعہ پشاور کے ڈاکٹر محمد سلیم اور ڈاکٹر نسیم صدیقی کی رہنمائی میں مرتب کیا گیا تھا۔ ان تربیتی کورسز کا افتتاح 26 اپریل 1986ء کو تنظیم اساتذہ پاکستان کے صدر جناب حافظ وحید اللہ خان صاحب نے کیا۔ راقم الحروف کی خوش قسمتی تھی کہ اسے افتتاحی تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہرچند کہ زمانی لحاظ سے ایک عرصہ بیت گیا' لیکن اس تقریب میں پیش کیے گئے مباحث آج بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں اس لیکچر کے اہم نکات دیئے جو رہے ہیں' جو راقم نے اساتذہ کے اس اجتماع سے "منصب استاد کے بنیادی تقاضے" کے موضوع پر پیش کیے۔۔۔۔ پشتو اور فارسی میں ترجمانی جناب پروفیسر سید جہاں بادشاہ اور ایک مجاہد استاد نے کی۔



مجاہد اساتذہ کرام! آپ آج اسلاف کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ آپ وہ عظیم اور خوش نصیب لوگ ہیں' جو ان مجاہدین کو علمی اور فکری محاذ پر تیار کریں گے جو ایک غاصب اور وقت کی "سپرپاور" کو انشاء اللہ نیچا دکھائیں گے اور جو مستقبل میں بھی ہر دور کے استعمار کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔۔۔۔ آپ خود بھی اور آپ کے زیر تربیت طلبہ بھی جہاد میں ہیں۔

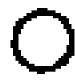
آپ اساتذہ ہی وہ روشن ضمیر اور روشن کردار شخصیت ہیں' جو آئندہ ایک روشن تاریخ کا باب لکھیں گے۔ آپ بلاشبہ عظیم لوگ ہیں۔۔۔۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم اس لمحہ آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے سامنے کھڑے ہوکر ہم خوشی بھی محسوس کررہے ہیں اور رشک بھی۔۔۔۔ جس کی بھی نظر قرآن و حدیث پر ہے وہ جانتا ہے کہ مجاہد کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جہاد کے لیے جس نے گھوڑے کی لید صاف کی وہ بھی جہاد میں شریک ہے۔۔۔۔ ہم سب پر اللہ کا انعام ہے کہ اس نے ہمیں مسلمان بنایا۔ اسلام کی دولت دی۔ بڑی خوبیاں ہیں اس دین کامل میں' لیکن ایک اہم ترین خوبی یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ خدا کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے اپنے مشن کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: انما بعثت معلماً" (بے شک میں معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں) پھر ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے)۔۔۔۔ خلفائے راشدینؓ جب جہاد کے لیے مجاہدین بھیجتے تھے تو فوجی کمانڈر کے ساتھ ساتھ معلم بھی بھیجتے تھے۔ معلم کا ساتھ ہونا لازمی تھا۔ حقیقت میں اسلامی نظام تعلیم و تربیت ایک خود کار نظام ہے۔ اس عمل میں استاد اور طالب علم دو اہم عناصر ہیں۔ پڑھنا بھی ضروری ہے اور پڑھانا بھی ضروری۔ محسن انسانیت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اس شخص کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی کہ اس کے پاس علم تھا' لیکن اس نے علم کو منتقل نہیں کیا۔۔۔۔ ناسازگار حالات میں بھی علم کی منتقلی ضروری ہے اور یہ وہ ضروری علم ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے' حیوانیت سے درجہ بلند کرتا ہے' بنیادی اخلاق سکھاتا ہے۔ جو اسلامی اقدار حیات کو فروغ دیتا ہے۔ جس کا مطلوب خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ جو آخرت کا تصور دیتا ہے اور پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے انسان کو جہاد میں شریک کرتا ہے۔ یہی فی الحقیقت ہماری تعلیم کی اصل غایت ہے اور اسی کی تکمیل منصب استاد کا بنیادی تقاضا ہے۔ علامہ اقبال نے ٹھیک کہا ہے:

من آں علم و فراست با پر کاہ نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را

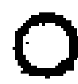


معزز اساتذہ! آج کا دور مختلف نظریاتی لہروں اور

دور ہے۔ تصادم اور کشمکش کی اس فضا میں کمزور نظریاتی بنیادوں پر کھڑی اقوام زبردست خطرے میں ہیں۔ طاقت ور اقوام کی طرف سے ثقافتی یلغار نے بھرپور حملے کا رنگ اختیار کرلیا ہے۔ ان پر آشوب حالات میں کوئی ایسی قوم ابھر ہی نہیں سکتی جو دوسروں کے ذہنی افکار کی دریوزہ گری کرتی پھرے اور جس کے پاس ایک مضبوط فکری انقلاب برپا کرنے کے لئے الہامی ہدایت پر مبنی کوئی نظریاتی سرمایہ نہ ہو۔۔۔۔ آپ جیسے مجاہد اساتذہ سے ہی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ نظام تعلیم کو ایک ایسی نئی نسل کی تعمیر کا ذریعہ بنائیں گے جو اسلامی فکر و عمل کے سانچے میں ڈھلی ہو۔ جو الحاد' مادہ پرستی' منافقت' خیانت' ظلم اور غلامی کے خلاف جہاد کے عظیم جذبے سے سرشار ہو۔ گویا مجاہدین کی ان تعلیمی درس گاہوں کو ایسے انسانیت ساز اداروں کا روپ اختیار کرلینا چاہئے جو ہر شعبہ زندگی میں اسلامی طرز فکر و عمل کو جاری و ساری کرسکیں۔ آپ ہی بلاشبہ اس عظیم تحریک کا مرکز و محور ہیں۔ اور آپ کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے معلم اعظم ﷺ کے اسوہ تعلیمی کو ہی مشعل راہ بنانا پڑے گا۔

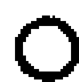


اساتذہ کرام! اس وقت عالم اسلام میں پریشان کن کیفیت کے باوجود ہمارے لیے ایک امید افزا صورت یہ ہے کہ قریب قریب ہر ملک میں اسلامی تحریک موجود ہے' جس کی فکر اور دعوت سے مسلمان اپنے مستقبل کو اسلام کے حوالے سے دیکھ رہے ہیں' یہ تحریکیں محض نظریاتی بحثیں ہی پیش نہیں کر رہی' بلکہ وہ ایک پیغام عمل بھی دے رہی ہیں' جو جہاد فی سبیل اللہ کی صورت میں نمایاں ہو رہی ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد ان کا جذبہ جہاد اشتراکی استعمار کو بھی شکست دے گا اور سرمایہ دارانہ بلکہ ہر نوع کے استعمار کو بھی شکست سے دوچار کرے گا۔۔۔۔ آج کی جنگ کے حوالے سے دفاع کاری میں سالار اعظم کا کردار بھی ان ہی اساتذہ کو ادا کرنا ہے جو فکری لحاظ سے ان اسلامی تحریکوں سے وابستہ ہیں۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ اس ادارہ کے تحت آپ کی تربیت' سنگ و خشت کے حوالے سے خوبصورت عمارتوں میں نہیں ہو رہی' لیکن مقصدیت کے حوالے سے انشاء اللہ اس کے گہرے مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔



... نظر سے ... بات پیش نظر رکھیں کہ مسلمانوں کے ہاں

تدریسی عمل ایک بے حس' جامد اور میکانکی عمل کا نام نہیں' جو ریڈیو' ٹی وی' ٹیپ ریکارڈر یا کمپیوٹر کے ذریعے معلومات کا انتقال کرتا رہے۔ بلکہ استاد کو نہایت ہی اہم اور ارفع مقام حاصل ہے اور صحیح طور پر تجزیہ کیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے معلم ایک مقدس روحانی احساس کی مانند تعلیمی عمل کی باقی تمام چیزوں پر حاوی ہے۔ گویا آسان لفظوں میں ہم یہ بات اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا معلم' مقاصد تعلیم اور نصاب تعلیم کے پہلو بہ پہلو محض ایک تیسری اکائی کا درجہ نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ایسے انداز فکر و عمل کا حامل ہوتا ہے جس میں مطلوبہ مقاصد کا رنگ جھلکتا ہے اور زیر بحث نصاب کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ استاد کی شخصیت کی جامعیت میں حسن بیان کا پہلو خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احترام' شفقت' محبت اور حکیمانہ انداز کے ساتھ ساتھ زبان کی شگفتگی' جملوں کی مناسب ساخت' انداز بیان کا بانک پن اور لہجے کا اتار چڑھاؤ یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں۔ گویا استاد کا کام طلبہ کی تربیت و اصلاح' معلومات کے انتقال اور اپنے مثالی کردار کا تاثر قائم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق کو بے رنگ انداز میں بیان نہ کرڈالے بلکہ اپنی شگفتہ بیانی اور شیریں مقالی سے اپنے درس کو دلچسپ اور پرکشش بنائے۔۔۔ ہمیں امید ہے آپ دوران تربیت جدید فنی طریقہ ہائے تدریس سے بھی آگاہ ہوں گے اور مثالی مسلمان اساتذہ کے اسالیب سے بھی۔ آپ کے ادارہ کے منتظمین نے فنی' پیشہ ورانہ اور نظریاتی تربیت کے حوالے سے بہت سا مواد مرتب کرلیا ہے۔ اس لٹریچر کے علاوہ ہماری خواہش ہے کہ تعلیم و تربیت کے تناظر میں آپ میں سے ہر استاد' عالم اسلام کے عظیم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی کتاب "تعلیمات" کا بھی بغور مطالعہ کرے' تاکہ ابتدا ہی سے اسے مقصد تعلیم کا گہرا شعور حاصل ہو جائے۔



مجاہد اساتذہ اور منتظمین کرام!

آخر میں آپ کی خدمت میں چند نکات پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ تربیت اساتذہ سے متعلق' تشکیل نصاب کے حوالے سے نظری مباحث سے لے کر اساتذہ کی عملی تربیت تک انہیں پیش نظر رکھا جائے۔

○ تعلیم و تعلم کا اساسی مسلمہ قانون یہ ہے کہ [illegible]

رویوں میں مثبت تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اسلامی نقطہ نظر سے اساتذہ کی تربیت سے متعلق سارے علمی ماحول اور دیگر نصابی سرگرمیوں کو نظریاتی رخ پر ڈھالنا انتہائی ضروری ہے۔

- اساتذہ کی تعلیم و تربیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ تربیت اس بنیادی اصول پر تشکیل پاتی ہے کہ استاد کا کام صرف معلومات فراہم کرنا ہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے قانون کو نافذ کرنے کی دعوت دینا بھی ہے۔
- استاد تعلیمی عمل کا مرکز و محور ہے۔ وہ ایک واجب الاحترام شخصیت ہے۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ وہ وارث پیغمبر ہے۔
- علم اور تربیت کے امتزاج سے تشکیل پایا ہوا نظام ہی اعلیٰ نظام ہے۔ تربیتی نقطہ نظر سے استاد کی شخصیت بڑی اہم ہے جس سے اچھائی اور برائی کے معاملے میں طلبہ اثر قبول کرتے ہیں۔
- استاد محض نفس مضمون اور طریقہ ہائے تدریس کا ماہر ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مربی' مزکی اور مصلح بھی ہوتا ہے۔ یعنی فکر و عمل اور سیرت و کردار میں پختہ' اپنے مضمون میں ماہر اور طریقہ ہائے تدریس پر عبور رکھنے والا استاد ہی طلبہ کی متوازن تربیت کر سکتا ہے۔
- مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی عالم بے عمل کو تسلیم نہیں کرتا۔ کردار کی اہمیت ہمیشہ بنیادی رہی ہے۔
- ہر سطح کے استاد میں درج ذیل چند صفات کا ہونا ضروری ہے۔

ا۔ قرآن و سنت سے آگہی' بندگی رب اور اتباع رسول ﷺ۔ (حقیقت میں جس تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانے کے لیے کوئی استاد مقرر کیا جائے' اس کے بنیادی نظریے پر اس کا ایمان شرط اول ہے)۔ بحیثیت مجموعی جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ نصابی سرگرمیوں کا اصل نصب العین ہے۔

ب - دیانت' عدل' حق گوئی' خدمت خلق' ایثار' قربانی' اخوت' عفو و درگزر' اختلاف رائے کا احترام اور فریضہ اقامت دین——— ان صفات کے حوالے سے درس و تدریس کے اسالیب میں خصوصی تربیت۔

ج - علمی و فنی مہارت' یعنی اپنے مضمون میں بھرپور صلاحیت اور اسے پڑھانے کی حکمت پر کامل عبور۔

د - قرآن حکیم کے تین خطوط یعنی نفس امارہ' نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ کی روشنی میں انسانی نفسیات کا مطالعہ اور تعلیمی دائرہ میں تبدیلی لانے کے لیے مناسب حکمت عملی کا شعور۔

ھ - علمی ذوق و شوق' دل جمعی اور پابندی وقت کی پاسداری۔

و - طلبہ کا احترام' ان کی قدر و منزلت اور ان سے شفقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ استاد طلبہ کو سزا دینے میں محتاط ہو۔ غیض و غضب' طعن و تشنیع سے کام نہ لے۔ استاد' طلبہ کی تلخ باتوں کو بھی گوارا کرے۔ طلبہ کے مسائل میں دلچسپی لے۔ طالبعلم یہ محسوس کرے کہ اس کے استاد کو اس کی فکر ہے۔ (کیمپ سکولوں کے تناظر میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اکثر بچے یتیم ہیں۔ وہ اپنے گھر کی فطری تربیت گاہ سے محروم ہیں۔ انہیں یاس اور افسردگی سے نکالنا اور انہیں والدین جیسی محبت دینا بھی مجاہد اساتذہ کی ذمہ داری ہے)۔

ز - اپنے ملک کے نظریاتی اور جغرافیائی نیز ملی مفادات کے تحفظ اور تعمیر کا بھرپور جذبہ۔

- استاد درحقیقت قائد ہوتا ہے وہ انسانی فطرت کو سمجھتا ہے اور وہ طلبہ کو ایک متعین مقصد کی طرف موڑنے کی کوشش اس انداز سے کرتا ہے کہ جس سے اس کا اعتماد اور احترام طلبہ کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ استاد کو یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ محض معلومات یا تقریری صلاحیت کافی نہیں۔ اس کے لیے علم و عمل کی یکسانیت اور مقصدیت کا گہرا شعور بھی ضروری ہے۔
- تربیت اساتذہ کے نظام کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ مستقبل کے اساتذہ میں اسلامی تعلیم کے نصب العین کا واضح شعور اور اس سے گہری وابستگی پیدا کی جائے اور ان میں وہ اخلاق و کردار اور مشنری جذبہ پروان چڑھایا جائے' جو انہیں اس منصب کے صحیح تقاضے ادا کرنے کے لیے تیار کرے۔ اس عمل میں تربیت اساتذہ کے اداروں کے لیے درج ذیل اصول بڑے اہم ہیں۔

الف۔ نصاب تربیت ایسا ہو کہ استاد بیک وقت پختہ مسلمان بھی تیار ہو اور اپنے مضمون میں بھی ماہر ہو۔

ب۔ تربیت اساتذہ کے نصاب میں مرکزیت قرآن و سنت کو دی جائے۔

ج۔ اساتذہ کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ اپنے اپنے مضامین خواہ وہ طبعی علوم ہوں یا عمرانی' اسلامی نظام فکر کی روشنی میں پڑھائیں۔

د۔ اساتذہ کو اپنے ملک اور بحیثیت مجموعی امت مسلمہ کے مسائل کے بارے میں آگہی فراہم کی جائے تاکہ وہ بعد میں اپنے زیر تعلیم طلبہ تک اسے منتقل کر سکیں۔

ھ۔ اساتذہ کو اسلام کے فلسفہ تعلیم' مقاصد تعلیم اور مفکرین تعلیم کے خیالات سے آگاہ کیا جائے۔

و۔ اساتذہ کو مغربی تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس کا مطالعہ تنقیدی نقطہ نظر سے کرایا جائے۔

ز۔ اساتذہ کے تربیتی کورس میں ایسا لٹریچر نہ ہو جو اجتماعی نصب العین کے بارے میں ایمان کو کمزور کرنے والا ہو۔

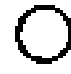
ح۔ تدریس کو موثر بنانے کے لیے اساتذہ کو جدید سمعی و بصری آلات کے استعمال سے واقف کرایا جائے اور انہیں تعلیمی تحقیق کے طریقوں میں بھی ٹریننگ دی جائے تاکہ مقاصد کی بہتر طور پر تکمیل ہو سکے۔

آخر میں اپنی بات علامہ اقبال مرحوم کے ان اشعار سے ختم کرتا ہوں' جن میں آپ نے شیخ مکتب کو ایک ایسے عمارت گر سے تشبیہ دی' جس کی صنعت اینٹ' پتھر' گارا اور لوہا نہیں بلکہ روح انسانی ہے اور جس کا اہم مقصد الٰہی ہدایت کی روشنی میں انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کی تربیت ہے۔ علامہ "شیخ مکتب" سے مخاطب ہوتے ہیں فرماتے ہیں:

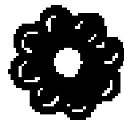
شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

نکتہ دلپذیر تیرے لیے
کہہ گیا ہے حکیم قاآنی

"پیش خورشید برکش دیوار
خواہی ار صحن خانہ نورانی"



(سہ ماہی مجلہ تعلیمات لاہور، جلد 15، شمارہ 2، جون 1992ء)



معلم کا قائدانہ کردار

علم کی بڑھتی ہوئی خواہش، علوم کی پھیلتی شاخوں، تعلیم کی توسیع اور تدریس کے نئے موثر طریقوں کے باوجود "معلم" پس منظر میں کیوں جارہا ہے؟ ہمارے ہاں تعلیمی نظام کا یہ مرکزی اور محوری نقطہ اتنا موہوم کیوں ہوگیا ہے؟ بھاری نصابوں اور بوجھل درسی کتابوں نے علم منتقل کرنے اور تعلیم سے آراستہ کرنے والی ہستی کو اس قدر ہلکا کیوں کر دیا ہے؟ مشین اور تکنیک نے تعمیر کردار اور شخصیت کی صورت گری کرنے والے فن کار کو اس قدر کم مایہ کیوں بنا دیا ہے؟ یہ اور اس سے ملتے جلتے بیسیوں سوالات ہر اس ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو تعلیم و تدریس کے عمل سے تھوڑا سا رشتہ و تعلق بھی رکھتا ہے۔ لیکن ان سوالوں کا واضح اور حتمی جواب کہیں سے نہیں آرہا۔ شاید ایسا جواب تلاش کرنا مشکل بھی ہے، کیونکہ معلم کی تحلیل کا عمل کئی برسوں پر محیط ہے اور اس المیے کو جنم دینے والے لا تعداد عوامل ہیں۔ مادیت کی گرفت میں جکڑے ہوئے معاشروں کی طرح ہمارے ہاں بھی تہذیبی اور معاشرتی اقدار کے نئے پیمانے رواج پا چکے ہیں اور ان پیمانوں نے روشن اخلاقی اقدار کی قیمت اتنی گرا دی ہے کہ خود معلم کے لئے بھی دنیوی اور رسمی معیارات سے بلند ہو کر کسی منصب فضیلت پر فائز ہونے کی آرزو زیادہ مطلوب نہیں رہی۔

دَور کی تاریخ میں معلم کا مقام تبلیغ و اشاعت دین تھا۔ وہ معمار قلب و نظر کے ناتے اعلیٰ معاشرتی قدر و منزلت کا حامل تھا۔ اس دور میں تعلیم اور دینی اخلاقیات کی تدریس کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ معلم کے لئے محض علم پر دسترس ہی کافی نہ تھی، وہ تقویٰ اور خداترسی کا ایک عملی نمونہ اور کردار کی مثالی صورت بھی ہوتا تھا۔ قرون اولیٰ کے معلمین، عالمانہ کمال اور بلندی کردار کے ایسے پیکر ہوتے تھے جن کی شخصیت کے ہر زاویے سے تاثیر کی شعاعیں پھوٹتی تھیں——— اور یہ تو ابھی کل کی بات ہے۔ معلم، بستی کا سب سے سیانا، سب سے باخبر، سب سے دانا و حکیم اور سب سے زیادہ صاحب عمل خیال کیا جاتا تھا۔ جاگیرداروں کے محل، چودھریوں کی حویلیاں، وڈیروں کی بیٹھکیں اور خانوں کے حجرے، قوت و حشمت کا مرکز ہونے کے باوجود "ماسٹر" کی روحانی سلطنت کے باج گزار خیال کیے جاتے تھے۔ معلم بستی کا ناصر بھی تھا، رہنما بھی، مشیر بھی اور مثبت اقدار کا مبلغ بھی۔ وہ بستی کا

واحد ترجمان ہوتا تھا۔ شہروں کی صورت حال ہر چند کہ کچھ مختلف تھی، لیکن یہاں کی سماجی اور معاشرتی زندگی بھی بڑے بڑے تاجروں، وزیروں، سرکاری اہل کاروں، سیاست دانوں یا صاحب حیثیت لوگوں کے ناموں سے نہیں، صاحبان علم بالخصوص اساتذہ کے ناموں سے عبارت تھی۔ طلبہ جب اپنی درس گاہوں سے فارغ ہو کر نکلتے تھے، تو ان کی بغل میں صرف علم کی گٹھڑی نہیں ہوتی تھی، بلکہ دلوں میں اپنے اساتذہ کے کردار و عمل کے جلووانی نقوش بھی ہوتے تھے۔ ذرا پہلے کے زمانے میں فارغ التحصیل ہونے والے نوجوان، اپنی درس گاہوں کا حدود اربعہ اور اپنے ہم جماعتوں کے خد و خال بھول جاتے تھے، لیکن اپنے اساتذہ کے انداز گفتار و کردار کا ایک ایک پہلو، ان کے حافظے کی لوح پر نقش رہتا تھا۔ علم کے ساتھ ساتھ معلم بھی، طالبان علم کے فکر و ذہن کے ہر گوشے میں اپنا گھر بنا لیتا تھا۔

اور آج ہمارے سامنے کوہ ہمالیہ جتنا بلند یہ سوال آکھڑا ہوا ہے کہ ہر دل میں گھر کرنے والا معلم بے گھر کیوں ہوگیا ہے؟ کیا وہ اتنا ہی کمزور تھا کہ جدید سائنسی آلات تعلیم کی پہلی یلغار نے اسے پسپا کر دیا؟ کیا وہ ایسا ہی بے ہنر تھا کہ کمپیوٹر اور نیٹ ورک کی ایک بھی ضرب نہ سہ سکا؟ لیکن اس سوال کا جواب لانے سے بھی پہلے، آیئے ہم اس سوال پر ایک نظر ڈال لیں کہ معلم نے اخلاقی و روحانی مقام فضیلت اور مثالی نمونہ کردار و قیادت کا جو مورچا رضاکارانہ طور پر خالی کر دیا ہے، اسے جدید سائنسی اور میکانکی سسٹم پر کرسکا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہے تو ہم واقعی جنگ ہار چکے ہیں اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو ہم نے محض ایک "جھڑپ" میں شکست کھائی ہے، جنگ ابھی باقی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس جنگ میں سرخرو نہ ہوں۔۔۔۔ میرے خیال میں، معلم کا خالی کیا ہوا مورچا ہنوز خالی ہے اور غنیم کا لشکر اس سے ابھی دور ہے۔ آج قومی سطح پر زندگی کے ہر شعبے میں ہمیں جس اخلاقی بحران (Value Crisis) کا سامنا ہے، اس کے مقابلے میں ہمیں جس حکمت عملی کی ضرورت ہے، اس میں تعلیم کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس پس منظر میں معلم کی ذمہ داری صرف کمرہ جماعت تک محدود نہیں رہتی۔ وہ ایک میکانکی اور جز وقتی استاد نہیں، بلکہ وہ درحقیقت ایک ہمہ وقتی تعلیمی قائد ہے۔ جس کا کام اپنے طلبہ، اپنے رفقائے کار اور اپنے حلقہ اثر میں شامل افراد کو اشتیاق اور اعتماد کے ساتھ، تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لئے متحرک کرنا اور ان سے نتیجہ خیز کام لینا ہے۔ یہ بات واضح رہے کہ علمی اور فکری قیادت کے لئے ضروری نہیں کہ معلم لازماً سربراہ ادارہ ہی ہو۔ بلاشبہ سربراہ ادارہ کا قائد ہونا ضروری ہے، لیکن قائد کا سربراہ ہونا ضروری نہیں۔ ایک معلم چاہے کمرہ جماعت کے اندر ہو، یا کمرہ جماعت سے باہر، وہ سٹاف روم میں ہو یا عام معاشرہ میں، اس کا منصب

ایک قائد اور ایک داعی کا ہوتا ہے۔ آپ جس سطح پر بھی پڑھا رہے ہوں اور جس سکیل کے بھی حامل ہوں، اگر آپ میں علم و کردار کی قوت ہے، تو سربراہی کے بغیر بھی آپ اپنے طلبہ اور اپنے ساتھیوں کے دلوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔ معلم کا یہ کردار، داعی اور اساسی قدروں سے بنتا ہے، جس میں حصول علم، بنیادی قدر ہے۔ جس سے مراد توحید و رسالت کی روشنی میں خیر و شر کا امتیاز ہے۔ دنیا کے سارے تمدن سارے علوم و فنون، سارے تعلیمی نظام، ساری ایجادات، اور ساری حکومتوں کو پرکھنے کی کسوٹی بھی یہی معیار خیر و شر ہے۔ چنانچہ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کا جو نظام، معلم کو اسلامی معتقدات کے تناظر میں مقصد حیات اور فرائض خلافت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے "-نفع الناس" کے معیار پر پورا اترتا ہے اور دنیائے انسانیت کے لئے باعث فوز و فلاح ہے، وہی نافع اور معیاری ہوگا ورنہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

فاما الزبد فیذھب جفاءً واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض
کذلک یضرب اللہ الامثال (الرعد:17)-

"....جو جھاگ ہے وہ اڑجایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لئے نافع ہے وہ زمین میں ٹھیر جاتی ہے اس طرح اللہ مثالوں سے اپنی بات سمجھاتا ہے۔
القرآن، الرعد : 17)

حقیقت میں وہ لوگ بے حد خوش نصیب ہیں، جنہیں معلمانہ منصب ملا۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کار نبوت کو چلانے کے لئے "علما نبیوں کے وارث ہیں اور نبیوں کا ورثہ دینار و درھم نہیں بلکہ علم ہے" (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)۔ اس کار نبوت کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "بے شک مجھے معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے" اور پھر یہ کہ "مجھے اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے تاکہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام و کمال تک پہنچاؤں"۔۔۔۔۔ میرے نزدیک آج طلبہ کا معیار تعلیم ہو، یا اساتذہ کا معیار کارکردگی، اس کے تنزل کی یہ وجہ نہیں کہ اب امتحانات میں نمبر کم آتے ہیں یا سند یافتہ افراد میں کوئی کمی آئی ہے بلکہ اصل تنزل یہ ہے کہ آج کا طالب علم، معلم، سیاست دان، غرض ہر شعبہ زندگی کا فرد، بالعموم نہ معلمانہ منصب کا حامل بن سکا اور نہ ہی حسن اخلاق کا پیکر۔ آپ اپنے نظام تعلیم کا ایک سرسری جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ باوجودیکہ طالب علم نے اسکولوں سے یونیورسٹی تک تمام مراحل طے کرلیے ہیں، اعلیٰ ترین ڈگریاں بھی حاصل کرلی ہیں، لیکن عملاً اس کے تربیتی نصاب کا یہ حصہ کبھی نہیں رہا کہ اسے ایک اچھا اور ایماندار آدمی بھی بننا ہے۔ سوشل، [illegible] سائنس اور [illegible] کے علوم سیکھ لیے لیکن اندر کی روشنی نصیب نہ ہوئی

وہ اسلامی تاریخ' اسلامی ادب اور اسلامی اخلاقیات سے بالکل بے خبر رہا اور اس طرح اپنے درخشاں ماضی سے بے تعلق ایک روبوٹ (Robot) قسم کا شخص تیار ہوا' جس کا مقصد زندگی' معیار انسانیت کو بہتر کرنا نہ تھا' بلکہ صرف معیار زندگی بڑھانا رہ گیا۔۔۔ آج ہمیں کھوئی ہوئی سرگزشت کو پھر حاصل کرنا ہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ ہم اپنے طلبہ اور اپنے اساتذہ کی تربیت میں علمی فضیلت اور اخلاقی علو کو نمایاں مقام دیں اور بحیثیت مجموعی تعلیم و تربیت کا رشتہ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے جوڑیں۔اس تناظر میں وہی معلم قیادت کے منصب کا حامل ہوگا جو صاحب علم' خدا سے ڈرنے والا' اسلامی اخلاق کا پیکر' مستقبل بیں اور علامہ اقبال مرحوم کی زبان میں "ندرت فکر و عمل" کا حامل ہوگا۔

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے' ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شے ہے' ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

اس ندرت فکر و عمل اور تخلیق و تحقیق کی صلاحیت کو پانے کے لئے معلم کو جہاں اسلام کا گہرا شعور' اپنے مضمون پر عبور اور موثر حکمت تدریس پر مہارت حاصل کرنا ہے' وہاں اپنے وقت کی مخالف اسلامی افکار و تحریکات سے بھی واقفیت حاصل کرنا ہے۔ اس کے بغیر وہ دور حاضر میں رائج غیر اسلامی نظریات کی تردید کا حق نہیں ادا کرسکتا اور نہ اپنے طلبہ کو دین اسلام کی صداقت کا قائل کر سکتا ہے۔ معلم کو اپنے عصری تقاضوں سے بھی ضرور آگاہ ہونا چاہیے۔ اس کی انگلیاں اپنے عہد کی نبض پر ہونی چاہیں اور اسے اس بات کا کامل ادراک ہونا چاہیے کہ آنے والے دنوں میں وطن عزیز کو یا امت اسلامیہ کو کس نوع کے فرد کی ضرورت ہے۔ معلم کا قائدانہ کردار یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے مختلف شعبوں اور اس دائرے میں کی گئی تحقیقات اور فن تعلیم کے تجربات سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھائے' تاکہ وہ ایک غالب ذہن کے ساتھ طلبہ کی علمی قیادت اس طرح کرے کہ وہ تمام علوم و نظریات کو اسلام کے نقطہ نظر سے چھانٹ پرکھ سکیں۔ معلم درحقیقت بیک وقت دائمی اسلامی اقدار کا امین بھی ہوتا ہے' معاشرہ میں موجود افکار و نظریات کا ناقد بھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ نظریاتی معیار کی روشنی میں حال اور مستقبل کے مسائل کے حل کے لئے اجتہاد' تحقیق اور تخلیق سے بھی کام لیتا ہے۔

اس نصب العین کے حصول سے متعلق ممتاز محقق' فلسفہ تعلیم و تاریخ کے استاد پروفیسر سید محمد سلیم' اساتذہ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے طلبہ میں تحقیق و تنقید کا ملکہ پیدا

کریں تاکہ وہ مستقل معیار رد و قبول کے آئینہ میں خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز کر سکیں۔
پروفیسر سید محمد سلیم کی رائے میں:

"......مقصد حیات اور مقصد تعلیم متعین ہو جانے کے بعد سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ طالب علموں کے اذہان کی آبیاری کی جائے۔ ان کے اندر فکر و فہم' شعور و ادراک کا ملکہ اور استعداد پیدا کی جائے۔ ان کے اندر تحقیق و تنقید کا ملکہ پیدا کیا جائے۔ ہر چیز کو وہ بلا سوچے سمجھے آمنا و صدقنا نہ کہہ دیں بلکہ اس کو اپنی عقل کے اور اپنی علم کی کسوٹی پر پرکھیں۔ اس کا غلط اور صحیح ہونا معلوم کریں۔ تنقید سے یہ معلوم کریں کہ کس قدر صحیح ہے کس قدر باطل کی آمیزش ہے۔ وہ کھلے دماغ سے اور کھلی آنکھوں سے تعلیم حاصل کریں----- فکر و فہم کی ان صلاحیتوں کو پیدا کرنے میں مضامین سے زیادہ طریق تدریس کو دخل حاصل ہے۔"

("ہمارا نظام تعلیم: تاثرات و تجاویز" ص ص 14-15)

اس مقصد کے لئے جہاں عصری علوم اور وقت کی اصطلاحوں (Phraseology) سے واقفیت ضروری ہے' وہاں تفہیم دین بنیادی شرط ہے۔ حقیقت میں ایک مسلم استاد' قیادت کے منصب پر اس وقت فائز ہوتا ہے' جب اس کا تخصص علمی (Specialization) تفقہ فی الدین ہوتا ہے اور اس کے لئے اس کے پاس وہ بنیادی اور ضروری علم ہوتا ہے' جو انسان کو انسان بناتا ہے' حیوانیت سے درجہ بلند کرتا ہے' بنیادی اخلاق سکھاتا ہے' جو اسلامی اقدار کو فروغ دیتا ہے' اور پھر امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے حوالے سے انسان کو جہاد فی سبیل اللہ میں شریک کرتا ہے۔ یہی فی الحقیقت ہماری تعلیم کی اصل غایت ہے اور اس کی تکمیل' منصب معلمی کا بنیادی تقاضا ہے۔

ان ساری خصوصیات کے حوالے سے معلم برسوں میں ایک خاص مقام بناتا ہے۔ اس کی علمی وجاہت اور اخلاقی تمکنت' اسے ایک خاص کردار اور خاص تشخص عطا کرتی ہے۔ اس تناظر میں نوجوان معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ بزرگ صاحب علم و عمل اساتذہ سے رہنمائی حاصل کرے۔ اگر نوجوان اساتذہ اپنے پیش رو اساتذہ سے بے تعلق ہو جائیں اور علم و کردار میں ان اساتذہ سے استفادہ کرنے میں بے نیاز ہو جائیں' تو وہ اعلیٰ تہذیبی اور علمی مقام مشکل سے ہی حاصل کر پائیں گے۔ ہمیں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ہوگی کہ مفاد پرست اور لادینیت پسند افراد ہمارے ایک ایک لفظ اور ہماری ایک ایک حرکت کا جائزہ لینے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ لیکن ان کا بس اسی وقت چلتا ہے جب ہمارا تعلق اللہ اور اللہ کے

رسول ﷺ سے کم ہوتا ہے۔ آج ہماری اصل جنگ ملحد' لادین' لبرل اور کرپٹ گروہ سے ہے۔ لہٰذا آج کے معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلامانہ ذہن کے طلسم کو توڑے اور غالب اسلامی ذہن کے ساتھ علوم کا مطالعہ کرے۔ حصول رزق کو دنیا پرستی کی شکل نہ دے اور اپنے علمی' تدریسی اور تخلیقی کام کو خدا کی عبادت کے جذبے سے انجام دے۔ روپے پیسے تو اس دنیا میں تیسرے چوتھے درجے کی چیز ہے۔ اصل کام مستقبل کی علمی امامت' اخلاقی قیادت' نظریاتی سیادت اور گہری سیاسی اثر اندازی کی صلاحیت حاصل کرنا ہے۔ استاد کی شخصیت اگر اعلیٰ اخلاقی معیار کی حامل ہے اور وہ معمولات حیات میں ایک قابل رشک مثال قائم کرتا ہے تو طلبہ کے لئے وہ زیادہ قابل تقلید نمونہ ہے جس کے اثرات ساری زندگی برقرار رہ سکتے ہیں۔

عالم اسلام کے ممتاز مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ایک وقیع تحریر سے معلم مطلوب سے متعلق ایک اقتباس' جو موضوع کو بڑی خوبصورتی سے واضح کرتا ہے' ملاحظہ ہو:

> "اگر آپ ایک ایمان دار اور باضمیر قوم تیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ تمام نظام بدلنا ہوگا۔ یہ مخلوط تعلیم' یہ فرنگی طرز زندگی سب چھوڑنا ہوگا اس کے لئے ایسے معلمین اور معلمات کی ضرورت ہے جو سیرت و اخلاق اور اعلیٰ قابلیت کے حامل ہوں۔ یاد رکھئے فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی' اخلاقی' اور عملی تربیت نہیں دے سکتے' جن کی ہمیں نئے دور کے لئے ضرورت ہے۔ تعلیم اگر بگڑے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو وہ آئندہ نسل کا ستیاناس کر دے گی۔ اس لیے اگر ہم اپنی قومی زندگی کو خرابیوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں؟ تو سب سے پہلے ہمیں اپنے اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ماحول کی تطہیر سے اس کا آغاز کرنا ہوگا۔"(ماہنامہ تعلیمات لاہور' سید مودودی نمبر' 1979)

سید مودودیؒ کی ایک اور گراں قدر تحریر "مسلمانوں کے لئے جدید تعلیمی پالیسی اور لائحہ عمل" سے ایک فکر انگیز اقتباس:

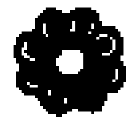
> "اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کا انحصار بڑی حد تک معلمین کے علم و عمل پر ہے۔ جو معلم خود اس روح سے خالی ہیں بلکہ خیال اور عمل دونوں میں اس کے مخالف ہیں' ان کے زیر اثر رہ کر متعلمین میں اسلامی اسپرٹ کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟۔۔۔۔۔۔ کسی شخص کا محض [illegible]

یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پورا اور پکا مسلمان ہو۔"

(تنقیحات ' ص ص 280-281)۔

آخر میں' میں صرف اس نکتہ کی تجدید کرنا چاہتا ہوں کہ ایک صاحب علم اور صاحب کردار استاد کی ہر زمانے میں قدر ہے۔ آپ اپنی معلمانہ صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لئے جو بھی جائز صورتیں ہوں' ان سے بھرپور استفادہ کریں۔ مثلاً" اگر آپ کو تعلیمی سیمینارز' ورکشاپس' کانفرنسز اور دیگر میٹنگز میں شرکت (Participation) کا موقع ملے' تو ان میں پوری تیاری کے ساتھ شریک ہوں اور ان سے بھرپور علمی استفادہ کریں۔ اپنے ذاتی مطالعہ و تحقیق اور اپنی تعلیمی اور پیشہ ورانہ قابلیت میں مسلسل اضافہ کریں۔ آپ اسلامی روایات کے امین وہ اساتذہ ہیں جو روشن ضمیر' روشن کردار' عظیم اور خوش نصیب لوگ ہیں' جو درحقیقت جہاد میں ہیں اور مجھے امید ہے کہ آنے والے وقت میں ایک روشن تاریخ کا باب بھی آپ ہی نے لکھنا ہے اور علمی قیادت بھی انشاء اللہ آپ ہی کے پاس ہوگی۔

(تنظیم اساتذہ پاکستان کے زیر اہتمام سہ روزہ انٹرنیشنل ایجوکیشن کانفرنس منعقدہ فیصل آڈیٹوریم' پنجاب یونیورسٹی لاہور' 28 دسمبر 1995ء کے دوسرے سیشن میں پیش کیا گیا۔۔۔ ماہنامہ مجلّہ افکار معلم لاہور' جلد 10 شمارہ 5' مئی 1996ء)



مسلم مفکرین کے تعلیمی نظریات

سید علی ہجویریؒ کے تعلیمی نظریات

(1009-1074ء)

برصغیر پاک و ہند میں اصلاحی اور تبلیغی کوششوں میں علماء اور صوفیاء کا حصہ نمایاں ہے۔ یہ انہی بزرگوں کی دعوت کا اثر ہے کہ اس خطے میں اسلام کسی نہ کسی صورت نظر آرہا ہے۔ برصغیر کے ان ہی صوفیاء میں سے ایک اہم شخصیت جسے ہر مکتبہ فکر کے لوگ عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں' شیخ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ کی ذات گرامی ہے۔ آپ نے درس و تبلیغ اور اپنے عمل کے ذریعے ان گمراہ کن تصورات کی نفی کی' جو تصوف اور روحانیت کے نام پر مسلمانوں میں پھیلائے گئے تھے۔ اس طرح آپ نے جاہل صوفیوں اور ان کے گمراہ کن عقائد کی بے لاگ تردید کی۔ سید علی 400 ہجری میں غزنی شہر سے متصل ایک بستی ہجویر میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام سید عثمان جلابی ہے۔ جلاب بھی غزنی سے متصل ایک بستی کا نام ہے۔ علی ہجویریؒ' محمود غزنوی کے بیٹے ناصر الدین محمود کے زمانے (431 ہجری بمطابق 1039-1040ء) میں لاہور تشریف لائے اور لاہور ہی میں بعض روایات کے مطابق 465ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کا سارا گھرانا زہد و تقویٰ کا گھرانا تھا۔ آپ خود تفسیر و حدیث اور تصوف کے عالم تھے۔

سید صاحب ایک باثر عالم اور صاحب تحقیق بزرگ شخصیت تھے۔ آپ نے بہت کچھ لکھا' لیکن جس کتاب کو عالمی شہرت حاصل ہوئی' وہ ان کی شہرہ آفاق تصنیف "کشف المحجوب" ہے۔ یہ کتاب برصغیر میں فارسی زبان میں اسلامی تصوف پر پہلی اہم کتاب ہے اور علم تصوف پر سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا انداز معلمانہ اور محققانہ ہے اور اسکا اہم مقصد جیسا کہ سید صاحب نے خود تحریر فرمایا ہے' یہ تھا کہ یہ ان لوگوں کے دلوں کو صیقل کرے گی جو ہر چند کہ تاریکی کے پردے میں گرفتار ہیں لیکن نور حق کا سرمایہ ان کے دل میں موجود ہے۔ آپ نے مختلف مسائل اور امور کی وضاحت میں مختلف مثالیں' حکایات اور بزرگوں کے اقوال بیان کئے ہیں تاکہ ان کی تفہیم آسان ہو جائے۔ اپنی بات کی وضاحت میں آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ کے علاوہ اسلامی تاریخ سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی اس رائے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جو [illegible] "کشف المحجوب" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

اگرچہ سید صاحب نے تعلیم و تعلم کے حوالے سے کوئی باقاعدہ کتاب تو نہیں لکھی اور نہ اپنی کسی کتاب میں تسلسل سے اپنے تعلیمی نظریات بیان کئے ہیں تاہم "کشف المحجوب" میں جابجا ان کے تعلیمی فلسفے کا اظہار ملتا ہے۔ ہر چند کہ کشف المحجوب کے علاوہ آپ کی بعض اور تصانیف بھی ہیں مثلاً" منہاج الدین' کتاب الفنا و البقا ' الرعایتہ لحقوق اللہ' اسرار الخرق والمؤنات' بحر القلوب اور کتاب البیان لاال العیان' لیکن ان کی تعلیمی نظریات کے بارے میں زیادہ تر انحصار "کشف المحجوب" ہی پر کیا گیا ہے۔

ذیل میں سید صاحب کے فلسفہ تعلیم پر انتہائی اختصار سے مختلف ذیلی موضوعات کے تحت ایک مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اس کے مجموعی تاثر سے ان کا نظریہ تعلیم قائم کیا جاسکے۔

تعلیم کی فکری اساس

1:0 تصور حقیقت

تصور حقیقت (Ontology) کے سلسلے میں سید صاحب کا ایک واضح نقطہ نظر ہے۔ ان کے نزدیک اس عالم وجود کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی حکمت پوشیدہ ہے اور وہی اس کا پورا نظام چلا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی قادر مطلق اور خالق کائنات ہے۔ بندہ کا فرض ہے کہ وہ خالق کے احکام کی تعمیل کرے۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ حمد درحقیقت اس پروردگار کو زیبا ہے' جس نے اپنی کبریائی کی تجلیات سے نوع انسانی کے مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ سچے مومن کی یہ واحد نشانی ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کو قضائے الٰہی اور مشیت ایزدی کے سپرد کرے اور قدم بہ قدم اس سے اعانت چاہے۔ علامہ اقبالؒ کے نزدیک بھی تصور حقیقت کی بنیاد "عشق" ہے اور سید ہجویریؒ کا بھی یہی نظریہ ہے۔ البتہ "عشق" کی جگہ سید صاحب نے "مجاہدہ اور کشف" کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ سید صاحب کے تصور حقیقت کو تین ذیلی موضوعات یعنی تصور خدا' تصور کائنات' اور تصور انسان کے تحت واضح کیا جاتا ہے:

1:1 تصور خدا

فلسفیوں نے خدا کے بارے میں تین طرح کے نظریات پر بحث کی ہے۔ یہ نظریات ان اصطلاحوں سے معروف ہیں۔

(1) عقیدہ کثیر الٰہیہ (2) عقیدہ ثنویت (3) عقیدہ توحید

عقیدہ کثیر الٰہیہ یا کثرت پر [illegible]

ایک دوسرے سے مختلف بھی ہوتے ہیں اور منفرد بھی۔ یہ دراصل مشرکین کا عقیدہ ہے۔ عقیدہ ثنویت یا ذوپرستی میں دو خداؤں کا تصور ہے۔ یہ بھی مشرکین کے ایک گروہ کا فلسفہ ہے۔ عقیدہ توحید یا وحدت پرستی ایک خدا پر یقین اور ایمان کا نام ہے۔ اسلام میں اس فلسفہ پر اس وضاحت کے ساتھ یقین رکھا جاتا ہے کہ خدا ایک ہے‘ وہی اصل حقیقت ہے اور حاکمیت بھی اسی کو زیبا ہے۔ سید علی ہجویریؒ اس نقطہ نظر سے موحد تھے۔ انہوں نے اپنے نظریہ توحید کی بنیاد قرآن و سنت پر استوار کی۔ ان کے نزدیک خدا کی معرفت کے سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی توحید کا صحیح علم ہے۔ توحید کے بغیر کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہے۔ خدا کی معرفت اور اس کی توحید کا علم حاصل ہونے کے باوجود‘ جو چیز خدا کی راہ پر چلنے میں انسان کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے‘ وہ ایمان کا موجود نہ ہونا یا اس کا ناقص اور کمزور ہونا ہے۔

1:2 تصور کائنات

سید صاحب کا کائنات کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات ایک مقصد اور ارادے سے تخلیق کی۔ صرف اللہ کی ذات ہی قائم رہنے والی ہے۔ باقی یہ ساری دنیا فانی ہے اور اسے بالآخر فنا ہی ہونا ہے۔ اس سوال کے بارے میں کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی۔ علی ہجویریؒ کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ---- یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق تخلیق ہوئی۔ اس کی بقاء کا سارا دار و مدار خدا کی مرضی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے اور مخلوق میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ طالب حق کو چاہیے کہ سب اعمال اس طریقے سے انجام دے‘ گویا خدا اس کو اور اس کے افعال کو دیکھ رہا ہے‘ کیونکہ خدا سے کوئی بھی عمل پوشیدہ نہیں۔

1:3 تصور انسان

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بامقصد پیدا کیا ہے۔ اسے خلیفتہ اللہ فی الارض کا منصب جلیلہ عطا فرمایا اور تمام مخلوقات میں اشرف ٹھہرایا۔ لہٰذا بندہ کا یہ فرض ہے کہ وہ خالق کے احکام کو پورا کرے۔ انسان کا صحیح علم حق تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے۔ سید علی ہجویریؒ کے نزدیک انسانی علم کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ یہ جان لے کہ فی الحقیقت وہ کچھ نہیں جانتا۔ ہر وہ کام جس میں انسان کے پیش نظر حق تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو‘ وہ اغراض نفسانی کے تحت ہوتا ہے اور جس کام میں نفسانی غرض شامل ہو جاتی ہے‘ اس [illegible] آدمی کا دل راہ حق سے منحرف ہو جاتا ہے۔ جن چیزوں سے

بارے میں آدمی خود جانتا ہے کہ یہ خدا کی نافرمانی کے کام ہیں' ان کو وہ ترک کرے اور جس کو خدا کے عائد کردہ فرائض اور پسندیدہ کام جانتا ہے ان کے لئے کمربستہ ہو۔ بندے کے لئے ایمان کی شرط ضروری ہے۔ ایمان کے بعد طہارت بندے کے لئے فرض ہو جاتی ہے۔ ہر قسم کی نجاست سے پاکیزگی ایک لازمی شرط ہے۔ سید صاحب کے نزدیک طہارت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک طہارت ظاہری اور دوسری طہارت باطنی اور یہ دونوں یکساں ضروری ہیں۔ سید صاحب کی رائے میں دنیا کا کوئی بھی جائز اور حلال کام کسی انسان کے مرتبہ سے فروتر نہیں ہے۔ انسان اور انسانیت کے مرتبے سے اگر کوئی شے فروتر ہے تو وہ یہ کہ وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کے کسی کام کا ارتکاب کرے۔ فی الحقیقت انسان کو چاہیے کہ وہ کسی کام میں نفس کی خواہش کو کوئی دخل نہ دے بلکہ محض حق تعالیٰ کی رضا کی خاطر کامل خلوص سے ہر کام کو سرانجام دے۔

2:0 تصور علم

تصور علم (Epistemology) کے سلسلے میں سید علی ہجویریؒ قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کو دائمی اور قطعی سرچشمہ علم سمجھتے ہیں' کیونکہ ان کی نظر میں یہی وہ سرچشمہ ہے جس میں علم کی عظمت کا ذکر ہے۔ سید صاحب کی رائے میں راہ راست کی طلب کے لئے پہلا قدم صحیح اور قابل اعتماد علم کا حصول ہے۔ کیونکہ صحیح علم کے بغیر نہ آدمی صحیح راہ پاسکتا ہے اور نہ اس پر چل سکتا ہے۔ دین میں جس علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اس سے مراد دنیا جہاں کے ہر علم کا حصول نہیں' کیونکہ دنیا میں تو علوم بے شمار ہیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی شریعت اور خصوصاً اس کے فرائض اور واجبات کے علم کا حصول ہی فرض یعنی لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کا اس حد تک حصول جس حد تک شریعت الٰہی کے احکام اور ان کے مختلف پہلو سمجھنے کے لئے درکار ہوں' وہ خود بخود ضروری ہوجاتا ہے۔ تمام علوم کا سیکھنا انسان پر فرض نہیں۔ کیونکہ علوم بہت ہیں اور انسان کی عمر تھوڑی۔ مثلاً فلکیات' حساب' طب اور علم بدیع کی تمام صنائع بدائع وغیرہ کا پڑھنا ضروری نہیں۔ البتہ فلکیات کا سیکھنا اس قدر ضروری ہے' جس سے امور شریعت کی تکمیل میں آسانی ہو' جیسے رات میں اوقات نماز معلوم کرنا۔ اسی طرح بیماری سے بچنے کے لئے طب' وراثت کے مسائل کے لئے علم میراث اور احکام شریعت کی تفہیم کے لئے علم فقہ وغیرہ۔ غرضیکہ علم کا سیکھنا اس قدر فرض ہے جس سے عمل درست ہو۔ غیر مفید علم نہیں سیکھنا چاہیے۔ جو لوگ علم سے مرتبہ اور دنیاوی عزت طلب کرتے ہیں وہ عالم نہیں ہوتے' کیونکہ مرتبہ اور دنیاوی عزت کی طلب جہالت کے لوازم میں سے ہے

صفت ہے جس سے جاہل عالم ہو جاتا ہے۔ علم کی نفی جہالت ہے اور علم کا ترک کرنا بھی جہالت۔ جاہل بہر صورت قابل ملامت ہوگا اور جہالت کفر اور باطل کی علامت ہوگی۔ کیونکہ امر حق کا امر باطل سے کوئی تعلق نہیں اور یہ جہالت اور ترک علم تمام مشائخ و صوفیاء کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ انسان کا صحیح علم حق تعالیٰ کے احکام اور اس کی ذات و صفات کی معرفت ہے۔ دراصل اخلاص کے ساتھ احکام الٰہی کی پیروی ہی حقیقی علم و حکمت ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ بے شعور ہے۔

2:1 علم کی اقسام

جہاں تک علم کی اقسام کا تعلق ہے۔ سید علی ہجویریؒ نے اس کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک خداوند تعالیٰ کا علم اور دوسرا مخلوق کا علم۔ خداوند تعالیٰ کا علم اس کا اپنا اور اس کی ذاتی صفت ہے اور اس کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے علم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ وہ تمام موجودات کو بھی جانتا ہے اور تمام معلومات کو بھی۔ اس کے برعکس مخلوق کا علم سب کا سب خدا کا عطا کردہ ہے اور اس کی ایک حد اور انتہا ہے' جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے۔ یہ حاصل بھی ہوتا ہے اور ضائع بھی۔ جن علوم کا سیکھنا انسان کے لئے فرض ہے' اس کے دو حصے ہیں۔ ایک علم حقیقت اور دوسرا علم شریعت۔ علم حقیقت کے تین ارکان ہیں:

(1) خدا کی ذات' اس کی توحید اور شرک کی حدود کا علم (2) خدا کی صفات اور اس کے احکام اور فرامین کا علم (3) خدا کے افعال اور ان کی حکمتوں کا علم۔۔۔۔علم شریعت: اس کے بھی تین ارکان ہیں (1) خدا کی کتاب (2) رسول ﷺ کی سنت (3) اجماع امت۔

سید صاحب نے علم کے ساتھ فکر کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے کیونکہ تدبر اور تفکر کے بغیر نہ تو آدمی کے اندر صحیح فہم پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر علم آدمی کی زندگی پر کوئی گہرا اور دیرپا اثر ڈال سکتا ہے۔ تدبر اور تفکر اور رجوع الی اللہ جیسی چیزیں' مجاہدوں کی کثرت (یعنی ایمان کی روشنی میں عمل صالح اور اخلاص پر مبنی عبادات کے حوالے سے پیہم جدوجہد) کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں۔

2:2 ذرائع علم

خدا کی معرفت اور اس کے متعلق صحیح علم رکھنے کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت عقل سے حاصل ہوتی ہے اور سوائے عقل (Rationally) کے اس کی معرفت کسی کو روا نہیں۔ لیکن سید صاحب کے نزدیک یہ

قول باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت صرف اللہ کی عنایت اور مشیت الٰہی ہی کی وجہ سے ہے۔ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر محض دلیل سے استدلال کرنا اور اس پر غور کرنا بھی خطا ہے۔ عقل بلاشبہ عطیہ ربانی ہے لیکن یہ حتمی علم نہیں بلکہ ظنی ہے۔ عقل کی اہمیت صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے اگر وہ اسلامی اصولوں اور ضوابط یعنی حتمی اور برتر ذریعہ علم (وحی الٰہی) کے تحت ہو۔ ذرائع علم کے بارے میں سید علی ہجویریؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حقیقت اصلیہ کو پانے کے لئے صرف وحی الٰہی یعنی قرآن و سنت ہی واحد اور قطعی ذریعہ ہے۔ سید صاحب وجدانی علم (Intuitive Knowledge) اور استنتاجی استدلال (Deductive Reasoning)کو بھی اہم ذرائع سمجھتے ہیں' لیکن حقیقت اصلیہ (Ultimate Reality) کو پانے کے لئے وہ وحی و الہام کو ہی صحیح ذریعہ علم تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق اس ذریعہ علم کو عقلی دلیل کے معیار سے نہیں پرکھا جاسکتا۔ بہر حال مختلف ذرائع علم مثلاً" عقل' وجدان اور مشاہدہ اسی صورت قابل قبول ہوسکتے ہیں اگر وہ مستقل اور قطعی سرچشمہ علم یعنی وحی الٰہی (قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ) کے تابع ہوں۔

2:3 معرفت الٰہی

معرفت الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت یہ ہے کہ خداوند کریم کے بارے میں انسان کا صحیح علم ہو۔ اس میں کوئی ٹیڑھ اور مغالطہ نہ رہے۔ حالی معرفت یہ ہے کہ بندے کا حال (اس کی عملی زندگی) اس کی علمی معرفت کی آئینہ دار اور مجسمہ ہو۔ حالی معرفت علمی معرفت پر فضیلت رکھتی ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ علم' حال کے بغیر ہوسکتا ہے لیکن حال' علم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عارف جاہل نہیں ہوسکتا اور جاہل عارف نہیں ہوسکتا۔ سید صاحب کے نزدیک خدا کی صحیح معرفت کا ذریعہ خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم اور آخری رسول ﷺ کی سنت ہے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم' تفہیم اور تعمیل کے بغیر معرفت الٰہی ممکن نہیں۔

2:4 علم اور تصوف

تصوف اور صوفی لفظ صفا سے مشتق ہیں۔ اس کی ضد کدر (کدورت) ہے۔ جس شخص نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذب بنایا اور اپنی طبیعت کو کدورت' کھوٹ اور میل سے پاک صاف کرلیا اور حق تعالیٰ کی سچی عبودیت کا وصف اپنے اندر پیدا کرلیا تو وہ صوفی بن گیا اور اہل تصوف میں شامل ہوگیا۔ صوفی پر ضرور [illegible]

صوفی وہ ہے جو دین اسلام کو اس کے حقیقی معنی میں سمجھتا ہو۔ صرف رنگ برنگے کپڑے پہننے سے کوئی صوفی نہیں بن جاتا۔ بلکہ نفس کو ہر ناپسندیدہ رجحان اور میلان سے پاک کرکے نیکی، خداترسی اور فضائل اخلاق سے آراستہ ہونے میں درجہ کمال تک پہنچنے کا نام ہی تصوف ہے۔ ذاتی اغراض و خواہشات کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ صوفیاء کے نزدیک علم تین ہیں۔ علم باللہ، علم مع اللہ اور علم من اللہ۔ علم باللہ سے مراد علم طریقت، علم مع اللہ سے مراد مقامات طریقت اور اولیاء کے درجات کا علم، اور علم من اللہ سے مراد علم شریعت ہے۔

سید صاحب کی رائے میں صوفی فی الحقیقت وہ ہے جس نے اپنے اخلاق و معاملات کو مہذب اور اپنے نفس کو آفتوں اور بلاؤں سے پاک صاف کر رکھا ہو۔ جو شخص جس قدر بھی اچھے اخلاق رکھتا ہے اور نفسانی لذتوں کو چھوڑتا ہے۔ وہ سب سے بہتر صوفی ہے۔ تصوف میں طریق ملامت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ملامت کی خواہش اور طلب درست نہیں ہے یہ عین ریا ہے اور ریا عین نفاق ہے۔ پس درویش اور فقیر وہ ہے جسے غیر اللہ سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہ رہے۔ اسے صرف خدا کی رضا مطلوب ہو، اسے اس کی کوئی پروا نہ ہو کہ مخلوقات اسے پسند کرتی ہے یا ناپسند۔ کون اسے داد دیتا ہے اور کون ملامت کرتا ہے۔

سید صاحب کی نظر میں صوفیائے کرام کے امام خلفائے راشدین تھے۔ آپ نے اصحاب عظام، اہل بیت، اہل صفہ، تبع تابعین، آئمہ اور صوفیائے متاخرین کا ذکر کیا ہے۔ اس فہرست میں آپ نے خلفائے راشدین کو مقدم رکھا ہے۔۔۔۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ اسلام کے گل سرسبد، اہل تجرید (وہ لوگ جو معمولی سے معمولی آلائشوں سے بھی اجتناب کے لئے کوشاں رہیں) کے امام اور اہل تفرید (جو نہایت باریک بینی کے ساتھ غلط کو صحیح سے الگ چھانٹ دیتے ہیں) کے شہنشاہ ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق فرماتے ہیں کہ دینی فراست و دانش، باریک بینی اور خدا کی محبت میں استغراق آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شرم و حیا اور تسلیم و رضا میں صوفیاء کے امام ہیں۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کا ذکر یوں کیا ہے کہ راہ طریقت میں ان کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ علم اور فہم دین میں آپ کا مقام بہت بلند ہے اور اصول حقیقت میں آپ بے نظیر ہیں۔۔۔۔ بحیثیت مجموعی سید علی ہجویریؒ کے نزدیک ایک صوفی، درویش اور فقیر کے لئے اصل کسوٹی اسلامی شریعت ہی ہے۔

علم و عمل

عمل وہ ہے جس کی بنیاد علم پر ہو۔ عمل کے بغیر علم

نافع ہے نہ علم کے بغیر عمل نفع بخش ہے۔ جس علم کی پشت پر عمل موجود نہ ہو وہ علم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے۔ جہاں ایک طرف علم سے صحیح عمل کی راہ کھلتی ہے اور آدمی کو جائز اور ناجائز بھلے اور برے میں تمیز حاصل ہوتی ہے' وہاں دوسری طرف معلوم پر عمل پیرا ہونے ہی سے علم سے نفع اور فیض حاصل ہوتا ہے اور مزید علم کی راہ کھلتی ہے۔ عوام الناس کے دو طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو علم کو عمل پر فضیلت دیتا ہے اور دوسرا طبقہ عمل کو علم پر۔ لیکن سید صاحب کے نزدیک دونوں نقطہ ہائے نظر صحیح نہیں۔ اس لئے کہ علم کے بغیر عمل' عمل نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ عمل اسی وقت ہوتا ہے جب علم اس کے ساتھ شامل ہو۔ عمل درحقیقت علم ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ سید صاحب نے اپنے نظریہ کی وضاحت میں امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ علم عمل کے بغیر ایسے ہے جیسے جسم روح کے بغیر۔ جس نے عمل نہ کیا تو گویا اس کے پاس علم ہی نہیں۔ سید صاحب نے علم کے باب میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ محض علم ہی ہدایت کے لئے کافی نہیں' اگرچہ حقیقت اور شریعت کے علوم ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ طلب ہدایت کے لئے ان علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے' مگر ہدایت' اللہ تعالیٰ کی عنایت اور عطا سے حاصل ہوتی ہے۔ سید علی ہجویریؒ نے اکثر جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ کوئی عالم ہو یا صوفی یا فقیر' شریعت کا علم سب کے لئے لازم ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ علم کے ذریعے ایک سالک' مراتب اور درجات کے حصول کے قابل ہوتا ہے' اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ حاصل کردہ علم پر عمل بھی کرتا ہو۔ آپ کے نزدیک ظاہر بغیر باطن کے منافقت ہے اور باطن بغیر ظاہر کے زمزمہ۔ علم باطن' حقیقت اور علم ظاہر' شریعت ہے۔ ان کے نزدیک شریعت نام ہے قرآن کریم' سنت رسول ﷺ اور اجماع امت کا۔ مزید فرماتے ہیں کہ جس شخص کو خدا کا علم یعنی علم حقیقت نہیں' اس کا دل جہالت کے سبب مردہ ہے۔ اور جسے اس کا عنایت کیا ہوا علم شریعت حاصل نہیں' اس کا دل نادانی کے مرض میں مبتلا ہے۔ گویا آپ نے حقیقت و شریعت دونوں کے علم کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔

3:0 تصور قدر

تصور قدر (Axiology) سے متعلق سید صاحب کا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ جو طرز فکر اور جو طرز عمل' اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے پسندیدہ قرار دیا ہے' وہی سب سے بڑی قدر ہے۔ جس چیز میں اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ راضی ہے وہ خیر ہے اور جس میں وہ راضی نہیں' وہ شر ہے۔ اس حوالے سے سید صاحب کے نزدیک سب سے بڑی قدر یہ ہے کہ بندہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا کے سامنے سر تسلیم [illegible]

3:1 تعمیر سیرت

سید صاحب نے قدر اعلیٰ یعنی حصول رضائے الٰہی کے تناظر میں اطاعت حق، مجاہدہ، تزکیہ نفس، فقر و استغنا، جود و سخا، ایثار اور قربانی پر خاصا زور دیا ہے۔ آپ نے علمی معلومات کی فراہمی کو بلاشبہ اہمیت دی ہے، لیکن سید صاحب کے نزدیک جو علم، افراد کے اعتقادی اور روحانی وجود کی تعمیر نہیں کرتا اور انہیں اخلاقِ علو کا حامل نہیں بناتا، وہ افراد کی شخصیت کی متوازن اور صحت مند تربیت کبھی نہیں کرسکتا۔ سید صاحب کی فکر میں یہ اساسی نکتہ مضمر ہے کہ تعلیم بنیادی طور پر انسان کے اخلاقی، اعتقادی یا روحانی وجود کی نشوونما کے لئے ہوتی ہے۔ اس حوالے سے طبعی وجود کو لازماً اخلاقی وجود کے تابع ہونا پڑے گا۔۔۔۔ اور یہی وہ تعلیمی اصول ہے جسے سید صاحب نے اپنی عارفانہ اصطلاح (Mystic Terminolgy) میں مختلف انداز میں واضح کیا ہے۔۔۔۔ سید صاحب کے نزدیک اخلاق کے دو اجزا ہیں۔ ایک خالق کے ساتھ اخلاق اور دوسرا مخلوق کے ساتھ اخلاق۔ خالق کیساتھ اخلاق یہ ہے کہ بندہ، اس کی قضا پر راضی ہو، اس کا ہر فیصلہ اسے بسر و چشم قبول ہو۔ مخلوق کے ساتھ اخلاق یہ ہے کہ خدا کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے انہیں ادا کرے۔ اس کام میں کوئی غرض اس کے سامنے نہ ہو۔ شیطان اور خواہشات نفسانی کی پیروی ہرگز نہ کرے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ عزت، چھوٹوں سے شفقت اور اپنے ہم مرتبہ لوگوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کرے۔ اس حوالے سے شریعت الٰہی میں سب سے پسندیدہ راہ، اعتدال کی راہ ہے۔

3:2 نظریہ ادب

ادب سیکھنے کے معنی اپنے اندر نیک خصلتوں کو جمع اور پرورش کرنا ہے۔ یعنی جس شخص میں عمدہ خصلتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے۔ انسان کے آداب کا عمدہ ہونا اس کے ایمان کا ضروری حصہ ہے۔ معاملات اور تعلقات میں پاس ادب خوبی کی چیز ہے۔ وہ لوگوں سے حسن سلوک اور مروت سے پیش آئے اور اپنی عزت کی حفاظت کرے۔ دین میں ادب ملحوظ رکھنے کے معنی سنت کی حفاظت کرنا ہے۔ خدا کا ادب یہ ہے کہ جو شخص خداوند تعالیٰ کے شعائر اور شواہد کی تعظیم اور نبی اکرم ﷺ کے اسوہ مبارکہ سے بے پرواہ ہو اس کا طریقت میں کوئی حصہ نہیں۔ تارک الادب کسی صورت میں ولی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کوئی انسان اپنے ہوش اور حواس میں قائم ہے، ہر حال میں آداب کی پیروی کرنا اس کے لئے لازم ہے۔ سید صاحب کے نزدیک ادب کی تین قسمیں ہیں۔

[illegible] کوئی ایسی حرکت نہ کربیٹھے جس سے اللہ اور اس [illegible]

کے رسول ﷺ ناراض ہوں۔
(2) آدمی سوائے سچائی کے کچھ نہ کہے۔ اس سے تمام معاملات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔
(3) آدمی کو اپنے ستر کی دوسروں ہی سے نہیں اپنے آپ سے بھی حفاظت کرنی چاہیے۔

سید صاحب کے اس نظریہ کی روشنی میں شعر و ادب کے موضوع اور اس کی پیش کش کا معیار تنقید بھی یہی اصول ہیں۔ چنانچہ ایک مسلمان ادیب اور فن کار وہی ہو سکتا ہے جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے زیر اثر اپنی تخلیقات پیش کرے اور اس کے قلم اور اسکی زبان سے کوئی ایسی چیز نہ نکلے جس سے اسلامی تعلیمات کی تضحیک یا نفی ہوتی ہو۔

عمل تعلیم

4:0 مقاصد تعلیم

سید علی ہجویریؒ کے نزدیک تعلیم کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں:
(1) عرفان الٰہی (2) احکام الٰہی اور سنت نبوی ﷺ کی پیروی (3) حق تعالیٰ کی رضا کا حصول (4) تعمیر سیرت اور کردار سازی (5) اکتفا' اتقاء' رزق حلال (روح اور جسم کی اصلاح کے لئے) (6) حق و صداقت اور عدل و مساوات (7) اسلامی تصور آخرت پر کامل عقیدہ (8) تدبر و تحقیق (9) سیادت عالم

5:0 نظریہ نصاب

سید صاحب نے نصاب تعلیم کا مرکز و محور' قرآن حکیم اور شریعت رسول ﷺ کو گردانا ہے۔ وہ نصاب کے رہبانی نظریہ کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان کے لئے اس قدر اور اس قسم کا علم حاصل کرنا ضروری ہے' جس سے اس کا عمل درست ہو سکے۔ اس کے علاوہ نصاب کی تشکیل و تکمیل کے سلسلے میں جو علم بروئے کار لایا جائے' وہ لازماً قرآن و حدیث کے تابع اور جس کا اصل مقصود طلب حلال اور اجتناب حرام ہو۔

5:1 وجد و سماع

مغربی نظریات سے متاثر بعض ماہرین تعلیم اس بات پر زور دیتے رہتے ہیں کہ تعلیمی نصابات میں رقص کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے' تاکہ اس سے طلبہ میں "لظم" پیدا ہو اور ان کی ذہنی اور جسمانی "نشوونما" ہو۔ ایسے نام نہاد ماہرین تعلیم اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں اکثر اوقات بعض صوفیاء کرام کا بھی حوالہ دیتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں "کشف المحجوب" کے مصنف (جو علم تصوف پر ایک سند ہیں) [illegible] طریقت دونوں کی رو سے [illegible]

وجدانی کیفیت میں ہی محسوس ہوتا ہے۔ سید صاحب کے نزدیک شریعت میں رقص کی کوئی سند موجود نہیں۔ اس لئے ناچنا' شرعاً" اور عقلاً" برا اور قبیح فعل ہے۔ سماع کے بارے میں سید صاحب کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ تمام سننے والی چیزوں میں' سماعت قرآن کا درجہ سب سے بلند ہے اور جو چیزیں قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف ہیں' ان کا سننا جائز نہیں۔ غرض سید صاحب کی نظر میں تمام حواس و اعضاء کا استعمال اسلامی تعلیمات کی روشنی ہی میں ہونا چاہیے اور اگر ان کا استعمال ان تعلیمات کے منافی ہے' تو یہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو ہرگز پسند نہیں۔

6:0 معلم مطلوب

طلبہ کی تعلیم و تربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی اوصاف کا کردار سب سے اہم ہوتا ہے۔ طلبہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ سید صاحب اپنے اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے "کشف المحجوب" میں انہوں نے اپنے کئی اساتذہ کا ذکر انتہائی فخر کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ ان کے اپنے اساتذہ کے بارے میں بیان کردہ خوبیوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو سید صاحب کے نزدیک ایک اچھے استاد میں درج ذیل خصوصیات کا ہونا قابل تعریف ہے۔

(1) عالم باعمل ہو (2) علوم و فنون میں ماہر ہو (3) شریعت اسلامی کا پابند ہو (4) علم سیکھنے کا عمل جاری رکھے اور اس میں کمال حاصل کرے۔ (5) فصیح البیان ہو (6) محققانہ تصنیفی کام کرتا ہو (7) طالبان حق کا اس پر اعتماد ہو۔ (8) شاگردوں سے محبت اور شفقت رکھتا ہو (9) طلبہ کی بات بہت توجہ سے سنتا ہو اور طلبہ بھی اس کی بات توجہ سے سنتے ہوں۔ (10) بیکار بحث و گفتگو اور لغو باتوں سے اجتناب کرتا ہو (11) نیک' خوش اخلاق اور ملنسار ہو۔ (12) اس کا کلام مہذب ہو اور اشارات لطیف دیتا ہو۔ان کے علاوہ اگر معلم میں مزید یہ اوصاف ہوں یا ان کے لئے کوشاں ہو تو وہ اہل علم و فضل کے حلقے میں انتہائی افضل استاد شمار ہوگا:

(1) جود و سخا (2) صدق و وفا (3) کشف و مجاہدہ (4) فراست و اصابت (5) حق کی بیباک ترجمانی (6) تسلیم و رضا

سید صاحب نے حارث بن اسدؒ کا یہ ارشاد بھی نقل فرمایا ہے کہ "زندہ رہنا ہے تو حق کے لئے رہ' ورنہ معدوم ہو جا" اور یہی ایک اچھے معلم اور ایک اچھے مسلمان کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح ایک جگہ معروف بن فیروز کرخیؒ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ جوانمردی میں تین باتیں ہیں ایک یہ کہ وفا جس کی خلاف ورزی نہ کی جائے' دوسرے یہ کہ [illegible] کی تعریف اور تیسرے عطیہ اور مستحق افراد کی ان

کے سوال کے بغیر اعانت۔ سید صاحب کے نزدیک ان اوصاف کے مالک استاد کا مقام یقیناً دین و دنیا میں بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہوگا۔

7:0 نظریہ قیادت

نظریہ قیادت سے متعلق دور حاضر کے جمہوری (Democratic)' آمرانہ (Authoritarion) اور عدم مداخلت یا آزاد قسم (Laissezfaire) کے نظریات قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان سب میں دو فکری نکات مرکزی حیثیت کے حامل ہیں۔ ایک مادہ پرستانہ اور دوسرا لادینی فلسفہ حیات۔ تعلیمی انتظامیات اور انتظام عامہ میں یہ بات ابھی تک زیر بحث چلی آرہی ہے کہ قیادت کا اسلوب (Leadership Style)کیا ہو؟ جس کی مدد سے وہ اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں سے بہتر طور پر کام لے سکے اور اچھے نتائج برآمد کرسکے۔ چنانچہ مغربی ماہرین تعلیم اب اس انداز پر سوچ رہے ہیں کہ جب تک انسانی روابط میں احترام و محبت اور باہمی اعتماد پیدا نہیں ہوگا' اس وقت تک مطلوبہ نتائج سامنے نہیں آسکتے۔ مگر ان تمام طریقوں میں ہمارے نزدیک سب سے بڑے خامی یہی ہے کہ وہ صرف مادی حصول ہی پر نظر رکھتے ہیں' اور ان کے انسانی روابط' ان کا لادینی' جمہوری اور آمرانہ فلسفہ صرف اس لئے ہے کہ کوئی ادارہ کتنا زیادہ پیداواری (Productive) ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کوئی سا بھی اسلوب قیادت ہو' اصل مقصد زیادہ مادی افادہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس سید علی ہجویریؒ ایک جامع نظریہ قیادت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک فضیلت اور قیادت کا معیار تقویٰ اور احسان ہے۔ رنگ' نسل' زبان' جغرافیہ' دولت غرض اس طرح کی کوئی چیز معیار نہیں۔ سید علی ہجویریؒ کے نزدیک انسانوں میں قیادت کا اہل وہی ہوسکتا ہے' جو علم و عمل میں اعلیٰ و ارفع ہو اور اپنے علم اور عمل کی بنیاد قرآن و حدیث پر استوار کرتا ہو۔ نیز اس میں بہت حد تک وہ اوصاف بھی موجود ہوں جو "معلم مطلوب" کے زیر عنوان آچکے ہیں۔ سید صاحب کے تصور قیادت کا اصل منبع بھی وہی ہے۔ جو دوسرے ممتاز مسلم فلسفیوں نے بیان کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید اور رسول ﷺ کا اسوہ حسنہ ہی وہ اصل سرچشمہ ہے جس کے آئینہ میں احترام آدمیت قائد کی وہ قوت تسخیر بنتی ہے' جس سے وہ عام لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتا ہے اور خیر کے کاموں کے لئے فعال کرتا ہے۔ سید صاحب کی نظر میں متلاشیان حق اور راہ ہدایت کے طلبگاروں کے لئے انسانوں کے اندر اہل حق کا ایک ایسا گروہ ہمیشہ موجود رہنا چاہیے' جو بندگان خدا کو حق کی طرف صحیح رہنمائی کرسکے۔ ان کے مطابق اسلام میں رہنمائی اللہ کی کتاب' رسول ﷺ کی سنت اور خلفائے راشدینؓ کی زندگی سے ملتی ہے۔ سید علی ہجویریؒ کے تصور قیادت کو سامنے رکھ [illegible]

امن و سلامتی، سکون، دینی و دنیوی ترقی اور ایک صاف اور شفاف معاشرہ صرف اسی صورت تیار ہوسکتا ہے، اگر دنیا میں فساق و فجار کی قیادت ختم ہو اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے امامت صالحہ کا نظام قائم ہو۔

8:0 مطالعہ و تحقیق

سید علی ہجویریؒ نے غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کی اہمیت پر خاصا زور دیا ہے۔ بقول ان کے جب اہل علم، تحقیق کا راستہ چھوڑ کر تقلید میں مبتلا ہوجاتے ہیں، تو تحقیق ان سے منہ چھپالیتی ہے۔ ان کے نزدیک راہ ہدایت اور راہ راست کی طلب کے لئے ضروری ہے کہ انتہائی قابل اعتماد اور مستند علم حاصل کیا جائے اور یہ قابل اعتماد اور مستند علم صرف تحقیق اور محنت شاقہ ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ معرفت الٰہی اسی بندے کو حاصل ہوتی ہے جس پر خدا کا خاص فضل و کرم ہو، وہی دل کو کشادہ کرتا ہے اور مہر لگاتا ہے۔ عقل اور دلیل، معرفت کا سبب ہوسکتی ہیں مگر علت نہیں۔ علت صرف اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے ملحدوں سے اور بالخصوص سوفسطائیوں (Sophists) سے خبردار کیا ہے، جن کے نزدیک کوئی شے شک و شبہ سے بالاتر نہیں اور جن کا یہ مذہب ہے کہ صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا حتیٰ کہ اپنی ذات کا بھی صحیح علم کسی کو نہیں۔ اس طرح سید صاحب نے سوفسطائیوں کے فلسفہ ارتیابیت (Scepticism) کو رد کیا۔ سید صاحب کی نظر میں ایک مسلمان محقق کے لئے ضروری ہے کہ انہی ذرائع علم پر یقین رکھے، جو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ ان کی رائے میں اللہ کی خصوصی عنایت کے بغیر علم و حکمت کی کاوشیں بے معنی ہیں۔ خدا کی راہ اختیار کرنے اور اس کے تقرب کے راستے کی پہلی رکاوٹ (حجاب) کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے ناواقفیت ہی پہلا حجاب ہے اور اس کا علاج اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم سے ہی ہوسکتا ہے۔ اس صحیح اور صادق علم کے حصول کا اصل تحقیقی منہج اور معیار نقد، خدا کی آخری کتاب اور اس کے آخری رسول ﷺ کی تعلیمات ہیں۔ ان کے سوا خدا کی صحیح معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ خلاصہ کے طور پر تدبر و تفکر اور تحقیق و جستجو ایک طالب حق کے لئے ضروری ہے اور اس کے لئے وہ اللہ کی عنایت کردہ صلاحیتوں اور قابلیتوں سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ اپنی تحقیقی کاوش کو لازماً وحی الٰہی کے تابع رکھے اور کسی صورت اس دائمی اور برتر سرچشمہ علم سے انحراف نہ کرے۔

(انجمن فاضلین، ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب لاہور کے زیر اہتمام [illegible] ایک تعلیمی نشست میں پڑھا گیا۔۔۔ ماہنامہ مجلہ [illegible] (1979 A [illegible])

علامہ اقبال کا تعلیمی فلسفہ اور مطلوب نوجوان

(1877ء - 1938ء)

علامہ اقبال کے نزدیک نظام تعلیم کی تفہیم کے ضمن میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ انسان مطلوب کے اہم خدوخال کیا ہونے چاہئیں۔ کیسا انسان؟ کیسا نظریہ؟ کیسی اقدار اور کون سا مقصد زندگی؟ اقبال کی نظر میں معلم و متعلم کو جب تک مقصد زندگی کا واضح شعور نہیں ہوگا اس وقت تک نہ تعلیمی نظام کی بہتر تشکیل ہوسکتی ہے اور نہ موثر تنفیذ۔ حقیقت میں علامہ نے بحیثیت مفکر تعلیم، تعلیمی عمل کے مختلف عناصر مثلاً تعلیم کی فکری، معاشرتی، معاشی اور نفسیاتی اساسات، نصاب، استاد، طالب علم، حکمت تدریس اور بحیثیت مجموعی پورے نظام تعلیم و تربیت پر اپنے مخصوص علمی و ادبی اسلوب میں بہت کچھ لکھا ہے جس پر کئی اصحاب علم نے بڑا مفید تحقیقی کام کیا ہے۔ لیکن ذیل کے مضمون میں انتہائی اختصار کے ساتھ صرف اس موضوع کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اقبال کے تعلیمی فلسفہ کے اہم نکات کیا ہیں اور وہ کس قسم کے نوجوان کے طالب تھے اور وہ اس میں کون سے اوصاف دیکھنا چاہتے تھے۔

تعلیمی فلسفہ

اقبال کے تعلیمی فلسفہ سے متعلق چند اہم نکات یہ ہیں:

(1) اقبال کے تعلیمی فلسفے کا نچوڑ یہ ہے کہ حقیقت اصلیہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ کائنات اس نے بامقصد بنائی۔ انسان کا مقصد زندگی، بندگئ رب ہے۔ علم کا دائمی اور بالاتر سرچشمہ علم، وحی الٰہی ہے۔ باقی تمام ذرائع اس کے تابع ہیں۔ اللہ کی رضا کا حصول ہی سب سے بڑی قدر ہے۔

(2) اقبال کے نزدیک توحید و رسالت کی تعلیم ہی وہ بلند ترین نصب العین ہے، جس پر اسلامی تہذیب کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ صحیح اسلامی نظام تعلیم وہ ہے جس میں کلمہ طیبہ کی روح شامل ہو۔ اقبال، تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کے لئے عشق رسول ﷺ کو بڑا مضبوط محرک تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ طلبہ کی ایسی تربیت ہو، جس کے نتیجے میں، وہ [illegible] کے تابع کریں۔ اپنے آپ کو پہچانیں، اپنے اندر مضمر قوتوں سے

آگہی حاصل کریں اور انہیں عمل صالح میں منتقل کریں۔

(3) اقبال، تعلیم کی تعمیر نو کے عمل میں اسلامی مقصد حیات سے وابستگی کو اساسی نکتہ قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ خودی کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ انسان کے اندر ایسی صفات پیدا ہوں جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کر سکیں۔ چنانچہ فرد کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کردہ ان تمام احکامات کی پیروی کرنا خودی کا اہم فریضہ ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کی اصل غایت انسان کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانا ہے اور جمود سے نکل کر تحرک کی صلاحیت کو اپنانا ہے۔ اس حوالے سے امت مسلمہ کی تعلیم کے چند اہم مقاصد یہ ہیں:۔

الف ایمان اور عمل صالح کی تربیت

ب - امت واحدہ کی تشکیل

ج - عسکری اور مادی قوت کا حصول

د - تخلیق، تحقیق، بصیرت اور اجتہاد کی صلاحیت

ھ - تسخیر کائنات اور امامت عالم کے لئے منظم جدوجہد

(4) اقبال کی تعلیمات کا یہ ایک اہم نکتہ ہے کہ ملت اسلامیہ ایک وحدت ہے اور اس کی قومیت، دین اور عقیدے سے بنتی ہے۔ چنانچہ وحدت انسانی اور اسلامی اخوت کی روشنی میں اسلام کے پوری دنیا پر گہرے تہذیبی و تمدنی اثرات ہیں۔ مسلمانوں کی اس عظمت رفتہ کی باز یابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ نصاب تعلیم کی اسلامی تشکیل کے لئے قرآن و حدیث کو اصل سرچشمہ ہدایت مانیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جدید دور میں سائنسی اور تکنیکی علوم کی تعلیم بھی انتہائی ضروری ہے۔ لیکن سائنسی علوم کے نصاب کی تدوین اور درسی کتب کی تیاری میں اسلامی زاویہ نگاہ سے اس کی از سر نو تدوین کی جائے۔ اسلامی تاریخ کی تدریس، مسلمانوں کے ملی شعور کو بیدار کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ اس حوالے سے دور حاضر کے مختلف نظریات مثلاً" اشتراکیت، سرمایہ داری، ملوکیت، نازیت، آمریت، فسطائیت اور لادینیت کو رد کیا جائے اور اسلام کی ہمہ گیر اور آفاقی برکات کو نژاد نو کے اذہان و قلوب میں راسخ کیا جائے۔

(5) اقبال تمام علوم کی اساس دین کو سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک فلسفہ، تمدن، طبیعات، طب، ریاضی، غرض تمام علوم کا اسلامی نقطہ نظر سے ناقدانہ مطالعہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ علوم کے ضمن میں مسلمانوں کے شاندار کارنامے جو ابھی تک مختلف کتب خانوں میں پنہاں ہیں، ان کے احیاء کی ضرورت ہے۔ ان علمی کارناموں کے بارے میں نوجوان نسل کو باخبر کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ وہ دور حاضر کے [illegible] سے نکلیں۔ اس

کے ساتھ طلبہ پر یہ واضح کیا جائے کہ اسلام ہر زمانے اور ہر علاقے کے لئے ایک زندہ دین ہے۔ اس کے اصول ابدی ہیں۔ اس حوالے سے نظام تعلیم کی تشکیل میں دین و دنیا کی تفریق کے مغربی تصور کو رد کیا جائے۔

(6) اقبال ایسے تعلیمی نظام سے نالاں ہیں جو طلبہ میں صرف درسی معلومات کو اہمیت دیتا ہے اور تربیت سے گریزاں ہے۔ ان کے نزدیک سیرت و کردار میں مثبت اور تعمیری تبدیلی کے بغیر کوئی شخص مہذب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال تعلیم کے تمام عناصر میں اصل روح "تربیت" کو ٹھہراتے ہیں' کیونکہ ان کے نزدیک تعلیم و تربیت کے باہم امتزاج سے ہی متوازن اور صحت مند نظام تعلیم تشکیل پاتا ہے۔

(7) اقبال کے نزدیک ایسی بنیادی تعلیم ضروری ہے جس سے طلبہ کو دین و دنیا کے تقاضوں کا شعور ہو۔ اس مقصد کے لئے قرآن و سنت کو نصاب کا لازمی حصہ ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ رزق حلال کے حصول کے لئے ضروری فنی تعلیم بھی بچوں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے اقبال نے ایک ایسی مثالی یونیورسٹی کا تصور پیش کیا جس کی اصل غایت اسلامی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ ہو' جس میں قدیم اور جدید علوم کی آمیزش دلکش انداز میں ہو جہاں اس کے تمام شعبے' اسلامی فکر کی روشنی میں عصر جدید کے تقاضوں کو اپنے نصاب کی اساس بنائیں۔

(8) اقبال کے فلسفہ تعلیم کی رو سے عمل تعلیم (Educational Process) میں مرکزی حیثیت معلم کو حاصل ہے۔ معلم کے لئے اپنے مضمون میں مہارت کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کی تفہیم ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ موثر تدریس کے لئے ضروری ہے کہ معلم ادب عالیہ سے بھی دلچسپی رکھتا ہو۔ وہ عربی' فارسی اور اردو زبانوں کا خاص ذوق رکھتا ہو۔ البتہ محض ادبی گفتگو اس کے درس کو موثر نہیں بناسکتی جب تک کہ معلم میں اخلاص کی صفت نہ ہو۔ اقبال تعلیم و تعلم اور فلسفہ و ادب کی مباحث میں آزاد خیالی (Free-Thinking) کے قائل نہ تھے۔ بلکہ وہ فکر و خیال کو لازماً الٰہی ہدایت کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بے مقصد ادب اور بے مقصد تعلیم کے خلاف تھے۔ اقبال کے نزدیک کتابی علم اور تقریری طریقہ تدریس ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ مطالعہ فطرت' مشاہدہ و تحقیق' بحث و تنقید اور تخلیق و اجتہاد کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بحیثیت مجموعی' فیض نظر' ان ہی اساتذہ سے حاصل ہوتا ہے جو اسلامی کردار کے مرقع اور عالم باعمل ہوں۔

(9) اقبال انگریزی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ البتہ انہوں نے اس تعلیم کی مخالفت کی

جو مسلم معاشرے کی خاندانی فضاء کو مکدر کروے۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کے نصاب میں اسلامی تاریخ، علم خانہ داری، اور علم صحت کو شامل ہونا چاہئے۔ اقبال مخلوط تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ وہ خواتین کی صحت مند نشوونما کے لئے حجاب اور ساتر لباس کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اقبال نے خواتین کی تعلیم و تربیت کے لئے جس کردار کو بطور نمونہ منتخب کیا۔ وہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ ہیں۔ اقبال انہیں ملت اسلامیہ کی ماؤں کے لئے نمونہ قرار دیتے ہیں۔

(10) بحیثیت مجموعی اقبال مغربی نظام تعلیم کو مسلمانوں کے لئے انتہائی غیر موزوں سمجھتے ہیں کیونکہ یہ نظام تعلیم جس مرکزی نکتہ کے گرد مرتب ہوتا ہے وہ الحاد اور سیکولرازم کے حوالے سے ہے۔ ان کے نزدیک مغربی علوم کا مطالعہ کیا جائے لیکن تنقیدی اور غالب نقطہ نظر سے، نہ کہ مرعوب اور مغلوب ذہن سے۔ اقبال کی نظر میں مغربی نظام تعلیم درحقیقت استعمار کا ایجنٹ بن کر مشرق بالخصوص مسلم امہ میں ملحدانہ اور لادینی تہذیب و افکار کے لئے فضاء سازگار بناتا ہے۔ اور نتیجے کے طور پر نوجوان نسل میں ذہنی انتشار کا باعث بنتا ہے۔

مطلوب نوجوان

علامہ کے فارسی اور اردو کلام نیز نثری نگارشات میں ایسا مواد کثرت سے ملتا ہے جس میں پوری نوجوان نسل علامہ کی مخاطب تھی۔ اقبال کے متعلم مطلوب کے خدوخال کا اندازہ ان نگارشات سے بھی بخوبی ہو سکتا ہے جو بظاہر ان کے بیٹے جاوید کے حوالے سے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ پوری نوجوان نسل کیلئے پیغام کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ اقبال محض فلسفی یا شاعر نہ تھے بلکہ ان کا فلسفہ اور سرمایہ شعر و ادب ایک مقصد کے تابع تھا۔ انہوں نے اپنے منفرد اسلوب کے حوالے سے اس اسلامی تعلیم و تربیت کے احیاء کی دعوت بڑے موثر حکیمانہ انداز میں دی جس سے مسلم قوم کا واضح تشخص ابھر کر سامنے آتا ہے۔ خدا، انسان اور کائنات کے بارے میں نظریات کی ایک جامع تصویر ابھرتی ہے۔ فرد کی زندگی کی اصل غایت کا پتہ چلتا ہے اور انسان مطلوب کے نقوش واضح ہوتے ہیں اور پھر اس سوال کا جواب بھی ملتا ہے کہ بحیثیت ایک فرد اور ایک ملت کے ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

علامہ کا عہد، ملت اسلامیہ کے حوالے سے ہمہ جہت انحطاط کا عہد تھا۔ دنیا کے بیشتر خطوں کے مسلمان اپنے شکوہ و جلال سے محروم ہو کر سیاسی، معاشرتی اور عملی زوال کا شکار تھے۔ خود برصغیر میں مسلمان اقتدار کے صبر آزما مرحلوں سے [illegible]

علامہ کی شاعری ایک نصب العین کے حصول کا ذریعہ تھی اور وہ نصب العین تھا لوگوں کو اسلامی نظام فکر کے تحت متحد کرنا۔ ان میں حریت کا جذبہ پیدا کرنا، غلامی سے نفرت دلانا اور ایک فعال اور متحرک قوم تیار کرنا۔ اقبال دراصل ایسی خوددار شخصیت کے خواہاں ہیں جو تن آسانی کی دشمن ہو، سراپا جدوجہد ہو اور بالاخر ایک کامل انسان بن کر فطرت کی طاقتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس زمین پر خدا کا نائب بنے۔ نوجوان مطلوب سے متعلق اقبال نے واضح طور پر اپنا فلسفہ "جاوید نامہ" میں بیان کیاہے۔ اگرچہ انہوں نے بظاہر اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کیا ہے لیکن دراصل اخلاقیات، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، دین و دنیا، خودی، عقل و عشق، علم و عمل، فقرو استغناء، غرض تمام موضوعات اس انداز سے بیان کئے ہیں گویا تمام جوانوں کے نام اقبال کا یہ پیغام ہے۔

بقول جرمن محقق ڈاکٹر شمل، جاوید نامہ، فلسفہ اقبال کے حوالے سے بڑا اہم مجموعہ ہے۔ کیونکہ اس میں اقبال کا پورا فلسفہ اور نظام حیات کا مکمل نقشہ ملتا ہے۔ (حوالہ: ماہنامہ سیارہ لاہور، اقبال نمبر) موضوع کی مناسبت سے ان تمام مباحث کو جو "جاوید نامہ" میں بیان ہوئے ہیں چھوڑتے ہوئے صرف آخری نظم "خطاب بہ جاوید: سخنے بہ نژاد نو" کو لیا جاتا ہے۔ اس نظم میں اقبال نے جو تعلیمی نظریات پیش کئے ہیں وہ دراصل ہمارے ہر نوجوان کو پیش نظر رکھنے چاہئیں کیونکہ ان کے بغیر انسانی زندگی مکمل نہیں۔ انہوں نے اسی نظم کے شروع میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

اے پسر! ذوق نگاہ از من بگیر
سوختن در لاالہ از من بگیر
لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں
تا ز اندام تو آید بوئے جاں
این دو حرف لا الہ گفتار نیست
لا الہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است
لا الہ ضرب است و ضرب کاری است

اقبال نے ان اشعار میں نوجوانوں کو کلمہ طیبہ کے انقلابی مفہوم کو سمجھنے کا درس دیا ہے اور تلقین کی ہے کہ وہ یہ کلمہ دل و جان سے کہیں۔ کیونکہ جب کوئی شخص دل و جان سے لا الہ کہے گا تو وہ صرف اللہ ہی کی حکمرانی تسلیم کرے گا، اسی نقطہ نظر کی روشنی میں انفرادی [illegible] تشکیل کرے گا، اور اللہ کی رضا کے حصول کیلئے بلاچون و چرا سر

تسلیم خم کرے گا۔

اقبال کی نظر میں نئی نسل میں توحید کے انقلابی تصور سے اجتناب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس میں وہ تڑپ، لگن، یقین کی کیفیت اور بلند نگاہی نہ رہی جو ایک مسلم نوجوان کی مطلوب صفات ہیں۔ خود تعلیمی ادارہ بھی جس کا اہم نصب العین ہی مطلوب اقدار کی منتقلی اور ترویج تھا، اس کی بہتر تکمیل نہ کرسکا، بلکہ ایسے نوجوان تیار کئے جو بظاہر تو بڑے شستہ رو تھے، روشن دماغ بھی، لیکن حقیقت میں تاریک جاں، بے روح، بے یقین، کم نگاہ اور ناامید۔ مروجہ نظام تعلیم نے انہیں دین کے اسرار و رموز سے بھی بیگانہ کیا اور روحانی تربیت سے بھی۔۔۔۔ اور اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارہ اور اس کا پورا تربیتی نظام اپنے اصل مقصد سے بیگانہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید
چشم شاں اندر جہاں چیزے ندید
مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست
تا بجذب اندرونش رہ نیست

اقبال کے کلام کی یہ خوبی ہے کہ جہاں وہ حالات کی سنگینی کا تجزیہ کرتے ہیں وہاں وہ یاسیت یا قنوطیت کا شکار ہوئے بغیر امید افزاء لہجے میں روشن مستقبل کیلئے لائحہ عمل بھی مرتب کرتے ہیں۔ آپ نوجوانوں کے لئے چند اہم نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

صد کتاب آموزی از اہل ہنر
خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر
کم خور و کم خواب و کم گفتار باش
گرد خود گردندہ چوں پرکار باش
شیوہ اخلاص را محکم بگیر
پاک شو از خوف سلطان و میر

(اے نوجوان! تو نے علماء اور حکماء سے تو بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مگر وہ درس جو زبان کے بجائے "نظر" سے دیا جاتا ہے اس درس کتابی سے بدرجہا افضل ہے۔ کم کھاؤ، کم سوؤ اور کم باتیں کرو۔ ہر وقت اپنی خودی کے استحکام میں کوشاں رہو۔ یعنی اپنی خودی کی حفاظت کرو اور کوئی ایسی بات مت کرو جس سے خودی ضعیف ہو جائے۔ اپنے اندر اخلاص کی صفت پیدا

کرو یعنی اپنی زندگی کو اللہ کیلئے خالص کر دو اور بادشاہوں کے خوف کو دل سے نکال دو (بحوالہ شرح از یوسف سلیم چشتی)۔

اقبال کی نظر میں عدل اور فقر دو اہم اساسی قدریں ہیں۔ ان کے بغیر نظام تعلیم صرف معلومات کا ایک ڈھیر ہے۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کو عملی زندگی کے واضح اصول بتاتے ہوئے تلقین کرتے ہیں کہ چاہے قہر ہو یا رضا کی کیفیت' عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اسی طرح فقر کی صورت ہو یا غنا کی صورت' اعتدال اور میانہ روی کا دامن تھامے رکھو۔ وہ فرماتے ہیں:

عدل در قہر و رضا از کف مدہ
قصد در فقر و غنا از کف مدہ

اور پھر نصیحت کرتے ہیں کہ سوائے قلب سلیم کے کسی اور قندیل سے روشنی تلاش نہ کرو اور جوانی میں جان و تن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ضبط نفس کو اپنا شعار بناؤ۔ نیکی و شرافت کی راہ پر مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ۔ سکینت قلب کیلئے اللہ تعالیٰ سے دل لگاؤ اور غیر اللہ کا خوف دل سے نکال دو۔ مزید فرماتے ہیں کہ دین کے معاملہ میں اپنے آپ کو پختہ تر رکھو' حق پر کار بند رہو' اور دین کے معاملہ میں شک و شبہ میں نہ پڑو اور پھر مسلم نوجوان کیلئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے قلب و جگر بخشے اور وہ صاحب ایمان اور صالح افراد کی رفاقت میں وقت گزارے۔ رزق حلال کا طالب بنے اور حرام سے اجتناب کرے۔ نیز علم الیقین کا حامل بن کر ظن و تخمین سے اپنے آپ کو بچائے۔ جاوید کو خطاب کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

سر دیں صدق مقال اکل حلال
خلوت و جلوت تماشائے جمال
در رہ دیں سخت چوں الماس زی
دل بحق بر بند و بے وسواس زی

(اے مخاطب! دین اسلام کی حقیقت تین باتوں میں پوشیدہ ہے۔ (1) صدق مقال یعنی ہر حال میں سچ بولنا (2) اکل حلال یعنی جائز طریقوں سے رزق حاصل کرنا۔ (3) خلوت و جلوت دونوں حالتوں میں اللہ کو حاضر و ناظر یقین کرنا۔ دین کے معاملہ میں الماس کی طرح سخت بن جا' تاکہ کوئی طاقت تجھے دین حق سے برگشتہ نہ کرسکے اور مداہنت یا منافقت تیرے پاس نہ پھٹک سکے۔ یعنی کسی حال میں کفر سے مفاہمت مت کرو۔ اللہ سے لو لگاؤ اور اس طرح بے وسواس زندگی بسر کرو (بحوالہ شرح از یوسف سلیم چشتی)

اقبال، طالب علم کی جامع، متوازن اور صحت مند نشوونما کیلئے فقر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ فقر کی ایک نمایاں علامت ادب و احترام ہے۔ نوجوانوں میں اس وصف حمیدہ کے فقدان کو علامہ نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ وہ فرماتے ہیں:

آبروئے گل ز رنگ و بوئے است
بے ادب بے رنگ و بو بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب
روز من تاریک می گردد چو شب

یعنی پھول کی عزت و آبرو اس کے رنگ و بو سے ہے۔ چنانچہ بے ادب آدمی ایسا ہی ہے جیسے وہ رنگ و بو کے بغیر ہو اور اس کی کوئی آبرو نہ ہو۔ علامہ فرماتے ہیں کہ جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرا دن بھی رات کی طرح سیاہ معلوم ہوتا ہے۔

اقبال کا یہ وسیع تر خطاب ساری بنی نوع انسان کیلئے ہے۔ ان کے نزدیک تربیت فرد کے نصاب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا احترام کیا جائے۔ انسان کے مقام کو پہچاننا اور اس کا احترام کرنا ہی آدمیت ہے۔ تعلیم و تربیت میں اس اہم نفسیاتی اور اخلاقی نکتہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے کہ معلم اور متعلم دونوں قابل احترام ہیں تو تعلیم و تعلم میں اثر اندازی اور اثر پذیری لازمی ہے۔ دراصل احترام آدمیت کا یہ تصور اسلام کے اساسی نظریات میں سے ہے۔ آج دنیا انسان یا آدمی کے حوالے سے جن حقوق و مراعات کے دعوے کرتی ہے وہ شرف انسانی کے اسی تصور کی خوشہ چینی ہے جو اسلام کا عطا کردہ ہے۔ البتہ استغناء اور فقر، عظمت انسانی کا وہ بنیادی جوہر ہے جو ہمیں صرف تعلیمات اسلامی میں ہی ملتا ہے۔ فکر اقبال کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلم کی تدریسی حکمت کا یہ اہم اصول سامنے آتا ہے کہ طلبہ بلکہ تمام افراد قابل احترام ہیں۔ اس کے بغیر موثر تدریس ممکن نہیں:

آدمیت احترام آدمی　　باخبر شو از مقام آدمی

مغربی افکار نے انسانی تہذیب کی جو نیو اٹھائی اس میں مادہ پرستی ایک مثبت قدر کے طور پر ابھرنے لگی۔ اقبال اس کی مضرتوں سے واقف تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ برق و بخارات کے ساتھ ساتھ فیضان سماوی بھی ضروری ہے۔ چنانچہ آپ بے خدا مادیت پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انہوں نے سالوں اس دنیا کی سیاحت کی ہے۔ ان کا تجربہ و مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ہر مادہ پرست میں روحانیت اور خدا ترسی کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام
نم بچشم منعماں کم دیدہ ام

من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

(میں نے مدتوں دنیا کی سیاحت کی ہے۔ مختلف ملکوں اور قوموں کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے دولت مندوں کی آنکھ میں نمی (ہمدردی) نہیں دیکھی۔ مبارک ہے وہ انسان جو دولت مند ہو کر درویشوں کی سی زندگی بسر کرے اور افسوس ہے اس پر جو خدا سے بیگانہ ہو کر زندہ رہے۔)

پھر جاوید کو تاکید کرتے ہیں کہ اگر تمہیں کسی مرد خبیر کی صحبت میسر نہیں تو جو میرے پاس ہے اسی کو حاصل کر لے۔ اس کے ساتھ ہی پیر رومی کو اپنا رہنما بنا۔ لے تاکہ خدا تجھے سوز و گداز بخشے۔ اس سے علامہ کا اشارہ یہ ہے کہ چونکہ ان کے اور پیر رومی کے کلام کا مستقل سرچشمہ قرآن حکیم اور سنت نبوی ﷺ ہے لہٰذا اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ کیونکہ اصل، قطعی اور یقینی سرچشمہ علم تو وحی الٰہی ہی ہے۔ علامہ، جاوید کے حوالے سے نوجوانوں کو اس لئے بھی پیر رومی کی طرف دعوت دیتے ہیں کہ ان کا کلام سوز پیدا کرتا ہے اور سوز کے ذریعہ وجدان بیدار ہوتا ہے اور وجدان سے انسانی زندگی میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔

گر نیابی صحبت مرد خبیر
از اب و جد آنچہ من دارم بگیر
پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

(اگر تو کسی وجہ سے مرشد کامل کی صحبت حاصل نہ کر سکے تو جو کچھ مجھے اپنے بزرگوں سے ملا ہے وہ تو مجھ سے لے لے اور وہ یہ کہ پیر رومیؒ کو اپنا مرشد بنا لے۔ اس سے تیرے دل میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔)

عشق رسول ﷺ کی کیفیت انسان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی اور جلا بخشتی ہے۔ اسوۂ رسول ﷺ کی پیروی معراج انسانیت کا زینہ ہے۔ چنانچہ اقبال نوجوانوں کی تربیت کیلئے ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا رہنما جانیں۔ یہی مقصد آپ کی شاعری کی روح ہے۔ آپ نے جذب و خلوص سے لبریز کیفیت سے نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر عمل اور خالص تصور دین کو سمجھنے کی تلقین کی۔ فرماتے ہیں۔

سر دیں مصطفیٰ گویم ترا
ہم احمد دعا گویم ترا

حقیقت میں یہ نظم (خطبے بہ نژاد نو) پوری نوجوان نسل کیلئے ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے اور آج کے طالب علم کیلئے بالخصوص مشعل راہ ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں الحاد کی فضا اور لادین تعلیم نے ہمارے نوجوان نسل کو شک اور بے یقینی کی کیفیت میں جس طرح مبتلا کردیا ہے' اس سے نجات کیلئے اقبال کی یہ نظم ایک مختصر مگر مدلل کلام ہے۔ اس کے مطالعہ سے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور انسان محسوس کرتا ہے کہ فی الحقیقت مسلمان ایک عظیم قوت ہیں' ان کا ایک منفرد تشخص ہے اور ان کی اپنی تہذیب ہے۔ غرض اقبال نوجوان نسل کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے فرد کی انفرادی اور اجتماعی ترقی میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ بنیادی حکمت ہے جو اقبال کے پیش نظر رہی اور اس کی روشنی میں وہ علوم کی اسلامی تشکیل جدید چاہتے تھے۔ اقبال کی خواہش تھی کہ نوجوان علم حاصل کریں لیکن مرعوب و مغلوب ذہن کے ساتھ نہیں بلکہ غالب ذہن کے ساتھ مطالعہ کریں۔ نیز دور جدید کے تمام علوم کا مطالعہ اسلام کے دائمی زاویہ نظر کی روشنی میں کریں۔ (طلبہ کی سیرت سازی کیلئے ضروری ہے کہ اس نظم یعنی "خطبے بہ نژاد نو" کا خلاصہ مختلف تعلیمی سطحوں اور طلبہ کی مختلف عمروں کی مناسبت سے زبان و ادب کے نصاب میں شامل کیا جائے۔)

علامہ نے صرف جاوید نامہ [illegible] نہیں بلکہ دیگر نظموں' تقاریر اور نثری نگارشات میں بھی اکثر جگہ نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے۔ علامہ کے نزدیک قرآن مجید کی تعلیمات نوجوانوں کیلئے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ مسلم کانفرنس دہلی (منعقدہ 1931ء) کی طرف سے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> "سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کیلئے تیار کرنے کا کام جیسا چاہئے تھا ہرگز نہیں کیا۔ لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کیلئے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینا ہوں گی۔"

اقبال بچوں کی اخلاقی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ چنانچہ نومبر 1911ء میں اکبر الہ آبادی کے نام اور باتوں کے علاوہ لکھتے ہیں۔

> "...جاوید طال عمرہ کو میری طرف سے بہت بہت پیار [illegible]
> اس نام سے ایک خاص تعلق ہے۔ [illegible]
> اور دین و دنیا میں [illegible]

ضرور ضائع ہوتا ہوگا مگر باوجود اس کے کس قدر خوش نصیب لڑکا ہے کہ پیراں مشرق سے فیض کی نظر لے رہا ہے۔ یہی نظر صبغۃ اللہ ہے۔ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ پیراں مشرق دنیا میں نہ رہیں گے اور آئندہ زمانے کے مسلمان بچے نہایت بد نصیب ہوں گے۔ میاں ہاشم! اب وقت ہے اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیر مشرق سے لے سکتے ہو لے لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمہاری روح لذت اٹھائے گی۔" (خطوط اقبال)۔

اقبال نوجوانوں میں شاہینی صفات کو پسند کرتے ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں شاہین کو علامت کے طور پر اس لئے استعمال کیا کہ وہ خود دار اور غیرت مند ہے۔ غیر کے ہاتھ کا مرا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ اس میں استغناء ہے یعنی آشیانہ نہیں بناتا۔ اس کا افق وسیع ہے وہ بلند پرواز ہے۔ تیز نگاہ ہے اور مستقبل بین ہے۔ اسی پس منظر میں علامہ نے نوجوانوں کو ہمیشہ سعی و عمل کی تعلیم دی اور کاہلی اور عزلت گزینی سے روکا ہے۔ آپ نوجوانوں کو یہ پیغام دیتے ہیں۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال طلبہ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ اگر ان میں تعمیری کام کرنے کا کوئی ولولہ ہے تو وہ تخلیقی مزاج پیدا کریں۔ آفاقیت کیلئے ضروری ہے کہ انسان خلاق طبیعت کا مالک ہو۔ ایسا نظام تعلیم جس میں طلبہ اور اساتذہ تعلیم و تعلم کے عمل میں خلاق نہیں ہیں وہ نظام تعلیم ایک میکانکی نظام تعلیم کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

زندہ مشتاق شو خلاق شو
ہمچوں ما گیرندہ آفاق شو

اقبال فی الحقیقت مسلم نوجوان کو فعال (Dynamic) دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انفعالیت (Passiveness) کو پسند نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں زندگی بخش، فعال اور جاندار تعلیم ہی اصل تعلیم ہے۔

بہ آں مومن خدا کارے ندارد
کہ در تن جان بیدارے ندارد
ازاں از مکتب یاراں گریزم
جوانے خود نگہدارے ندارد

اقبال نے ملت بیضا کے اس دور میں پوری قوت کے ساتھ اللہ کا پیغام بلند کیا اور اس

بات پر زور دیا کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات ہی ہمارے لئے بہتر اسوہ ہے۔ وہی محسن انسانیت ﷺ ہے اور وہی ایک مثالی شخصیت ہے جو پوری انسانیت کی رہبر و رہنما ہے۔ اقبال کے لفظوں میں:

به مصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کا نوجوان مطلوب دراصل ایسی شخصیت ہے جو اپنی جوانی کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے حصول کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار رکھے۔ نفس مطمئنہ کے مقام تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ مسلم ریاست ایسے تعلیمی نظام کا بندوبست کرے' جس کا تربیت شدہ فرد روحانی اور مادی ہر لحاظ سے ایک بہترین انسان ہو اور یہ اسی صورت ممکن ہے اگر تعلیمی اداروں میں اساتذہ۔۔۔۔۔ تلاوت آیات' تزکیہ اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے حوالے سے اپنے فکر و عمل میں ہم آہنگ ہوں۔ درحقیقت اقبال ایسی ہی تعلیم کے خواہاں تھے جس سے اس عظیم مقصد کی تکمیل ہوتی ہو۔ اقبال فکری اور عملی لحاظ سے حاکم اور غالب نوجوانوں کو پسند کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اخلاقی علو سے عاری قوم چاہے مادی اور عسکری تناظر میں کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو شکست اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

اس سے اقبال کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمان عسکری اور مادی قوت سے بے نیاز ہو جائیں بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے نظام تربیت میں سب سے پہلے ایمان اور عمل صالح کو اہمیت دیں۔ امت واحدہ کی تشکیل کریں' بحیثیت فرد اور بحیثیت معاشرہ اپنے آپ کو ذمہ دار جانیں اور عسکری قوت بھی حاصل کریں' لیکن یہ مادی اور عسکری قوت لازماً اس خودی مطلق یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا کے تابع ہو۔ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ہمارے نوجوان علم حاصل کریں' لیکن علم ایسا ہو جو وحدت اللہ کے تصور کے تحت بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھائے۔ زیر دستوں اور غریبوں کی حمایت پر مائل کرے اور برائیوں سے بچائے اور نیکی کے راستے پر گامزن کرے۔ کیونکہ یہی راستہ فلاح کا راستہ ہے۔ اقبال کی نظر میں مساوات انسانی' محبت کا آفاقی ضابطہ' ظلم سے گریز اور بنیادی انسانی حقوق کا ضامن صرف اسلام ہے جو دین فطرت ہے۔ اس فطرت کی تسکین کے لئے کوئی انسانی نظام تعلیم کارآمد نہیں ہو سکتا اور نہ یہ انسان کے بس کی بات ہے کہ وہ پوری انسانیت کے لئے ایسی تعلیم کا تشکیل دے سکے جو ماضی' حال اور مستقبل کے علم پر [illegible]

دے سکے۔ اس کے لئے لازماً" الٰہی ہدایت پر مبنی نظامِ تربیت ہی پوری انسانیت کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرسکتا ہے۔

اقبال اپنی تہذیب و ثقافت کے بارے میں واضح تصورات رکھتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں اسلامی اقدار کو افضل سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک نوجوانوں کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ اپنی تہذیب (جس کی اساس توحید و رسالت ﷺ ہے) سے رجوع کریں اور ایسی ثقافت جو اسلام کے منافی ہو' اس سے قطعی طور پر دور رہیں۔انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو تہذیب نو کی غلامی کا شکار ہونے سے بچانے کیلئے یہ مشورہ دیا کہ:

زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلی دگرے در خور تقاضا نیست

یعنی ایسی آگ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ اپنی ہی مٹی سے پیدا کر' دوسروں کی روشنی' دوسروں کی تہذیب اور دوسروں کے طور طریقے ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ اسی مفہوم کو اردو شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

علامہ درحقیقت علمی غلامی کے خلاف تھے۔وہ نوجوانوں کیلئے ایسی تعلیم کو پسند نہیں کرتے تھے جس سے ان کی قومی خودداری' ان کی منفرد تہذیب اور ان کا مخصوص تشخص ختم ہوتا ہو۔ چنانچہ وہ طالب علم سے اس طرح مخاطب ہیں۔

تاکجا در تہ بالِ دگراں می باشی
در ہوائے چمن آ و پریدن آموز

(یعنی کب تک دوسروں کے پروں تلے زندگی بسر کرو گے۔ تم باغ کی صاف ستھری فضا میں خود اپنے پروں سے اڑنا سیکھو)۔

اقبال کی فکر ان اشعار سے اور واضح ہوجاتی ہے جب وہ نئی نسل کی اسی تعلیم کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں جس نے اپنی ملی ثقافت و معاشرت اور اسلامی تاریخ کی اقدار کو بری طرح مجروح کیا ہے۔اقبال جہد مسلسل' تحقیق و جستجو اور علم کو نوجوانوں کیلئے لازمہ سمجھتے ہیں۔ وہ طالب علموں سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تم علمی معلومات کے حامل تو ہو لیکن اجتہاد کی صلاحیتوں اور اصل سرچشمہ علم سے محروم ہو۔ چنانچہ وہ دعائیہ انداز میں کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

آخر میں "بال جبریل" کی دو نظموں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ دونوں کا عنوان ایک ہی ہے یعنی "جاوید کے نام"۔ ان دونوں نظموں میں بظاہر وہ اپنے بیٹے سے مخاطب ہیں لیکن فی الحقیقت ان کے سامنے پوری نوجوان نسل ہے۔ پہلی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ عمر جاوداں کا سراغ دراصل خودی کی پختگی سے ہے۔ وہ نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ انہیں نیک اور پارسا لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور پھر آخر میں وہ دعا کرتے ہیں کہ یہ زمانہ اخلاقی لحاظ سے انحطاط پذیر ہے۔ اللہ نوجوان نسل کو نیکی کی راہ پر گامزن رہنے کی توفیق دے اور برائیوں سے بچائے۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تیری رہے بے داغ

دوسری نظم "دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر" میں بھی علامہ نے جاوید سے خطاب کیا ہے۔ اس نظم میں وہ نوجوانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ مادہ پرستانہ ذہنیت کو ترک کر کے اپنے دین اور اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ استغنا اور قناعت کو اپنا شعار بنائیں اور حرص دولت و جاہ سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ اس نظم کا ہر شعر ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے اور نوجوانوں کیلئے مشعل راہ۔

حقیقت میں اقبال کا پورا کلام تمام مسلمانوں اور پوری بنی نوع انسان کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً نوجوان نسل کیلئے کیونکہ ان ہی سے اقبال نے اپنی توقعات وابستہ کی ہیں۔ اقبال کے نزدیک ایک نوجوان مطلوب کی شخصیت اسی صورت منفرد اور نمایاں ہوتی ہے جب ایک مسلم نوجوان اپنے نظریات، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنی معاشرت، اپنی سیاست، اپنی تعلیم، اپنی تاریخ اور اپنے نظام حیات پر فخر کرے۔ اس کو عملاً اپنی زندگی میں رائج کرنے کی کوشش کرے اور اقامت دین کا فعال سپاہی بنے۔ وہ نہ صرف احقاق حق کا فریضہ سرانجام دے بلکہ ابطال باطل کی ذمہ داری کو بھی نبھائے۔ نیز اپنے آپ کو نہ صرف پہچانے بلکہ دوسروں سے بھی اپنی شخصیت کو منوائے۔ یہ اس کا حق ہے کہ اسے ایسا نظام تعلیم دیا جائے جس کی فکری اساس قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ ہو۔ وہ نہ صرف فکری

اور نظری لحاظ سے صالح ہو بلکہ عمل صالح کا بھی حامل ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس کی تعلیم و تربیت کا انتہائی مقام یہ ہو کہ وہ اللہ کی رضا کے سامنے بلاچون و چرا اپنا سر تسلیم خم کر دے۔

(ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد' جلد 17' شمارہ 10' اپریل 1980 ---- سہ ماہی
مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 6' شمارہ 20' جولائی 1995ء)

❁

سید مودودیؒ کا تعلیمی نقطہ نظر

(1903ء - 1979ء)

اس مضمون کا ابتدائی حصہ سید مودودیؒ کی رحلت پر ایک ذاتی تاثر کے اسلوب میں لکھا گیا' جسے بعد میں مجلہ ماہنامہ تعلیمات لاہور نے اپنے ضخیم نمبر (سید مودودی اور تعلیم) جلد 4' شمارہ 5' اکتوبر 1981ء میں شامل کیا۔ موجودہ صورت میں اسے مجلہ ماہنامہ افکار معلم لاہور نے جلد 3' شمارہ 3' مارچ 1991 میں شائع کیا۔

زندگی نہ جانے کتنے رنگوں کے امتزاج کا نام ہے۔ کائنات کا سارا حسن ان ہی رنگوں کا مرہون منت ہے' یہی رنگ تخلیق انسان کے گوناگوں مقاصد کو اجاگر کرتے ہیں اور انہی رنگوں کے طفیل انسان معراج عظمت کی طرف سرگرم سفر رہتا ہے۔

انسان کائنات کا مرکزی نقطہ ہے اور رنگوں کی ساری قوس قزح اسی نقطے سے نمو پاکر افق تا افق پھیل جاتی ہے' انسان جو روح حیات ہے' جس کی تقویم احسن انداز میں کی گئی ہے' جس کو شعور دیا گیا کہ وہ خیر و شر میں تمیز کرے' جسے حکمت و دانش کا خزانہ دیا گیا کہ وہ اپنا تفوق قائم کرے' اور جسے کائنات کی سب سے بڑی نعمت "علم" عطا کی گئی کہ وہ کائنات کی ازلی و ابدی حقیقتوں کا ادراک حاصل کرے' اپنے مقام سے شناسا ہو' اپنی تخلیق کی علت سے آگاہ ہو' اپنے آپ کو پہچانے' کائنات میں اپنے مقام کو پہچانے اور اس ارفع و اعلیٰ حقیقت کو پہچانے جو ساری حقیقتوں کی اساس اور تمام علوم کا ماخذ ہے۔ وہ انسان یقیناً بڑے ہوتے ہیں جو پہچان کے اس سفر میں دوسروں کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ پہچان کے اس نور کو اپنی شخصیت میں جذب کرتے اور پھر پہچان کی یہ روشنی دوسروں تک منتقل کرتے ہیں۔ علم کی تحصیل و ترسیل کا یہ عمل پیغمبروں کا منصب ٹھہرا' مصلحین کا طرہ امتیاز قرار پایا اور انسان کو انسانیت کی طرف بلانے والوں کا سرمایہ افتخار بنا۔ علم کی روشنی سے چراغ روشن ہوتے رہے اور پھر ان چراغوں سے مزید چراغوں نے زندگی پائی۔ علم کا سفر مسلسل جاری رہا۔ روشنی اندھیروں کی قبا چاک کرتی ہوئی نئی منزلوں کا پتہ دیتی رہی۔ روشنی گام بہ گام حیات تازہ کے نقوش چھوڑتی گئی اور روشنی کے پیامبر ظلمت کی منفی طاقتوں سے ٹکراتے وقت کی مصلحت سے بے نیاز شاہراہ حیات پر سرگرم سفر رہے' نہ روشنی کا تسلسل ٹوٹا' نہ

روشنی کے سفر کا سلسلہ منقطع ہوا۔ کیونکہ روشنی موت و حیات کے تصور سے ماورا ہے اور روشنی کے پیامبر مرکر بھی زندہ رہتے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی روشنی کے ایک ایسے سفیر ہیں جنہوں نے علم کی تحصیل و ترسیل کو اپنی زندگی کا مقصد اولیٰ قرار دیا۔ اپنی پہچان کے سفر سے گزرے اور پھر انسان کی خود شناسی کا درس دیتے رہے۔ جنہوں نے گراں تاگراں فکر کے دیے روشن کیے۔ الجھے ہوئے ذہنوں کو یقین کی دولت لازوال عطا کی۔ تشکیک زدہ سوچوں کو ایمان کا جوہر بخشا' مرعوب افکار کو خودی کی توانائی دی۔ وقت کی نبض پر انگلیاں رکھیں اور پستیوں کی طرف لڑھکتی ہوئی قوم کی مسیحائی کی۔ اقامت دین کا پرچم اٹھایا اور طاغوتی طاقتوں سے اس طرح پنجہ آزمائی کی کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ سیاست کو آلودگیوں سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھایا اور کبھی اساسی اصولوں سے دست کش نہ ہوئے۔ قلم سے فکری جہاد کا آغاز کیا اور نہ صرف گراں مایہ افکار کے موتی بکھیرے بلکہ اردو زبان و ادب کو ایک منفرد اسلوب بھی عطا کیا۔ جرات و عزیمت کے بلند و بالا مینار نصب کیے۔ وقت کے فرعونوں کی خشمگیں نگاہوں' زنجیروں کی جھنکار' زندانوں کی صعوبتیں اور دار و رسن کی وحشتیں ان کے پائے استقامت میں معمولی سی لغزش بھی نہ لاسکیں۔ اس عہد ناہنجار میں اجلی سیرت اور بے داغ کردار کا درخشندہ نمونہ چھوڑا۔ بے وفائیوں کے زخم کھائے' مختلف کمیں گاہوں سے برستے تیروں کو اپنے سینے پر روکا۔ پتھروں کی بارش میں شرابور ہوگئے' لیکن ان کی پیشانی پر کوئی شکن نہ آئی' نہ ان کے لہجے میں کرختگی نے جگہ پائی اور نہ ان کے لبوں کی شیرینی میں کوئی کمی آئی۔ وہ روشنی کے پیامبر بن کر نشان منزل دکھاتے رہے کچھ اس ڈھب سے کہ خود روشن چراغ بن گئے۔ سید مودودی مرحوم ہوچکے ہیں لیکن دنیا کی فضاؤں میں جگمگانے والا وہ چراغ جوں کا توں سر راہگذر حیات جگمگاتا رہا۔ وہ یونہی جگمگاتا رہے گا کیونکہ نہ روشنی فنا ہوتی ہے' نہ روشنی کے پیامبر۔

تعلیم کا ایک میدان وہ ہے جہاں رسمی تعلیم کے کے لیے حکومتی ادارے اپنے مخصوص دائروں کے اندر رہ کر فرائض سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ مختلف سطحوں پر درسگاہوں کا قیام' نصاب تعلیم کی تیاری' امتحانات کے گوناں گوں طریقے' اساتذہ کے لیے موزوں تربیتی نظام وغیرہ اسی رسمی تعلیم کے بعض پہلو ہیں۔ اس انداز کی تعلیم یقیناً اپنی افادیت رکھتی ہے اور آج کی دنیا میں اسی تعلیم کی کار فرمائی ہے۔ لوگ رسمی درس گاہوں کے تعلیمی عمل سے گزرتے اور پھر زندگی کے طویل سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں لیکن تعلیم کا ایک انداز وہ بھی ہے جہاں نہ روایتی درسگاہ ہوتی ہے' نہ کسی مخصوص ترتیبی [illegible]

کے لیے ماہرین کی کمیٹی کا تیار کردہ نصابی مواد' نہ کوئی امتحانی نظام اور نہ ہی درس و تدریس کا مانوس ماحول۔ لیکن ان تعلیمی لوازمات کے بغیر بھی تعلیم کا عمل جاری و ساری ہوتا ہے بلکہ اس کا دائرہ اثر انتہائی وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔ یہ تعلیم بالکل غیر محسوس انداز میں لوگوں کے دلوں میں جذبوں کی کونپلیں کھلاتی اور ان کے شعور میں آفاقی حقیقتوں کی تخم ریزی کرتی ہے۔ یہ تعلیم محض ذہنی اور فنی مہارتوں پر اکتفا نہیں کرتی' بلکہ پوری شخصیت کو اتنے خوب صورت انداز سے تراشتی ہے کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ معاشرے بھی علم کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ یہ تعلیم' تاریخ کے ایک ایک موڑ پر روشنی کے مینار نصب کرتی بلکہ خود تاریخ رقم کرتی ہے۔ علم کے اسی ارفع انداز نے ریگزار عرب کے شتربانوں کو جہان بانی اور جہانگیری کا منصب عطا کیا اور کردار کے وہ عظیم معیار قائم کیے جو انسانیت کا جوہر ہیں۔ مختلف اقوام کی تاریخ میں ایسے عظیم اساتذہ مل سکتے ہیں جنھوں نے روایتی تدریس سے بے نیاز اور ماورائی رہتے ہوئے انسانیت کی تعمیر کی اور افکار کی رفعتیں عطا کیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بھی عہد حاضر کے ایک ایسے ہی آفاقی معلم ہیں جنھوں نے ایک طویل عرصے تک غیر روایتی انداز میں ذہنوں کی آبیاری کی۔ افکار کو پستیوں سے نکالا۔ تخریب کی جگہ تعمیری رجحانات کو نمو بخشی۔ اسلامی تاریخ کے تناظر میں استدلالی اور منطقی طرز تحریر اختیار کیا جو معذرت خواہانہ روش سے نجات دلاتا اور اسلام کو ایک طاقتور فکر کے طور پر پیش کرتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کی درسگاہ کی چار دیواری اتنی وسیع ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا' ان کی فکر کی روشنی پاکستانی سرحدوں تک محدود نہیں بلکہ عالم اسلام کے ایک ایک گوشے تک پہنچ چکی ہے۔ مولانا کے افکار' مغربی دنیا اور غیر مسلم فلسفیوں کے لیے بھی اجنبی نہیں رہے۔ مرحوم ایک عظیم معلم کا درجہ رکھتے ہیں اور علم کی دنیا میں ان کے مقام کو کسی متعصب مورخ کا قلم بھی کم کرنے کی جسارت نہیں کرسکے گا۔

علاوہ ازیں مولانا رسمی تعلیم کے تقاضوں کو بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے بلکہ خود ایک عرصہ تک اسلامیہ کالج لاہور میں بطور پروفیسر' درس و تدریس کا کام بھی سرانجام دیتے رہے۔ انھوں نے تعلیم کے موضوع پر اتنا کچھ لکھا اور کہا کہ شاید ہمارے ہاں کے کسی اور ماہر نے نہ کہا ہو۔ مولانا کے تعلیمی مقالات کا مجموعہ "تعلیمات" ایک اسلامی معاشرے کے انسان مطلوب کے لیے نظام تعلیم کا بھرپور خاکہ پیش کرتا ہے۔ یہ تعلیمی مقالات ہمارے ہاں کے ارباب اختیار کو وہ اساس فراہم کرتے ہیں' جن سے ایک موثر اور کارگر نظام کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے۔

رسمی اور غیر رسمی دونوں حوالوں سے سید مودودیؒ نے کتب تعلیم کو گراں بہا سرمایہ

فراہم کیا ہے اور یہ ان کا ایسا احسان عظیم ہے جسے تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے افراد کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ آج پوری دنیا کی اسلامی تحریکوں کے نوجوانوں کے افکار و احساسات پر مولانا کے افکار کی جس قدر گہری چھاپ ہے' اس کے پیش نظر بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ دور حاضر کے نہ کسی اور معلم کو یہ اعزاز حاصل ہے اور نہ ہی کوئی رسمی درسگاہ اتنے وسیع اثرات کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے مولانا نے تنہا وہ کچھ کیا جس کے سامنے دور حاضر کے لا تعداد معلمین کی مساعی ہیچ دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔سید مودودی کا چھوٹا سا مکان (5 - اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور) بہت سی یونیورسٹیوں کے سامنے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

سید مودودیؒ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی ذات کے صدہا پہلو ہیں۔ ایسی ہستی کے کارناموں کا احاطہ کرنا جس کی صدہا جہتیں ہوں' ایک انتہائی مشکل کام ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مولانا کی اجلی شخصیت اور واضح ہوتی چلی جائے گی۔ تحقیق کا عمل جاری رہے گا اور زمانہ خود طے کرتا رہے گا کہ مولانا کا مقام کیا تھا اور ان کے اثرات کا دائرہ کتنا لا محدود تھا۔ تعلیم کے حوالے سے بلاشبہ وہ دور حاضر کے ایک بہت بڑے معلم تھے۔ انہوں نے درس و تدریس کو عام معنوں میں بھی اپنایا اور پھر زندگی بھر تصنیف و تالیف کے ذریعے اشاعت علم اور تعمیر سیرت کا عظیم فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ عالم اسلام کی ایک انتہائی معزز و محترم اور قدر آور شخصیت ہیں۔ اس حوالے سے نہیں کہ سید مودودیؒ کسی خاص سیاسی مکتبہ فکر کے قائد تھے' بلکہ صرف ان لازوال خدمات کے طفیل جو مولانا مرحوم نے تعلیم و تربیت کے میدان میں سرانجام دیں اور ایک اسلامی ملک کے نظام تعلیم کے لیے ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کیں۔ آپ کی اہم کتب کی تعداد تو سو سے بھی متجاوز ہے لیکن نظام تعلیم سے متعلق آپ کی دو کتب "تعلیمات" اور "تصریحات" (انٹرویوز کا مجموعہ۔ مرتب : پروفیسر سلیم منصور خالد) بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ سید مودودیؒ کی یہ کتب ایک اسلامی معاشرے کے لئے نظام تعلیم کا بھرپور خاکہ پیش کرتی ہیں۔ یہ تعلیمی مقالات اور مباحث وہ اساس فراہم کرتے ہیں جن سے ایک موثر نظام تعلیم کی تشکیل کی جاسکتی ہے۔ مغربی تعلیمی نظام فکر سے مرعوب و مغلوب اس دور میں' اسلامی زاویہ نگاہ سے بقول نعیم صدیقیؒ' ایک جامع تعلیمی انقلاب کی آواز سید مودودیؒ کی ہی تھی۔ آپ نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایک جامع حکمت تعلیم' اس پر عمل پیرا ہونے کی سکیم' اس کے لیے نصابیات' اساتذہ کی تعلیم و تربیت اور مثالی اسلامی یونیورسٹی کے خاکہ سے متعلق بڑا وسیع علمی مواد پیش کیا ہے۔ ذیل میں سید مودودیؒ کے تعلیمی نقطہ نظر سے متعلق صرف چند اہم اساسی نکات اجمالی

اختصار سے دیے جا رہے ہیں' جو زیادہ تر آپ ہی کے الفاظ میں آپ کی کتب "تعلیمات" "تنقیحات" اور "تصریحات" سے اخذ کردہ ہیں۔

تعلیمی نقطہ نظر: چند اہم اساسی نکات

1:0 نظریہ تعلیم

(ا) نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل میں دین و دنیا کی تفریق کا تخیل غیر اسلامی ہے' مسلمان اس کے بالکل قائل نہیں کہ ان کی ایک تعلیم دنیوی ہو اور ایک تعلیم دینی۔ اس کے برعکس وہ تو اس بات کے قائل ہیں کہ ان کی پوری کی پوری تعلیم بیک وقت دینی بھی ہو اور دنیوی بھی۔ دنیوی اس لحاظ سے کہ وہ دنیا کو سمجھیں اور دنیا کے سارے کام چلانے کے قابل ہوں اور دینی اس لحاظ سے کہ وہ دنیا کو دین ہی کے نقطہ نظر سے سمجھیں اور دین کی ہدایت کے مطابق اس کا سارا کام چلائیں۔

(ب) اسلامی نقطہ نظر سے علم عطیہ الٰہی ہے۔ لہٰذا علم اس کا نام ہوگا جس سے تعلق باللہ پیدا ہو۔ دنیا کے دوسرے علوم اس وقت تک بے معنی اور ضلالت کا سرچشمہ ہیں' جب تک انسان "العلم" کو حاصل نہ کرے۔ حقیقت میں ہر تعلیمی نظام فکر اپنے کلچر کا خادم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے مسلمان ایک ایسی قوم ہیں' جس کے اپنے کچھ عقائد ہیں' جس کا اپنا نظریہ زندگی ہے' جس کا اپنا نصب العین ہے' جو اپنی زندگی کے کچھ اصول رکھتی ہے' لہٰذا اسے اپنی نئی نسلوں کو اس غرض کے لئے تیار کرنا ہوگا' کہ وہ اپنے کلچر کو نہ صرف زندہ رکھیں بلکہ ان ہی بنیادوں پر اسے ترقی دیں جن پر یہ کلچر قائم رہتا ہے۔ کیونکہ جو قوم اپنی آئندہ نسلوں کو اپنی تہذیب کے خلاف کسی دوسری طرز کی تہذیب پر تعلیم دیتی ہے' وہ اپنی تباہی کا سامان کرتی ہے' اس کو صحیح معنوں میں تعلیم کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

(ج) دین اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے' جو انفرادی اور اجتماعی معاملات میں دائمی رہنما ضابطہ ہے' جس کا قطعی ماخذ قرآن و سنت ہے۔

2:0 تعلیمی نصب العین

(الف) تعلیم کا اہم ترین نصب العین ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اسلامی تہذیب یعنی دین اسلام کو اچھی طرح سمجھتے ہوں' اس پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہوں' اس کے اصولوں کو خوب جانتے ہوں اور ان کے برحق ہونے کا یقین رکھتے ہوں' اس کے مطابق [illegible] اعلیٰ اخلاق رکھتے ہوں اور اس قابلیت کے مالک ہوں

کہ اجتماعی زندگی کے پورے کارخانے کو اسلامی تہذیب کے اصولوں پر چلا سکیں اور مزید ترقی دے سکیں۔

(ب) نظام تعلیم میں تشکیل سیرت کو کتابی علم سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ محض کتابیں پڑھانے اور محض علوم و فنون سکھا دینے سے اسلامی مقاصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ اسلامی ریاست کو اس کی ضرورت ہے کہ اس کے ایک ایک طالب علم کے اندر اسلامی کریکٹر پیدا ہو' اسلامی طرز فکر اور اسلامی ذہنیت پیدا ہو۔ جس شعبہ کے لیے بھی وہ تیار ہو رہا ہو' اس کے اندر اسلامی ذہنیت اور اسلامی کریکٹر ضرور ہونا چاہئے۔ جس آدمی میں اسلامی اخلاق نہیں وہ چاہے جو کچھ بھی ہو' اسلامی ریاست کے کسی کام کا نہیں۔

(ج) تعلیم کا اصل مدعا یہ ہے کہ انسان کی صلاحیتیں اور قوتیں' جو اللہ نے اسے عطا کی ہیں' نشوونما پائیں تاکہ وہ دنیا میں ان بھلائیوں کو فروغ دے سکے' جو خدا کو پسند ہوں۔ اس طرح یہ تعلیم و تربیت' اس کی زندگی کے لئے فلاح و ترقی کا ذریعہ ثابت ہو' اور وہ بالآخر اپنی سوسائٹی کے لئے مفید اور کار آمد فرد بن سکے۔

(د) علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس تناظر میں تعلیم کا اہم مقصد ایسے افراد کی تربیت ہے جو دنیا بھر کی رہنمائی کر سکیں۔

3:0 نصاب تعلیم

3:1 نظریہ نصاب

پورا نظام تعلیم اس کے سارے مضامین دینی نقطہ نظر سے مرتب ہونے چاہئیں اگر طلبہ فلسفہ پڑھیں تو دینی نقطہ نظر سے پڑھیں' تاکہ وہ مسلمان فلاسفر بن سکیں۔ اگر وہ سائنس پڑھیں' تو ایک مسلم سائنس دان بن کر اٹھیں۔ اگر تاریخ پڑھیں تو ایک مسلمان مورخ بن سکیں۔ اگر معاشیات پڑھیں تو اس قابل بنیں کہ اپنے ملک کے پورے معاشی نظام کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ اگر سیاسیات پڑھیں تو اس لائق بنیں کہ اپنے ملک کا نظام حکومت' اسلام کے اصولوں پر چلاسکیں۔ اگر قانون پڑھیں' تو اسلام کے معیار عدل و انصاف پر معاملات کے فیصلے کرنے کے لائق ہوں۔ اس طرح اسلام' دین و دنیا کی تفریق مٹا کر پوری تعلیم کو دینی بنا دینا چاہتا ہے۔

3:2 ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم میں وہ مضامین پڑھائے جائیں جو آج کے پرائمری سکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا بھر میں ابتدائی تعلیم کے متعلق جتنے تجربات کیے گئے ہیں یا آئندہ کیے جائیں' ان سب سے بھی فائدہ اٹھایا جائے لیکن چار چیزیں ایسی ہیں جو اس کے ہر مضمون میں پیوست ہونی چاہئیں۔

(الف) بچے کے ذہن میں ہر پہلو سے یہ بات بٹھائی جائے کہ یہ دنیا ایک خدا کی سلطنت اور ایک خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے۔ یہاں ہم خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے مامور ہیں اور یہاں جو امانت ہمارے سپرد کی گئی ہے اس معاملے میں ہم خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔

(ب) اسلام جن اخلاقی اقدار کو پیش کرتا ہے انہیں ہر مضمون کے اسباق میں حتیٰ کہ حساب کے سوالات تک میں حکمت و دانائی سے بچوں کے ذہن نشین کرایا جائے۔ اسلام جن چیزوں کو نیکی اور بھلائی کہتا ہے ان کی قدر' ان کے لیے رغبت اور شوق بچوں کے دل میں پیدا کیا جائے اور جن کو برائی قرار دیتا ہے ان کے لئے ہر پہلو سے بچوں کے دل میں نفرت بڑھائی جائے۔

(ج) اسلام کے بنیادی حقائق اور ایمانیات بچوں کے ذہن نشین کرا دیے جائیں۔ اس کے لیے دینیات کے الگ کورس پر ہی اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ایمانیات کو دوسرے تمام مضامین میں بھی روح تعلیم کی حیثیت سے پھیلا دیا جائے۔ ابتدائی سطح پر ہر مسلمان بچے کے دل میں توحید کا عقیدہ' رسالت کا عقیدہ' آخرت کا عقیدہ پوری قوت کے ساتھ بٹھا دیا جائے' لیکن طریقہ تدریس ایسا ہونا چاہئے کہ بچہ یہ نہ محسوس کرے کہ کچھ تحکمات ہیں جو اس سے منوائے جا رہے ہیں بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ یہی کائنات کی معقول ترین حقیقتیں ہیں جن کا جاننا اور ماننا انسان کے لیے ضروری ہے اور ان کو مانے بغیر آدمی کی زندگی درست نہیں ہو سکتی۔

(د) بچے کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائے جائیں اور اس سلسلے میں وہ تمام فقہی مسائل بیان کرا دیے جائیں جو ایک دس برس کے لڑکے اور لڑکی کو معلوم ہونے چاہئیں' طہارت اور پاکیزگی کے احکام' وضو کے مسائل' نماز اور روزے کے طریقے' حرام اور حلال کی ابتدائی حدود' معاشرتی زندگی کے پسندیدہ اطوار' یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر مسلمان بچے کو معلوم ہونی چاہئیں۔

3:3 ثانوی تعلیم

ثانوی سطح پر عربی زبان کو بطور لازمی مضمون پڑھایا جائے۔ کوئی شخص اسلام کی سپرٹ پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس میں اسلامی ذہنیت اچھی طرح پیوست ہوسکتی ہے، جب تک کہ وہ قرآن کو براہ راست اس کی اپنی زبان سے نہ پڑھے۔ ثانوی تعلیم کا ایک اہم لازمی مضمون قرآن مجید ہونا چاہئے، جس کے کم از کم دو پارے ہر میٹرک پاس طالب علم اچھی طرح سمجھ کر پڑھ چکا ہو۔ ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہائی سکول کے آخری مرحلوں میں عربی زبان، قرآن ہی کے ذریعہ پڑھائی جائے۔ ان کے علاوہ درج ذیل موضوعات / مضامین کو بھی نصاب میں لازماً شامل کرنا چاہیے:

(الف) اسلامی عقائد اور اسلامی اخلاقیات۔

(ب) اسلامی تاریخ، تاریخ انبیاءؑ، سیرت نبوی ﷺ، سیرت خلفائے راشدینؓ، خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک کی تاریخ کا عملی خاکہ۔

(ج) طلبہ کی عملی تربیت۔ ہائی سکول میں کوئی مسلمان طالب علم ایسا نہ ہو جو نماز کا پابند نہ ہو۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ نماز ہی وہ بنیاد ہے جس پر عملاً اسلامی زندگی قائم ہوتی ہے۔

(د) ثانوی مرحلے کے عام مضامین کو جاری رکھا جائے۔ البتہ ان کے نصاب کی درسی کتابیں اسلامی تصورات کی روشنی میں اور ان کے پس منظر کے ساتھ از سرنو تیار کی جائیں۔

3:4 اعلیٰ تعلیم

3:4:1 مقصد

اعلیٰ تعلیم کا اہم مقصد یہ ہے کہ مجتہدانہ بصیرت والے ایسے صالح علماء تیار ہوں جو اس دور جدید میں ٹھیک ٹھیک دین حق کے مطابق رہنمائی کرنے کے قابل ہوں۔

3:4:2 نصاب

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر اسلامی تعلیم کے لیے ایک عام نصاب ہو جو تمام طلبہ اور طالبات کو لازمی پڑھایا جائے، خواہ وہ کسی شعبہ علم کی تعلیم حاصل کررہے ہوں اور ایک نصاب خاص ہو جو ہر شعبہ علم کے طلبہ و طالبات کو ان کے مخصوص شعبے کی مناسبت سے پڑھایا جائے۔ اس سطح کے لیے سید مودودیؒ نے عام نصاب اور خاص نصاب کا تعین کیا ہے۔

عام نصاب : یہ نصاب ہر طالب علم کے لیے لازمی ہے' چاہے وہ کسی بھی شعبہ علم میں تعلیم حاصل کر رہا ہو:

(الف) قرآن مجید اس طرح پڑھایا جائے کہ ایک طرف طلبہ قرآن کی تعلیمات سے بخوبی واقف ہو جائیں اور دوسری طرف ان کی عربی اس حد تک ترقی کر جائے کہ وہ قرآن مجید کو ترجمے کے بغیر اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

(ب) حدیث کا ایک مختصر مجموعہ جس میں وہ احادیث جمع کی جائیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں پر' اس کی اخلاقی تعلیمات پر اور نبی ﷺ کی سیرت پاک کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہوں۔ یہ مجموعہ بھی ترجمے کے بغیر ہونا چاہیے تاکہ طلبہ اس کے ذریعے سے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عربی زبان دانی میں بھی ترقی کر سکیں۔

(ج) اسلامی نظام زندگی کا ایک جامع نقشہ جس میں اسلام کی اعتقادی بنیادوں سے لے کر عبادات' اخلاق' معاشرت' تہذیب و تمدن' معیشت' سیاست' تعلیم اور صلح و جنگ تک ہر پہلو کو وضاحت کے ساتھ معقول اور مدلل طریقے سے بیان کیا جائے۔

(د) سمع' بصر اور فواد' ان تینوں چیزوں سے مل کر علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے۔ مختلف مضامین کی تدریس کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتیجہ اخذ کرنا ہے۔

خاص نصاب: یہ نصاب صرف مخصوص شعبہ علم کی تخصیص (Specialization) کرنے والے طلبہ کے لیے ہے:

(الف) ہر مضمون کا خاص نصاب اسلامی تناظر میں پڑھایا جائے۔ یہ نصاب صرف اس مضمون کے متعلقہ طلبہ کے لیے ہی ہو۔

(ب) ان مخصوص شعبوں / مضامین میں مغربی علوم و افکار کا مطالعہ مغلوب و مرعوب ذہن سے نہ کیا جائے بلکہ تنقیدی شعور کے ساتھ کیا جائے۔

4.0 معلم مطلوب

عمل تعلیم میں استاد کا کردار مرکزی ہے۔ ایک حقیقی استاد کوئی پیشہ ور کتابیں پڑھانے والا [illegible] ایک مشنری ہوتا ہے جس کی زندگی کا اصل مشن یہ ہے کہ

جو علم، جو تہذیب، عقائد، افکار و عادات، فضائل اور جو کچھ اسے اپنے اسلاف سے ملا ہے، اس کو وہ آگے آنے والی نسل تک اچھی طرح سے صحیح شکل میں عمدگی کے ساتھ اور پوری دیانتداری کے ساتھ پہنچائے تاکہ نئی نسل اس راستے پر آگے بڑھ سکے جس راستے پر اس امت کا آگے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ معلمی درحقیقت ایک مشن ہے اور اگر مشنری جذبے سے کوئی شخص معلمی کا کام نہیں کرتا تو وہ ملازم ہے، معلم نہیں ہے۔

5:0 متعلم مطلوب

طلبہ کو ایسی تربیت دی جائے کہ ان میں خصوصیت کے ساتھ درج ذیل اوصاف پیدا ہوں:

(الف) اسلام اور اس کی تہذیب پر فخر اور اسے دنیا میں غالب کرنے کا عزم

(ب) اسلامی اخلاق سے اتصاف اور اسلامی احکام کی پابندی

(ج) دین میں تفقہ اور مجتہدانہ بصیرت

(د) تنگ نظر فرقہ بندی سے پاک ہونا۔

(ھ) تحریر و تقریر اور بحث کی عمدہ صلاحیتیں اور تبلیغ دین کے لیے مناسب قابلیتیں

(و) جفاکشی، محنت، چستی اور اپنے ہاتھ سے ہر طرح کے کام کر لینے کی صلاحیت

(ز) تنظیم و انتظام اور قیادت کی صلاحیتیں

6:00 علمی تحقیق

(الف) امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ ہے۔ لہٰذا امامت عالم کے لیے ایک اہم صورت یہی ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مفکر اور محقق پیدا ہوں جو فکر و نظر، تحقیق و انکشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھادیں جس پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ اسلام کے بتائے ہوئے طریق فکر پر آفاق کے مشاہدے اور حقائق کی جستجو سے ایک نئے نظام فلسفہ کی بنیاد رکھی جائے۔ ملحدانہ نظریات کو توڑ کر خدا پرستانہ نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کی جائے اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھایا جائے کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے۔ اس طرح بالآخر دنیا میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔

(ب) جو طریق فکر خدا کی ہستی کو نظر انداز کرکے نظام کائنات کی جستجو کرے گا وہ مادیت، بے دینی اور الحاد تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا۔

(ج) یورپ اور امریکہ سے علوم و فنون سیکھے جاسکتے ہیں لیکن ان کا معاشرتی فلسفہ، طرز زندگی اور اخلاقی اصول لینے کی ضرورت نہیں، اس معاملہ میں اسلام سے جو

ہدایات امت مسلمہ کو ملی ہیں وہ نہ صرف یہ کہ بدر جہا ارفع و اعلیٰ ہیں بلکہ خود مغرب بھی اگر تباہی سے بچنا چاہتا ہے تو اس کو اس معاملہ میں اسلام سے ہی رہنمائی لینی ہوگی۔

7:00 حکمت عملی

اسلامی تعلیمی فکر کی تشکیل و تنفیذ کے لیے درج ذیل اقدامات کی ضرورت ہے:

(الف) تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں دینی چاہئیں جو اسلامی فکر رکھتے ہوں' اسلامی نظام کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا بھی چاہتے ہوں۔ یہ کام اگر ہو سکتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکتا ہے نہ کہ ان لوگوں کے ہاتھوں جو نہ اسلام کو جانتے ہوں نہ اس کے نظام تعلیم کو اور نہ اس کے قیام کی کوئی خواہش ہی دل میں رکھتے ہوں۔

(ب) سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے معلمین اور معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و اخلاق اور دینی حالت کو' ان کی تعلیمی قابلیت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ اہمیت دی جائے اور آئندہ کے لیے اساتذہ کی تربیت میں بھی اس مقصد کے مطابق اصلاحات کی جائیں' کیونکہ فاسد العقیدہ اور فاسد الاخلاق استاد اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ ذہنی' اخلاقی اور عملی تربیت نہیں دے سکتے' جن کی نئے دور کے لیے ضرورت ہے۔

(ج) سکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پورے ماحول کی تطہیر کی ضرورت ہے۔ اس کے سارے ماحول کو اسلام کے اصول اور سپرٹ کے مطابق بنانا ہوگا۔ مخلوط تعلیم' مغربی تہذیب و تمدن کا غلبہ' غیر اسلامی نصابی سرگرمیاں' اگر یہ سب کچھ یوں ہی جاری رہتا ہے' تو اس ذہنی و تہذیبی غلامی کے ماحول میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے وہ باعزت شہری اور کارکن و کار فرما پروان نہیں چڑھ سکتے جنہیں اپنی قومی تہذیب پر فخر ہو۔ پورے نظام' نصاب تعلیم' طریقہ ہائے کار اور ماحول کو بدلنا ہوگا۔ اس کے لیے افکار بنانے والے تمام ذرائع ابلاغ صحیح اور مناسب طریقے سے استعمال کرنے ہوں گے اور ان کے غلط استعمال کو روکنا ہوگا۔

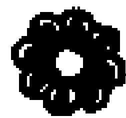
(د) دنیا میں اخلاقی' سیاسی' معاشی اور عمرانی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں قائدین اور کارکنان کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے علم و تحقیق اور نظام تعلیم کی قوت کو بر سر عمل لانا ضروری ہے۔ اس تناظر میں نظام تعلیم کی اس انداز پر اسلامی تشکیل مطلوب ہے' جو ان ضرورتوں کو پورا کر سکے جو ہمیں ایک مسلمان قوم' ایک آزاد قوم

اور ایک ترقی کی خواہش مند قوم کی حیثیت سے اس وقت لاحق ہیں۔

آخر میں جناب نعیم صدیقی کے مقالہ "مکمل تعلیمی انقلاب کی منفرد آواز" سے ایک مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے' جو سید مودودی کی انقلابی تعلیمی فکر کے اساسی نکتہ کا تعین کرتا ہے:

> سید ابوالاعلیٰ مودودی جس انقلابی دعوت تعلیم کو لے کر اٹھے' اس کی رُو سے علم و تعلیم اور امامت و قیادت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو قوم' تعلیم اور علم و تحقیق میں آگے بڑھتی ہے' وہی دوسروں کے لیے پیش رو بنتی ہے اور اسی کی تقلید کی جانے لگتی ہے۔ علم اسے اس فکری و ذہنی استیلا اور سیاسی و اقتصادی فوقیت کا راستہ بنا کے دیتا ہے---- "علم برائے امامت عالم" کے اسی نظریے کے فریم میں تعلیم کے متعلق ان کی انقلابی فکر نصب ہوئی ہے۔ (ماہنامہ تعلیمات لاہور' جلد 4' شمارہ' 4-5' ستمبر اکتوبر 1981ء ص 75)۔

(ماہنامہ تعلیمات لاہور' جلد 4' شمارہ 5' اکتوبر 1981ء ----ماہنامہ افکار معلم لاہور جلد 3' شمارہ 3' مارچ 1991ء)



چند دیگر مباحث و مسائل

تعلیمی تحقیق کی اہمیت

تعلیم دراصل ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جس میں ایسے تجربات اور سرگرمیاں شامل ہیں جو انسانی شخصیت اور کردار کی تشکیل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان تجربات اور سرگرمیوں کو محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ایک جاری عمل ہے۔ اس عمل کے دوران اور حصول مقاصد کی خاطر کئی مسائل بھی پیش آسکتے ہیں۔ چنانچہ نئے نئے خیالات' رجحانات اور تصورات کی ہروقت گنجائش رہتی ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک تعلیمی کارکن کو ہروقت چوکنا رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ مناسب تشخیص و علاج بھی کرسکے۔

کسی بھی علم میں مسائل کو حل کرنے کے لیے تحقیق کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ روز آفرینش ہی سے انسان اپنے اردگرد کی دنیا کے متعلق متجسس ہے۔ وہ اپنے طور پر بعض چیزوں کے بارے میں سوچ کر فیصلہ کرتا ہے اور پھر خود ہی مشاہدہ کی بنا پر اس کی تائید یا تردید کرتا ہے یا پھر اپنی رائے میں کچھ رد و بدل کرلیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بدولت اپنی قوم کے سامنے سیاروں کے نظام طلوع و غروب سے توحید کی ناقابل انکار حجت پیش کی جن کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ سورۃ الانعام میں آتا ہے۔ ترجمہ: "چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہوگیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب' میرا رب سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھے "اے برادران قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں۔ جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یک سو ہوکر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کرلیا جس نے زمین اور آسمان کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔" (الانعام : 76'79)۔ دراصل حضرت ابراہیمؑ کو بصیرت و یقین کی یہ غیر معمولی قوت' الٰہی ہدایت کی روشنی میں زمین و آسمان کے نظام سلطنت کے مطالعہ اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے حاصل ہوئی۔ ان کی فکر مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی اور مفروضوں کو مٹاتی ہوئی اس نتیجے پر پہنچی کہ اصل خالق تو اللہ کی ذات ہے اور وہی سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تمام انداز فکر دراصل تحقیق و جستجو کا تقاضا

قرآن حکیم میں ایک فقرہ بھی ایسا نہیں جو کسی مسلمان کو مظاہر فطرت سے متعلق تحقیق و جستجو سے باز رکھے۔ سائنس کے متعدد شعبوں میں مسلم مفکرین کے کارناموں کی طویل فہرست اس بیان کا بلیغ ثبوت ہے۔ اسلام نے تحقیق' غور و فکر اور علم و حکمت کے لیے عظیم تحریک دی ہے اس کے لیے کئی کلیدی الفاظ و عبارات قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً۔

ترجمہ: "اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش' اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمند لوگوں کے لیے۔" (الروم : 22)

ترجمہ: "یہ کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے بڑی برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و تدبر کریں اور تاکہ دانشور نصیحت حاصل کریں۔" (ص : 29)

ترجمہ: "کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں' برحق اور ایک مقرر مدت کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔" (الروم : 7-8)

ترجمہ: "زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے' تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔" (ال عمران : 191:190)

ترجمہ: "ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی تو ہو اندھا بہرا اور دوسرا ہو دیکھنے اور سننے والا' کیا یہ دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور و فکر نہیں کرتے" (ھود : 24)

ترجمہ: "اور ان کو ابراہیم کا قصہ سناؤ جب کہ انہوں نے اپنے باپ اور قوم کے لوگوں سے پوچھا یہ کیا ہیں جن کو تم پوج رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ کچھ مورتیاں ہیں جن کو ہم پوجتے ہیں اور جن کی سیوا میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کیا یہ تمہاری سنتے ہیں۔ جب تم انہیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا نہیں۔ بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے دیکھا۔ اس پر ابراہیم نے کہا کیا تم نے کبھی ان پر غور کیا ہے؟ جن کو تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یہ سب میرے تو دشمن ہیں۔ مگر ہاں ایک رب العالمین (وہی عبادت کے لائق ہے) جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر وہی مجھے سیدھی راہ دکھاتا ہے اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا بخشتا ہے اور وہ مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ زندہ کرے گا اور

جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں میری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔" (الشعراء : 69- 72)

ترجمہ: "(اللہ) جسے چاہے حکمت دیتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوئی۔ اسے بہت بڑی بھلائی ملی ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں' جو دانشمند ہیں۔" (البقرہ:269)

ترجمہ: "ان سے پوچھو کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں کبھی یکساں ہوسکتے ہیں؟" (الزمر:9)

ترجمہ: "اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔" (یونس : 24)

ترجمہ: "یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے" (الانفال : 22)

ترجمہ: "ان سے کہو! زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہوسکتی ہیں" (یونس : 101)

ترجمہ: "(یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟" (الغاشیہ : 17-20)

ترجمہ: "اے نبیؐ" ان سے کہو کہ میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو۔۔۔۔۔" (سبا : 46)

ترجمہ: "تم یہ حکایات ان کو سناتے رہو' شاید کہ یہ کچھ غور و فکر کریں" (الاعراف: 176)

ترجمہ: یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں۔" (الحشر:21)

ترجمہ: "کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی چھپی نعمتیں تم پر تمام کردی ہیں۔" (لقمان :20)

ترجمہ: "ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ اللہ کا شکر گزار ہو۔" (لقمان :12)

ترجمہ: "ہم نے اسے (انسان کو) سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا۔ خواہ وہ شکر کرنے والا ہے یا کفر کرنے والا۔" (الدھر:2-3)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کی یوں تفسیر کرتے ہیں: "اصل میں فرمایا گیا ہے "ہم [illegible] یہاں سننے اور دیکھنے سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان

علم حاصل کرتا اور پھر اس سے نتائج اخذ کرتا ہے ۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائع علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے' ورنہ اصل مراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعہ سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں ان حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے ہیں کیونکہ اس کے ہر حاسہ کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعہ سے آنے والی معلومات کو جمع کرکے اور ان کو ترتیب دے کر ان سے نتائج نکالتا ہے' رائے قائم کرتا ہے' اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویہ زندگی مبنی ہوتا ہے۔" (تفہیم القرآن' جلد ششم' حاشیہ 4' ص 187)۔

محسن انسانیت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں تدبر و تفکر کی دعوت دی' کیونکہ اللہ کی تخلیق کردہ چیزوں پر غور و فکر کرنا عبادت ہے۔ اس ضمن میں چند احادیث نبوی ﷺ:

ترجمہ: "حکمت والی بات' مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے' مومن جہاں بھی اسے پائے اس کا زیادہ حق دار ہے" (ترمذی)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرو" (غزالی' احیاء علوم الدین' جلد 4)

ترجمہ: "جس شخص کو علم کے بغیر فتویٰ دیا گیا' اس کا گناہ فتویٰ دینے والے کے اوپر ہے" (ابوداؤد)

ترجمہ: "جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے سفر کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں اور طالب علم کے لئے فرشتے خوشی خوشی پر بچھاتے ہیں۔ عالم کے لئے آسمان و زمین کی تمام مخلوقات حتیٰ کہ پانی کی مچھلیاں استغفار کرتی ہیں۔" (ابوداؤد' ترمذی)

ترجمہ: "کسی شخص کے لئے یہ بات مناسب نہیں کہ ایسی بات کہے جس کا اسے علم نہیں۔" (بخاری)

ترجمہ: "تم میں دو خصلتیں ہیں جو اللہ اور اسکے رسول ﷺ کو پسند ہیں: عقل اور احتیاط"۔ (غزالی' احیاء علوم الدین' جلد 4)

ترجمہ: "جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ نکالا' اسے اس کا اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس طریقے کو اس کے بعد اپنائیں گے ان سب کے برابر اجر ملے گا' لیکن اس سے ان لوگوں کا اجر کم نہیں ہوگا' اور جس شخص نے اسلام میں کوئی برا طریقہ نکالا اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان سب لوگوں کے برابر گناہ ہوگا جو اس طریقے پر اس کے بعد چلیں گے لیکن اس سے ان

کے گناہوں میں کمی نہیں آئے گی۔" (مسلم)

قرآن حکیم اور احادیث نبوی ﷺ کا طرز استدلال' علم و حکمت اور غور و فکر کے بارے میں ان کی تحریک' یہ بذات خود الگ موضوعات ہیں جن پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کا سرسری تذکرہ صرف اس لیے کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ قرآن و حدیث میں تحقیق اور غور و فکر کی کیا اہمیت ہے؟ بہر حال مندرجہ بالا چند حوالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے جو دراصل دین فطرت ہے' تعلیم و تحقیق کی عظیم تحریک دی ہے۔ یہ وہ دین ہے جس میں جاہل کا کوئی مقام نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام علم کا نام ہے جہالت کا نہیں۔ چنانچہ مومن وہی ہے جو اسلام کو سوچ سمجھ کر قبول کرتا ہے اور اس کا اسلامی تشخص کسی نسل' رنگ یا جغرافیہ پر نہیں بلکہ بالاتر سرچشمہ علم یعنی وحی الٰہی کے تناظر میں' عمیق غور و فکر' عقل سلیم اور علم و حکمت کی بنا پر قائم ہوتا ہے۔

جدید تحقیق

مختلف ادوار میں جتنی بھی سائنسی ترقی ہوئی ہے وہ تحقیق ہی کی مرہون منت ہے۔ ہر چند کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ باضابطہ سائنسی تحقیق کی ابتدا کب اور کہاں ہوئی۔ اس کے لئے قطعی طور پر زمان و مکاں کا تعین مشکل ہے' لیکن ایک رائے یہ ہے کہ اسے اہل یونان نے ترقی دی۔ خاص طور پر ارسطو نے اس نقطہ نظر کو پیش کیا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے بنیادی طور پر مقدمات کی ضرورت ہے۔ یعنی ایک مقدمہ کبریٰ اور دوسرا مقدمہ صغریٰ۔ مقدمہ کبریٰ ایک بدیہی اور نمایاں مفروضہ ہے جو پہلے سے ہی کسی مابعد الطبعی سچائی یا عقیدہ کی وجہ سے قائم ہوا ہے۔ مقدمہ صغریٰ ایک ایسی مخصوص صورت ہے جو مقدمہ کبریٰ کے کسی ایک حصے سے ماخوذ یا متعلق ہو۔ ان ہر دو مقدمات سے نتیجہ مستخرج ہوتا ہے۔ چنانچہ منطقی تجزیہ کے لیے اس استخراجی طریق کار نے سائنسی طرز فکر میں ایک اہم اضافہ کیا۔ کئی صدیوں بعد فرانسس بیکن نے اس بات کی وکالت کی کہ جب تک مظاہر قدرت کا براہ راست مشاہدہ اور ادراک نہ کیا جائے' کسی تعمیمی اصول تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ بیکن نے استقرائی طریق کار کی حمایت اس بنا پر کی کہ استخراجی طریق کار بعض حقیقتوں اور صداقتوں کو پانے کی راہ میں حائل تھا۔ کیونکہ یہ طریق کار اس مقدمہ کو لے کر چلتا ہے جو فلسفے کے قدیم اصول کی بنیاد پر قائم ہے اور جسے انسانی ذہن نے پہلے سے ہی تسلیم کیا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف استقرائی طریق کار نے بھی منطقی تجزیہ میں چنداں رہنمائی نہیں کی۔ اسی لیے بعد کے [illegible] کے استخراجی طریق کار [illegible] اور بیکن کے استقرائی طریق کار کو

باہم ملا دیا۔ چنانچہ اس نے اپنے تھیسس کو ان دونوں طریقوں کی مدد سے ثابت کیا۔ بہر حال یہ بات سب کے سامنے رہی کہ مطلوبہ مواد فراہم کرنے کے لیے سب سے پہلے کسی نہ کسی مفروضہ کو سامنے رکھ کر چلنا ہوتا ہے اور پھر نتائج کی روشنی میں اس مفروضہ کی تائید یا تردید یا پھر اس میں کوئی تبدیلی کرنا پڑتی ہے۔ چنانچہ تجزیہ کے سائنسی طریق کار میں مندرجہ ذیل امور کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا:

- مسئلہ کی نشاندہی، وضاحت اور اہمیت
- مفروضہ یا مفروضات کی باقاعدہ اور باضابطہ تیاری
- ضروری مواد کی فراہمی، اس کی ترتیب اور تجزیہ
- نتائج کا استخراج و استنتاج
- مفروضہ / مفروضات کی توثیق یا تردید

مسلمان، جدید تحقیق کے شماریاتی انداز، منضبط جائزوں اور دیگر ممالک میں کی گئی تعلیمی تحقیقات کے خلاف نہیں، البتہ ان کی اپنی تاریخی اور علمی روایات ہیں، جن کا مستقل معیار وحی الٰہی ہے۔ اسی دائمی سرچشمہ علم کے تحت وہ دیگر ذرائع علم سے استفادہ کرتے ہیں۔ اسلام کی تحقیقِ روایت سے متعلق سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بی بی سی کے نمائندے ولیم کرالے سے 25- نومبر 1975ء کو ایک انٹرویو میں فرمایا:

> "---آپ تاریخی تحقیق و مطالعہ کے جس ماڈرن سسٹم کا حوالہ دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں جو طریق تحقیق ہے اس کا ماڈرن ریسرچ سکالرز کو کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا۔ ہمارے ہاں جس طریقے سے روایات کو، تحقیق و جستجو اور چھان پھٹک کے بعد قبول کیا جاتا ہے اس کا اہتمام کسی دور میں بڑے سے بڑے علمائے تاریخ نے کبھی نہیں کیا۔ ہمارے ہاں روایات کی صحت کو عقلی معیار پر جانچنے کے ساتھ ساتھ ان کی اسناد کی تحقیق کی جاتی ہے اور جب یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کی سند پوری طرح متصل ہے اور اس میں سے کوئی کڑی غائب یا کمزور نہیں ہے۔ تب ان روایات کو قبول کیا جاتا ہے۔ احادیث اور کتب سیرت میں رسول اللہ ﷺ سے منسوب تمام روایات کو اس طریق تحقیق پر جانچنے کے بعد ان کو قبول یا رد کیا جاتا ہے۔ آپ کے موجودہ ریسرچ سکالرز اس طرز تحقیق سے [illegible] [1]

[1] تعلیمات لاہور، جلد [illegible]، شمارہ [illegible]

بہر حال تحقیق کی اہمیت اور افادیت کے بارے میں جن آراء پر تقریباً" تمام ماہرین تحقیق کا اتفاق رہا۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

- تحقیق (چاہے بیانیہ ہو یا تجرباتی) سے نیا علم اور مواد' مقاصد کو پیش نظر رکھ کر حاصل کیا جاتا ہے۔
- تحقیق' منظم' صحیح' موزوں اور ماہرانہ کھوج کا نام ہے۔
- تحقیق مدلل اور معروضی ہوتی ہے۔ تحقیق کنندہ اپنے تعصبات اور اپنی ذاتی رائے کو دخل نہیں دیتا۔
- تحقیق صبر آزما کام ہے اور جلد بازی سے مبرا ہے۔ اس کے لیے انتہائی محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔
- تحقیق' علم' محنت' دیانت اور صبر کا تقاضا کرتی ہے۔
- تحقیق کو انتہائی احتیاط سے ریکارڈ اور رپورٹ کیا جاتا ہے۔

یونیسکو نے 1966ء میں پبلک ایجوکیشن پر ایک عالمی کانفرنس منعقد کی' اس کانفرنس کے دوران تعلیمی تحقیق کے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے مندرجہ ذیل پانچ امور کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا۔

- تعلیمی تحقیق کا اہم مقصد تعلیمی عمل کے لیے قوانین اور اصولوں کو دریافت کرنا ہے۔
- تعلیمی تحقیق کسی ملک کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد تعلیمی مقاصد کے تعین میں نظریاتی اور سائنسی بنیاد فراہم کرتی ہے۔
- تعلیمی تحقیق کا اہم مقصد تعلیمی معیار کی اصلاح و ترقی ہے۔
- تعلیمی تحقیق کا مقصد ایسے ذرائع تلاش کرنا ہے جن کی مدد سے تعلیم و تعلم میں اصلاح ہو سکے۔
- تعلیمی تحقیق کا مقصد بچے کی نشوونما پر دوسرے ذرائع (مثلاً" ابلاغ عام' عام حالات زندگی' کام کاج' معاشی اور معاشرتی حالات' فارغ اوقات میں مشاغل اور کام وغیرہ) کا اثر معلوم کرنا ہے۔

جہاں تک تعلیمیات میں سائنسی مطالعہ کا تعلق ہے اس کی ابتداء انیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی جب 1803ء میں پسٹالوزی نے طریق تعلیم پر ایک سائنسی مطالعہ کیا۔ اس کے بعد [illegible]' [illegible]' فرانسس گالٹن' جے ایم کیٹل اور کئی دوسرے محققین نے تعلیم [illegible] کیے۔ لیکن ایشیاء کے اکثر ممالک میں بالخصوص پاکستان میں

تعلیمی تحقیق کی باقاعدہ کوشش 1960ء سے کی گئی جب قومی تعلیمی کمیشن 1959ء کی سفارشات کی روشنی میں پاکستان کے اس وقت کے دو صوبوں میں دو ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق کا قیام لاہور اور ڈھاکہ میں عمل میں آیا۔ حقیقت میں تعلیمات کے شعبہ میں ایسے ہزار ہا مسائل ہیں جن پر منظم اور منضبط تحقیق کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر لوگ یہی خیال کرتے ہیں کہ تحقیق تو صرف طبعی علوم میں ہی ہو سکتی ہے۔ آخر تعلیم کے مسائل ہیں کیا؟ جن پر تحقیق کے لیے اتنا روپیہ صرف کیا جائے۔ چونکہ تعلیم میں تحقیق کے نتائج فوری طور پر نظر نہیں آتے اس لیے عام آدمی یہی سوچتا ہے کہ سائنسی دنیا میں تو وہ انقلاب اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن تعلیم کے مسائل میں تحقیق کے کیا معنی ہیں؟ دراصل زراعت' طب اور ایٹمی سائنس کے برعکس تعلیمی تحقیق کے نتائج فوری طور پر تو نظر نہیں آتے لیکن وہ بہت دور رس ہوتے ہیں۔ اکثر ترقی یافتہ ممالک میں ترقی کا تمام تر انحصار تحقیق پر ہے۔ امریکہ' روس' چین' جاپان' برطانیہ' جرمنی' فرانس غرض کوئی بھی ملک لیں اگر ان کے ہاں کسی شعبہ زندگی میں کوئی ترقی ہوئی ہے' تو وہ منظم منصوبہ بندی اور تحقیق کی بدولت ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اساتذہ صرف روایتی "کلاس روم ٹیچر" ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کی تدریس' تحقیق کے تابع ہوتی ہے۔ چنانچہ ان ممالک میں ایک طرف معیار تعلیم بڑھ رہا ہے اور دوسری طرف معیار زندگی بہتر ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں مقداری اور معیاری دونوں نکتہ ہائے نظر سے کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی۔ آج غربت اور جہالت کے اژدھے صرف اس لیے ہمیں کھانے کو دوڑ رہے ہیں کہ ہم نے تعلیم کو بے مقصد جانا' تعلیم کے مسائل سے بے اعتنائی برتی اور جہاں کہیں تعلیم کو رائج بھی کیا تو یہ سوچے بغیر کہ نصاب تعلیم کن بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے؟ ملک اور قوم کی کیا ضروریات ہیں؟ ان ضروریات کی روشنی میں نصابات کی کیسے تدوین ہو؟ طریقہ ہائے تعلیم کون سے ہونے چاہیں"؟ کون سا طریقہ امتحان ہو؟ غرض ہماری تعلیمی گاڑی بغیر منزل کے چلی جا رہی ہے اور اس گاڑی کے ڈرائیور بھی وہ لوگ ہیں' جنہیں نہ منزل کی خبر ہے اور نہ اپنی خبر۔ چنانچہ جس طرح بے خبر اور کم علم ڈرائیور کی وجہ سے سواریوں کی جان ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ اسی طرح جو استاد تعلیمی مسائل کی تشخیص و علاج کی مناسب صلاحیت نہیں رکھتا' اس سے طلبا کی رہبری اور قیادت کی توقع عبث ہے۔

جہاں تک تعلیمی مسائل کا تعلق ہے۔ صرف ایک مسئلے یعنی "تعلیمی زبان" کو ہی لیجئے جو تقریباً" ہر سطح کے اساتذہ کو پیش آسکتا ہے۔ اب اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کئی سوالات آئیں گے جن کے واضح جوابات [illegible]

سے بچوں نے اپنی تعلیم چھوڑ دی؟ سکول چھوڑنے کی کیا وجوہات تھیں؟ بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے بارے میں والدین کے رجحانات کیسے ہیں؟ استاد کا اپنے تدریسی پیشے کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ کیا سکول میں کمرہ جماعت' فرنیچر' کتب اور دیگر تدریسی مواد ایسا ہے جو طلبہ کی تعلیمی کارکردگی کو بہتر بنانے میں معاون ہے؟ کیا طلبہ درسی کتب میں دلچسپی لیتے ہیں؟ کیا ان کتابوں کی قیمتیں عام آدمیوں کی آمدنی کے مطابق ہیں؟ کیا اساتذہ مطلوبہ علمی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل ہیں؟ کیا اساتذہ وقت پر سکول آتے ہیں؟ طریقہ ہائے تدریس غیر موثر تو نہیں؟ سکول انسپکٹر کتنی بار سکول کا معائنہ کرتے ہیں؟ کیا انتظامیہ کا عملہ کافی ہے؟ طلبہ کے امتحان میں ناکامی کے کیا اسباب ہیں؟ طریقہ امتحان کس قسم کا ہے؟ غرض عمل تعلیم کے مختلف عناصر سے متعلق کتنے ہی اور سوالات ہوں گے جو ایک دوسرے سے متعلق ہوں گے۔ موثر تدریس کا جدید تصور یہ ہے کہ استاد صرف کمرہ جماعت تک ہی محدود نہ رہے بلکہ وہ تدریسی مسائل کے بارے میں بھی کچھ غور و فکر کرے جو اسے ہر روز پیش آتے ہیں۔ وہ اس بات کا کھوج لگائے کہ اس کا شاگرد اکمل کلاس میں کیوں دیر سے آتا ہے؟ رشید نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی؟ محمود پچھلی جماعتوں میں تو بہت اچھا تھا اب اچانک اس کے نمبر کیوں کم آئے؟ ماجد انگریزی میں تو خوب ہے لیکن ریاضی سے کیوں بھاگتا ہے؟ خالد سب اساتذہ کے پیریڈز میں حاضر رہتا ہے صرف اس کی کلاس میں کیوں نہیں آتا؟ کہیں اس کا طرز عمل تو خراب نہیں؟ کہیں اس کا طریق تدریس تو غیر موثر نہیں۔ اس طرح کے بیسیوں سوالات ہیں' جن کے جوابات استاد کو تلاش کرنا ہیں۔ وہ ان مسائل کے بارے میں یا تو خود تحقیق کرے یا پہلے سے ہی ان مسائل اور حالات سے متعلق جو تحقیقی نتائج موجود ہیں' ان کی روشنی میں مسائل کو حل کرے۔ بہر حال یہ ضروری نہیں کہ تحقیق کے ذریعے استاد کو پورا جواب مل جائے تحقیق ایسی چابی نہیں جو تمام دروازوں کو کھول دے۔ یہ تو ایک ذریعہ ہے چابیوں کے حصول کا۔ ایک اچھا استاد وہی ہے جو تدریس و تحقیق میں کمال پیدا کرے۔ تحقیق دراصل ایک استاد کو مستعد' متحرک' فعال اور جدید معلومات سے باخبر رکھتی ہے۔ اگر پڑھانے والا نئی اور جدید معلومات فراہم کرے گا تو اس کے طلبہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ کورے (Corey) کے خیال میں اساتذہ' نگراں' اور منتظمین مدرسہ یقیناً بہتر فیصلے کر سکتے ہیں اور موثر سرگرمیوں میں حصہ لے سکتے ہیں اگر وہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ تحقیق کی اہمیت کو جانیں اور پھر تحقیق کرنے کے لیے رضا مند ہوں۔ درحقیقت تدریس ایک پیچیدہ اور اہم عمل ہے جو سائنسی توجہ کا محتاج ہے۔ تحقیق ہی قیادت اور [illegible] سے نئے نئے خیالات اور تصورات سامنے آتے ہیں' مثلاً

حال ہی میں منضبط تدریس، مائیکرو ٹیچنگ، اوپن سکول، اوپن یونیورسٹی، انسٹرکشنل ٹیکنالوجی جیسے نئے تجربات ہمارے سامنے آچکے ہیں۔

پاکستان میں تحقیق کی اہمیت کو مختلف سرکاری رپورٹوں میں تسلیم تو کیا گیا لیکن عملی طور پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ جہاں تک تحقیق کی اہمیت کا تعلق ہے اس کا ذکر پاکستان کے پہلے پنج سالہ منصوبہ میں اس طرح کیا گیا:

> "کالج اور یونیورسٹی کے مندرجات تعلیم اور معیار کی اصلاح کا انحصار تعلیم و تربیت کے اچھے ماحول پر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے نصاب اور درسی کتب کی مسلسل اصلاح کرتے رہیں تاکہ نئی علمی معلومات سے ان کا تعلق قائم رہے اور یہ طلبہ اور قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرتے رہیں۔ اس وقت ان امور کی طرف خاص توجہ درکار ہے تاکہ مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ یہ مقاصد کیا ہیں؟ ان کا تعین اپنے آزاد قومی زندگی کے پیش نظر کیا جاسکتا ہے اور اس سے تربیت یافتہ کارکنوں کی فراہمی اور منظم تحقیق کے فروغ کے مسائل حل ہوسکتے ہیں"۔

اس کے علاوہ تقریباً" تمام پنج سالہ منصوبوں، تعلیمی پالیسیوں اور قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں تحقیق کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے اور یہ کہا گیا کہ تعلیم کے ہر پہلو میں ترقی کے لیے تحقیق کو ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔ پاکستان پلاننگ کمیشن نے مختلف تعلیمی منصوبوں کی تشکیل کے لیے کئی تحقیقی موضوعات تجویز کیئے مثلاً" پاکستان میں تعلیمی اقتصادیات، یونیورسل پرائمری تعلیم، تعلیم بالغاں، فنی تعلیم، درسی کتب، تعلیم نسواں، تعلیم میں بیرونی مدد، اسلامی ادارے، سمعی و بصری تدریسی اعانتیں، نصاب تعلیم، معیار تعلیم، مقاصد تعلیم، امتحانات، افرادی قوت کی منصوبہ بندی، بہبود طلبہ اور جسمانی تعلیم۔ گو ان موضوعات پر کسی نہ کسی طور پر کئی اداروں میں کام ہو رہا ہے، لیکن تعلیم کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک باقاعدہ اور منظم تحقیق کا کوئی مربوط نظام نہ ہو۔ منظم اور منضبط تحقیق کے بغیر نہ تعلیم کے مندرجات کی اصلاح ہوسکتی ہے اور نہ ہی طریق تدریس کو موثر بنایا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے تعلیمی اداروں میں تدریس و تحقیق کے درمیان مناسب اور صحیح توازن قائم نہیں ہوسکا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تدریس و تحقیق دونوں کو فروغ حاصل ہو کیونکہ دونوں کے بغیر تعلیمی ترقی ممکن نہیں۔

چند تجاویز

○ ہر یونیورسٹی میں تحقیق کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں، خصوصاً" تحقیق میں اعلیٰ تربیت کا انتظام ہو تاکہ معیار تحقیق بلند ہو۔

○ قومی سطح پر ریسرچ بورڈ ہو جس کا صدر خود وفاقی وزیر تعلیم یا کوئی اور معروف ماہر تعلیم ہو۔ اس بورڈ میں مختلف تحقیقی اداروں کو نمائندگی دی جائے تاکہ ایک تو ان کے کام میں رابطہ پیدا ہوسکے دوسرے تمام تحقیقات کی جانچ پرکھ ہو سکے۔

○ یونیورسٹی کے ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق کی طرح ٹریننگ کالجز کے نصابات میں بھی تحقیق کو ایک الگ کورس کی حیثیت سے شامل کیا جائے اور جو طالب علم بی۔ایڈ میں تحقیقی مقالہ پر کام کرنا چاہے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

○ ادارہ تعلیم و تحقیق لاہور، پورے پاکستان کی سطح پر تعلیم و تحقیق کا ایک بنیادی اور اہم ادارہ ہے۔ تعلیم کے متعلق تمام تحقیقاتی منصوبے اسی ادارے کے سپرد کیے جائیں یا اس کی فیکلٹی کونسل کے مشورے سے کسی اور فرد یا ادارے کو سونپے جائیں۔

○ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جہاں تحقیقی یونٹس قائم کیے گئے ہیں ان میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تحقیق کنندگان تدریسی فرائض انجام نہیں دیتے اور دوسری طرف تدریسی فرائض انجام دینے والے، تحقیقی منصوبوں میں پوری طرح شامل نہیں ہوتے۔ اس پالیسی کو جلد از جلد بدلا جائے۔ اس طرح پڑھانے والا، ساتھ ساتھ تحقیق بھی کرے گا اور ہر تحقیق کرنے والا ساتھ ساتھ پڑھائے گا بھی۔ اس سے یہ فائدہ ضرور پہنچے گا کہ تمام تدریسی و تحقیقی تجربات مجموعی طور پر موثر تدریس میں معاون ثابت ہوں گے۔ تعلیم اور تحقیق کو الگ الگ یونٹوں میں تقسیم کرنا شاید دفتری ماحول میں تو چل جائے لیکن تعلیمی اداروں میں اس طرح کی تقسیم تعلیمی زیاں کا باعث ہی ہو سکتی ہے۔

○ جامعات میں قائم ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق اور اس سطح کے دوسرے تعلیمی تحقیق کے اداروں میں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ تدریسی یا تحقیقی کام صرف ان لوگوں کو سونپا جائے جو ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھتے ہوں یا مناسب عملی و تحقیقی تجربہ رکھتے ہوں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کسی نئے لیکچرار کو اس وقت تک کلاسز پڑھانے کو نہ دی جائیں جب تک وہ کم از کم ایک سال تک اس ادارہ کے ملحقہ لیبارٹری ماڈل سکول یا ادارہ کے کسی تحقیقی منصوبے میں کام نہ کرلے۔

○ ادارہ تعلیم و تحقیق لاہور پاکستان میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا قدیم ادارہ ہے۔ اگر اس کے لیے [illegible] لیے لازمی شرط ہے کہ وہ کم از کم ایجوکیشن میں فرسٹ کلاس ماسٹرز [illegible] اس سے کیوں مستثنیٰ ہو۔ حالانکہ ادارہ کے ابتدائی قیام [illegible]

میں یہ شق موجود ہے کہ اس کا ڈائریکٹر' ایجوکیشن میں پی ایچ ڈی ہوگا۔ لیکن اگر مصلحتوں کی خاطر اس طرح کے قانون "آناً فاناً" بدل دیئے جائیں یا ان پر عمل نہ کیا جائے تو تعلیم کی خدمت تو ایک طرف' یہ قوم و ملک سے بھی صریحاً" ناانصافی ہوگی۔

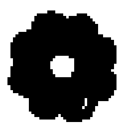
○ تعلیم و تحقیق کے فروغ کے لیے' ادارہ تعلیم و تحقیق لاہور کو "یونیورسٹی آف ایجوکیشن" کا درجہ دیا جائے' اس سے ملک میں بحیثیت مجموعی اساتذہ کے علمی اور معاشرتی وقار میں بھی اضافہ ہوگا اور تعلیم و تحقیق کے کام کو بھی فروغ حاصل ہوگا۔

○ ادارہ ہائے تعلیم و تحقیق کے سینئر پروفیسرز جو ریٹائر ہوچکے ہیں' ان میں لائق اساتذہ کو پروفیسر ایمریطس تعینات کرکے مختلف تحقیقی منصوبوں کی رہنمائی سونپی جائے۔

○ تمام ابتدائی' ثانوی اور تربیتی تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے لیے' ماسٹرز ڈگری ان ایجوکیشن کی لازمی شرط ہونی چاہیے۔ صرف بی۔ ایڈ اساتذہ تعلیم و تحقیق کے جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے۔ سردست تمام سینئر اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحبان جو ایجوکیشن میں ماسٹرز ڈگری نہیں رکھتے' ان کے لیے مختلف مقامات پر تعلیم و تحقیق میں شارٹ ٹرم کورسز کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ تعلیم و تحقیق سے کسی حد تک روشناس ہوسکیں۔

○ تمام تعلیمی اداروں میں اساتذہ کو ان کی نمایاں علمی و تحقیقی مقالات پر ترقیاں دی جائیں تاکہ ان کی مناسب حوصلہ افزائی ہو۔

(شش ماہی مجلہ تعلیم و تحقیق' آئی ای آر' جامعہ پنجاب' لاہور' 1977)



تربیت اساتذہ کے چند مسائل

دنیا بھر میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کسی بھی نظام تعلیم میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ بے شک تعلیمی عمل کے دوسرے عوامل مثلاً" نصاب کی تدوین' درسی کتب کی تیاری' طریقہ ہائے تدریس اور نظام امتحانات وغیرہ سبھی بڑے اہم ہیں لیکن یہ بے معنی اور غیر موثر ہو جاتے ہیں' اگر استاد تیار نہیں ہے۔ اس چیز کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے' جب ہم اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں بات کرتے ہیں کیونکہ اس نظام میں معلم محض تنخواہ دار یا کوئی پیشہ ور کاریگر نہیں ہوتا' بلکہ ایک مشنری کارکن ہوتا ہے۔ وہ ایک داعی ہے جس کی برتری صرف اس کے سرٹیفکیٹوں کی بناء پر نہیں ہوتی بلکہ اس کی اصل اہمیت اس کے عقیدے اور اس کی سیرت کو حاصل ہے۔

اگر مروجہ تعلیمی نظام کا جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑا مسئلہ یہ سامنے آئے گا کہ یہ نظام اب تک نظریاتی بنیادوں پر استوار نہیں ہوا اور حقیقت میں اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ دین و دنیا کی دوئی پر قائم ہے۔ چنانچہ تربیت اساتذہ کے اداروں میں بالعموم جو ماڈل رائج ہے وہ اپنے نصابی مواد اور پورے پروگرام کے لحاظ سے بہت حد تک اسلامی روح سے خالی ہے۔ بے شک ایک ایسے فرد کو جسے استاد بننا ہے ہمارے ادارے کچھ جدید تدریسی طریقے اور فنی مہارتیں سکھا دیتے ہیں اور فنی لحاظ سے شاید وہ ماہر استاد بھی تیار کر دیتے ہیں' لیکن اخلاقی و روحانی ترقی کی حامل ایک جامع اور ہمہ گیر شخصیت تیار نہیں ہو پاتی۔ اصل میں ہم نے دوسری تہذیبوں کے لئے بنائے گئے تعلیمی طریقوں اور تعلیمی اصولوں کو اندھا دھند اپنا لیا ہے۔ ہم نے تربیت اساتذہ کے ضمن میں یہ مقصد اپنے ہاں بھی طے کر لیا ہے کہ صرف جسم اور ذہن کی تربیت کی جائے اور استاد کو محض ایک ایسی مشین بنا دیا جائے جس کا روحانی اور دینی تربیت کے ساتھ قطعی طور پر کوئی تعلق نہ ہو۔ چنانچہ آپ اپنے ہاں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ جدید علم کے اصولوں اور اسلامی علم کی بنیادوں کے درمیان کوئی ربط نہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جدید مغربی علم سراسر تعقل اور مشاہدہ کا پیرو ہے اور وہ کسی الہامی ہدایت کی بالاتری کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ پھر ایک اور وجہ مغرب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ طالب علم کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ چند معروضی معلومات کا ستور [illegible] بن جائے کیونکہ طالب علم کی شخصیت اور اس کی فکر میں آگہی کے لئے یہ معروضی [illegible] ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ بھی محض دھوکا ہے۔ جب تک ایک

دائمی اور حتمی نظریہ' رہنمائی کے لئے نہیں ہو گا اس وقت تک طالب علم کا دماغ محض منتشر معلومات کا ایک کباڑخانہ بنا رہے گا۔ پھر کسی مقصد زندگی سے محروم ہونے کی وجہ سے غیر منظم اور غیر تخلیقی بھی ہو گا اور کوئی اخلاقی علو بھی حاصل نہ کر سکے گا۔

حقیقت میں بے دین ماہرین' چاہے مغربی ہوں یا مشرقی ان کی حکمت عملی یہ ہے کہ اسلامی نظریات کو کمزور کر کے لبرل یا سیکولر نظریات کو تقویت پہنچائی جائے یہی وجہ ہے کہ اس نظام تعلیم کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں ہر جگہ دہرا پن نظر آتا ہے۔ اور اس طرح عملاً تمام نظام ہائے تعلیم پر بتدریج لادینی فلسفہ غالب آگیا ہے۔ ہمارے ہاں تربیت اساتذہ کے ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں' بلکہ مغرب کے تعلیمی پروگراموں کی کاربن کاپی بن چکے ہیں۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب مسلمانوں کو شدید احساس ہوا ہے کہ یہ لادینی نظام ہمارے قومی تشخص اور اسلامی کردار کو کھو دے گا اور اس طرح ہماری اخلاقی حالت بھی منتشر ہو جائے گی۔ دور حاضر میں اس احساس کو اجاگر کرنے کا سہرا یقیناً علامہ اقبال' سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حسن البنا شہید جیسی شخصیات کے سر ہے۔ ان حضرات کی کاوشوں سے مسلمانوں میں یہ احساس شدت اختیار کر گیا ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسا نظام تعلیم بہت ضروری ہے جو علم کی تمام شاخوں کو اسلامی رنگ میں ڈھال دے' دین و دنیا کی تفریق مٹا دے' معرفت الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنے اور بالآخر ایسا فرد تیار کرے جس کا انتہائی مقام یہ ہو کہ: قل ان صلاتی ونسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین O (القرآن، الانعام ' 162)

(کہو میری نماز' میرے تمام مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔" (ترجمہ : تفہیم القرآن' جلد اول' ص 605)

حقیقت میں ہمیں اپنے موجودہ نظام تعلیم بالخصوص تربیت اساتذہ کے پروگرام کو بدلنا ہو گا اور اس میں انقلابی تبدیلی لانا ہو گی۔ دین و دنیا کی تفریق کے اس سیکولر نظریہ کے ساتھ ہم اسلامی تربیت کے مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ لوازمات زندگی سے متعلق محض طبعی یا پیشہ ورانہ کورسز اگر ہمارے ہاں حاوی ہوں گے اور تربیتی و تہذیبی کورسز کا تناسب نہ ہونے کے برابر ہو گا' تو اس کا نتیجہ لازماً' ایک انتشار زدہ شخصیت کی صورت میں ہی سامنے آئے گا۔

چند عمومی تعلیمی مسائل

تربیت اساتذہ کے اہم مسائل کے بیان سے [illegible]

کیونکہ پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کی ترویج کے لئے ان پر عمل پیرا ہونا بہت ضروری ہے۔

○ ہمارے نظام تعلیم کی تشکیل اس اصول پر کی جائے کہ پاکستان میں یکساں نظام رائج ہو اور اس طرح عملاً دین و دنیا کی تفریق کو ختم کر دیا جائے۔

○ نظام تعلیم میں طلبہ کو معلومات دینے کے ساتھ ساتھ ان کی سیرت کی تشکیل کا سامان بھی ہونا چاہئے اور نظام امتحان میں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

○ مخلوط تعلیم کا فی الفور خاتمہ کیا جائے۔ اسلامی نظام تعلیم کے مقاصد کی تکمیل میں ایک بڑی رکاوٹ یہی مخلوط تعلیم ہے۔ حکومت نے خواتین یونیورسٹی کے قیام کا جو اعلان کیا تھا اس پر عمل کیا جائے لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھا جائے کہ یہ یونیورسٹی اپنے پروگرام کے لحاظ سے بھی ایک مثالی اسلامی یونیورسٹی ہو' جہاں سے طالبات اسلامی جذبے سے بھی سرشار ہوں اور اپنے اپنے فن اور شعبے میں بھی مہارت رکھتی ہوں۔

○ اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر رائج کیا جائے۔ قومی یکجہتی اور نظریہ پاکستان کے فروغ کے لئے قومی زبان کو اپنانا بہت ضروری ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ اردو کوئی علاقائی زبان نہیں یہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی زبان ہے۔

○ تعلیمی اداروں کو اس قابل بنانے کے لئے کہ وہ نئی نسل کی کو اسلامی خطوط پر تربیت کر سکیں' اس کا صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ اسلام کا زندگی کے عام شعبوں پر اطلاق کیا جائے۔ اس سلسلے میں ذرائع ابلاغ ایک نہایت موثر ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان ذرائع کو علم و ہدایت کی روشنی پھیلانی چاہئے نہ کہ جہالت اور گمراہی کا باعث بننا چاہئے۔

تربیت اساتذہ سے متعلق چند مسائل

تربیت اساتذہ سے متعلق بنیادی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ان اداروں میں طلبہ کے داخلے کا معیار ہے۔ اس وقت صرف طلبہ کی سابقہ امتحانات میں کارکردگی اور جسمانی موزونیت ہی اصل معیار ہے۔ اس معیار میں اس بات کا کوئی دخل نہیں کہ درخواست دہندہ کی اسلام اور اپنے ملک سے وفاداری کتنی ہے؟ وہ کس اخلاق و کردار کا مالک ہے۔ اس کا پیشہ تدریس سے متعلق رجحان (Aptitude) کیا ہے؟ اس کے لئے باقاعدہ ایک معیار اور طریق کار وضع کیا جانا چاہئے اور اس کی روشنی میں ہی داخلے کے لئے ٹیسٹ اور انٹرویو سسٹم کو جاری کیا جائے۔

[illegible] عام طور پر جو طلبہ داخلہ لیتے ہیں۔ وہ معاشی لحاظ سے

درمیانے یا غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تربیت اساتذہ کے پروگراموں میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے شعبوں اور کاموں میں اتنی کشش ہوتی ہے' کہ بہت سے ذہین لوگ تدریسی شعبے کی طرف نہیں آتے یا بسا اوقات ایسے شعبے کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اس لئے جہاں علمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی ضروری ہے' وہاں اصل کام حکومت کی سطح پر ہونا چاہئے۔ اور وہ یہ کہ اساتذہ کی تنخواہوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک تو دوسرے شعبوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہ ہوں' بلکہ زیادہ ہوں اور دوسرے اساتذہ کی تنخواہ ان کی علمی استعداد کے مطابق ہو' چاہے وہ پرائمری سکول میں ہوں یا سیکنڈری سکول میں' کالج میں یا یونیورسٹی میں کام کر رہے ہوں۔

○ دوران ملازمت اساتذہ کو اپنی علمی استعداد بڑھانے اور پوری تنخواہ کے ساتھ مطالعاتی رخصت ملنی چاہئے۔اس کے ساتھ تعلیم کے دو سالہ پروگراموں میں داخلہ لینے والے Fresh Graduates کو وظائف (Scholarships) دیئے جائیں' تاکہ اچھی علمی قابلیت رکھنے والے طلبہ تدریسی پیشہ کی طرف راغب ہوں۔

○ تربیت اساتذہ کے اداروں میں کام کرنے والے اساتذہ کو ہر پانچ سال بعد اپنے علمی' ادبی اور تحقیقی منصوبوں پر کام کے لئے رخصت Sabbatical leave ملنی چاہئے۔

○ کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے بھی ٹیچر ایجوکیشن کے چند کورس طے کر دینے چاہئیں اور اس طرح کالج اور یونیورسٹی میں ملازمت کے لئے طریقہ ہائے تدریس اور تعلیمی تحقیق سے متعلق ٹریننگ بنیادی شرط کے طے کر دینی چاہئے۔

○ اساتذہ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لئے ایک خود مختار ٹیچر ایجوکیشن یونیورسٹی قائم کی جائے جو اپنے تعلیمی پروگرام کے لحاظ سے منفرد ہو اور جہاں سے حقیقی معنوں میں ماہر معلم تیار ہوں۔ اس تجویز پر عمل سے یہ قوی امید کی جاسکتی ہے کہ اساتذہ کا معاشرتی مقام بھی یقیناً بلند ہوگا اور تعلیمی تحقیق میں بھی ترقی ہوگی۔

○ ایک اور اہم مسئلہ تربیت اساتذہ کے نصاب کا ہے۔ ہمیں موجودہ نصابی سکیم میں واضح تبدیلی لانا ہوگی اور علوم کے مطالعہ کے لئے بنیادی رہنمائی قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے لینی پڑے گی۔ تربیت اساتذہ کا نصاب دو حصوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ پہلا حصہ جو ہر سطح پر لازمی ہو یعنی چاہے پی ٹی سی ہو' سی ٹی ہو' بی - ایڈ' ایم ایڈ' ایم اے ایجوکیشن' ایم فل یا پی ایچ ڈی ہو' اس میں مطالعہ قرآن و حدیث' اسلامی تہذیب' اسلامی فلسفہ' عصری تاریخ' دور جدید کے چیلنج اور اسلام' اسلامی تحقیق' اسلامک ایجوکیشن اور زبان و ادب جیسے کورسز کو شامل ہونا چاہئے۔ دوسرے حصے میں جدید [illegible]

سازی، تعلیمی منصوبہ بندی، تعلیمی انتظامیات،تعلیمی فلسفہ، تعلیمی عمرانیات، تعلیمی نفسیات، تعلیمی تاریخ، تعلیمی شماریات، تعلیمی تحقیق، تعلیمی نظاموں کا تقابلی مطالعہ اور جانچ پرکھ کے طریقوں کو شامل کرنا چاہئے۔ اس حصے میں Options بھی ہو سکتی ہیں، طریقہ ہائے تدریس میں خصوصیت سے رسول اللہ ﷺ کی حکمت تدریس کو کورس میں ضرور شامل کرنا چاہئے۔

ایسے نصاب کا اصل مقصود یہ ہے کہ استاد اپنے فن میں بھی ماہر ہو اور پختہ مسلمان بھی ہو۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ محض ان دو مجوزہ حصوں کو جمع کر دینے سے تربیت اساتذہ کا نظام، اسلامی نہیں بن جائے گا۔ بلکہ دوسرے حصے کو لازماً "پہلے حصے کے تابع ہونا ہو گا" اور پھر فکری اور نظریاتی نقطہ نظر کو عمل تعلیم کے تمام عناصر سے اس طرح باہم مربوط کیا جائے کہ وہ "العلم" بن جائے اور اپنی روح کے لحاظ سے یہ مختلف شعبوں میں ہوتے ہوئے بھی کسی دوئی اور دین و دنیا کی تفریق کا شکار نہ ہونے پائے۔

○ تربیت اساتذہ کے مختلف پروگراموں کا دورانیہ (Duration) بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس کے نتیجے میں تدریسی مشق (Teaching Practice) کے دورانیہ میں بھی اضافہ کیا جانا ضروری ہے تاکہ فنی لحاظ سے ایک ماہر استاد تیار ہو۔

○ تربیت اساتذہ کا ایک اور اہم مسئلہ خود تدریسی عمل ہے۔ایک مسلم استاد صرف یہی نہیں چاہتا کہ اس کا شاگرد (Pupil-Teacher) صرف میکانکی لحاظ سے ہی بہتر استاد ہو بلکہ وہ اپنے اخلاق اور کردار میں بھی مثالی ہو۔ اس لئے تربیت اساتذہ کے اداروں کے ٹیچر ایجوکیٹرز کو بھی علمی، فنی اور اسلامی اخلاقیات کے لحاظ سے پہلے خود نمونہ بننا پڑے گا۔ بہتر تدریس کے لئے صرف نمونہ کے اسباق (Model Lessons) کافی نہیں بلکہ جانچ پرکھ کرنے والے استاد کو کرداری لحاظ سے بھی نمونہ بننا پڑے گا۔ تجربہ کار مسلم معلم اپنے زیر تربیت استاد کے کام کو اگر پرکھے تو وہ اس کی صرف تدریسی مہارتوں کو ہی نہ دیکھے بلکہ اس سے زیادہ اہم چیز یہ دیکھنا ہے کہ اس طالب علم کی شخصیت اخلاقی سطح پر کس طرح مرتب ہو رہی ہے؟ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ادارے کے ٹائم ٹیبل میں عبادات کی ادائیگی کے لئے وقت دینا چاہئے، اور اس خصوصیت کی قدر بھی کرنی چاہئے۔ اس طرح طلبہ کی اجتماعی کارکردگی میں عبادات اور معاملات کو مستقل حصہ ہونا چاہئے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ایسا کام بھی تفویض (Assign) کیا جا سکتا ہے، جیسے معاشرے میں خواندگی کی مہم میں شرکت، غریب طلبہ کی مدد، طلبہ کی علمی رہنمائی، دعوت و تبلیغ کا کام، علمی اور فکری تربیت گاہوں کا اہتمام، خواندگی کے مراکز کا قیام، خصوصی بچوں کے اداروں میں تعلیمی خدمات، [illegible]ات اور دیگر سماجی خدمات وغیرہ۔

○ ایک اور اہم مسئلہ جانچ پرکھ (Evaluation) کا ہے۔ عمل تعلیم کا ایک اہم ترین عنصر یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ بالآخر اس کا ماحصل (Product) کیا ہے۔ ہمیں اس پہلو کو جانچنا چاہیئے کہ دوران تربیت' طالب علم کی شخصیت میں کیا مثبت تبدیلیاں آئی ہیں۔ اس سلسلے میں جب طالب علم کو مطلوب معیار کے تحت داخل کیا جائے تو اس وقت سے لے کر آخر تک اس کے کردار اور تعلیمی حالت کو تسلسل کے ساتھ جانچا جائے۔ اس کے لیئے ہمیں منضبط تحقیق کی بنیاد پر کوئی جانچ پرکھ کا معیار بنانا پڑیگا۔

○ ٹیچر ایجوکیشن کے اداروں میں ایک موثر استاد کی تیاری کے لئے کم از کم مطلوبہ معیار فضیلت ضرور مقرر ہونا چاہیئے۔ جب تک یہ کم سے کم معیار مطلوب' (علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے) پورا نہیں ہوتا' ڈگری نہ دی جائے۔ اس کے علاوہ اگر ہم اساتذہ کی تربیت کو ضروری سمجھتے ہیں تو پھر پرائیویٹ بی۔ایڈ وغیرہ کی تعلیم کے متعلق بھی سوچنا پڑے گا۔ میرے خیال میں سردست بی۔ایڈ پرائیویٹ حیثیت سے کرنے والے دوران ملازمت اساتذہ کے لئے بھی کم از کم ایک سمسٹر کا ہمہ وقتی کورس کسی اعلیٰ تربیتی ادارے میں لازمی قرار دیا جائے اور اس کے لئے متعلقہ زیر تربیت استاد کو پوری سہولت ملنی چاہیئے۔

○ دوران ملازمت (In-Service) تربیت کا انتظام بھی موثر ہونا چاہیئے تاکہ اساتذہ نئے نصابات اور نئے تدریسی طریقوں سے بخوبی روشناس ہوسکیں۔

○ تربیت اساتذہ کے اداروں کی کارکردگی کا بھی تحقیقی جائزہ لیا جانا چاہیئے تاکہ اصلاح کے لئے ٹھوس علمی مواد فراہم ہوسکے۔

○ تربیت اساتذہ کا ایک اور مسئلہ اساتذہ تنظیموں (Teachers Organization) کا ہے۔ یہ تنظیمیں بے شک لوازمات زندگی کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ اعلیٰ گریڈز اور دیگر ضروری سہولیات کا حصول یقیناً ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اساتذہ اس سلسلے میں خاصے محروم چلے آرہے ہیں' لہذا ان کی پرامن کاوشیں ضروری بھی ہیں۔ لیکن اہم چیز جس کا ہماری اکثر تنظیمیں خیال نہیں رکھتیں وہ اساتذہ کی علمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے بارے میں بیشتر لٹریچر اساتذہ کی تنظیموں نے ہی پیش کیا ہے۔ وہ اپنے طور پر سیمینار اور کانفرنسوں کا اہتمام کرتی ہیں' مختلف تعلیمی امور میں تحقیقات کراتی ہیں' مختلف مضامین کے لئے ٹیچرز گائیڈز اور تدریسی مواد ان ہی تنظیموں کی مختلف کمیٹیاں تیار کرتی ہیں۔ اسی طرز پر پاکستان میں بھی مختلف تنظیموں کو چاہیئے کہ وہ مطالعاتی گروپوں کی تشکیل کریں اور نصاب' طریقہ ہائے تدریس' اخلاقیات اور دوسرے [illegible] تدریسی مسائل میں تحقیق رپورٹیں تیار [illegible]

تعلیمی کانفرنس تو ضرور منعقد کرے اور اس میں پیش کئے گئے تعلیمی مقالات پر مبنی اپنی سالانہ کتاب (Year Book) چھاپے۔ اس طرح یقیناً تعلیمی و تدریسی لٹریچر میں ایک اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو سکتا ہے۔یہ تنظیمیں اپنا ایک ضابطہ اخلاق (Code of Ethics) بھی تیار کریں اور اپنا تعلیمی مجلہ (Journal) بھی جاری کریں۔

اساتذہ کی کوئی تنظیم اگر مستقل مقام حاصل کرنا چاہتی ہے تو اسے یہی طریق کار اختیار کرنا ہو گا' یعنی نظریہ پاکستان کا فروغ' اساتذہ کی علمی' ادبی اور پیشہ ورانہ تربیت' تعلیمی مسائل میں تحقیق اور ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کی اجتماعی' معاشی و معاشرتی بہبود کے لئے کوشش۔ جب تک تعلیمی حلقے اس شعور کو پھر سے زندہ نہیں کرتے کہ قیادت علم کی ہوتی ہے' جہالت کی نہیں اور تعلیم و تحقیق اور تصنیف و تالیف اور سارے وہ کام عبادت ہیں جو اللہ کی رضا کے مطابق ہوں' اس وقت تک نہ اساتذہ بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی تعلیم و تربیت اپنی سمت متعین کر سکتی ہے۔

(تنظیم اساتذہ پاکستان صوبہ پنجاب کے زیر اہتمام تعلیمی کانفرنس منعقدہ پنجاب یونیورسٹی لاہور 7 اپریل 1982 کو پڑھا گیا۔۔۔۔ سہ ماہی مجلہ علم کی دستک' اسلام آباد' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد' جلد 2' شمارہ 3' 1986)

پیشہ ورانہ تنظیم اور ضابطہ اخلاق

(تربیت اساتذہ کے تناظر میں دو اہم موضوعات)

تعلیم بنیادی طور پر ایک تہذیبی اور معاشرتی عمل ہے۔ جب طلبہ سکول آتے ہیں تو کمرہ جماعت میں پیش کی گئی متعین معلومات کا بستہ ہی نہیں اٹھائے پھرتے بلکہ وہ اساتذہ اور اپنے ساتھیوں سے وہ تہذیبی اقدار اور اخلاقیات کے اسالیب بھی سیکھتے ہیں جو ان کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ معلومات و تجربات کے حوالے سے اساتذہ اور طلبہ کا باہمی تبادلہ خیال اور حالات و واقعات کا مشاہدہ' خود ایک علم ہے۔ طلبہ صرف معلومات ہی نہیں حاصل کرتے وہ تہذیبی' اخلاقی اور جذباتی تربیت بھی حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ اس سارے عمل' بالخصوص طلبہ کی تشکیل سیرت میں سب سے اہم عامل استاد ہے۔ استاد کا علمی مقام و مرتبہ' اس کی پیشہ ورانہ تربیت' اسکا اخلاقی مقام' اسکی حکمت ابلاغ' یہ سب چیزیں طالب علم کی جامع اور صحت مند نشوونما میں بڑا اہم مقام رکھتی ہیں۔ چنانچہ پورے تعلیمی عمل کی کامیابی اور موثر حکمت عملی کا انحصار اس پر ہے کہ اساتذہ نفس مضمون پر عبور رکھتے ہوں' اپنے فریضہ معلمی سے محبت رکھتے ہوں' بیدار مغز ہوں اور اپنی علمی اور پیشہ ورانہ ترقی کے لئے ہر وقت کوشاں ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بلاشبہ نصابیات' تربیت اساتذہ' نظام امتحان' تعلیمی انتظامیہ' تعلیمی مالیات' تعلیمی سہولیات' بہتر تنخواہوں اور مراعات کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلمہ ہے اور عمل تعلیم کے ان عناصر کے حوالے سے سرکاری سطح پر بڑی مثبت اور نتیجہ خیز تبدیلیوں کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن خصوصیت سے دو موضوعات ایسے ہیں جن میں اساتذہ کا اگر اپنا ذوق و شوق' ان کی محنت' قلبی لگاؤ اور رضاکارانہ محنت و مشقت کا جذبہ کار فرما ہو تو یقیناً تعلیمی معیارات بہتر ہوسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک موضوع تو اساتذہ کی ایسی پیشہ ورانہ تنظیم (Professional Teachers Organization) کی رکنیت ہے' جو اس کی تربیت کی ضامن بنے اور دوسرے وہ ضابطہ اخلاق (Code of Ethics) ہے جو ہر رکن تنظیم کو خود اپنے اوپر رضاکارانہ طور پر (Voluntarily) لاگو کرتا ہے۔

تربیت اساتذہ کے مقاصد

ذیل میں ان دو موضوعات سے متعلق چند نکات دیئے جا رہے ہیں لیکن اس سے قبل تربیت اساتذہ کے ضمن میں ضروری مقاصد کی نشاندہی ضروری ہے۔ اختصار سے یہ مقاصد درج ذیل ہیں:

- ابتدائی اور ثانوی سطح کے تعلیمی اداروں کے لئے پیشہ تدریس میں تربیت یافتہ اساتذہ کی فراہمی۔
- قومی سطح پر بالعموم اور تربیت اساتذہ میں بالخصوص مقاصد تعلیم سے آگہی۔
- اسلامی نظریہ حیات کے حوالے سے اساتذہ کی تربیت۔
- اساتذہ کو مختلف مضامین اور ان کے نفس مضمون میں مہارت بہم پہنچانا۔
- اساتذہ کو تعلیم و تعلم سے متعلق مختلف نظریات اور طریقہ ہائے تدریس میں آگہی۔ یعنی ایسی حکمت تدریس کی تعلیم دینا جو علمی مواد کو موثر انداز میں پیش کرنے میں معاون ثابت ہو۔
- اساتذہ کو نصابیات کی تشکیل و تنفیذ کے بارے میں تربیت دینا۔
- اساتذہ کو تعلیم کے شعبہ میں بالخصوص اور دیگر علوم میں بالعموم طریقہ تحقیق کی تربیت دینا۔
- اساتذہ کو معاشرہ اور سکول کے باہمی کردار کے بارے میں واضح نقطہ نظر دینا۔
- اساتذہ کو تعلیم و تربیت کے حوالے سے اس قابل بنانا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں پیشہ تدریس سے متعلق ضابطہ اخلاق کی تعمیل کریں۔
- اساتذہ کو صرف متعین نصابات اور درسی کتب کی تدریس کا ذمہ دار ہی نہیں بلکہ انہیں مربی' اور تعلیمی مشیر کی حیثیت سے بھی تیار کرنا۔
- اساتذہ کو تعلیم کے سارے عمل (Process) بالخصوص امتحانی ماحصل (Product) کو جانچنے اور پرکھنے کی تربیت دینا۔
- بحیثیت مجموعی ایسے تعلیمی قائد تیار کرنا جو تعلیم و تربیت کے مباحث و مسائل اور عمل تعلیم کے مختلف عناصر سے متعلق بصیرت و آگہی رکھتے ہوں۔

اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیموں کی ضرورت

نظریہ تربیت کو تسلیم کرنے میں ایک اہم نکتہ پیشہ ورانہ تنظیموں کی رضاکارانہ رکنیت

ہے۔ ان تنظیموں کے حوالے سے اساتذہ کا تعلیمی نظریات اور تجربات پر باہمی تبادلہ خیال ان کی پیشہ ورانہ نشوونما کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ان تنظیموں کی علمی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں سے اساتذہ اپنی کارکردگی کی عام سطح کو بہت بلند کرسکتے ہیں۔ مزید یہ کہ اساتذہ اپنے اجتماعی اور تنظیمی اثر و رسوخ سے اپنے رفقائے کار کے لئے زیادہ بہتر اور پسندیدہ ماحول فراہم کرسکتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے ضمن میں جو قابل ذکر کام ہوا ہے' اس میں زیادہ تر ہاتھ وہاں کی اساتذہ تنظیموں کا ہے۔ فن معلمی کی ترقی کا بہت حد تک انحصار پیشہ ورانہ تنظیم اور اسکے ارکان کی محنت شاقہ پر ہے۔ ایک موثر استاد اپنے پیشہ تدریس میں مثبت تبدیلیاں بھی لا سکتا ہے اور اس پیشہ کو محترم بھی بنا سکتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اساتذہ کی کسی ایسی پیشہ ورانہ تنظیم میں اپنا فعال کردار ادا کرے جو اساتذہ کی علمی و فنی تربیت' ان کے مقام و مرتبہ' ان کے لئے مناسب شرائط ملازمت' اور تعلیمی مقاصد کے حصول کے لئے کوشاں ہو۔

پیشہ ورانہ تنظیموں کے مقاصد: پاکستانی تناظر میں

- نظریہ پاکستان کے تحفظ اور اسلامی نظام تعلیم کے نفاذ کی جدوجہد کرنا۔
- ارکان کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ وہ اپنے پیشہ معلمی کو معزز تصور کریں اور علمی فضیلت میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کریں۔
- ارکان کے مطالعہ و تحقیق کے کاموں میں حوصلہ افزائی کرنا اور ان کے تحقیقی منصوبوں کی تکمیل میں ہر ممکن مدد کرنا۔ نیز پورے تعلیمی عمل میں ان تحقیقی نتائج کے اطلاق کی کوشش کرنا۔
- ارکان کو علمی اور پیشہ ورانہ معلومات بہم پہنچانا اور اس حوالے سے ان کی سوجھ بوجھ میں مختلف اشاعتی طریقوں (مثلاً کانفرنس' سیمینار' تعلیمی ورکشاپ اور علمی مجلہ) کے ذریعہ اضافہ کرنا۔
- ارکان کے حقوق و فرائض بالخصوص تدریسی اور تحقیقی معاملات میں' قانونی اور اخلاقی حدود کے اندر علمی آزادی (Academic Freedom) کے حق کی حفاظت کرنا۔
- ارکان کے لئے موزوں تنخواہ' سہولیات اور کام کے بہتر مواقع فراہم کرانے کے لئے کوشش کرنا۔
- ارکان سے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کی پابندی کرانا' نیز ارکان کے خلاف غیر اخلاقی [illegible]

○ تعلیمی نظام، تعلیمی پالیسی، تعلیمی منصوبہ بندی، تعلیمی مسائل اور ان مسائل کو حل کرنے کے بارے میں اپنی تجاویز مرتب کرنا۔ اس ضمن میں رائے عامہ کو باخبر کرنا اور تعلیمی ترقی کے لئے ان کا تعاون حاصل کرنا۔

○ عمل تعلیم سے متعلق مختلف تحقیقی پراجیکٹس کے لئے ایسا تحقیقی اور تربیتی ادارہ قائم کرنا، جس میں اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اساتذہ کے دوران ملازمت تربیت کا بھی انتظام ہو اور تعلیمی مسائل سے متعلق علمی مقالات کی اشاعت کا بھی اہتمام ہو۔

○ نظریاتی، علمی اور پیشہ ورانہ موضوعات پر اپنا مضبوط اور دیانت دارانہ موقف اختیار کرنا اور واضح فکری نقطہ نظر مرتب کرنا۔ اس طرح پورے معاشرے کو تعلیم و تعلم کے حوالے سے بھرپور قیادت فراہم کرنا۔

○ معاشرہ کے ان سرکاری، نیم سرکاری یا نجی تعلیمی اداروں سے جو مختلف تعلیمی معاملات میں مثبت اور تعمیری سوچ رکھتے ہیں، تعاون کرنا۔

اساتذہ تنظیموں کی مختلف اقسام

اساتذہ تنظیموں کی چند اہم اقسام یہ ہیں:

1 - بعض پیشہ ورانہ تنظیمیں ایسی ہوتی ہیں، جو اپنے دائرہ کار (Scope) میں جغرافیائی حد بندیوں کے اندر محدود ہوتی ہیں یعنی یا تو وہ مقامی ہوتی ہیں یا ضلعی، یا صوبائی، یا قومی یا بین الاقوامی۔

2 - بعض اساتذہ کی تنظیمیں ایسی ہوتی ہیں، جن کی تشکیل ان کے ارکان کے کام اور پیشہ ورانہ تخصص (Specialization) کے پیش نظر کی جاتی ہے مثلاً تعلیمی رہنمائی و مشاورت، تعلیمی نگرانی، تعلیمی انتظامیہ، تعلیمی نصاب، تعلیمی تحقیق، تعلیمی فلسفہ، تعلیمی نفسیات، ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم، صنعتی تعلیم، کاروباری تعلیم، سائنسی تعلیم، اسلامی تعلیم وغیرہ۔

3 - بعض پیشہ ورانہ تنظیمیں ایسی ہوتی ہیں جو مختلف مضامین کی نوعیت سے تشکیل دی جاتی ہیں مثلاً عربی، اردو، انگریزی، اسلامیات، مطالعہ پاکستان، تعلیمیات، لسانیات، سائنسی اور صنعتی علوم وغیرہ سے متعلق اساتذہ کی الگ الگ مضمون وار تنظیمیں۔

4 - بعض تنظیمیں اپنے اپنے کاڈرز (Cadres) اور تعلیمی اداروں کی سطح کے حوالے سے تنخواہوں کے تکمیل، مرتبہ، یا انتظامی ڈھانچہ [illegible]

تنظیمیں بالعموم ٹریڈ یونین ازم کے فلسفہ اور طریق کار کے تناظر میں کام کرتی ہیں۔

5 - بعض پیشہ ورانہ تنظیمیں اپنے دائرہ کار کے لحاظ سے بڑی منفرد اور آفاقی نوعیت کی ہوتی ہیں' ہر چند کہ ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ وہ طبقاتی' علاقائی' لسانی' نسلی یا تعلیمی اداروں کی مختلف سطحوں' مرتبہ و مقام' کاڈرز' یا سکیلوں کی تنگ دامانیوں میں سکڑی ہوئی نہیں ہوتیں' بلکہ ان کا افق وسیع ہوتا ہے' اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑی جامع ہوتی ہیں۔ یعنی پرائمری سطح سے لیکر یونیورسٹی سطح کے اساتذہ تک اس کے رکن ہوتے ہیں اور اس طرح تمام اساتذہ مل جل کر ایک ایسی فعال تنظیم تشکیل دیتے ہیں جو ہمہ گیر تعلیمی انقلاب کی داعی ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی لٹریچر میں اضافہ کرتی ہے' جس کا اپنا تحقیقی ادارہ ہوتا ہے' جس کا اپنا باوقار علمی مجلہ ہوتا ہے اور جو اپنے ارکان کی تہذیبی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کا ذریعہ بنتی ہے۔ وہ علمی امور میں قوم کی رہنمائی کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہر سطح کے اساتذہ کے لئے جائز مالی مراعات اور سہولیات کے لئے بھی تگ و دو کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی اپنے ارکان سے ضابطہ اخلاق کی پابندی کراتی ہے۔

اس طرح کی پیشہ ورانہ تنظیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے ارکان کے لئے ضابطہ اخلاق تشکیل دے اور پھر اس پر عمل کرائے۔ اس ضمن میں چند رہنما خطوط ذیل میں دیئے جا رہے ہیں' جن کی روشنی میں اساتذہ کی پیشہ ورانہ تنظیم اپنے لئے ضابطہ اخلاق تیار کر سکتی ہے اور اپنے ارکان سے اس پر رضاکارانہ بنیادوں پر پابندی بھی کرا سکتی ہے۔

ضابطہ اخلاق: تعریف' مقاصد

کسی بھی پیشہ کی بالعموم کوئی تسلیم شدہ نمایاں خصوصیات ہی دراصل اخلاقیات کا وہ ضابطہ ہوتی ہیں جنہیں اس پیشہ سے متعلق افراد از خود تسلیم کرتے ہیں' ان کی تعبیر و توضیح کرتے ہیں اور انہیں رضاکارانہ طور پر اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں۔ ضابطہ اخلاق کے چند اہم مقاصد یہ ہیں:

- ○ ضابطہ اخلاق وہ اساس فراہم کرتا ہے جس کے تناظر میں کسی پیشہ سے متعلق افراد کے غلط اور غیر غلط طرز عمل میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔
- ○ ضابطہ اخلاق' فرائض و حقوق اور مراعات کے بارے میں واضح نقطۂ نظر فراہم کرتا ہے۔
- ○ ضابطہ اخلاق [illegible] کے حقوق اور [illegible] منصبی فرائض ادا کرنے والے افراد کے

درمیان پیشہ ورانہ آداب کو قائم کرنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

- ضابطہ اخلاق پسندیدہ اور مطلوب پیشہ ورانہ طرز فکر اور طرز عمل کی بہتر تفہیم کے لئے ایک معیار فراہم کرتا ہے۔
- ضابطہ اخلاق صرف اپنے مخصوص پیشہ سے متعلق ہی نہیں بلکہ عام افراد معاشرہ کو بھی رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

ضابطہ اخلاق کی تیاری کے چند اصول

- عمومی اصول اور دیگر شقیں بڑی واضح اور حقیقت پسندانہ ہونی چاہیں۔
- وہی اصول و ضوابط شامل ہوں جن پر ارکان کا اتفاق ہو۔
- فریضۂ منصبی سے متعلق امور ہی شامل کئے جائیں۔
- ہر دفعہ یا شق ایسی ہو جس کے حوالے سے ارکان کا احتساب ممکن ہو۔
- ایسے واضح نکات شامل ہوں جن کی روشنی میں اگر کسی طرف سے ارکان پر غیر صحت مندانہ اور ناپسندیدہ تنقید ہو تو اس کی مدافعت کی جاسکے۔
- ضابطہ کی ہر شق نظریہ پاکستان سے مرتب کی جائے۔
- ضابطہ میں ایسی دفعات ہوں جس پر عمل در آمد سے اساتذہ کو معاشرہ کا بھرپور اعتماد و احترام حاصل ہو۔
- ضابطہ اخلاق کو ارکان پر لازماً نافذ ہونا چاہیے ورنہ وہ بے معنی ہے۔

ضابطہ اخلاق ---- ایک عمومی خاکہ

ذیل میں پیشہ معلمی سے متعلق صرف ایک رہنما عمومی خاکہ دیا جارہا ہے۔ اساتذہ کی تنظیمیں اپنے ارکان کی باہمی مشاورت سے اور اپنے دائرہ کار کی نوعیت کے لحاظ سے ضروری رد و بدل کرسکتے ہیں:

- استاد اپنے طلبہ سے انتہائی عادلانہ اور غیر جانب دارانہ سلوک کا مظاہرہ کرے گا۔ قطع نظر اسکے کہ طلبہ کی جسمانی، معاشی، معاشرتی، نسلی، لسانی، گروہی، جغرافیائی، مذہبی یا مسلکی خصوصیات کیا ہیں۔
- استاد طلبہ کی حوصلہ افزائی اسطرح کرے گا کہ طلبہ اپنی روحانی، اخلاقی، ذہنی، تخلیقی اور جسمانی نشوونما کے لئے محنت و ریاضت سے کام لیں۔
- استاد کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ ہر طالب علم میں اسلامی نظریہ حیات اور [illegible]

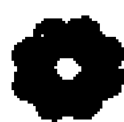
آئیڈیالوجی کا گہرا شعور پیدا کرے گا' اور انہیں ان کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں سے آگاہ کرے گا۔ نیز استاد اسلامی ریاست اور اسکے اساسی نظریہ حیات کا وفادار رہے گا۔

- استاد ہر طالب علم کی عزت نفس اور اس کے استحقاق کا پورا احترام کرے گا۔
- استاد' طلبہ کو پڑھانے کے ضمن میں صرف وہی معاوضہ قبول کرے گا جو منظور شدہ قوانین اور ضابطوں کے مطابق ہو۔
- تعلیم کے ضمن میں استاد' طلبہ کے والدین کی بنیادی ذمہ داری کی قدر کرے گا اور اسے طالب علم کی تعلیمی نشوونما کے حوالے سے اہمیت دے گا۔
- استاد قابل بحث (Debatable) نصابی امور کو کمرہ جماعت میں معروضی نقطہ نظر' استدلال اور حکمت سے زیر بحث لائے گا۔
- استاد اہم سرکاری اور رازدارانہ (Secret) امور کو غیر متعلق افراد کے ساتھ زیر بحث نہیں لائے گا۔
- استاد پیشہ ورانہ سرکاری امور میں صرف طے شدہ چینل (Channel) یا طریق کار ہی اختیار کرے گا۔
- استاد ملازمت کے حصول کے لئے صرف علمی اور فنی مہارت کی بنیاد پر ہی درخواست دے گا' اور حصول ملازمت یا دیگر مفادات کے لئے صرف مستند طریق کار کو ہی اختیار کرے گا اور ہر اس طریق کار سے اجتناب کرے گا جس سے اساتذہ کا وقار مجروح ہوتا ہو۔
- استاد کسی ایسے عہدہ کو قبول نہیں کرے گا جو کسی غیر منصفانہ طریق کار یا غیر پیشہ ورانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں تخلیق کیا گیا ہو۔
- استاد دیگر اساتذہ کے بارے میں اپنی رائے دینے میں انتہائی دیانت دار ہوگا۔
- استاد اپنے فرائض منصبی کے ساتھ کسی ایسی اضافی ملازمت کو قبول نہیں کرے گا جس سے اس کا پیشہ ورانہ وقار مجروح ہوتا ہو اور اسکے فرائض منصبی متاثر ہوتے ہوں۔
- استاد متعین دفتری اوقات کے دوران کسی دوسرے ادارے میں کوئی تدریسی یا انتظامی منصب کو قبول نہیں کرے گا اور نہ ہی کسی ایجنسی کی طرف سے ایسے پراجیکٹس (Projects) قبول کرے گا' جو اس کے اصل فرائض منصبی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنیں۔
- استاد تعلیمی ادارہ کے مثبت ضابطوں کی تشکیل و تعمیل میں تعاون کرے گا اور اس

ضمن میں اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی بجاآوری کرے گا۔ نیز اپنے تعلیمی ادارے اور اپنی کلاسوں کے طے شدہ اوقات کی پابندی کرے گا۔

- استاد اپنے پیشہ سے متعلق دیگر ارکان کا اسی طریقے سے احترام کرے گا' جس طرح کہ وہ خود اپنے بارے میں چاہتا ہے۔
- استاد اپنے رفقائے کار کے بارے میں تعمیری گفتگو کرے گا اور غیبت' بہتان' طعن و تشنیع' تضحیک اور بے جا تنقید سے گریز کرے گا۔ بالخصوص اپنے ساتھی اساتذہ کے بارے میں اپنی کلاسوں میں یا الگ' اپنے طلبہ کی سامنے وقار کے منافی گفتگو سے اجتناب کرے گا اور اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کو پیش نظر رکھے گا۔
- استاد ذمہ دار افراد کو طلبہ کی فلاح و بہبود' تعلیمی نظام اور پیشہ معلمی کے ضمن میں صحیح صورت حال سے باخبر رکھے گا اور ان معاملات کے بارے میں اپنی دیانت دارانہ رائے دے گا۔
- استاد پیشہ ورانہ تنظیم یا تنظیموں میں اپنی فعال رکنیت کو برقرار رکھے گا اور اپنی بھرپور شرکت سے قومی تعلیمی مقاصد کے حصول اور بحیثیت مجموعی اسلامی تعلیم کے نفاذ کے لئے کوشش کرے گا۔
- استاد' مسلسل مطالعہ' تحقیق' تصنیف' تالیف' تعلیمی دوروں' تعلیمی کانفرنسوں' سیمیناروں اور دیگر تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعہ اپنی پیشہ ورانہ نشوونما کو ترقی دے گا۔
- استاد اپنے پیشہ معلمی کو اخلاقی' علمی اور فنی لحاظ سے اتنا پرکشش اور باوقار بنائے گا کہ اس کے مخلص اور قابل نوجوان طلبہ فریضہ معلمی کی طرف ذوق و شوق سے آئیں اور اس پر فخر محسوس کریں۔

(سہ ماہی تعلیمی زاویئے اسلام آباد' جلد 2' شمارہ 1' اپریل 1991ء)



ٹیچر ایجوکیشن کے نصاب میں "ادبیات" کی ضرورت

ادب حسن کلام اور تاثیر کلام کا نام ہے۔ جو چیز ادب کو عام انسانی گفتگوؤں اور تقریروں سے ممتاز کرتی ہے وہ کلام کا حسن اور اس کی تاثیر ہے۔ جب انسان اپنی بات خوبصورت انداز اور ایک ایسے موثر طریقے سے ادا کرے کہ سننے والا اثر قبول کرے تو اس نوعیت کے کلام کو ادب کہتے ہیں۔ اصل میں ادب حسن بیان کا نام ہے۔ بیان کی صلاحیت تو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دی ہے لیکن اس صلاحیت کے مدارج میں فرق ہے۔ ایک ہی بات ایک شخص کی زبان سے کہی ہوئی بے اثر ہو جاتی ہے لیکن دوسرے شخص کی زبان سے ادا ہوتی ہے تو دل میں اتر جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک اس کی قوت استدلال پر اور دوسرے حسن ادا یعنی اسلوب بیان کی خوبی پر۔ جو شخص استدلال کی قوت کے ساتھ ساتھ اپنی بات کو موثر پیرائے میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ ادیب ہے۔ (حفیظ الرحمٰن، ماہنامہ پکار لاہور، اگست 1993ء، ص 26)۔ حقیقت میں ہر لفظ کا ایک مزاج اور ایک انداز ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا صحیح موقعہ پر استعمال ہی ایک ادیب کی کامیابی ہے۔ بے محل استعمال، بدصورتی اور برمحل استعمال، ادبی حسن ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ادیب کا کلام موثر ابلاغ ہے اور یہ موثر ابلاغ دراصل اچھی بات کو اچھے انداز سے کرنے کا ہی ہے۔۔۔۔ تعلیم و تعلم کی دنیا میں استاد کی موثر تدریس کے لئے ادب اور ادیب کی یہ تعریف کسی حد تک تعلیم اور معلم کے لئے بھی یکساں ہے۔ ادیب کی طرح معلم کی بھی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اچھی بات (Desirable Content) کا انتخاب کرے اور اسے موثر اسلوب (Effective Style) کے تحت طلبہ کے اذہان و قلوب تک منتقل کرے۔

معروف دانشور اور تنقید نگار پروفیسر ڈاکٹر احمد سجاد نے اپنے ایک مضمون میں ادب کی اہمیت سے متعلق بڑی خوبصورت اصطلاح "ادب کی قوت تسخیر" استعمال کی ہے۔ ان کے نزدیک، ادب اپنے موضوع کی عظمت، ہیئت کی عمدہ ترکیب اور اسلوب و ابلاغ میں جمالیاتی انکسار کے سبب مسرت و بصیرت کا وافر سامان مہیا کرتا ہے۔ فنکار اپنے خون جگر کی آمیزش سے بعض ادبی اور سماجی باتوں میں تاثیر کا ایسا جادو بھر دیتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اس

کی ندرت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ادب' درحقیقت' دیگر فنون کے مقابلے میں دوہری تسخیر کا حامل ہے۔ ایک اس کی فکری قوت' دوسرے اس کی جمالیاتی لطافت۔۔۔۔۔ اور یہ جمالیاتی حسن دراصل نام ہے ہم آہنگی (Harmony)' تناسب (Proportion) اور تسویہ (Adjustment) کی وحدت کا۔ ادب کی یہی وہ قوت تسخیر ہے جس کے سبب بعض اوقات کسی فکر یا نظریہ کا مخالف بھی شعر و افسانے کی راہ سے غیر محسوس طور پر اس فکر کا بتدریج قائل اور گرویدہ ہوتا چلا جاتا ہے (تعمیری ادبی تحریک' قاضی پبلشرز' نئی دہلی' 1994' ص ص 20-19)۔ اگر توازن' تناسب اور تسویہ کے ان پہلوؤں سے دیکھا جائے تو فن تدریس (Art of Teaching) بھی جمالیاتی حسن کی اسی وحدت کا نام ہے۔ اس نکتہ کو جب تک اساتذہ کے تربیتی نصاب میں پیش نظر نہیں رکھا جائے گا' اس وقت تک تدریسی عمل (Teaching Process) کا ماحصل (Product) لازماً" عدم تسویہ (Mal-adjustment) کا شکار رہے گا۔

اچھے ادب اور اچھی تعلیم' دونوں کا سرچشمہ براہ راست دائمی اقدار حیات ہیں اور پھر مقاصد تعلیم کی تشکیل میں بھی ان ہی اقدار کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔۔۔۔ ادیب معلم ہی ہوتا ہے' ہرچند کہ رسمی معلم کے برعکس اس کا دائرہ اثر ہمہ گیر اور وسیع ہوتا ہے اور وہ "تدریسی میکانیات" کی تنگنائیوں میں مقید نہیں ہوتا۔ اچھے ادیب کی تعلیم بالکل غیر محسوس انداز میں لوگوں کے دلوں میں جذبوں کی کونپلیں کھلاتی اور ان کے شعور میں آفاقی حقیقتوں کی تخم ریزی کرتی ہے۔ اس کی یہ تعلیم محض فنی مہارتوں پر اکتفا نہیں کرتی' بلکہ پوری شخصیت کو اتنے خوبصورت انداز سے تراشتی ہے کہ انسانوں کے ساتھ معاشرے بھی علم کی روشنی سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ بہرحال اچھے ادیب اور اچھے معلم میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں کی شخصیت "علم و احساس" کا ایک حسین امتزاج ہوتی ہے اور دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اچھی بات کو اچھے انداز میں منتقل کیا جائے۔ گویا جو نفس مضمون یا لوازمہ وہ منتقل کرنا چاہتے ہیں' اس کا نہ صرف جاندار' اور دائمی حقیقتوں پر مبنی ہونا ضروری ہے' بلکہ اس کی پیش کش کا اسلوب بھی اسی طرح کے قلبی لگاؤ (Conviction) اور روحانی تحرک (Inspiration) کا متقاضی ہے۔ البتہ اچھائی کا دائمی پیمانہ تو وہی اخلاق ہوگا جس کا سرچشمہ قرآن و سنت ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ایک اچھا استاد [illegible]

سا بھی مضمون پڑھا رہا ہو۔۔۔۔ یا ایک اچھا ادیب چاہے کسی بھی صنف ادب میں اپنا مافی الضمیر ادا کر رہا ہو' اسے لازماً" خدا پرستی' وحدت انسانی' احترام آدمیت' معروف و منکر کے احساس' اور اخروی شعور جیسی آفاقی اقدار کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ان اقدار کے حوالے سے آج کے معلم کو جمال فکری' علمی اور فنی تربیت کی ضرورت ہے' وہاں اس کے لئے صالح ادب اور اپنی ملی تاریخ کا مطالعہ بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس جامعیت پر محیط تربیت کی وجہ سے معلم کی فکر' آفاقی ہوگی اور وہ علاقائی' لسانی اور نسلی تعصبات سے پاک ہوگا اور اسطرح اس کی تعلیمی فکر اور تدریسی حکمت آفاقی قدروں کی حامل ہوگی۔۔۔۔ سیرت و کردار میں اس طرح کا پختہ اور وسیع المطالعہ موثر استاد ہی تعلیم و تعلم کے تمام تر سلسلوں کا محوری نکتہ ہوگا اور حقیقت میں ایسے استاد کے بغیر ہم کسی حرف تدریس کا تصور ہی نہیں کرسکتے۔

آج تعلیم و تدریس کی دنیا میں دیکھا جائے تو "علم التعلیم" یا "ایجوکیشن" (Science of Teaching) کے مضمون (Discipline) میں کئی شاخیں بن چکی ہیں اور پھر ہر ایک شاخ کی مزید شاخیں ہیں' جن میں تخصص (Specialization) کے نام پر کئی شعبے (Areas) مرتب کیے گئے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہم نے "علم التعلیم" کو محض سائنس بنا کر "میکانکی جزیات" کا مطالعہ تو ضرور کیا لیکن اس پہلو سے بے خبر ہوتے چلے گئے کہ "ایجوکیشن" کا تعلق پوری زندگی سے ہے اور یہ زندگی بامعنی بنتی ہے چند دائمی اساسی سوالات کے خدا پرستانہ جوابات سے۔۔۔۔ لہٰذا استاد چاہے کوئی سی بھی سپیشلائزیشن کر رہا ہو یا چاہے عالمی تناظر میں علم التعلیم کا ماہر ہی کیوں نہ بن رہا ہو' اسے لازماً" ان اساسی سوالات کے مثبت جوابات کے لئے قرآن و حدیث' اسلامی تاریخ' اسلامی ثقافت' اسلامی ادب اور ان حوالوں سے اپنی تہذیبی زبانوں یعنی عربی' فارسی اور اردو کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر وہ ایک مشینی یا میکانکی استاد تو بن جائے گا' لیکن ایک کلیت بیں اور زندگی بخش اسلوب سے محروم ہوگا۔۔۔۔ حقیقت میں نفس مضمون پر عبور (Subject Excellence) اور فن تدریس میں مہارت(Pedagogical Competence) سے انکار ممکن نہیں' لیکن پڑھانا ایک فن (Art) بھی ہے' جس کا تعلق جمالیاتی اظہار (Aesthetics) سے ہے۔ طلبہ کی صحت مند اور جامع ذہنی' اخلاقی' روحانی اور جسمانی [illegible] کہ استاد تدریس کے سائنسی پہلوؤں کے ساتھ ایک ادیب

شناس' خلاق' فعال اور مقصد حیات سے باخبر شخص بھی ہو۔ اب اس غرض کے لئے اسے یقیناً عظیم مفکرین کی تخلیقات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔۔۔۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عظیم مفکر' ادیب یا شاعر محض اپنے زمانے یا کسی ایک علاقے کے لئے مختص نہیں ہوتا' وہ تو زمانوں کا مفکر' ادیب اور شاعر ہوتا ہے۔ وہ ایسی دائمی صداقتوں اور حقیقتوں کو بیان کرتا ہے جن کی اہمیت اور ضرورت ہر دور میں برقرار رہتی ہے اور جو وقت گزرنے کے ساتھ متروک یا فرسودہ (Obsolete) نہیں ہو جاتیں۔

اس تناظر میں پاکستان میں تربیت اساتذہ کی موجودہ نصابی روش کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اس میں فنی میکانیات کے حوالے سے محض چند پیشہ ورانہ (Professional) کورسز کا غلبہ ہے اور اگر یہی رجحان (Trend) جاری رہا تو مستقبل کا استاد ایک سدھا سدھایا روبوٹ ٹائپ انسٹرکٹر (Instructor) تو شاید تیار ہو جائے گا' لیکن تہذیبی لحاظ سے فی الواقع "یک رخا" اور کسی حد تک "کھوکھلا" شخص ہوگا جسے یہ بھی خبر نہ ہوگی کہ فارسی اور اردو علم و ادب کی دنیا میں رومی' جامی' نظیری' سعدی' حافظ' خسرو' ولی' میر تقی میر' غالب' درد' ذوق' مومن' میر انیس' سودا' مصحفی' ناسخ' آتش' مظہر جانجاناں' فانی' فراق' جگر' شرر' سرشار' محمد حسین آزاد' نذیر احمد' ابوالکلام' حالی' شبلی' سرسید' نظیر اکبر آبادی' اکبر الٰہ آبادی' خواجہ حسن نظامی' اقبال' اسمٰعیل میرٹھی' جوہر' مولوی عبدالحق' ظفر علی خان' سید امتیاز علی تاج' چراغ حسن حسرت' مرزا فرحت اللہ بیگ' شیخ عبدالقادر' غلام رسول مہر' نیاز فتح پوری' نسیم حجازی' ایم اسلم' جوش' ماہر القادری' فیض' خواجہ دل محمد' احمد شاہ بخاری (پطرس)' شفیع الدین نیر' آغا حشر کاشمیری' چوہدری افضل حق' مولانا صلاح الدین احمد' حفیظ جالندھری' نصراللہ خاں عزیز' صوفی تبسم' احسان دانش' شورش کاشمیری' نعیم صدیقی' حفیظ میرٹھی' جیلانی بی۔ اے' شوکت تھانوی' مرزا ادیب' اسعد گیلانی' سید محمد جعفری' سید ضمیر جعفری' فروغ احمد' ابن فرید' ابن انشاء' عبدالعزیز خالد' حافظ مظہر الدین' عنایت علی خان' مشتاق یوسفی' غلام الثقلین نقوی' باقی صدیقی' احمد ندیم قاسمی' مائل خیر آبادی' جسٹس کیانی' اے۔ حمید' مختار مسعود' انتظار حسین' اشفاق احمد' غلام عباس' الطاف فاطمہ' بانو قدسیہ' عاتبہ رحیم الدین' بشریٰ رحمٰن' بیگم اختر ریاض' ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور' سلمیٰ یاسمین نجمی' نیر بانو' بنت الاسلام' ام [illegible]' [illegible] کرنل محمد خان' [illegible] الرحمان

پروفیسر عبدالحمید صدیقی' سلیم احمد' شمیم احمد' خرم مراد' میاں عبدالرشید' یوسف سلیم چشتی' پروفیسر مرزا محمد منور' پروفیسرڈاکٹر احمد سجاد' ڈاکٹر عبدالمغنی' ڈاکٹر وزیر آغا' انور سدید' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' ڈاکٹر سید محمد عبداللہ' ڈاکٹر اسرار احمد' ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر احسن فاروقی' رشید احمد صدیقی' محمد صلاح الدین شہید' الطاف حسن قریشی' پروفیسر سید محمد سلیم' مشفق خواجہ' جیلانی کامران' مجید امجد' نظر زیدی' عطا الحق قاسمی' طفیل ہوشیار پوری' امجد اسلام امجد' مظفر وارثی' حفیظ تائب' صبا اکبر آبادی' عامر عثمانی' حمایت علی شاعر' مستنصر حسین تارڑ' رحیم گل' حفیظ الرحمٰن احسن' حافظ محمد ادریس' تحسین فراقی'۔۔۔۔ اور کئی دیگر نامور ادیبوں' شاعروں' تنقید نگاروں اور دانشوروں نے علم و ادب کی مختلف جہتوں میں کیا کارہائے نمایاں سرانجام دیئے؟۔۔۔۔ نظم و نثر کے حوالے سے محض یاداشت کی بنا پر یہ چند نام غیر مرتب انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ فہرست طویل بھی ہوسکتی ہے لیکن اصل مقصد تو یہ واضح کرنا ہے کہ ہمارے اساتذہ کی نئی نسل کو قدیم و جدید ادیبوں' شاعروں' تنقید نگاروں اور دانشوروں کے تعمیری اور سبق آموز ادب سے متعارف ہونا چاہئے۔ البتہ یہ مطالعہ واضح تعمیری معیار نقد کے تناظر میں ہی ہونا چاہئے کیونکہ ان میں سے بعض کے نقطہ نظر سے یقیناً اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ بہرحال ان اصحاب دانش نے علم و ادب کی مختلف جہتوں میں کئی صفحات لکھے' اور بعض نے تو تعلیمی فکر کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا۔ آج کتنے اساتذہ نے ان کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے؟ کیا ان اصحاب دانش کے علمی اور ادبی حسن کو تربیت اساتذہ کے کسی بھی کورس میں زیر بحث لایا جاتا ہے؟ محض "ایجوکیشن" کی مخصوص مروجہ کتابی اصطلاحوں کے جان لینے سے تو کوئی "ماہر تعلیم" (Educationist) نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے تو صحت مند ثقافت' صالح اقدار اور مثبت روایات کا امین اور وارث بھی بننا پڑے گا۔ ایک مسلمان معلم کو قرآن و حدیث اور اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اپنے ادبی ورثہ سے بھی واقف ہونا چاہئے۔ بالخصوص برصغیر کی اہم زبانوں کے حوالے سے سید علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب' مثنوی مولانا روم' سعدی کی گلستاں بوستاں' حالی کی مسدس' کلیات اکبر' کلیات اقبال' سید مودودیؒ کی موثر ادیبانہ زبان کا حامل عظیم علمی اور تحقیقی لٹریچر' شاہ ولی اللہ' شبلی' سلیمان ندوی' ابوالحسن ندوی' امین احسن اصلاحی اور محمد یوسف اصلاحی کا علمی [illegible] کے [illegible] میں دیگر پاکستانی اور عالمی نمایاں دانشوروں کے تعمیری ادب کا

مطالعہ' پاکستانی استاد کی تعلیمی آگہی' تہذیبی شعور اور لسانی و ادبی مہارات کو مزید روشن کرے گا۔۔۔ اس مقصد کے لئے استاد کی اپنی ایک ایسی ذاتی لائبریری ہونی چاہئے جس میں اپنے مخصوص مضمون کے علاوہ علمی و ادبی لٹریچر بھی موجود ہو تاکہ اس کے ذاتی مطالعہ میں وسعت و جامعیت آتی جائے۔۔۔ اسی طرح اجتماعی نقطہ نگاہ سے تعلیمی میدان میں اگر ہمیں لادینیت اور تشکیک کے خلاف خدا پرستی کے محاذ کو مضبوط بنانا ہے تو ہمارے تربیتی اداروں کو لازماً" ایسے مفکرین' مورخین' ادباء' شعراء اور تنقید نگاروں کی تحریروں سے استفادہ کرنا ہوگا' جو طلبہ میں صالح اقدار کو فروغ دیں اور ان کی ملی اور نظریاتی وابستگی (Committment) کو مستحکم کریں۔ اس مقصد کے لئے تعلیمی اداروں کی لائبریروں میں بھی اس نوع کا لٹریچر موجود ہونا چاہئے تاکہ طلبہ اور اساتذہ اس سے بھرپور استفادہ کریں۔ بقول جناب نعیم صدیقی:

> "ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے' جس کے اوراق کا مطالعہ کرکے جب ہم فارغ ہوں تو محسوس کریں کہ ہم نے فکر و کردار کی راہوں پر ترقی کا کوئی نہ کوئی قدم بڑھا لیا ہے۔ کسی افسانے اور نظم اور کسی اداریے اور تنقید نے ہمیں ہمارے حیوانی رجحانات' اپنی نفسیاتی الجھنوں' معاشرے کی بے انصافیوں اور بین الاقوامی تشدد و جارحیت کے خلاف نئی قوت سے مسلح کر دیا ہے" (سہ ماہی تعلیمات لاہور' جون 1992' ص 134)۔

اس حوالے سے دیکھا جائے تو وسیع تر معنوں میں ادبیات اور تعلیمیات کا یہی وہ مشترک تہذیبی نظریہ ہے' جس کی قوت تسخیر سے انکار ممکن نہیں۔ادب کی اسی قوت تسخیر کے باعث' ٹیچر ایجوکیشن کے نصاب میں "ادبیات" کے ایک ایسے کورس کا اجراء ہونا چاہیے جو درج ذیل مقاصد کی تکمیل کا باعث ہو۔

- تعمیری ادب کے حوالے سے قوت ادراک اور تحسین جمال کے جذبہ کی صحت مند نشوونما کرنا اور اس طرح تقریر و تحریر کی صلاحیتوں کو جلا دیتے ہوئے زیر تربیت اساتذہ کو اچھی بات' اچھے لفظوں میں بیان کرنے کا سلیقہ سکھانا۔
- ادب عالیہ کے ذریعہ زیر تربیت اساتذہ میں احساس کی تیزی (Sharpened Sensibility) اور فکر و خیال کی بلندی (Heightened Imagination) پیدا کرنا' تاکہ ان میں تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔

- آفاقی صالح ادب کے تناظر میں' احترام آدمیت کا احساس راسخ کرنا اور انسانی جذبات و خواہشات کی تہذیب کرنا تاکہ نئی نسل ہر نوع کی فحاشی سے بچے۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ فطرت سلیم کے مطابق حیا' انسان کی ایک اعلیٰ قدر ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف جو بھی چیز پیش کی جائے گی وہ کسی نہ کسی درجہ کی فحاشی ہوگی۔ اس لئے جو ادب' فطرت انسانی کے خلاف ہوگا' وہ لازماً" ایک منتشر اور عدم تسویہ کا شکار شخصیت تیار کرے گا)۔
- صحت مند ادب کے ذریعے وحدت انسانی' ملی وحدت' تاریخی و تہذیبی شعور کی بازیافت' ملی یک جہتی اور اسلامی نظریہ حیات کے فروغ کے لئے عربی' فارسی اور اردو زبانوں کی ترویج و اشاعت کا اہتمام کرنا' تاکہ اساتذہ کی نژاد نو ناجائز ادب کے اثرات سے بچی رہے' جو انسان میں غلط افکار پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے اور بالآخر اسے خدا پرستی سے الحاد کی طرف لے جانے یا اس میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں بے یقینی اور تشکیک پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔
- بحیثیت مجموعی تعمیری ادب کے ذریعے اخلاقی علو کے حامل ایسے اساتذہ تیار کرنا جو اعلیٰ آفاقی انسانی قدروں کے بھی مالک ہوں اور اپنے اپنے شعبہ علمی میں بھی ماہر ہوں' تاکہ وہ بالآخر قیادت عالم کے منصب کے اہل بن سکیں۔

حقیقت میں تربیت اساتذہ کے نصاب کی تشکیل نو میں "ادبیات" سے متعلق مباحث کو شامل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ بالخصوص ادبی ورثہ سے موزوں انتخاب کو نصابات میں شامل کیا جانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ تاکہ ایک ایسا ہمہ جہت موثر معلم تیار ہوسکے' جسے زبان و بیان پر عبور ہو اور اپنی تدریس کے ذریعے آفاقی قدروں کو نئی نسل تک حسن و خوبی کے ساتھ منتقل کرنے کے قابل ہو۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک آفاقی ادب سے مراد وہ ادب ہے جو حصول رضائے الٰہی کو اساسی قدر (Root Value) تسلیم کرتے ہوئے خیر اور بھلائی کی بات کو لطیف اور احسن انداز میں اس طرح پیش کرے' کہ سننے والا کوئی بوجھ یا تنگی محسوس کئے بغیر اس کا اثر قبول کرے۔ آفاقی ادب کی اہم خصوصیت درحقیقت لوگوں کو صالح اقدار کی طرف راغب کرنے کا واضح اور متعین مقصد ہے۔ البتہ یہ رغبت وابستہ ہے کہ اقدار میں نہیں بلکہ ایک بااخلاق اور مخلص ادیب کے موثر اسلوب کے

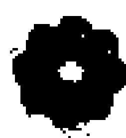
ذریعے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ حقیقت میں زیر تربیت اساتذہ کو ایسا ادب مطلوب ہے جو ان کو اور ان کے زیر تعلیم طلبہ کو برائی کی طرف لے جانے والا نہ ہو اور جو خیر اور بھلائی کو ہرگز نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دے' بلکہ ایسی معروف قدروں کی ترویج کا باعث ہو جو انسانی فطرت کے مطابق ہوں نہ کہ انسان کے حیوانی جذبات کو ابھارنے کا باعث بنیں۔ ادب کا یہی وہ تہذیبی نظریہ ہے جو تعلیم کے حیاتیاتی یا حیوانی تصور کے بجائے انسانیاتی تصور کو نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے لفظوں میں:

"ادب و فن دراصل انسان کی جذباتی دنیا کی خوبصورت تنظیم کا نام ہے۔ لہٰذا اس کی دو بنیادیں واضح ہیں۔ ایک تو سچے شریفانہ جذبات اور دوسری جمالیاتی تنظیم ---- پھر وہ ادب جو سچے شریفانہ جذبات کی ترجمانی کرے اور اپنی ساخت میں خوبصورت ہو' نصاب کا حصہ بن سکتا ہے۔ ادبی نصابوں کے تعلق میں ایک معیار اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ان میں کوئی ایسی شے شامل نہ کی جائے جو قوم کی سماجی تصورات سے متصادم ہو' اس لئے کہ تعلیم ایک معاشرتی ادارہ ہے۔ لہٰذا اسے معاشرتی احساسات کا خیال رکھنا چاہئے۔" (سہ ماہی تعلیمات لاہور' جون 1992ء' ص 2)۔

خلاصہ کے طور پر تشکیل نصاب کے ماہرین اور تعلیم و تدریس سے متعلق افراد کو "لفظ" یا "ادب" کی تاثیر اور اس کی قدر و قیمت کا گہرا شعور ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حکمت تعلیم کا بھی ادراک ہونا چاہئے کہ خدا پرستانہ اخلاقی اقدار کے بغیر "لفظ" یا "ادب" کا احترام باقی نہیں رہ سکتا۔ بقول اقبالؒ:

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

(سہ ماہی تعلیمی زاویے لاہور؛ جلد 8' شمارہ 3' اکتوبر 1997ء)



ثانوی تعلیم

اردو زبان کی تعلیم و تدریس

اردو انسائیکلوپیڈیا کے مطابق زبان (Language) کے معنی ہیں بول چال، بات چیت، گفتگو، لسان، محاورہ، بولی، الفاظ یا کلمات جو زبان اور منہ سے نکالے یا بولے جاتے ہیں۔ انسان کو قدرت نے علم اور بیان کی طاقت سے نواز کر اشرف المخلوقات قرار دیا ہے۔ خلق الانسان ○ علمہ البیان (القرآن : الرحمٰن 3-4) میں انسان کی اسی نطق اور قوت گویائی کی طرف بہت بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔ زبان ایک ایسا طاقت ور ذریعہ ہے جس سے ہم اپنا مافی الضمیر اور مفہوم، دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور ان سے ان کا مدعا اور مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ علمی، تہذیبی اور ثقافتی ترقیات، زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ ایک قدرتی عطیہ ہے جو انسان کو نباتات اور حیوانات سے ممیز کرتا ہے۔۔۔۔۔ اصل میں زبان کسی قوم کے نظریات و افکار، تہذیب و ثقافت، تعلیمی نظریات، بین الاقوامی تعلقات اور سیاسی و معاشرتی کردار کا آئینہ خیال کی جاتی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بعض اوقات زبان کے اعتبار سے ایک ملک کئی جغرافیائی خطوط میں منقسم ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے مقدم اور اہم وہی زبان ہوتی ہے جو ملک کی "قومی زبان" کہلاتی ہے اور جس کا دامن علاقائی زبانوں سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہوتا ہے۔

اردو زبان

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے اپنے جس تہذیبی سرمائے کی حفاظت کے لئے ایک آزاد وطن کی جنگ لڑی اور بے بہا قربانیاں دیں، اس سرمائے میں اردو بھی نہایت ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ یہ زبان، ہند یورپی خاندان کی ہند ایرانی شاخ میں ہندی زبانوں کے گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس گروپ کی دوسری زبانوں، ہندی، سندھی، پنجابی، کشمیری، بنگالی وغیرہ سے کئی اعتبار سے مماثل ہے۔ پشتو، فارسی اور بلوچی زبانیں اگرچہ ہند ایرانی زبانوں کے ایرانی گروپ سے تعلق رکھتی ہیں، تاہم اپنے ذخیرہ الفاظ اور لسانی ساخت کے اعتبار سے اردو کے بہت قریب ہیں۔ اردو کا افق اس لحاظ سے بڑا وسیع ہے کہ اس کا رشتہ دنیا کے بڑے لسانی خاندانوں (Language Families) مثلاً حامی سامی، ہند یورپی اور تورانی سے [illegible] ایک [illegible] زبان ہے جس میں تقریباً تمام آوازیں (Sounds) آ گئی

ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو بولنے والا شخص دنیا کی ہر زبان بالعموم آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ برصغیر کے حوالے سے یہ زبان کسی خاص علاقے یا صوبے سے وابستہ نہیں' بلکہ بنیادی طور پر یہ تہذیبی زبان ہے۔ آزادی سے پہلے اردو' برصغیر کے اکثر علاقوں میں تعلیم' عدلیہ اور ضلعی دفاتر کی زبان رہی ہے اور اب بھی نشرو اطلاع کے ذرائع مثلاً ریڈیو' اخبارات اور رسائل میں عام طور پر یہی زبان رائج ہے۔ اردو میں مسلمانوں کے تہذیبی اور تاریخی سرمائے کا بہت قیمتی حصہ محفوظ ہے اور یہی زبان پاکستان کے نظریاتی اور جغرافیائی اتحاد کی امین ہے۔

اردو کی ابتداء کے نظریات پر بحث کرنا یا اس کے ارتقائی منازل کا تجزیاتی مطالعہ کرنا زیر بحث موضوع سے ہٹ کر ہے۔ تاہم آج کی دنیا کو سامنے رکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان اس وقت عالمی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ اب اردو برصغیر تک محدود نہیں رہی' بلکہ شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا' جہاں اردو بولنے اور سمجھنے والے افراد نہ ہوں۔ اردو کا شمار دنیا کی معیاری زبانوں میں ہونے لگا ہے۔ لہذا ہمیں اسی حقیقت کی روشنی میں تدریس اردو کے مقاصد' نفس مضمون' اور طریقہ تدریس کا تعین کرنا پڑے گا۔

پاکستان کے قومی تعلیمی کمیشن 1959ء نے ثانوی تعلیم کے نصاب کی تشکیل نو کے سلسلے میں جو سفارشات پیش کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ ہمارے طلبہ کو قومی زبان پر اعلیٰ درجہ کا عبور حاصل ہونا چاہئے۔ پڑھنے اور لکھنے میں ان کی مہارت ہی سے اعلیٰ مدارج کی تعلیم میں ان کی کامیابی متعین ہوگی اور اسی سے وہ مستقبل کے مشاغل میں سرخرو ہوں گے۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے کمیشن کی رائے میں اسکی تدریس کا موجودہ معیار پست اور غیر موثر ہے اور تعلیمی اداروں میں اس کی تدریس کے لئے جتنا وقت ضروری ہے' اتنا نہیں دیا جاتا۔ کمیشن نے تجویز کیا کہ اردو کو مغربی پاکستان کے تمام مدارس میں تیسری جماعت سے بارھویں جماعت تک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جائے' اس کی تدریس کے لئے وسطانی جماعتوں میں زیادہ وقت دیا جائے اور جوں جوں طلبہ اس میں زیادہ مہارت حاصل کرلیں اس کے وقت میں رفتہ رفتہ کمی کی جا سکتی ہے۔ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں کمیشن نے یہ سفارش کی کہ پاکستان کی قومی زبان کی تدریس میں خامیوں کو دور کیا جائے تاکہ یہ زبان اعلیٰ مدارج میں بھی موثر ذریعہ تعلیم بن سکے۔ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی کہ تمام مدارس میں چھٹی سے دسویں جماعت تک اردو کو ذریعہ تدریس بنایا جائے۔ اس سے اگلی جماعتوں میں بھی کمیشن نے اردو کو اختیاری ذریعہ تدریس کے طور پر رائج کرنے کی [illegible]

ثانوی تعلیم کی نصابی کمیٹی 1960ء نے قومی [illegible]

نصاب کی تدوین پر جو رپورٹ پیش کی' اس میں واضح طور پر لکھا کہ تعلیمی اصلاحات کا ایک بنیادی مقصد معیار تعلیم کو بلند کرنا ہے تاکہ ہمارے تعلیم یافتہ افراد' ترقی یافتہ ممالک کے ہم پلہ افراد سے کسی طرح پیچھے نہ رہ جائیں۔ کمیٹی کے نزدیک معیار تعلیم کا انحصار اس بات پر ہے کہ طلباء کا ذخیرہ الفاظ کتنا ہے اور وہ ضروریات زندگی کے لیے اس کے موزوں استعمال کی کتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کمیٹی کی رائے میں اب تک ہمارے نصاب میں قومی زبان کی تدریس کو مناسب اہمیت نہیں دی گئی اور اس بات کا خیال نہیں رکھا گیا کہ زبان کی وجہ سے ہی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ علم میں کمال اس وقت تک حاصل نہیں کیاجاسکتا جب تک زبان پر عبور حاصل نہ ہو کیونکہ زبان اور فکر دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن عملاً ہمارے تعلیمی نظام کے تحت فارغ التحصیل طلبہ کو بالعموم زبان پر عبور حاصل نہیں ہوتا۔اس کے علاوہ کمیٹی نے تدریس زبان کی درج ذیل بڑی خامیوں کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ تدریس میں اصلاح اسی صورت ممکن ہوسکتی ہے اگر ان خامیوں کا تدارک کیا جائے۔

- زبان کی تدریس سائنسی طرز پر نہیں ہوتی۔ درسی کتب میں طلبہ کی استعداد' دلچسپیوں اور ضروریات کو بہت حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔
- درسی کتب' ذخیرہ الفاظ اور تراکیب و مواد کے اعتبار سے تدریجی اور ارتقائی اصولوں کے تحت نہیں لکھی گئیں۔
- طریقہ ہائے تدریس جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔
- زبانوں کے کثیر الاستعمال الفاظ کی کوئی تدریجی فہرست فی الحال موجود نہیں۔
- طریقہ ہائے تدریس میں تحقیق کا کام نہیں ہوا۔

نئی تعلیمی پالیسی 1969ء میں بھی اردو کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ملک کی معاشی اور سیاسی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ انگریزی کی طرف رجحان کو کم کیا جائے اور یہ اسی صورت ممکن ہے اگر تعلیم کے تمام مدراج میں قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

قومی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ اور نصابی کمیٹی کی رپورٹ' تعلیم کے شعبہ میں اہم دستاویزات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سے قبل اتنی جامعیت کے ساتھ کام نہیں کیا گیا۔ غالباً" پہلی دفعہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ثانوی مدارج کے سبھی طلبہ کے لیے اردو لازمی ہوگی۔ مگر اس اہمیت کے باوجود اس کی موثر تدریس کی طرف کوئی منظم کاوش نہیں کی گئی۔ خود نصابی کمیٹی نے بھی اس کے ضمن میں اہم رکاوٹوں اور خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ (ملاحظہ ہو' باب سوم)۔

اس مایوس کن صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو چند بڑی بڑی وجوہات نظر آتی ہیں:

- اساتذہ کو اردو زبان پر کامل عبور حاصل نہیں ۔ ان میں سے اکثر نے زبان و ادب کا سرے سے کوئی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ تدریس زبان و ادب کے حوالے سے اساتذہ میں عام طور پر دو چیزوں کا فقدان ہوتا ہے۔ ایک احساس کی تیزی (Sharpened Sensibility) اور دوسرے فکر و خیال کی بلندی -(Heightened Imagination)
- اکثر اساتذہ میں علمی اور فنی اہلیت کا فقدان ہوتا ہے۔ یعنی نہ نفس مضمون پر عبور اور نہ طریقہ ہائے تدریس میں مہارت۔
- ادبیات کے حوالے سے اساتذہ میں بالعموم تخلیقی صلاحیتوں کا فقدان ہوتا ہے۔ ان کا دامن روحانی شیفتگی اور شوق ادب سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ ان میں فن معلمی سے وابستگی اور لگاؤ کی بھی کمی ہوتی ہے۔
- اساتذہ عام طور پر روٹین تدریس اور سطحی مطالعہ پر یقین رکھتے ہیں۔
- درسی کتب' ذخیرہ الفاظ اور تراکیب و مواد کے لحاظ سے تدریجی اور ارتقائی اصول کے تحت نہیں لکھی گئیں۔ ان میں شامل کیا ہوا علمی مواد بالعموم مقاصد تعلیم کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔
- تعلیمی اداروں میں تدریس اردو کے لئے مناسب وقت الاٹ نہیں کیا جاتا۔
- سرکاری سطح پر اردو کے کثیر الاستعمال الفاظ کی فہرست (Word Frequency List) تیار نہیں کی گئی۔ البتہ کسی حد تک اس ضمن میں ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور نے اہم تحقیقی کام کیا ہے' جس سے درسی کتب کی تیاری میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔
- طریقہ ہائے تدریس میں کوئی منضبط اور منظم تحقیق نہیں کی جاتی۔
- تعلیمی انتظامیہ بالعموم قیادت (Leadership) کی صلاحیتوں سے عاری ہے اور اساتذہ کی فن تدریس اور دیگر تعلیمی امور میں رہبری نہیں کرسکتی۔
- مدارس میں ساز و سامان کی سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ طلباء کے مطالعہ کے لیے اضافی کتب اور بہتر تدریس کے لیے ضروری سمعی و بصری معاونات عام طور پر دستیاب نہیں ہیں۔
- اساتذہ بالعموم' تعلیم کے قومی' مرحلہ وار' اور مضمون وار مقاصد سے بے خبر ہوتے ہیں۔

تدریس اردو: مقاصد، نفس مضمون

تدریس اردو کے ضمن میں درج بالا مسائل فی الواقع بڑے اہم ہیں، لیکن ان سب میں اہم ترین مسئلہ اساتذہ کا مقاصد تعلیم سے بے خبری کا ہے۔ حقیقت میں تعلم کے لیے مقاصد کا شعور انتہائی ضروری ہے۔ مقاصد براہ راست نصاب کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک بہتر اور موزوں انداز میں بیان کردہ مقاصد، دراصل طلبہ اور اساتذہ دونوں کو رہنمائی بہم پہنچاتے ہیں۔ مقاصد، تعلیم و تعلم کے عمل میں تسلسل کو برقرار رکھتے ہیں اور تعلیمی ترقی کے لیے بھی مدد گار ثابت ہوتے ہیں۔ مقاصد، اساتذہ کو اس کی تعلیمی منصوبہ بندی میں مدد فراہم کرتے ہیں اور ان کے تعین سے استاد کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اسے کیا چیز پڑھانی ہے؟ اسی طرح طلبہ کو بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انہیں فی الحقیقت کیا کرنا ہے؟ اور کن توقعات پر پورا اترنا ہے؟ تعلیمی مقاصد کے کئی فوائد ہیں، لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ استاد کو تعلیمی مواد اور موثر تعلم کے لیے مختلف سرگرمیوں کے انتخاب میں مدد ملتی ہے اور ساتھ ہی اسے ایک معیار بھی میسر آجاتا ہے، جسکی روشنی میں وہ یہ طے کرتا ہے کہ اسے کیا پڑھنا اور کیسے پڑھانا ہے؟

مقاصد کا بیان عام طور پر تین صورتوں میں کیا جاتا ہے:

(الف) قومی تعلیمی مقاصد: یہ تعلیمی مقاصد بحیثیت مجموعی پوری قوم کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی قوم کے فلسفہ حیات اور مکمل لائحہ عمل یا پروگرام سے ہوتا ہے۔

(ب) مرحلہ وار تعلیمی مقاصد: تعلیمی مقاصد کو مرحلہ وار تقسیم کر لیا جاتا ہے تاکہ ان کے حصول میں آسانی ہو۔ مثال کے طور پر ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مقاصد وغیرہ۔

(ج) مضمون وار تعلیمی مقاصد: مقاصد کو مضمون کی روشنی میں مرتب کرلیا جاتا ہے یعنی مرحلہ وار بھی اور مضمون وار بھی۔ مثال کے طور پر ثانوی سطح پر تدریس اردو کے مقاصد۔ اسی طرح کسی ایک سبق یا اسباق کے مقاصد وغیرہ۔

قومی مقاصد تعلیم

قومی تعلیمی کمیشن نے درج ذیل قومی مقاصد تعلیم متعین کیے:

- تعلیم یافتہ شہری، تربیت یافتہ کارکن اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک افراد تیار کرنا۔
- سائنسی علوم اور فنی مہارتوں کی ترویج و ترقی۔

- ذہین افراد کو ان کی صلاحیتوں کی کامل نشوونما کے مواقع فراہم کرنا۔
- معذور افراد کو تعلیم و تربیت کے مناسب مواقع بہم پہنچانا جس سے وہ معاشرے میں باعزت طور پر زندگی بسر کرسکیں۔
- نظریہ پاکستان کا تحفظ کرنا اور پاکستان کے شہریوں میں جذبہ حب وطن بیدار کرنا۔
- اسلام کی اخلاقی' روحانی اور معاشرتی اقدار کو فروغ دینا۔
- پاکستان میں اسلام کے بتائے ہوئے اصول جمہوریت آزادی' مساوات اور معاشرتی انصاف کا نفاذ کرنا۔
- عوام میں اتحاد' یک جہتی اور تنظیم کے جذبات کو تقویت دینا۔
- قومی استحکام کی خاطر علاقائی' نسلی' قبائلی' فرقہ وارانہ اور صوبائی تعصب کی حوصلہ شکنی کرنا۔
- قومی اقدار و مقاصد کو سمجھنے' اس پر فخر کرنے اور ان کے تحفظ کا احساس اور شعور پیدا کرنا۔

ثانوی سطح پر مقاصد تدریس اردو

ثانوی سطح پر تدریس اردو کے چند اہم مقاصد یہ ہیں:

- اردو کو زندہ اور ترقی پذیر زبان کی حیثیت سے پڑھنا۔
- سماعت و قرات کے ذریعے معلومات حاصل کرنا۔
- تقریر و تحریر کے ذریعے سادہ اور واضح تخلیقی اظہار کرنا۔
- صحیح ہجوں اور خوش خطی میں مہارت حاصل کرنا۔
- نثر اور نظم کو صحیح لہجے' درست الفاظ اور روانی کے ساتھ پڑھنا۔
- قوت مشاہدہ' حافظہ' فکر' تخیل اور تنقیدی صلاحیت کی تربیت کے لیے عملی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔
- تقریر و تحریر پر قدرت حاصل کرنے کے لیے اردو زبان کی ساخت کا مزید علم حاصل کرنا۔
- ادبی اور لسانی سرگرمیوں کے ذریعے انفرادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا۔
- اضافی مطالعہ کا شائق بننا اور مطالعہ کی صحیح عادات پیدا کرنا۔
- مطالعہ اور تحریر میں تفہیم اور رفتار پر خصوصی توجہ دینا۔
- قومی ادب کے مطالعہ سے لطف اندوز ہونا۔

- اخلاقی اقدار کی صحیح اہمیت کے احساس کے بعد انہیں زندگی کا حصہ بنانا۔
- نظریہ پاکستان اور اسلامی تہذیب کے لیے محبت و احترام کے جذبات پیدا کرنا۔
- پاکستان کی قومی وحدت اور سالمیت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھنا۔

مقاصد تعلیم کی تنقید کے اصول

ہمتہ، شیخے، شورز / شورنگ، خان نے مقاصد کی تشکیل و تنفیذ کے لئے درج ذیل اصول مقرر کئے ہیں :

- مقاصد تعلیم کو قومی نظریہ کے تقاضوں کا ترجمان ہونا چاہیے۔
- مقاصد تعلیم کے تعین میں معاشری اور اجتماعی حقیقتوں اور بنیادی انسانی ضروریات کی تسکین کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔
- مقاصد تعلیم کو اس طرح بیان کیا جائے کہ طلبہ کے طرز عمل میں جو تبدیلیاں لانا مقصود ہوں وہ واضح ہو سکیں۔
- مقاصد تعلیم میں داخلی تضاد یا عدم مطابقت نہیں ہونی چاہیے۔
- مقاصد کو براہ راست طلبہ کی صلاحیتوں، رجحانات، فکر و عمل، کردار، علم، فہم، مہارتوں اور تصورات سے مربوط ہونا چاہیے۔
- مقاصد قطعی اور واضح ہوں تاکہ نفس مضمون کے انتخاب میں آسانی ہو۔
- مقاصد صاف اور واضح ہوں تاکہ ان سے براہ راست نتائج اخذ کئے جاسکیں اور انہیں پرکھا جاسکے۔
- مقاصد غیر مبہم ہوں تاکہ طلبہ کو مثبت رخ پر عمل پر ابھارنے کا کام دیں۔
- مقاصد کا حصول طلبہ کی اکثریت کے لئے ممکن ہو۔
- مقاصد میں یہ خوبی ہو کہ وہ تعلیم اور معاشرہ میں تدریجی ارتقاء کا ساتھ دے سکیں۔
- مقاصد طلبہ کے معیار اور ذہنی اپج سے رابطہ رکھتے ہوں۔
- مختلف مضامین کے مقاصد، تعلیم کے مجموعی قومی مقاصد سے ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔

مقاصد تعلیم کا جائزہ

ان اصولوں کی روشنی میں اگر تدریس اردو کے مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل

نکات سامنے آتے ہیں۔

- تدریس اردو کے مقاصد کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مقاصد کے تین پہلو انتہائی اہم ہیں۔ ایک زبان پر عبور' دوسرے انفرادیت کی نشوونما اور تیسرے اجتماعیت کی نشوونما۔ ان تینوں پہلوؤں میں بالعموم قومی تعلیمی مقاصد کی ترجمانی کی گئی ہے۔
- مقاصد کے تعین میں معاشرتی اور اجتماعی حقیقتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔
- مقاصد کے تعین میں انسانی ضروریات کی تسکین کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔
- مقاصد باہم متضاد نہیں۔ ان میں عدم مطابقت بھی نہیں بلکہ مقاصد بہت حد تک ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔
- مقاصد کے بیان کے حوالے سے سب سے بڑی کمی یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض مقاصد غیر واضح' مبہم' اور قطعیت سے عاری ہیں۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے وہ تو بہت بلند بانگ ہیں' مگر ان الفاظ سے فی الواقع ہماری کیا مراد ہے' پوری طرح واضح نہیں۔ مثلاً" ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبا کی سیرت و کردار کی تہذیب و تربیت کی جائے' لیکن سیرت و کردار کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں کیا گیا۔ یعنی کسی مقصد کو بیان کرتے ہوئے طلبہ کے طرز عمل میں مطلوبہ تبدیلی کا جو خاکہ ہمارے ذہن میں ہونا چاہئے' وہ نہیں ہوتا۔

اردو کا نفس مضمون

نفس مضمون میں وہ تمام معلومات' مہارات اور اقدار شامل ہیں جو معاشرے نے اس کائنات کا علم حاصل کرنے' اسے بہتر بنانے اور انسانی زندگی کو زیادہ سکون اور خوشحالی سے ہم کنار کرنے کے لیے تشکیل دی ہیں۔ نفس مضمون' انسانی علوم کے وسیع ذخائر سے منتخب کیا جاتا ہے اور درسی کتاب اسی انتخاب پر مبنی ہوتی ہے۔ نفس مضمون کے بہتر انتخاب میں مقاصد تعلیم کے علاوہ درج ذیل اصولوں کو بھی پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے:

- مدارس میں پڑھانے کے لیے منتخب کیا ہوا نفس مضمون کسی مسلمہ شعبہ علم کے اہم حصوں پر مشتمل ہونا چاہئے۔
- اس کی اہمیت امتداد زمانہ کے باوجود مسلم رہی ہو۔
- اسے طلبہ کے لیے عملی زندگی میں مفید اور کار آمد ہونا چاہئے۔
- اس میں طلبہ کی دلچسپی کا سامان کیا گیا ہو۔

- اس کی تعلیم ملی نظریہ حیات کے مطابق معاشرہ کی تعمیر نو میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔

عمل تعلیم کی کامیابی کے لیے ایک نہایت اہم مگر مشکل کام مناسب نفس مضمون کا انتخاب ہے۔ جس کی تدریس سے مقاصد تعلیم حاصل ہو سکیں۔ اگر ہم نے مقاصد تعلیم میں تبدیلیاں کیں اور نصاب تعلیم کو جوں کا توں رکھا' تو تعلیم کے نتائج کے بارے میں ہماری آرزوئیں محض وہم و گمان تک محدود رہیں گی۔ حقیقت میں ہمیں نفس مضمون کے انتخاب میں ان اصولوں کو عملی شکل دینے کے لیے درج ذیل طریق کار کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

- عام طور پر نفس مضمون کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ مستند اہل علم و فن' مختلف علوم کے جن اہم حصوں کو جدید معاشری ضروریات کے مطابق اور مقاصد تعلیم کے حصول کے لیے موثر سمجھیں' انہیں منتخب کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اہل علم و فن کو تمام ضروری علوم پر پوری دسترس حاصل ہو اور وہ تمام متعلقہ افراد اور حلقوں سے جتنی زیادہ علمی اور پیشہ ورانہ رہنمائی ممکن اور مفید ہو' کما حقہ حاصل کریں۔
- نفس مضمون کے انتخاب کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ طلبہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد عملی زندگی کی جو ذمہ داریاں سنبھالنے والے ہیں' ان کا تجزیہ کیا جائے اور ان ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لیے جو معلومات' حقائق' تصورات' مہارتیں' اور اطوار مفید اور موثر ثابت ہو سکتے ہیں' مختلف علوم و فنون سے منتخب کر کے نصاب میں شامل کیے جائیں۔
- نفس مضمون کا انتخاب مدارس میں عملی تجربات کے ذریعے بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کہ اہل علم و فکر جو نصاب مرتب کریں' انہیں پڑھانے کے بعد طلبہ کی اہلیت کا جائزہ لیا جائے جس سے معلوم ہو سکے کہ اس نصاب کی تدریس سے مقاصد تعلیم کی تکمیل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ طریق کار جہاں زیادہ قابل اعتماد اور موثر ہے وہاں اس میں تمام متعلقہ عوامل پر کما حقہ' کنٹرول کرنا بہت مشکل بھی ہے۔
- نفس مضمون کے انتخاب اور اس کی ترتیب و ترویج کے تعین میں طلبہ کی طبعی اور ذہنی عمر اور ان کی سابقہ تحصیل علم پیش نظر رکھنی چاہیے۔ اس طرح منتخب نفس مضمون کی افادیت کے ساتھ ساتھ آسانی اور دلچسپی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔

پاکستان میں بالعموم نصاب تعلیم کی تشکیل اور نفس مضمون کے انتخاب کا تجزیاتی اور تجربی [illegible] کے بارے [illegible] ہر چند کہ تدوین نصاب کے مختلف ادارے متعدد

ماہرین کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں' مگر ان کے موجودہ طریق کار سے علمی تحقیق اور مشاورت کے وہ تقاضے پورے نہیں ہوتے جو دور جدید کی زندگی نے پیدا کر دیئے ہیں۔ بہرحال روایتی طریق کار کے تحت ہی ثانوی تعلیم کی نصابی کمیٹی نے ثانوی مدارس کے نصاب کو از سر نو مدون کیا اور چھٹی جماعت سے بارہویں جماعت تک کا نیا نصاب پورے پاکستان کے ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے لیے تجویز کیا۔ قومی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے تحت اس کمیٹی نے اردو کو چھٹی سے بارھویں جماعت تک کے لیے لازمی مضمون قرار دیا۔ نویں اور دسویں جماعت کے لیے اس کے سو سو نمبروں کے دو پرچے لازم کئے اور اس کی تدریس کے لیے چھ گھنٹے فی ہفتہ کا وقت مقرر کیا۔۔۔۔گزشتہ دس سالوں کے نصاب اردو کا اگر عنوان وار مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ نصاب میں تبدیلی نہ باقاعدہ تھی نہ مسلسل اور نہ اس کے لیے کوئی واضح منصوبہ بندی کی گئی۔ اگر ثانوی تعلیم کی نصابی کمیٹی کی سفارشات نہ ہوتیں تو نصاب اردو میں غالباً سرے سے کوئی تبدیلی واقع نہ ہوتی۔ کمیٹی کی سفارش کے تحت ہی اردو کو لازمی مضمون قرار دیا گیا۔ اگر 1959ء کے نصاب اردو کا مقابلہ 1968ء کے نصاب اردو سے کیا جائے' تو معلوم ہوگا کہ صرف درسی کتب کی تعداد میں اضافہ ہوا اور گرامر کی رسمی تدریس کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی جو پہلے تھی۔ کچھ تبدیلیاں مختلف ادباء اور شعراء کے کلام کے انتخاب میں بھی ہوئیں۔

مجوزہ مقاصد' نصاب' تدریس' امتحان: ایک خاکہ

قومی تعلیمی کمیشن ثانوی تعلیم کی نصابی کمیٹی اور دوسری قومی اہمیت کی دستاویزات سے ثانوی جماعتوں میں تدریس اردو کے جو مقاصد سامنے آتے ہیں' انہیں درج ذیل تین عنوانات کے تحت مجتمع کیا جاسکتا ہے:

(الف) زبان پر عبور (ب) انفرادیت کی نشوونما (ج) اجتماعیت کی نشوونما

ان مقاصد کے حصول کے لئے چند ضروری نصابی سرگرمیوں' اہم طریقہ ہائے تدریس' اور جائزہ و امتحان سے متعلق چند اہم نکات کو درج ذیل خاکہ میں پیش کیا گیا ہے۔

مجوزہ مقاصد

(الف) زبان پر عبور (معیاری زبان سمجھنا' معیاری زبان بولنا: صحیح تلفظ اور لہجہ' شائستہ انداز گفتگو۔۔۔۔ معیاری زبان پڑھنا: رواں اور خاموش مطالعہ' [illegible] کی [illegible] معیاری زبان لکھنا: درست ہجے' صاف لکھائی [illegible]

بحیثیت مجموعی زبان پر عبور کے حوالے سے طلبہ کو اپنے خیالات' جذبات' احساسات' اور مافی الضمیر کے تخلیقی اظہار کے قابل بنانا)۔

(ب) انفرادیت کی نشوونما (طلبہ کی ذہانت' تجسس و اختراع' قوت فکر و استدلال' قوت فیصلہ اور تخلیقی و تنقیدی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے ہوئے انہیں حاصل کردہ معلومات' عملی زندگی میں استعمال کرنے کے قابل بنانا۔ نیز ان میں جمالیاتی حس اور تہذیبی و اخلاقی اقدار کا شعور پیدا کرنا۔ ان میں محنت کے وقار کا احساس پیدا کرنا اور باضابطہ کام تن دہی اور سرگرمی کے ساتھ کرنے کی عادت ڈالنا اور اس طرح ان کی زندگی میں نظم و ضبط اور توازن و اعتدال پیدا کرنا)۔

(ج) اجتماعیت کی نشوونما (طلبہ میں ملی و تہذیبی اقدار کا احساس و شعور پیدا کرنا' اور ان میں قومی یک جہتی اور ملی اتحاد کے جذبات کو فروغ دینا۔ ان میں وطن کی ترقی اور ملت کی سربلندی کے لئے سعی و عمل کا جذبہ پیدا کرنا۔ اسلامی نظریہ حیات' قومی تاریخ' تہذیب و ثقافت' طرز معاشرت اور علم و ادب پر فخر کرنے کا احساس پیدا کرنا۔۔۔۔۔ نیز طلبہ میں بہتر انسانی روابط قائم کرنے اور معاشری خدمت بجالانے کا جذبہ پروان چڑھانا اور ان میں قائدانہ صلاحیتوں کی نشوونما کرنا)۔

مجوزہ نصاب

معیاری ادب پارے' ادبیات عالیہ' تخلیقی اور فکر و خیال کو تحریک دینے والے واقعات' اخلاقی مضامین' کہانیاں اور نظمیں' مشاہیر اسلام کی سیرت کے حالات' ملت کی تاریخ کے مضامین' اخلاقی ادب' قومی نظریہ حیات اور قومی مسائل پر مبنی مضامین' اسلامی ادب سے انتخاب' عام نصاب۔

مجوزہ طریق تدریس

انفرادی کام اور اس کی اصلاح و تصحیح' اجتماعی بحث میں معیاری زبان کی خصوصیات کی تشریح' زبانی کام' سوالات و جوابات کا طریقہ' مشکل الفاظ کے معانی' مختلف موضوعات پر گفتگو' تحریر و تقریر' بحث مذاکرہ' معلم کا نمونہ قرات' طریقہ مشق' کسی علمی شخصیت کے انسانی لیکچرز' آزاد مطالعہ' اسباق کی باقاعدہ تدریس' مضمون نویسی کا مقابلہ' ڈرامہ' شعر و شاعری' بزم ادب' منصوبی طریقہ' موقع و محل کی مناسبت سے تصاویر اور چارٹس' تحریری اور تقریری صلاحیتوں کی [illegible] کے لئے طلبہ کے ساتھ قریبی علمی تعلق' تنقید و تبصرہ' معاشرتی

فعالیتوں میں طلبہ کی شرکت' ہم نصابی مشاغل اور انفرادی و اجتماعی عملی کام' تحلیلی و ترکیبی طریقے' طریق بین و گو' ابجدی طریقہ' پڑھنے لکھنے کے کھیل' طلبہ کو کام دینے اور ان سے حفظ کرانے اور سننے کا طریقہ' بیانی اور تشریحی طریقہ' کتابی تدریس کا طریقہ' انشاء' قواعد اور زبان کے تدریس کی حوالے سے مسئلی' استخراجی اور استقرائی طریقے۔

مجوزہ طریق امتحان

زبانی اور تحریری امتحان' تفہیم و استحسان عبارت کا امتحان اور جائزہ کے معروضی و موضوعی سوالات' انفرادی کام کا جائزہ' مشاہدہ اور عملی حالات کا جائزہ' طلبہ کے احوال و کوائف کا جامع ریکارڈ' تفویض کار کا جائزہ' واقعاتی ریکارڈ کا جائزہ' تدریس انشاء میں ظاہری اور باطنی غلطیوں کی انفرادی اور اجتماعی اصلاح۔

اشارات سبق

تدریس اردو کے حوالے سے اشارات سبق (Lesson Plan) کی تیاری میں معلم کو درج ذیل نکات کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

(1) مقاصد عمومی (2) مقاصد خصوصی (3) درسی مواد (4) طریق تدریس (5) سابقہ معلومات (6) اعلان سبق (7) استحضار (8) قرات معلم (9) قرات متعلم (10) اصلاح' صحت تلفظ (11) اخذ معانی (12) توضیح' تفہیم' استحسان (13) اعادہ' جائزہ (14) تفویضی کام

(مجلہ تعلیم و تحقیق' آئی ای آر' جامعہ پنجاب لاہور' جلد 1' شمارہ 3' 1969---- مجلہ ماہنامہ فکر و نظر' بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن' کراچی' شمارہ 8-9' 1970ء)

وقت کی بہتر تنظیم

(سربراہ ادارہ کی ایک اہم ذمہ داری)

تعلیمی ادارہ کے سربراہ کی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کا دائرہ بلاشبہ بڑا وسیع ہے' لیکن یہ مضمون نظم و نسق کے صرف ایک اہم موضوع "تنظیم اوقات" (Time-Management) سے متعلق چند نکات تک محدود ہے۔ البتہ اس سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی قائد کی مطلوب نظریاتی' علمی اور فنی اہلیت و تربیت کے بارے میں اساسی مباحث پیش کی جائیں' تاکہ تفہیم موضوع کے ضمن میں ایک معیار اور منہج ہمارے سامنے آجائے۔ تعلیم و تعلم سے وابستہ افراد یہ جانتے ہیں کہ نظم و نسق سے مراد' درحقیقت وہ پروگرام' دستور' قاعدہ' لائحہ عمل یا طریقہ کار ہے جس کی روشنی میں تعلیمی ادارے کی مختلف نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے سب سے اہم عامل خود سربراہ کی قائدانہ شخصیت ہے۔ نظریاتی حوالے سے سربراہ ادارہ کا اسلامی نظریہ علم پر اعتقاد' دین کی قدر و منزلت اور خدا کی نصرت پر یقین' خوف خدا اور آخرت پر ایمان یہ وہ اساسی قدریں ہیں جو موثر قیادت کے لئے شرط اول ہیں۔ یہی ایمان اس کا فکری نقطۂ نظر اور ادارہ کے سارے تعلیمی و انتظامی امور کے لئے اصل سلسلہ وابستگی (Binding Force) ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک کامیاب سربراہ ادارہ کے لئے مطلوب اوصاف کی ایک طویل فہرست بن سکتی ہے' لیکن علم و شعور' تقویٰ' خوف خدا' فکر آخرت' اعلیٰ سیرت و کردار' عفو و درگزر' صبر و استقامت' بے لوثی' راست بازی' ایثار' شائستگی' ضبط و تحمل' احساس ذمہ داری' انتظامی سوجھ بوجھ' تدریسی مہارت' وسعت نظری' فہم و تدبر' عدل' احترام آدمیت' حاضر دماغی اور بحیثیت مجموعی علمی فضیلت' پیشہ ورانہ کمال اور اخلاقی علو—— یہ سب ایسی صفات ہیں' جو سربراہ ادارہ کے منصب پر فائز ہونے والے شخص کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ سربراہ ادارہ ہونے کے ناتے وہ منتظم (Administrator) [illegible] ہی ہے' لیکن اس کا قائدانہ کردار (Leadership Role) [illegible] نظریاتی' علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کے ساتھ [illegible]

رفقائے کار کو بڑی توجہ اور چاہت کے ساتھ کام کی طرف راغب کرتا ہے اور انہیں متعین مشترکہ مقاصد کی تکمیل کے لئے اس انداز سے قائل کرتا ہے' جس سے باہمی اعتماد اور احترام دلوں میں راسخ ہو جاتا ہے اور اس طرح مطلوب مقاصد کی تحصیل کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

اس تناظر میں تعلیمی ادارہ کے سربراہ کی یہ اہم پیشہ ورانہ ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کیا اس کے ادارہ میں طلبہ کے فکر و عمل کی صلاحیتوں کو خیر کی طرف منتقل کرنے کے لوازمات موجود ہیں؟ وہ یہ بھی دیکھے کہ تعلیمی ادارہ کے متعین اوقات میں کیا ایسی پسندیدہ نصابی سرگرمیاں موجود ہیں' جن کے ذریعے طلبہ کی جامع اور صحت مند اخلاقی' ذہنی اور جسمانی نشوونما ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس نشوونما کے لئے اساتذہ اور طلبہ فعال ہیں؟ اس کے ساتھ ساتھ سربراہ ادارہ کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ جو سہولیات' تعلیمی ادارہ کے اندر موجود ہیں' کیا ان سے نتیجہ خیز کام لیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اس طرح کے بیسیوں سوالات ہیں' جن کا سربراہ ادارہ کو بہتر نظم و نسق کے حوالے سے خیال رکھنا ہوتا ہے۔ وہ سہولیات کی فراہمی اور موجود سہولیات کے بہتر استعمال کا بھی ذمہ دار ہے۔ وہ وقت اور حالات کی مناسبت سے اپنے ادارہ میں مثبت تبدیلیاں لاتا ہے' لیکن ظاہر ہے کہ تبدیلی لانا ایک خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے لئے وہ اپنے مثبت تعمیری رویے سے معاون قوتوں میں اضافہ اور مزاحم قوتوں میں کمی کرتا ہے۔ اس طرح وہ ادارہ میں باہمی تعاون' اعتماد اور احترام کی فضا پیدا کرتے ہوئے' نگرانی' رہنمائی' مشاورت اور ڈسپلن کے فرائض کی بجا آوری میں اپنی ساری صلاحیتیں کھپا دیتا ہے۔

سکول ایڈمنسٹریشن سے متعلق لٹریچر کا ریویو کیا جائے تو سبھی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ ادارہ کی مثبت کارکردگی کا زیادہ تر انحصار' سربراہ کے اسلوب قیادت اور نظم و نسق سے متعلق اس کے موثر لائحہ عمل پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ماہرین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک کامیاب اور موثر تعلیمی سربراہ وہی ہوگا' جو بہ یک وقت پختہ مسلمان بھی ہو' ماہر استاد بھی اور فرض شناس منتظم بھی۔ چنانچہ موثر تعلیمی عمل کے لئے ضروری ہے کہ سربراہ ادارہ نہ صرف اپنی نظریاتی اور پیشہ ورانہ تربیت کی طرف دھیان دے' بلکہ وہ اپنے سٹاف کے ارکان کو بھی' ان کے متعلقہ مضامین کی تدریس اور انتظامی امور سے آگہی کے بارے میں مختلف تربیتی کورسز کرائے۔ اس کے علاوہ ایسے سیمینارز' ورکشاپس' کانفرنسز اور مطالعاتی گروپس کی اہمیت اور ضرورت بڑھ جاتی ہے' جن کے ذریعے [illegible] ورانہ صلاحیتوں میں اضافہ ہو۔ اس طرح [illegible]

سٹاف کو مختلف موضوعات مثلاً" اسلامی نظریہ حیات، نظریہ پاکستان، تعلیمی مقاصد، نصاب، درسی کتاب، طریقہ ہائے تدریس، مالیات، انتظامیات، امتحانات، سہولیات، ریکارڈ کیپنگ، بجٹنگ، آڈیٹنگ اور تعلیمی قوانین و ضوابط میں آگہی اور مہارت فراہم کی جاسکتی ہے۔ البتہ یہ تربیتی پروگرام ایڈہاک بنیادوں پر نہیں ہونے چاہئیں بلکہ سٹاف ڈیویلپمنٹ (Staff Development) کا ایک مستقل حصہ ہونا چاہئیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سربراہ ادارہ کا اصل کمال یہ ہے کہ کم وسائل کے باوجود اس کی کارکردگی قابل تعریف ہو۔ لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ تعلیمی ادارہ یہ سارا کام اکیلا نہیں کرسکتا، جب تک اسلامی ریاست کے تمام تعلیمی، اشاعتی، ابلاغی اور بالخصوص تربیت اساتذہ کے ادارے، سب اسی رخ پر نہ مرتب ہوں۔ اگر یہ متضاد رخ پر چلنا شروع کردیں گے تو ٹکراؤ ہوگا اور اس طرح مطلوب انسان تیار نہیں ہوں گے۔

وقت کی بہتر تنظیم

تعلیمی انتظامیات کے حوالے سے سربراہ ادارہ کی متعدد پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ہیں، لیکن میں یہاں صرف ایک اہم ذمہ داری سے متعلق چند نکات پیش کروں گا اور وہ ہے وقت کی بہتر تنظیم۔ سربراہ ادارہ ہو یا یا عام استاد، ان کے وسائل میں اہم ترین قیمتی چیز وقت ہے۔ بس ایک لمحہ گزرا، تو وہ ہمیشہ کے لئے گزر گیا۔ لہٰذا ایک موثر سربراہ کو ادارہ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے وقت کا صحیح استعمال کرنا چاہیے۔ اسے ہر روز اپنے تعلیمی ادارہ سے متعلق ضروری کاموں کی ایک فہرست بنالینی چاہئے اور یہ طے کرنا چاہئے کہ ان کاموں میں سے اسے خود کیا کرنا ہے اور دوسرے کو کیا کام سونپنا ہے؟ وقت کی تقسیم کے حوالے سے سربراہ ادارہ کو روزانہ بالعموم درج ذیل نوعیت کے امور سے واسطہ پڑتا ہے:

- روٹین کام مثلاً" ادارہ کی پراپرٹی، بلڈنگ، کلاسز اور دیگر دفتری امور
- ادارہ میں تعلیمی نگرانی، رہنمائی، مشاورت اور ڈسپلن سے متعلق امور
- اساتذہ، ملازمین، طلبہ کے مسائل سے متعلق امور
- بچوں کے والدین اور کمیونٹی کے افراد سے رابطہ
- ادارہ کی مجموعی بہتری کے حوالے سے تخلیقی و تحقیقی نوعیت کے کام
- غیر متوقع اور ہنگامی نوعیت کے کام

وقت کے ضیاع کے چند اسباب

[illegible] میں ہر سربراہ ادارہ کا اپنا منفرد اسلوب قیادت ہوتا ہے۔

لیکن مشاہدہ میں یہ بات آئی ہے کہ بعض سربراہان ادارہ اپنے وقت کی بہتر تنظیم نہیں کرپاتے اور وہ اپنے وقت کو مختلف صورتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ ان میں سے چند صورتیں یہ ہیں:

1 ۔ بعض سربراہان' اول تو اپنے ادارہ میں دیر سے آتے ہیں یا پھر آنے کے بعد اپنے دفتر میں باہر کے احباب یا اپنے منظور نظر رفقاء (Favourites) سے گھنٹوں بے مقصد گپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ اس میں شاید ان کی تسکین انا کا سامان ہوتا ہو' لیکن اس سے ادارہ کی مجموعی کارکردگی ضرور متاثر ہوتی ہے۔ ادارہ کے دوسرے ارکان یا طلبہ اپنے جائز کاموں کے لئے بھی سربراہ ادارہ سے نہیں مل پاتے اور اس طرح ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ شاید اس طرح کے سربراہان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ وقت کے ضیاع سے مجموعی طور پر ادارہ کا کتنا نقصان ہوتا ہے؟

2 ۔ بعض سربراہ' کچھ کام کئے بغیر' دوسرے کو یہ بتانے میں وقت ضائع کرتے ہیں' کہ ان کے ادارہ میں سوائے ان کے کوئی اور صلاحیت والا آدمی نہیں ہے' سب واجبی سے لوگ ہیں۔ کسی کو بولنا' پڑھنا' لکھنا نہیں آتا۔ لہٰذا سارا کام بالآخر ان کو ہی کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کی غلطیاں بتانے میں جہاں محظوظ ہوتے ہیں' وہاں اچھا خاصا قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنے بچوں کو تعلیمی ادارہ میں لے آتے ہیں۔ ان کی ذہانت اور شکل و صورت کے تذکرے کرتے ہیں۔ دوسروں سے اپنے' اپنے بچوں اور عزیزوں کے بارے میں تعریفی کلمات سننا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھار اپنے بچوں کو پڑھانے کے لئے اپنے کسی رفیق کار کو کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض سربراہ اپنے بچوں کو ٹائپ' کمپیوٹر سکھانے کے لئے اپنے ادارہ کے ٹائپسٹ یا کمپیوٹر آپریٹر کی ڈیوٹی لگا دیتے ہیں۔ یوں سربراہ ادارہ کے ذاتی کاموں میں سرکاری اہل کاروں کی شرکت' تعلیمی مقاصد سے انحراف کا باعث بنتی ہے۔ پھر بعض سربراہ فرائض منصبی سے متعلق اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات کی تکمیل (Achievement) کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور یوں ہر روز عملاً "نشستند گفتند و برخاستند" والی صورت حال پیدا ہوتی رہتی ہے اس طرح وقت کا زیاں تو ہوتا ہی ہے' ساتھ ہی سرکاری فنڈز سے اپنے ساتھیوں اور ملاقاتیوں کی غیر ضروری خاطر تواضع بھی جاری رہتی ہے۔ حالانکہ اگر یہ وقت اور پیسہ وہ کسی نتیجہ خیز کام پر لگائیں تو اس کے اثرات بالعموم مثبت ہی نکلیں گے۔ اس طرح کے سربراہان ادارہ کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اپنا وقت ہی ضائع نہیں کرتے بلکہ دوسرے ارکان کے کام کو بھی [illegible]

3 ۔ بعض سربراہان ادارہ [illegible]

اور اگر ان کے پاس ان اسناد کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور تعلیمی و تحقیقی ذوق بھی ہو' تو سونے پر سہاگا۔ یہ سب مطلوب صلاحیتیں ہیں۔ لیکن ان سربراہان میں بعض ایسے افراد بھی ہوتے ہیں' جو موقع بے موقع اپنے علمی کمال' ادیبانہ ذوق اور فلسفیانہ مباحث سے اپنے رفقائے کار کو صرف مرعوب کرنے میں ہی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس طرح دفتری وقت کا بیشتر حصہ' "نمائش علم" پر ہی ضائع کرتے رہتے ہیں۔ رفقائے ادارہ محض "تالیف قلب" کی خاطر اپنے "اشتہار پسند" طبیعت کے حامل سربراہ کو داد تو دیتے رہتے ہیں' لیکن اس سے کتنا قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے' اسے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

4 - سربراہ ادارہ کی پیشہ ورانہ تربیت سے متعلق میٹنگز میں شرکت بلاشبہ بڑی مفید اور ضروری ہے' لیکن بعض سربراہان کا سرکاری میٹنگز' ورکشاپس' سیمینارز اور کانفرنسز میں شرکت کا اصل مقصد پیشہ ورانہ تربیت سے زیادہ محض تعلقات عامہ' سیر و تفریح اور ٹی اے' ڈی اے تک ہی محدود رہتا ہے۔ اس طرح کے "نمائشی پیشہ ور دانشور" (Pseudo Scholars) اپنے ادارہ کے روز مرہ کے فرائض منصبی پر بالکل توجہ نہیں دیتے اور یوں ان کے اس اسلوب سے جہاں ادارہ کے دفتری اوقات کا صحیح مصرف نہیں ہو پاتا وہاں ادارہ کی مجموعی علمی اور انتظامی فضاء بھی منفی رخ پر متاثر ہوتی ہے۔

5 - بعض سربراہان' ادارہ کی ساری ذمہ داریاں اپنے پاس ہی رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس سے ان کو ادارہ میں اہم ترین شخص (VIP) ہونے کا نشہ تو رہتا ہے' لیکن ان کا اصل فریضہ یعنی تعلیمی نگرانی اور مجموعی نظم و نسق کا نظام بری طرح مجروح ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنا فرض منصبی کما حقہ' پورا نہیں کر پاتے۔ یوں نہ صرف کوئی نتیجہ خیز کارکردگی سامنے نہیں آتی بلکہ الٹا وقت کا بھی زیاں ہوتا ہے۔

6 - بعض سربراہان ادارہ بظاہر بہت کچھ سوچتے ہیں' پالیسیاں بھی بناتے ہیں' لیکن عملاً "شیخ چلی" کی طرح بس خیالی دنیا میں ہی رہتے ہیں اور اگر کسی پروجیکٹ پر کام شروع کرتے ہیں تو اسے ادھورا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً" وہ ادارہ میں کوئی چیز شروع کریں گے تو اس میں ذرا سی دشواری یا مزاحمت محسوس ہوئی یا یہ اندازہ ہوا کہ اس سے کوئی بااثر استاد یا ملازم یا گروہ ناراض ہو جائے گا' تو اسے فوراً" ایک طرف پھینکا یا اسے کیبنٹ میں مقفل کیا اور پھر کوئی دوسرا کام شروع کر دیا۔ اس نئے کام کے ساتھ بھی یہی حشر ہوتا ہے اور اس طرح وقت کا ضیاع تو ایک طرف' ادارہ کے کسی کام کی بھی احسن طریق سے تکمیل نہیں ہوتی۔ بس روٹین (Routine) کے چھوٹے موٹے کام چلتے رہتے ہیں' کوئی تخلیقی اور اہم کام نہیں

7 - وقت کے ضیاع کی ایک اور وجہ یہ ہوتی ہے کہ سربراہ ادارہ اپنے روزانہ کے کام کی صحیح منصوبہ بندی (Planning) نہیں کرتا۔ بعض کام بس تھوڑی سی توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں' لیکن یا تو انہیں ملتوی (Defer) کردیا جاتا ہے یا انہیں غیر ضروری طور پر زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔ سربراہ ادارہ کے پاس ایسی کوئی مرتب فہرست نہیں ہوتی' جو اسے یہ بتائے کہ ہر روز ترجیحی انداز میں اسے کون سے کام سرانجام دینے ہیں؟ بعض سربراہ ظاہر تو کرتے ہیں کہ وہ اچھے منتظم ہیں' لیکن ان کے ادارے کو دیکھ کر یا طلبہ' اساتذہ' ملازمین سے مل کر اندازہ ہوتا ہے کہ سربراہ ادارہ عملاً انتظامی مہارات (Skills) سے یا تو بے خبر ہیں یا ان میں انتہائی کمزور۔ یوں ان کا دفتر بڑا صاف ستھرا اور اس میں تزئین و آرائش کا بھی بڑا سامان ہوتا ہے' لیکن جب کسی دفتری ریکارڈ کی ضرورت پڑتی ہے تو اچھا خاصا وقت تلاش کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح دفتری قوانین اور ریکارڈ کیپنگ کے سسٹم سے عدم واقفیت جہاں وقت کے ضیاع کا باعث بنتی ہے' وہاں مجموعی انتظامی کارکردگی بھی منفی طور پر متاثر ہوتی ہے۔ حالانکہ وقت کی بہتر تنظیم اور ادارہ کو ایک صحت مند آرگنائزیشن بنانے کے لئے سربراہ کو بڑا ہی فعال اور نظم و ضبط کا پابند (Organized & Disciplined) ہونا چاہئے۔

8 - وقت کے ضیاع کی ایک اور وجہ سربراہ ادارہ کا منفی رویہ بھی ہے۔ وہ یا تو جان بوجھ کر جائز کاموں میں رکاوٹ ڈالتا ہے یا انہیں دبائے رکھتا ہے۔ اسی طرح بالآخر وہ محض کسی کو "احسان مند" یا "خوش" کرنے کے لئے یا کسی دباؤ کے تحت کام تو کر دیتا ہے' لیکن یہ سب عمل' نہ صرف وقت کے زیاں بلکہ ادارہ میں ایک غیر صحت مند ماحول کی نشوونما کا باعث بھی بن جاتا ہے۔

9 - وقت کے ضیاع کا ایک اور عامل (Factor) کسی کام کی تکمیل میں غیر ضروری تاخیر ہے۔ بعض اوقات سربراہ ادارہ کسی کام کو اپنے روایتی فطری تساہل کی بنا پر نہیں کرپاتا۔ جس کے نتیجے میں کام کا ایک ڈھیر جمع ہوتا رہتا ہے اور عملاً وہ کسی کے بارے میں کوئی واضح فیصلہ نہیں کرپاتا۔ یوں اس کے اعصاب ٹوٹنے شروع ہو جاتے ہیں اور وہ جذباتی عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کی شخصیت کے تناؤ اور چڑچڑے پن کی وجہ سے ادارہ کی مجموعی فضا' اضطراب' یاس اور بے یقینی کا شکار ہو جاتی ہے۔

10 - بعض سربراہان کو اپنے ادارہ میں سٹاف ویلفیئر اور طلبہ کی اصل اہم فلاحی سرگرمیوں سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی' جتنی انہیں اپنی ذاتی [illegible]
ہوتی ہے۔ اس طرح کے سربراہ [illegible]

"شوبز" (Show Biz) کی دنیا کے آدمی ہوتے ہیں۔ وہ ایسی تقاریب کے اہتمام میں کوشاں رہتے ہیں' جن میں کوئی اعلیٰ سرکاری افسر یا کوئی ممبر پارلیمنٹ یا بڑا تاجر یا وزیر یا کوئی اہم شخصیت' مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہو۔ یوں کئی ہفتے اس طرح کی تقاریب کی تیاری میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ہم نصابی سرگرمیوں کی افادیت مسلمہ ہے اور اس تناظر میں جائز اور بامقصد تقاریب کا انعقاد بلاشبہ نہ صرف ادارہ کے لئے رونق کا باعث ہوتا ہے بلکہ ادارہ کے اساتذہ' سٹاف اور طلبہ بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن جو تقاریب ادارہ کے مجموعی علمی اور تربیتی مقاصد سے کوسوں دور ہوں اور محض لحاتی نمائش کا باعث ہوں وہ صرف وقت اور پیسے کے زیاں کا باعث بنتی ہیں اور ان کی کوئی نتیجہ خیز علمی افادیت نہیں ہوتی۔

وقت کے ضیاع سے بچنے کی چند تدابیر

وقت کے ضیاع سے بچنے کے لئے ذیل میں چند تدابیر پیش کی جاتی ہیں:

1 - سربراہان' ادارہ کے کاموں کو خوب سے خوب تر بنانے کے لئے اپنی ڈائری میں مجموعی کارکردگی کے پروگریس چارٹس بنائیں۔ وہ ہر روز ادارہ سے متعلق ضروری کاموں کی ایک فہرست بنائیں اور انہیں اپنی ڈائری میں تین کالموں کی صورت میں نوٹ کریں مثلاً" پہلے کالم میں کام کی نوعیت' دوسرے میں کل وقت درج کریں جتنا انہوں نے اس کام پر صرف کیا اور تیسرے کالم میں اگر وقت زیادہ صرف ہوا تو اس کی وجوہ کا اختصار سے بیان۔ اس مقصد کے لئے بس اشارات کافی ہوتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ خود یہ کام اتنا تفصیل طلب بن جائے۔ شروع شروع میں تو اس طرح کی مشقت سے سربراہ کو پریشانی ہوگی' لیکن آہستہ آہستہ عادت بن جائے گی اور خود سربراہ کو اپنے بارے میں یہ معلومات بڑی دلچسپ معلوم ہوں گی۔ اس میں جب اپنے وقت کی بہتر تنظیم کرنے کی عادت پختہ ہوجائے گی' تو پھر اس تحریری مشقت کو چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔

2- وقت کے ضیاع سے بچنے کے لئے روزمرہ کے منصبی کاموں کی منصوبہ بندی کیجئے۔ ضروری' کم ضروری اور غیر ضروری کاموں میں فرق کیجئے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ کیا تمام ملاقاتیوں (Visitors) کو آپ نے ہی اٹینڈ (Attend) کرنا ہے' یا بعض امور کی مناسبت سے ادارہ کے دوسرے ارکان کو یہ کام سونپنا ہے۔ سربراہ ادارہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ بعض اوقات اس کے دفتر میں سٹاف کا ایک بااثر یا پسندیدہ رکن یا چند ارکان غیر ضروری [illegible] بیٹھے رہتے ہیں اور ادھر ادھر کی گپ یا من گھڑت خبروں کا گھنٹوں تبادلہ خیال ہوتا رہتا [illegible] بھی ایک گونہ خوشی ہوتی ہو' لیکن ایسا تنظم ایک حصار میں

مقید ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کا رشتہ باقی سٹاف اور طلبہ سے کٹ جاتا ہے۔ یوں وہ ایک "خوشامد پسند شخص" کا کردار اختیار کرکے، تعلیمی قائد کے معزز اور محترم مقام سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ اسے شعوری طور پر اپنی یہ عادت بنانا ہوگی کہ اس کا بیک وقت سٹاف میٹنگز کے ذریعے اور انفرادی ملاقاتوں کی وساطت سے، ارکان ادارہ اور طلبہ سے رابطہ بھی ہو اور اسے ان "مخصوص افراد" کی اچھے انداز میں حوصلہ شکنی کا اسلوب بھی آتا ہو، جو اپنے فرائض منصبی کو چھوڑ کر لیپا پوتی، گپ شپ یا طویل غیر ضروری "عالمانہ گفتگو" کے لئے اس کے دفتر میں براجمان رہتے ہیں اور اس طرح وقت کی ضیاع کا باعث بنتے ہیں۔

3 - سربراہ ادارہ اپنے آپ کو عقل کل نہ سمجھے بلکہ اپنے ادارہ کے افراد کی متنوع صلاحیتوں کو جاننے کی کوشش کرے اور ان پر اعتماد کرے۔ وہ اگر دیانت داری سے اپنے ادارہ کے افراد کا مشاہدہ کرے، تو ان میں فی الواقعہ بعض بڑے قابل اور دیانت دار لوگ ہوتے ہیں۔ پھر ہر شخص میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے جسے بروئے کار لانا ہوتا ہے اور یہی قیادت کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ سارے کام اپنے ذمہ لینے کی بجائے بعض امور میں اپنے رفقائے کار سے نہ صرف مشاورت (Consultation) کرے بلکہ اس بات کا بھی تعین کرے کہ اسے کون سا کام خود سر انجام دینا ہے اور کون سا کام دوسروں کو سپرد (Delegate) کرنا ہے۔ اس مشاورت اور تفویض کار کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سٹاف میں ایک ٹیم سپرٹ کے تحت کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ البتہ جب وہ کسی سٹاف ممبر کو کوئی کام تفویض (Assign) کرے تو یہ دیکھ لے کہ کیا اس رکن کے پاس اس کام کی مہارت یا ممکنہ صلاحیت (Potential) ہے۔ پھر سربراہ ادارہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ جو کام وہ اپنے رفیق کار کو سونپے، اسے اس کا مقصد، طریق کار اور اس کے لئے مطلوب وقت، پوری طرح واضح ہو اور وہ اس کام کو کرنے کے لئے آمادہ بھی ہو۔

4 - یہاں ضمناً" اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ بعض سربراہ ادارہ تو سٹاف کے ارکان کے درمیان تفویض اور تقسیم کار پر یقین نہیں رکھتے لیکن بعض سربراہ اسے بڑی "نعمت" سمجھتے ہیں اور دوسروں کو سارا کام سونپ کر خود آرام سے بیٹھ جاتے ہیں۔ [illegible] وہ اکثر اپنے ادارے سے یا تو غیر حاضر رہتے ہیں، یا دیر سے آتے ہیں، یا اپنے [illegible] ملتے ہیں۔ اگر موجود ہوتے ہیں تو بس محض چند روٹین کے کام کرتے ہیں۔ اس [illegible] چھٹکارے کی ضرورت ہے۔ سربراہ ادارہ رفقائے کار کے درمیان [illegible] کرے۔ خود بھی فعال رہے اور اپنے رفقا کو بھی فعال اور [illegible]

5 - بعض اوقات، سربراہ اپنے ادارہ [illegible]

بھی رہتا ہے' کوئی چھٹی نہیں کرتا اور کاموں کا ایک گٹھڑ بھی گھر لے جاتا ہے' لیکن مناسب منصوبہ بندی کے فقدان کی وجہ سے کوئی چیز بروقت مکمل نہیں کر پاتا۔ پھر ایک اور وجہ سربراہ ادارہ کا معیاری اور مثالی (Ideal) بننے کی خواہش بھی ہے۔ یہ اچھا جذبہ ہے لیکن بغیر کسی شعوری کاوش کے مقاصد کی تکمیل ممکن نہیں ہوا کرتی۔ سربراہ ادارہ کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ سال پر محیط جامع پروگرام اور لائحہ عمل مرتب کرے تاکہ وقت کا صحیح مصرف اور مقاصد کی بہتر تکمیل ہو۔

6 - سربراہ ادارہ سرکاری کاموں کے لئے ٹیلی فون کا استعمال ضرور کرے۔ یہ سہولت ہے ہی اسی لئے کہ وقت بچے' اور کام کی تکمیل ہو۔ لیکن ٹیلی فون پر طویل اور غیر مرتب گفتگو' پیسے کے زیاں کا بھی باعث ہے اور تضیع وقت کا بھی۔ وہ خود یہ حساب لگائے کہ چھوٹی سی بات کے لئے اس نے ٹیلی فون پر کتنا وقت صرف کیا؟ کس مقصد کے لئے گفتگو ہوئی اور بحیثیت مجموعی وہ کتنی بار آور (Productive) تھی۔ بہتر یہ ہے کہ ٹیلی فون بالخصوص ٹرنک کالز کی صورت میں پہلے ضروری بات مختصر لفظوں میں کاغذ پر لکھ لی جائے۔

7 - سربراہ ادارہ کو" ادارہ کے طے شدہ اوقات کی سختی سے پابندی کرنی چاہئے۔ وہ اپنے ادارہ میں کم از کم آدھ گھنٹہ پہلے پہنچے اور اسی طرح وقت سے پہلے ادارہ نہ چھوڑے۔ سربراہ کا یہ ذاتی رویہ' سٹاف کے لئے ایک مثال ہوگا۔ اس طرح وہ بھی وقت کی پابندی کریں گے اور نتیجۃً " تضیع اوقات کے رجحان میں کمی آئے گی۔ سربراہ ادارہ اس بات کا بھی خیال رکھے کہ وہ یا اس کا کوئی رفیق کار' ادارہ کے متعین اوقات میں' ادارہ کے اندر یا باہر' ادارے کے مقاصد اور کاموں سے ہٹ کر کسی بیرونی ایجنسی (Agency) یا تنظیم (Organization) کی تفویض کار (Assignment) پر ایسا کام نہ کر رہا ہو' جو اس کے لئے مالی منفعت کا باعث ہو اور اس سے اس کی اصل منصبی کارکردگی پر منفی اثر پڑتا ہو۔ ایسی صورت میں چند افراد کا مالی فائدہ تو ہو جاتا ہوگا' مگر ادارہ کا مجموعی ڈسپلن تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور یوں سٹاف کے دیگر ارکان اٹھتے بیٹھتے اس طرح کی کیفیت سے متعلق جلی خفی شکایت (Grumble) کرتے رہتے ہیں۔ ویسے اضافی مالی فائدہ شاید اتنا خراب نہ ہو جتنی یہ بات کہ ادارہ کے مقرر شدہ وقت جس کے لئے ایک شخص تعینات ہوتا ہے اور اس کے لئے اسے مراعات ملتی ہیں' وہ یہ وقت کسی اور مقصد یا کسی اور آرگنائزیشن کے لئے صرف کرے۔ لہٰذا سربراہ ادارہ کی [illegible] یہ ہے کہ وہ مجموعی نظم و نسق کو اس طرح مرتب کرے کہ ادارہ کا سارا پروگرام [illegible] یا ناپسندیدہ اسلوب کی وجہ سے وقت ضائع نہ [illegible] ادارہ کے لئے ایک ضابطہ اخلاق

(Code of Ethics) تشکیل دے' جس کی سربراہ ادارہ اور دیگر ارکان رضا کارانہ طور پر پابندی کریں۔

8 - سربراہ ادارہ اپنی شخصیت کی جامع' متوازن اور صحت مند نشوونما کی ہمہ وقت کوشش کرے۔ اپنے ادارہ کا نصب العین (Mission Statement) متعین کرے اور اس کے حصول کے لئے منصوبہ بندی' تنظیم اور تفویض کی صلاحیتوں کو بڑھائے اور اس طرح ایک ٹیم (Team) کی حیثیت سے کام کرنے کا سلیقہ سیکھے۔ وہ اپنی ذات کا احتساب (Self-Appraisal) کرے کہ وہ اپنی کون سی ایسی منفی عادات کو چھوڑ سکتا ہے جو تکمیل مقاصد کی راہ میں حائل ہیں اور کون سی ایسی مثبت صفات ہیں' جن کو وہ بروئے کار لا کر ادارہ میں ایک صحت مند فضا تیار کر سکتا ہے۔ غیر مطلوب عادات کو ترک کرنا اور مطلوب عادات کو اختیار کرنا ایک موثر منتظم کی اہم خصوصیت ہے۔ وقت کی بہتر تنظیم کے حوالے سے تساہل اور ٹال مٹول کی عادت اور آج کا کام کل پر چھوڑنے کا اسلوب ترک کر دینا چاہئے۔ بلاشبہ ادارہ کے دیگر عملہ میں بھی ان خصوصیات کی ضرورت ہے' لیکن نتیجہ خیز تبدیلی کا آغاز' سربراہ ادارہ سے ہی ہو گا۔

9 - وقت کے ضیاع کی ایک صورت' سٹاف میں ضروری علمی اور فنی صلاحیتوں کا فقدان ہے۔ اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے سٹاف کی نظریاتی' علمی' فنی اور انتظامی صلاحیتوں کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ ہوسکتا ہے ابتداء میں مطلوب صلاحیت کے افراد نہ ملیں لیکن سربراہ ادارہ کا یہیں سے تو قائدانہ کردار شروع ہوتا ہے کہ وہ مناسب تربیت سے ان کی پیدواری صلاحیت میں اضافہ کرے۔ اس طرح اسے اپنے آپ کو بھی اور اپنے رفقائے کار کو بھی کاہلی' انفعالیت اور یاسیت سے نکالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس اہم نفسیاتی اصول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ادھورے یا نیم دلی سے کئے گئے کاموں سے مایوسی بڑھتی ہے۔ لہٰذا مختلف اداراتی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مکمل یک سوئی سے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے رفقائے کار کی بہتر کارکردگی پر ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ ان کی خوبیوں کو تلاش کرنے کا اسلوب اپنایا جائے اور ان کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے۔ خود اپنے اور اپنے رفقاء میں وقت کی بہتر تنظیم کا احساس پیدا کیا جائے۔ وقت کے بہتر استعمال کے سلسلے میں سربراہ ادارہ کو اپنی اصلاح کی بھی اور اپنے ساتھیوں کی مسلسل رہنمائی کی بھی ضرورت ہے۔

10- ادارہ کے مختلف کاموں کی بہتر تنظیم کے لئے [illegible]
اور متعین ایجنڈا کے تحت سٹاف [illegible]

ہو۔ اس طرح باہم مشاورت سے وقت کی بہتر تنظیم ہو سکتی ہے۔ میٹنگز میں بحث و مباحثہ کے دوران بعض اوقات تلخی یا کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس پر قابو پانے کے لئے بعض صدر مجلس شگفتہ مزاجی یا ادبی ذوق سے کام لیتے ہیں۔ یہ اسلوب بسا اوقات کامیاب ہوتا ہے' لیکن اس اسلوب کو ہمہ وقت غالب نہ رکھیں۔ اس سے اجلاس کی سنجیدگی مجروح ہوتی ہے۔ بہرحال اصل توجہ' ایجنڈا کے نکات پر ہی رہنی چاہئے۔ اس سے وقت بھی بچتا ہے اور کارکردگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ میٹنگز میں صدر مجلس کی گفتگو باوقار' مختصر اور مدلل ہونی چاہئے اور اس میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہونا چاہئے۔ نیز میٹنگز میں جو امور طے پا جائیں' ان پر عمل درآمد کا نقشہ بھی پوری جزیات کے ساتھ طے کر لینا چاہئے۔

11 - بحیثیت مجموعی سربراہ ادارہ اس بات کا خیال رکھے کہ وہ اپنی ان عادات سے اجتناب کرے جن کی وجہ سے اس کا خاصا وقت ضائع ہوتا ہے۔ اسے اپنی عادات کو چھوڑنے کے لئے خود ہی جدوجہد کا آغاز کرنا ہوگا اور اس طرح اپنی زندگی میں تنظیم و ترتیب کو لانا ہوگا۔ اسے اپنے ادارہ کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو مرتب کرنا اور ان کے لئے متعین ٹائم ٹیبل کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ تعلیمی قائد خاموش کام کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ کارکردگی کی جائز تشہیر بری چیز نہیں۔ آج کے دور میں اس کی اپنی ایک افادیت بھی ہے لیکن محض اشتہار پسندی اور خود نمائی کے حوالے سے تقاریب کا انعقاد کوئی مستحسن اقدام نہیں۔ آپ جب ہر کام حصول رضائے الٰہی کے لئے کریں گے اور فکر آخرت کے تناظر میں اپنی شخصیت میں اخلاص' راست بازی' دردمندی' دیانت' محنت' عدل اور خیر خواہی کو پروان چڑھائیں گے' تو اس سے آپ کے رفقائے کار میں آپ کے لئے محبت و احترام کے جذبات بھی پروان چڑھیں گے اور ادارہ کی مجموعی کارکردگی بھی بہتر ہوگی۔ یہ باہمی محبت و احترام اور اعتماد کا ماحول' ادارہ کے تعلیمی ماحول کو یقیناً صحت مند اور خوشگوار بنائے گا اور یوں ادارہ کا ہر رکن' وقت کی قیمت کا قدردان ہوگا اور تمام تفویض کردہ کام خوش اسلوبی سے بروقت سرانجام دینے کی کوشش کرے گا۔

تعلیمی انتظامیات کے تناظر میں تربیت اساتذہ کا مروجہ پروگرام

پاکستان میں تربیت اساتذہ کے مروجہ پروگراموں سے متعلق ایک عمومی تاثر یہ ہے کہ اساتذہ کے ان تربیتی اداروں کے طلبہ نے شاید کچھ میکانکی تدریسی اصول اور انتظامی تکنیکیں [illegible] نہیں سیکھا کہ انہیں ایک اعلیٰ اخلاق و کردار اور خدا کے سامنے [illegible] ہے۔ استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر' تربیت اساتذہ

کے یہ ادارے تہذیبی نقطہ نظر سے بالعموم بنجر' بے مقصد اور کھوکھلے سے ہیں۔ بنجر ان معنوں میں کہ یہ ادارے ظاہری تمدن کے حوالے سے تو کسی حد تک افادی علم و فن پر زور دیتے ہیں' لیکن اسلامی شعور سے مزین تہذیب اور اسلامی اخلاقیات سے کوسوں دور۔ ہو سکتا ہے کہ اساتذہ کی یہ تربیتی اسناد (Degrees) انہیں کسی حد تک مادی منفعت اور اعلیٰ تدریس اور انتظامی مناصب کے حصول کی ضمانت دیتی ہوں' لیکن یہ روحانی اطمینان اور مقصد زندگی کی آگہی قطعاً" نہیں دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی ادارہ میں ہوتے ہوئے ادارہ کے شاف میں وہ نظریاتی یک نگاہی نہیں پیدا ہوتی' جو اسلامی نظام تعلیم کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ روحانی اور فکری وحدت کے نہ ہونے سے' تعلیمی اداروں میں عملاً ایک لبرل یا سیکولر تعلیمی پالیسی رواج پاجاتی ہے۔ آج ہمارے ہاں یہ بحث زوروں پر ہے کہ موثر استاد کیسے تیار کیا جائے؟ بلاشبہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اچھے ماہر استاد کی جو اپنے مضمون میں بھی فضیلت رکھتا ہو اور فن تدریس میں بھی اہلیت رکھتا ہو' وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ لیکن ان میکانکی صفات کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمیں سب سے پہلے ایک ایسا انسان تیار کرنا ہے جس میں تقویٰ اور خوف خدا ہو اور پھر اسی محوری خاصیت کی اساس پر ایک اچھے معلم اور منتظم کی تشکیل و تعمیر کرنا ہے۔ آج ہمارے تعلیمی حلقہ میں یہ بحث زوروں پر ہے کہ تربیت اساتذہ کا دورانیہ جتنا زیادہ ہوگا" اتنے ہی اچھے معلم اور منتظم تیار ہوں گے۔ میرے خیال میں محض وقت گزاری سے اچھے افراد تیار نہیں ہوں گے جب تک یہ دورانیے نتیجہ خیز نہ ہوں۔ میں تربیت اساتذہ میں جدید تمدنی رجحانات' سمعی و بصری معاونات اور جدید تعلیمی تحقیق کے خلاف نہیں۔ ان کی ضرورت و اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔ لیکن اہم مسئلہ یہ ہے کہ مروجہ تدریسی مشقوں اور چند نظری کورسز کے ذریعے شاید کسی حد تک ماہر (Skilled) اساتذہ اور منتظمین تیار تو ہو جائیں' مگر کیا یہ تدریسی مشقیں یہ ضمانت دیتی ہیں کہ اس مشقت کی چکی سے گزرنے والا تعلیمی قائد فی الحقیقت ایک خیر خواہ' صاحب کردار' امین' متقی' ذمہ دار' صادق اور محب وطن انسان بھی ہے۔ ہمارے تربیتی اداروں کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ زیر تربیت طلبہ کو بھی بالعموم جانوروں کی طرح سدھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس فوجی ڈرل سے ان میں کچھ "فن کاری" اور "میکانکی مہارت" تو آجاتی ہے' لیکن انسان سازی تو اسلامی تہذیبی شعور سے ہی تشکیل پاتی ہے' اور یہی وہ عنصر ہے جس سے ہمارا تربیتی نصاب [illegible]

آج تعلیمی انقلابات کے [illegible]

بلاشبہ انسانی [illegible]

مصنوعی اخلاقیات کے تحت آپ ماتحت (Subordinate) سے شاید کچھ کام لے لیں اور اپنی "فنکارانہ مسکراہٹ" اور چند "ظاہری خوش کن جملوں" سے اپنا تابع دار بھی بنالیں، مگر یہ انتظامی ماڈل زیادہ دیر چلتا نہیں۔ اخلاص پر مبنی اخلاقی طرز عمل، جس سے ایک معلم اپنے طلبہ سے اور ایک سربراہ اپنے رفقائے کار سے موثر کام لے سکتا ہے، وہ درحقیقت خالصتاً روحانی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق دین سے ہے۔ انسان سماجی جانور نہیں، بلکہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کے تمدن کی ترقی کا انحصار اسلامی اخلاقی اقدار پر ہے۔ اسلامی تعلیم دراصل اعلیٰ اسلامی اقدار و اخلاقیات کا مجموعہ ہے۔ اس حوالے سے ہمیں ایسے مطلق ذہین معلم اور منتظم نہیں چاہییں جو اسلامی اخلاقیات سے عاری ہوں، کیونکہ روحانی و اخلاقی علو سے محروم شخص دراصل زوال کی علامت ہے۔ لہٰذا ہمیں زوال کی طرف لے جانے والے نظام تعلیم نہیں بلکہ غالب اور حکمران نظام چاہیے جو ایسے افراد تیار کرنے کا باعث ہو، جو اپنے کردار و اخلاق کے حوالے سے اپنے رفقا اور طلبہ میں ممتاز ہوں اور جس کی اخلاقی ساکھ معتبر ہو۔ ایسے افراد ہی امامت عالم کے منصب کے اہل ہوسکتے ہیں۔

اس پس منظر میں آج تعلیمی منتظم ہو، یا استاد، اس کی تربیت میں انسانی، اخلاقی یا روحانی وجود کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اہم ترین وسائل تربیت، سمع، بصر اور فواد ہیں، جن کے حوالے سے تزکیہ نفس کی تربیت کا انتظام ہونا چاہیے اور "تفقہ فی الدین" کو نصاب تربیت میں تخصص (Specialization) کا مقام ملنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ دور حاضر کی علمی تحقیقات سے استفادہ اور عمل تعلیم کے تمام عناصر سے متعلق تربیت بھی ضروری ہے۔ تربیت اساتذہ کے نصابات میں، اس رخ پر تبدیلی سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ عام استاد ہو یا سربراہ ادارہ، ان کی تعلیمی و انتظامی کارکردگی یقیناً بہتر ہوگی اور بحیثیت مجموعی وہ ایسے دیانت دار انسان ہوں گے، جن کے بدترین مخالف بھی ان کے کردار پر انگلی نہ اٹھا سکیں گے۔

آخر میں تربیتی اور تعلیمی نوعیت سے متعلق چند ایسے موضوعات کی نشاندہی کی جاتی ہے، جن کے حوالے سے سربراہ ادارہ کی مناسب تربیت، اسے ایک موثر تعلیمی قائد بناسکتی ہے:

○ **مطالعہ قرآن و حدیث:** سربراہ ادارہ کے منصب پر فائز ہونے والے شخص کے لئے جہاں دنیوی علوم پر دسترس کے حوالے سے چند اسناد ضروری قرار پاتی ہیں، وہاں اولیت اس کو دی [illegible] قرآن حکیم کا ترجمہ اور سیرت رسول ﷺ کا مکمل مطالعہ کیا ہوا ہو، تاکہ وہ [illegible] عمل کرے اور اسے دوسروں تک منتقل کرنے کے

قابل ہو۔ لیکن جو لوگ پہلے سے تعینات ہیں' ان کے لئے دوران ملازمت کم از کم ایک ماہ کا خصوصی تربیت کورس تشکیل دیا جانا چاہئے' کیونکہ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں قیادت اسی کے پاس ہوتی ہے' جو عالم باعمل ہو۔ یہی وہ بنیادی سرچشمہ علم ہے' جس کی روشنی میں اسلامی نظام حیات سے متعلق سربراہ ادارہ کی جامع تربیت ضروری ہے۔

- اسلامی تاریخ اور حالات حاضرہ سے آگہی' نیز علم التعلیم کے جدید رجحانات اور مباحث سے متعلق تربیت۔
- عمل تعلیم کی مختلف مباحث مثلاً" اسلامی فلسفہ تعلیم' مقاصد تعلیم' تعلیمی نصابیات' درسی کتب کی تیاری' طریقہ ہائے تدریس' تعلیمی انتظامیات' مالیات' امتحانات اور تعلیمی تحقیق کے طریق کار میں تربیت۔
- تعلیمی انتظامات کے چند اہم موضوعات مثلاً" سٹاف میٹنگز کا انعقاد' ریکارڈ کیپنگ' اکاؤنٹنگ' آڈیٹنگ' فیصلہ سازی' موثر ابلاغ' وقت کی بہتر تنظیم' سٹاف سپرویژن' سٹاف ڈویلپمنٹ اور تعلیمی ادارہ سے متعلق ضروری قوانین و ضوابط کے بارے میں تربیت۔

خلاصہ بحث

وقت کی توقیر و منزلت اور وقت کی بہتر تنظیم' بڑی اہم تعلیمی قدر ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک ذمہ دار ہستی ہے اور اسے ایک ایک لمحہ کا حساب دینا ہے۔ اس کی ساری صلاحیتیں اور قابلیتیں امانت ہیں اور ان کے لئے خدا کے حضور جواب دہ (Accountable) ہونا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اساتذہ کی تربیت لازماً" اسلامی منہج کی روشنی میں ہو۔ حقیقت میں' تعلیمی اداروں میں نتیجہ خیز مثبت تعلیمی تبدیلی کا اہم ترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم صدق دل سے اسلامی نظام تعلیم کی طرف لوٹیں۔ ہمیں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لئے ایسی تعلیمی قیادت کی ضرورت ہے جو جدید علوم اور اسلامی علوم میں اجتہاد اور حکمت کے قابل ہوں۔ اس تناظر میں تربیت اساتذہ کے نصاب کا اصل نصب العین ایسے اساتذہ اور ایسے تعلیمی منتظمین تیار کرنا ہے جو بہ یک وقت علمی فضیلت اور پیشہ ورانہ مہارت کے بھی حامل ہوں اور اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک بھی۔ خصوصیت سے اسلام کے تصور آخرت پر ان کا محکم یقین ہو' کیونکہ اسلامی اخلاقیات کے نفاذ کے لئے اصل قوت اسلام کا تصور آخرت ہی ہے۔ خلاصہ کے طور پر ایک تعلیمی قائد کی علمی و اخلاقی برتری ہی درحقیقت اس کی سب سے بڑی اساسی قوت (Power Base) ہوتی ہے' جو کہ صرف اسے ایک رہنما اور لیڈر کا [illegible] میں مسلمان اور ممتاز مقام [illegible]

ہے۔ آج تعلیمی دنیا ہو یا سیاسی دنیا' اس میں موجود اخلاقی بحران کا خاتمہ صرف اسی صورت ہوسکتا ہے' اگر ہم خوف خدا اور فکر آخرت کی اساس پر اپنے نظام تعلیم و تربیت کو مرتب کریں۔ یہی وہ کارگر حکمت عملی ہے جس سے ہم انشاء اللہ سیادت عالم کا مقام ضرور حاصل کریں گے۔

(اسلامی نظامت تعلیم پاکستان کے زیر اہتمام "تعلیمی انتظامیات" کے موضوع پر نجی تعلیمی اداروں کے سربراہان کی تربیت سے متعلق منصورہ آڈیٹوریم لاہور میں سہ روزہ قومی تعلیمی سیمینار منعقدہ 23 دسمبر 1996ء کے پہلے سیشن میں پیش کیا گیا۔۔۔ سہ ماہی مجلہ تعلیمی زاویے اسلام آباد' جلد 8' شمارہ 10' اپریل 1997ء)

❁

ابتدائی تعلیم

عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنسوں کی روشنی میں

پاکستان کے نظام تعلیم کا اگر مجموعی نتائج کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ یہ نظام بالعموم نظریاتی بنیادوں پر مرتب نہیں ہوا۔ باقی مسلم دنیا کے نظام ہائے تعلیم کی طرح یہ بھی عملاً دین' دنیا کی ثنویت (Duality) پر قائم ہے۔ بلا شبہ ہمارے ہاں اب نظام تعلیم کو اسلامی تناظر میں ڈھالنے کی باتیں ہورہی ہیں اور یہ ایک خوش آئند مستقبل کی علامتیں ہیں' لیکن ابھی تک تو تعلیمی اداروں کے نصابات اور ان سے متعلق سرگرمیوں میں عام طور پر جدید علم کے اصولوں اور اسلامی علم کی بنیادوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ یہ نظام کسی نقطہ نظر اور مقصد زندگی سے محروم ہونے کی وجہ سے غیر منظم بھی ثابت ہورہا ہے' غیر تخلیقی بھی اور روحانی قدروں سے محروم بھی۔ حقیقت میں تعلیمی عمل نظریاتی تناظر میں جتنا منظم اور مربوط ہوگا' اتنا ہی قومی اور ملی ترقی کی منزلیں آسانی سے طے ہوں گی۔ لیکن یہ عمل جتنا بے ہنگم اور غیر مربوط ہوگا' اسی قدر مقاصد کی تکمیل مشکل ہوتی چلی جائے گی۔ تعلیمی عمل کے موثر ہونے میں بلاشبہ عمارات اور دیگر سہولیات ضروری ہیں' لیکن ان سے کہیں زیادہ اہمیت فکری اساس کی ہوتی ہے۔

ایک نظریاتی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی حکومت کا وظیفہ و کردار یہ ہونا چاہیے کہ وہ پورے تعلیمی نظام کو ایک منضبط اکائی کی حیثیت دے اور اس کے سارے تضادات دور کرکے اس کا واضح رخ متعین کرے۔ لیکن ہمارے ہاں اس وقت بھی تعلیمی عمل بالعموم تین مختلف دھاروں میں بہہ رہا ہے۔ ایک طرف یورپین ٹائپ انگریزی میڈیم سکول ہیں جو سینئر کیمبرج کا سہارا لیکر اپنے مقاصد کی آبیاری کررہے ہیں۔ دوسری طرف اردو میڈیم ادارے ہیں جو بوجوہ آج تک احساس کمتری کی گرفت سے نہیں نکل سکے ہیں اور نہ ہی اسلامی حوالے سے مطلوبہ مقاصد حاصل کرسکے ہیں۔ تیسری طرف وہ دینی مدارس ہیں جو مروجہ تعلیمی نظام سے ہم آہنگ ہوئے بغیر اپنے انداز سے برسرپیکار ہیں۔ ان مختلف دھاروں میں توازن کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہر دھارے کا تیار شدہ فرد اپنے مخصوص ٹریڈ مارک کے ساتھ سامنے آرہا ہے اور انتشار بڑھ رہا ہے۔ یہ فکری انتشار صرف پاکستان تک محدود [illegible] مسلم امہ اس کا شکار ہے۔ خود معلمین کی اچھی خاصی تعداد فکری تضادات کی

حال ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے معلم اپنے شاگردوں کو ہرگز وہ نظریاتی اور عملی تربیت نہیں دے سکتے جس کی ہمیں ایک اسلامی ریاست کیلئے ضرورت ہے۔ آج تعلیم کے حوالے سے مسلم دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ علوم کے معاملے میں ہم عصر دنیا سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ پورا نظام تعلیم بالعموم دین و دنیا کی دوئی کے فلسفے پر مرتب شدہ ہے۔ حقیقت میں آج پوری امت مسلمہ کو یہ چیلنج درپیش ہے کہ وہ اپنے عہد کو کیسے عدل پر قائم کرے اور کس طرح پھر سے پوری انسانیت کی قائد بن سکے؟ کس طرح دین و دنیا کی ثنویت ختم ہو؟ کس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں حق سربلند اور باطل سرنگوں ہو؟ اور کس طرح تلاوت آیات، تزکیہ نفس، تعلیم کتاب، اور تعلیم حکمت پر مبنی نظام تعلیم مرتب ہو؟ یہ کسی حد تک اطمینان کی بات ہے کہ اب ان سوالات کے بارے میں مسلم دنیا میں کسی نہ کسی انداز میں سوچا جارہا ہے اور مسلمانوں کو یہ احساس ہورہا ہے کہ مسلم ممالک کے اندر رائج لادینی نظام ان کے اسلامی کردار، ان کی تہذیبی انفرادیت اور علمی تشخص کو کھو دے گا اور اس طرح ان کی اخلاقی حالت بھی کمزور ہوتی چلی جائے گی اور مادی اور عسکری علوم کے حوالے سے بھی ان میں قائدانہ کردار کے بجائے تقلیدی کردار پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ حقیقت میں علمی، فکری، مادی اور روحانی امامت و قیادت کیلئے جو تین چیزیں بڑی اہم ہیں، وہ خوش قسمتی سے مسلمان دنیا کے پاس ہیں لیکن بوجوہ وہ قوتیں استعمال نہیں ہورہیں۔ یہ تین قوتیں یہ ہیں:

(الف) ایمانیات (ب) مادی وسائل (ج) انسانی وسائل

اب بہرحال مسلمان ملکوں میں کسی نہ کسی طور پر یہ احساس اجاگر ہورہا ہے کہ تعلیم کی کس طرح اسلامی تعمیر نو کی جائے کہ ہماری دنیا بھی سنورے اور آخرت بھی۔ دور حاضر بالخصوص 1900ء کے پہلے عشرے میں تین ایسی شخصیتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں جنہوں نے اپنے وقت کی غالب تہذیب کو چیلنج کیا۔ مثلاً ہندوستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903ء)، مصر میں حسن البنا شہید (1906ء) اور ترکی میں سعید نورسیؒ (1906ء) نے تجدید و احیائے دین کا کام بڑی حکمت و جرات سے کیا۔ مسلمانوں میں اس احساس کو اجاگر کرنے کا سہرا یقیناً ان ہی شخصیات کے سر ہے جنہوں نے اپنی تحریکوں کے ذریعہ واضح کیا کہ اسلام ایک منفرد نظام زندگی ہے اور ایک دین ہے جو زندگی کے تمام امور میں رہنمائی بہم پہنچاتا ہے۔ ان شخصیات میں سے خصوصیت سے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے تعلیم کے موضوع پر تنہا اتنا کچھ لکھا اور کہا کہ شاید مسلم دنیا میں عصر حاضر کے کسی اور ماہر تعلیم نے نہ کہا ہو نہ لکھا ہو۔ سید مودودیؒ کے تعلیمی مقالات کا مجموعہ [illegible] متعلق انٹرویو کا مجموعہ "[illegible]

تعلیم کا بھرپور خاکہ پیش کرتے ہیں۔ یہ تعلیمی مقالات پوری مسلم دنیا کے ارباب اختیار کو وہ اساس فراہم کرتے ہیں جن سے ایک موثر اور کارگر نظام کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے۔

نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل سے متعلق جو آواز سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اٹھائی تھی، اسے عالمی سطح پر بڑی پذیرائی ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کیلئے اسلامی تعلیم سے متعلق چار عالمی کانفرنسیں بلائی گئیں۔ پہلی کانفرنس 31 مارچ 1977ء سے 8 اپریل 1977ء کو ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ سعودی عرب کے تعاون سے مکہ مکرمہ میں منعقد ہوئی۔ اس میں دنیا کے معروف مسلم زعماء نے شرکت کی اور تعلیم کے مقاصد کا تعین کیا گیا۔ دوسری عالمی کانفرنس ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد اور وزارت تعلیم حکومت پاکستان کے تعاون سے 15 سے 20 مارچ 1980ء کو اسلام آباد (پاکستان) میں منعقد ہوئی۔ جس میں تشکیل نصاب کے سلسلے میں ایک اجمالی خاکہ اور بنیادی اصول وضع کئے گئے۔ تیسری عالمی کانفرنس اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ ڈھاکہ اور ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کے تعاون سے 5 سے 11 مارچ 1981ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہوئی، جس میں درسی کتب کی تیاری کے لئے رہنما اصول متعین کئے گئے۔ چوتھی عالمی کانفرنس انٹر اسلامک یونیورسٹی کو آپریشن جکارتہ (انڈونیشیا)، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی، عالمی مرکز برائے اسلامی تعلیم، مکہ مکرمہ اور اسلامی کانفرنس (OIC) کے تعاون سے 22 سے 28 اگست 1982ء کو جکارتہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا مقصد مختلف سطحوں پر اور مختلف مضامین کی حکمت تدریس سے متعلق وہ بنیادی نظریات اور وہ طریقہ ہائے تدریس وضع کرنے تھے جو اسلامی تعلیم کے مقاصد کے حصول میں معاون اور موثر ثابت ہوں۔

ابتدائی تعلیم سے متعلق اہم سفارشات کا خلاصہ

ذیل میں ان کانفرنسوں کی تفصیلی سفارشات میں سے صرف ابتدائی تعلیم سے متعلق ان اہم سفارشات کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے جن کا تعلق تعلیمی نصب العین، نصاب تعلیم، درسی کتب اور طریق تدریس سے ہے۔ یہ تعلیمی سفارشات پوری مسلم دنیا کے نظام تعلیم کی اصلاح کیلئے ہیں۔ خوش قسمتی سے پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و تنفیذ کی جو کوششیں ہورہی ہیں یہ سفارشات تعلیمی عمل کی بہتر تفہیم اور تعلیم کو صحیح سمت منتقل کرنے میں انشاءاللہ مددگار ثابت ہوں گی۔

تعلیمی نصب العین

عالمی تعلیمی کانفرنسوں کی نظر میں تعلیم کی توضیح و تفہیم اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کائنات میں انسان کے مقام کا تعین' خالق کائنات کا تصور اور علم کی نوعیت واضح نہ ہو۔ چنانچہ اسلامی حوالے سے تعلیم کا اساسی نصب العین ہی یہ ہے کہ وہ انسان کی روحانی' مادی' ذہنی' جسمانی اور جذباتی قوتوں کو جلا دے اور خیر کی ساری صلاحیتوں کو اجاگر کرکے اس کی شخصیت کی متوازن نشوونما کرے' تاکہ وہ نیکی اور خیر کی طرف راغب ہوسکے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ انسان انفرادی اور اجتماعی سطح پر خدا کا اطاعت شعار بن جائے اور فکری و عملی ہر لحاظ سے یہ کہنے کیلئے تیار ہو۔ ترجمہ: "کہو' میری نماز' میرے مراسم عبودیت' میرا جینا اور میرا مرنا' سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔" (القرآن' الانعام: 162)۔ اس لحاظ سے تعلیم کا سب سے بڑا مقصد بندگئی رب اور اللہ کی رضا کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرنا ہے اور حقیقت میں علم کا ماحصل اور قدر اعلیٰ' رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے۔۔۔۔۔ ان عالمی کانفرنسوں میں اس بات کو بھی واضح کیا گیا کہ اپنی کلیت اور جامعیت میں تعلیم کا مفہوم "تربیت" کی اصطلاح میں مخفی ہے۔ تعلیم و تربیت کے امتزاج سے مزین تعلیم ہی اصل تعلیم ہوگی۔ تعلیم کے حتمی مقاصد کے حصول کی تشکیل و تحصیل کے حوالے سے پہلی عالمی تعلیمی کانفرنس منعقدہ مکہ مکرمہ نے علوم کی درج ذیل درجہ بندی کی ہے۔

(الف) مستقل اور دائمی علم : یہ علم صرف الہامی ہدایت پر مبنی ہے جو قرآن و سنت کی شکل میں موجود ہے۔ اس سے کامل استفادہ اور اس کی بہتر تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کو اہمیت اور فوقیت دی جائے۔

(ب) اکتسابی اور عقلی علم : یہ علم سوشل' نیچرل اور اطلاقی علوم پر مشتمل ہے۔ انہیں اس حد تک بحال رکھا جانا چاہئے جس حد تک وہ شریعت سے مطابقت رکھیں۔

حقیقت میں ہر سطح پر ایسا بنیادی علمی ذخیرہ موجود ہونا چاہئے جو درج بالا دونوں ذرائع سے ماخوذ ہو' لیکن اول الذکر کو اہمیت اور فوقیت دینی ہوگی۔ یعنی اسلامی شریعت کو ابتدائی درجہ تعلیم سے لیکر اعلیٰ درجہ تعلیم تک طلبہ کے لئے لازمی قرار دیا جائے' جو بتدریج ہر سطح کے معیار کے مطابق ہو اور بنیادی نصاب کا لازمی حصہ ہو۔ غرض حصول رضائے الٰہی کے اہم مقصد کے تناظر میں طلبہ کی تعلیمی سرگرمیوں کو اس لحاظ وضع کیا جائے کہ [illegible] حضرت محمد ﷺ کی سیرت کو نمایاں حیثیت دی جائے [illegible]

مسترد کر دیا جائے اور بچوں کے دلوں میں اللہ کی محبت اور خوف خدا کو جاگزیں کیا جائے۔

نصاب تعلیم

عالمی تعلیمی کانفرنسوں نے ابتدائی سطح پر نصاب تعلیم سے متعلق جو اہم سفارشات مرتب کیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

1- تدوین نصاب سے متعلق ماہرین کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ دائمی اور اکتسابی علوم کے درمیان باہمی تعلق کو واضح کریں اور پھر نصاب کو تشکیل دیں۔ نصاب کی تشکیل میں دوسرا ضروری امر بچوں کی نفسیات کا شعور ہے۔ اس سطح پر سکول کے نصاب میں اس بات کو اہمیت ملنی چاہئے کہ بچوں کے دل و دماغ میں دین کا تصور راسخ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مدارس میں ایسا ماحول پیدا کرنا چاہئے جو اسلامی اقدار کی ترویج کا باعث بنے۔ ذرائع ابلاغ میں ان تمام مزاحم قوتوں اور ان عناصر کا خاتمہ کیا جانا چاہئے جو اسلامی اخلاق و ضوابط کی حکمرانی میں حائل ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ کوشش ہونی چاہئے کہ ذرائع ابلاغ طلبہ کی سیرت سازی میں شریک ہوں اور مقاصد تعلیم کے حصول میں معاون ثابت ہوں۔

2- ابتدائی سطح پر نصاب میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ بچہ یا تو پورا قرآن حکیم یاد کرلے یا قرآن کا ایک خاص حصہ یاد کرلے۔ اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی منتخب احادیث بھی یاد کرے۔ نصاب میں اس امر کا خصوصی خیال رکھا جائے کہ مسلمان ملکوں میں عربی زبان' اسلامی ثقافت اور اکتسابی علوم کی تمام شاخیں مثلاً" ریاضی' جیومیٹری' طبیعات' کیمیا' نباتیات وغیرہ اسلامی تناظر میں پڑھائی جائیں۔ ابتدائی مدارس میں تعلیمی عمل کو موثر بنانے میں سمعی و بصری معاونات کا انتظام بھی کیا جانا چاہئے۔

3- بچے جو دیکھتے ہیں سنتے ہیں' یا محسوس کرتے ہیں' اسے بڑی جلدی ذہن نشین کرلیتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انہیں مثالوں کے ذریعے اور عمل کے ذریعے اسلام کے اساسی نظریات کا علم ہو۔ غرض تدریسی پروگرام بڑا واضح اور ادارے کا پورا ماحول اسلامی نظریے کا عکاس ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ ابتدائی سطح پر درج ذیل نصاب بڑی اہمیت کا حامل ہے:

(I) قرآن حکیم کی تعلیم (ناظرہ) : قراۃ' حفظ اور بعض منتخب سورتوں کے معانی اپنی قومی زبان میں یاد کرنا۔ وہ طلبہ جو پہلے تین سال میں پورا قرآن حکیم یاد کرنا چاہیں وہ اس مقصد کیلئے اسی فیصد وقت دیں اور بیس فیصد وقت اپنی قومی زبان کے پڑھنے لکھنے' عربی اور ریاضی کے ابتدائی اصول کیلئے وقف کریں۔ اسی طرح وہ طلبہ جو چھ سال میں مکمل قرآن حکیم حفظ [illegible] ان تمام مضامین میں بھی شرکت کرنا چاہئے جن کیلئے باقی ماندہ

طلبہ سے توقع کی جاسکتی ہے۔ شام کی کلاسز کا بھی انتظام کیا جاسکتا ہے جن میں قرآن حکیم حفظ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ باقی طلبہ کے لئے بھی یہ ضروری ہو کہ وہ قرآن حکیم کا کم از کم تیسواں پارہ اور دوسری سورتیں مثلاً" سورہ یاسین اور سورہ الرحمٰن ضرور حفظ کریں۔

(ii) دینیات (بشمول توحید اور فقہ) : ابتدائی جماعتوں کے تمام مضامین میں بنیادی اسلامی قوانین اور ضوابط پڑھا دیئے جائیں اور طلبہ کی اس رخ پر تربیت کی جائے کہ وہ ان اصولوں کا عملاً اتباع بھی کریں۔

(iii) تاریخ : تاریخ کی مادی تعبیر کے بجائے اخلاقی تعبیر کو پیش نظر رکھا جائے۔ ابتدائی سطح پر ماضی کی اسلامی تاریخ کو دلچسپ انداز میں قصص کے ذریعے پڑھایا جائے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی سیرت طیبہ اور دیگر انبیاءؑ کی حیات مبارکہ ابتدائی جماعتوں میں ہی نصاب کا حصہ ہونا چاہئے۔ اس کیلئے درسی مواد قرآن و حدیث' سیرت النبی ﷺ' اسلامی تہذیب اور تاریخی روایات سے منتخب کیا جانا چاہئے۔ اس کیلئے طریق کار یہ ہونا چاہئے کہ نصابی خاکہ اور تدریسی اسلوب ہر سطح کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جانا چاہئے۔ ابتداء میں کہانیوں' واقعات اور حالات کی شکل میں تدریس ہو اور پھر آخری دو سال میں مسلسل بیانیہ اسلوب اختیار کیا جائے۔ موضوعات اور اسباق ایسے ہوں جن کے ذریعے بچے اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے جانیں اور حیات انسانی کے لئے دین کی اہمیت کو محسوس کریں۔ تاریخ کے اسباق کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ بچے مسلمانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ خود اپنے ممالک کی تاریخ سے بھی باخبر ہوں۔

(iv) نثری تحریریں اور نظمیں : نثری تحریریں اور نظمیں اس طرح پیش کی جائیں جو تدریجاً" بچوں میں اپنے احباب' ہمسایوں اور دیگر لوگوں سے ہمدردی' والدین اور بزرگوں سے فرمانبرداری' انبیاءؑ کیلئے عقیدت اور دینی رہنماؤں' نیک افراد اور خواتین کیلئے احترام کا جذبہ' حقوق اللہ اور حقوق العباد کا احساس اور اعلیٰ مقاصد کیلئے قربانی و ایثار کا احساس اجاگر کریں۔ یہ تحریریں اور موضوعات رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ' صحابہ کرامؓ اور اسلامی تاریخ کے ممتاز مسلم زعما کی زندگیوں سے منتخب کی جائیں۔

(v) جغرافیہ : جغرافیہ سے متعلق ایسے موضوعات اور اسباق شامل کئے جائیں جن کی مدد سے بچوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ ان کا مسلم دنیا اور اس کے مرکز مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ سے کیا تعلق ہے؟ مزید اپنے گردونواح کی طبعی دنیا اور وہاں کے باشندوں سے [illegible] طرح یہ اسباق ان طلبہ میں امت مسلمہ اور [illegible] [illegible] [illegible]

دلائیں گے۔ تدریس جغرافیہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ بچہ جب ابتدائی درجہ کو پاس کرے تو اسے یہ احساس ہوجانا چاہئے کہ مسلم دنیا سے کیا مراد ہے؟ اس کے اپنے ملک کا مسلم دنیا سے کیا تعلق ہے؟ آغاز میں یہ اسباق' تصاویر' کارڈ یا تعلیمی معموں کے ذریعے اور پھر تدریجاً" منصوبی طریقے کے ذریعے دیئے جاسکتے ہیں۔ اس طریقے کے ذریعے استاد متعلقہ کتب و رسائل اور مختلف ابواب کے پڑھنے میں طلبہ کی رہنمائی کرے۔ جغرافیہ کی تدریس میں نقشہ خوانی بچوں کے لئے ایک دلچسپ کام ہے۔ بحیثیت مجموعی منصوبی طریقہ ان کے جذبہ تجسس کو مطمئن کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں مدد دے گا۔

(vi) ریاضی : ابتداء میں کھیل اور تعلیمی معموں کے ذریعے ریاضی کا مضمون پڑھایا جائے اور اس کے بعد سوالات کے ذریعے۔ جب بچہ پرائمری پاس کرلے تو اسے اس قابل ہوجانا چاہئے کہ وہ حساب کے اعداد کے علاوہ الجبرا اور جومیٹری کی علامات کو اعتماد کے ساتھ استعمال اور حل کرسکے۔ اس سطح پر ریاضی کی تدریس کا مقصد طلبہ کو اس قابل بنانا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت اس طرح ہو کہ وہ مقرون چیزوں سے مجرد دنیا کی طرف' حسی تجربے سے تصورات کی طرف اور حقائق سے علامات کی طرف جاسکیں۔ ریاضی کا مقصد جہاں طبعی دنیا کا سائنسی اور معروضی مطالعہ ہے' وہاں بچے کو اس حقیقت کا ادراک کرنا بھی ہے کہ یہ کائنات جو ٹھوس اور مادی حقیقت نظر آرہی ہے' دراصل "آیت اللہ" یعنی اللہ کی نشانی ہے اور اللہ ہی اصل حقیقت ہے جسے دوام حاصل ہے۔

(vii) عربی : عرب ملکوں میں تو عربی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن باقی ماندہ مسلم ممالک میں ابتداء ہی سے عربی کو بطور ثانوی زبان کے پڑھانا چاہئے۔ غیر عرب بچوں کے لئے عملی اور اطلاقی لسانیات کے ذریعے ترتیب وار اور درجہ بندی کے تحت مختلف کورسز کو مرتب کیا جائے۔ کوشش یہ ہونا چاہئے کہ چھ سال کے اندر اندر بچوں میں یہ صلاحیت پیدا ہوجائے کہ وہ عربی زبان کے بنیادی ذخیرہ الفاظ اور عربی زبان کی ساخت پر عبور حاصل کرلیں۔ تاکہ پرائمری سکول پاس کرنے کے بعد طلبہ بخوبی قرآنی عربی کو بغیر کسی دقت کے سمجھ سکیں۔

(viii) مطالعہ فطرت اور ابتدائی سائنس : سائنس میں ایسے موضوعات اور سرگرمیاں ہونی چاہئیں جن سے بچوں کو اس دنیا کی خوبصورتی' اس کی حکمت' اس کی شان و شوکت' اس کی [illegible] اور اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا جائے تاکہ خالق کائنات کی عظمت' حکمت اور [illegible] کے دلوں میں گھر کر جائے اور اس طرح وہ سائنس کے بنیادی اصولوں کے پیچھے [illegible] طرح انہیں سادہ تجربات و مشاہدات کرنے کے بھی قابل [illegible]

جائے تاکہ وہ روز مرہ زندگی میں سادہ میکانکی چیزوں کو استعمال کرنے کا انداز بھی جان لیں۔

درسی کتب

اسلامی تناظر میں درسی کتب کی تیاری کے لئے درج ذیل رہنما اصول اور اقدامات ضروری ہیں:

1- ایسے مصنفین اور مولفین کا انتخاب عمل میں لایا جائے جو اسلامی اور جدید علوم کے اصول و مبادی سے شناسا ہوں۔ مزید وہ درسیات کی تحریر و ادارت کی اہلیت رکھتے ہوں اور راسخ العقیدہ مسلمان ہوں۔

2- مستند مسلم ماہرین تعلیم درسیات کے مسودے تیار کریں اور پہلے سے موجود درسی کتب پر تبصرہ و نظرثانی کا کام کریں۔

3- درسی کتب کے تجزیہ اور جانچ پرکھ کے لئے منتخب سکولوں میں باضابطہ تحقیق اور پائیلٹ سٹڈی کی جائے۔

4- درسی کتب کے منضبط سائنسی جائزہ کے بعد انہیں مدون کیا جائے اور پھر ملک کے تمام سکولوں میں رائج کیا جائے۔

5- درسی کتب لکھنے کے لئے درج ذیل اقدامات کو پیش نظر رکھا جائے:

(i) درسی کتب بچوں کی نفسیات کے مطابق اور ان کی اپنی قومی زبان میں لکھی جانی چاہئیں۔

(ii) انفرادی اسباق بنیادی طور پر کرداری مقاصد کی روشنی میں تیار ہونے چاہئیں' تاکہ وقوفی' احساسی اور عملی مقاصد کے حوالے سے جانچ پرکھ بہتر ہو سکے۔

(iii) مجموعی لحاظ سے درسی کتاب' اسلامی نصاب کے مقاصد کی آئینہ دار ہو۔

(iv) ایک سبق میں ایک یا ایک سے زیادہ تصورات شامل کئے جا سکتے ہیں مگر نظریات و تصورات کی بھرمار بھی نہیں ہونی چاہئے۔ ایک سبق کو ایک بنیادی تصور کا ہی حامل ہونا چاہئے۔ اصولی طور پر ایک کتاب مجموعی لحاظ سے بہت زیادہ اسباق پر محیط نہ ہو۔

(v) علمی مواد' تصورات اور موضاعات کو درسی کتاب میں سموتے وقت درج ذیل عناصر کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہئے:

(الف) بچوں میں قبولیت علم کی صلاحیت۔

(ب) بچوں کی بہتر تفہیم کیلئے درسی کتاب میں شامل مواد کی موزونیت۔

(ج) تعلیمی سال میں مضامین کی تدریس کیلئے وقت کی مناسب تقسیم۔

(vi) اسباق کی پیش کش میں الگ مواد [illegible]

مانوس ماحول سے لی گئی ہوں۔

(vii) درسی کتب میں تصورات کی تکمیل' ذخیرہ الفاظ اور زبان کے استعمال کے بارے میں درج ذیل اصول پیش نظر رہنے چاہئیں:

(الف) توحید میں یقین و اعتماد اور رسول اکرم ﷺ کی ذات سے عقیدت و احترام کے جذبات راسخ کئے جائیں۔

(ب) اسلامی تصور زندگی کے مطابق اخلاقی شعور پیدا ہو۔

(ج) قوت استدلال کی صلاحیت پروان چڑھے۔

طریق تدریس

عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنسوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ عملی تعلیم میں مرکزیت معلم کو حاصل ہے۔ لہذا اسلامی تناظر میں اس کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ خصوصیت سے طریقہ ہائے تدریس میں اسکی اتنی مہارت ہونی چاہئے کہ وہ اپنی موثر حکمت دعوت و تدریس سے ایسے طلبہ تیار کرے جو بہ یک وقت پختہ مسلمان بھی ہوں اور اپنے اپنے شعبہ میں ماہر بھی۔ بدقسمتی سے مسلم دنیا میں تربیت اساتذہ کے اداروں نے اپنے پروگراموں کو اس رخ پر ابھی تک نہیں ڈھالا جس سے اسلامی تعلیم کے مقاصد کا حصول ممکن ہو۔ چنانچہ وقت کی یہ اہم ضرورت ہے کہ مسلم ممالک اس کا کامل ادراک کریں اور اپنے اپنے ملکوں کے تعلیمی پروگراموں کی اسلامی نہج پر تشکیل نو کریں۔ خاص طور پر تربیت اساتذہ کے اداروں میں طریقہ ہائے تدریس سے متعلق کورسز میں اسلامی معیارات کو ضرور پیش نظر رکھیں۔ اس ضمن میں نصابات سے متعلق دوسری کانفرنس منعقدہ اسلام آباد اور طریقہ ہائے تدریس کے متعلق چوتھی کانفرنس منعقدہ جکارتہ نے متعدد تجاویز پیش کیں' جن میں سے چند کو ذیل میں اختصار سے پیش کیا جاتا ہے:

1- استاد کا ذہن جہاں مضمون سے متعلق معلومات کا خزانہ ہو' وہاں فکری اور عملی لحاظ سے ایک راسخ مسلمان بھی ہو یعنی وہ ایک اچھا مسلمان بھی ہو اور ماہر مضمون بھی۔

2- اسلامی تناظر میں حکمت تدریس کا یہ مطلب نہیں کہ استاد محض واعظانہ اسلوب اختیار کرلے' اس کے برعکس اسے حکمت و دانائی اور دلچسپ پیرائے میں اپنے لیکچرز تیار کرنے چاہئیں۔

3- معلم کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ وہ طلبہ کے لئے اس لحاظ سے نمونہ عمل ہو کہ وہ

4- موثر تدریس کا انحصار اس بات پر ہے کہ معلم' نفس مضمون' طریقہ تدریس اور اپنے شخصی اخلاق و کردار کے حوالے سے اعلیٰ معیار پر ہو۔ اس مقصد کے لئے معلم کو درج ذیل چند نکات پیش نظر رکھنا چاہئیں:

- انسانی نفسیات کا شعور اور داعیانہ صفات
- مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق و شوق
- اشارات و تمثیلات پر عبور اور لطیف ذوق مزاح
- جائز تفریحات اور علمی و ادبی مشاغل میں شرکت
- اخلاقی علو کے ساتھ ساتھ ظاہری وضع قطع میں نفاست
- طلبہ اور معاشرہ کے افراد سے مخصی تعلق
- قائدانہ کردار کے حوالے سے فکری و عملی تربیت
- تعلیمی ماحصل (Product) پر نظر

5- ہر مضمون کی تدریس میں بنیادی فکر قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ سے ہی لی جائے۔ اسلوب تدریس نظری سے زیادہ عملی ہو۔

6- ہر مضمون سے متعلق قرآن و حدیث سے موزوں مواد منتخب کیا جائے تاکہ دوران تدریس استاد موقع و محل کی مناسبت سے اس سے مدد لے۔

7- ہر مضمون کی موثر تدریس کے لئے ضروری ہے کہ رہنمائے اساتذہ تیار کی جائیں۔ ان میں ہر اہم موضوع یا سبق کے بارے میں بتایا جائے کہ یہ سبق اسلامی تناظر میں کیسے پڑھایا جائے۔

8- قرآن حکیم کی حکمت ابلاغ اور رسول اکرم ﷺ کی معلمانہ حکمت عملی کو تربیت اساتذہ کے نصابات میں شامل کیا جائے۔ موثر تدریس کیلئے یہ سرچشمہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

9- ہر مضمون کی تدریس میں زندگی کے جامع تصور کو پیش نظر رکھا جائے کیونکہ ایک متوازن اور ہمہ گیر تعلیمی نظام وہی ہے جو فرد کی جسمانی' ذہنی اور روحانی ضرورتوں کو ایک وحدت سمجھتے ہوئے تشکیل دیا جائے۔ عمل تدریس کو جتنا حقیقی دنیا (Real World) سے مربوط کیا جائے گا' اتنا ہی تعلم (Learning) میں دلچسپی کا عنصر بڑھے گا۔

10- مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں حکمت تدریس کے ضمن میں اہمیت ہمیشہ استاد کی علمی فضیلت' اس کے کردار اور اس کے مجموعی تشخص کو ہی رہی ہے۔ محض کسی [illegible] کا "فن کارانہ" استعمال مطلوب نہیں تھا' بلکہ [illegible] بہرحال مضمون و موضوع کے مناسبت [illegible]

کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اچھی بات کو اچھے انداز سے پیش کیا جائے۔ اس حوالے سے ہمارے قدیم اسلامی مدارس میں عام طور پر درج ذیل طریقہ ہائے تدریس رائج تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ سے یہ واضح ہے کہ یہ طریقے موثر تعلیم و تعلم کے لئے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔

- قصص (Story Method)
- منصوبی طریقہ (Project Method)
- استنباطیہ (Deductive Method)
- استقرائیہ (Inductive Method)
- محاضرہ (Lecture Method)
- حوار و مناقشہ (Discussion Method)
- محادثہ (Narration Method)
- استماع (Listening With Care)
- قراۃ و اطلاع (Reading and Communication)
- تعبیریہ (Analysis and Interpretation)
- زیارہ و رحلات (Study Field Trips)

ابتدائی سطح پر تعلیمی نصب العین' نصاب تعلیم' درسی کتاب اور طریق تدریس سے متعلق چند اہم سفارشات اس مضمون میں زیر بحث آئی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی تعلیم سے متعلق عالمی کانفرنسوں منعقدہ مکہ مکرمہ' اسلام آباد' ڈھاکہ اور جکارتہ کی تمام سفارشات کو تعلیمی حلقوں میں متعارف کرایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کانفرنسوں میں پیش کئے گئے گراں قدر مقالات جو عربی اور انگریزی زبانوں میں ہیں انہیں اردو زبان میں ڈھالا جائے۔ اس طرح ہمارے اساتذہ اور ماہرین تعلیم' ان کانفرنسوں کی کارکردگی سے بھی واقف ہو سکیں گے اور دوسری طرف یہ کام پاکستان میں اسلامی نظام تعلیم کی تفہیم' تشکیل' تنفیذ اور تکمیل میں بھی مددگار ثابت ہوگا۔

(شش ماہی مجلہ ابتدائی تعلیم لاہور' شمارہ 10 ستمبر1985ء)

فکری مباحث: چند سوالات

ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور کی ایم ایڈ ثانوی سپیشل کلاس سیشن 86-1984 کے خصوصی مجلہ "علم و آگہی" کی ایڈیٹر محترمہ نسیم اختر صاحبہ کی طرف سے انٹرویو کی صورت میں کئے گئے سوالات کے جوابات۔

سوال: عصر حاضر میں مادہ، جذبے سے برتر ہے؟

جواب: حقیقت میں مادہ و روح یا دین و دنیا کی تقسیم کا نظریہ صحیح نہیں ہے۔ مادیت کوئی قابل نفرت چیز نہیں بلکہ خلافت ارضی اور قیادت عالم کے فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مادی اور عسکری علم کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مادی یا طبعی علوم لازماً" ہدایت الٰہی کے تابع ہوں۔ مادی کائنات میں تصرف کا اصل مقصد تو اخروی فوز و فلاح کا حصول ہے۔ چنانچہ مادی آسائشوں کے لئے تمام مساعی کو اس اخلاقی قانون کے تابع ہونا چاہئے، جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے متعین کیے ہیں۔ جہاں تک "عصر حاضر میں مادہ، جذبے سے برتر ہے" کا سوال ہے تو بلاشبہ ترقی پسند فلسفہ، مادی افادیت ہی کو اصل اہمیت دیتا ہے۔ لیکن جامعیت اور کلیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو پوری دنیا میں اس مادی فکر کے مضر نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ حقیقت میں جذبہ اور مزاج ایک نقطہ نظر کا نام ہے اور صحیح نقطہ نظر وہی ہوگا جس کا سرچشمہ انسانی فکر یا ذاتی پسند و ناپسند نہیں بلکہ جس کی اساس اللہ تعالٰی کی آخری کتاب قرآن حکیم اور اللہ کے آخری نبی ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے۔ بقول اقبال "از کلید دیں در دنیا کشاد"۔ ان معنوں میں "جذبہ" یقیناً برتر ہوگا۔ محض شکم پروری تو کوئی چیز نہیں۔۔۔۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اساتذہ اور طلبہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اس فکری لادینیت اور ادبی تخریب کاری کی بیخ کنی کریں، جس نے ہمیں موجودہ نظام تعلیم کی وساطت سے فکری انتشار، تشکیک، علمی فریب اور دین و دنیا کی ثنویت کا درس دیا ہے۔ ہم مادی اور سائنسی تعلیم کے خلاف نہیں بلکہ اسے ہمہ گیر ترقی کے لیے ایک اہم عامل تصور کرتے ہیں۔ لیکن نظام تعلیم کی جامع اسلامی تعمیر نو کے لئے اس اساسی اصول کو ضروری سمجھتے ہیں [illegible] سے غافل کر دیا جائے تو تعلیم رحمت نہیں زحمت بن جاتی

ہے۔

سوال : "پرانی روشنی" اور "نئی روشنی" میں فرق اتنا ہے...... "کسے کشتی نہیں ملتی کسے ساحل نہیں ملتا۔"

جواب : قدیم و جدید کی تقسیم سے متعلق بھی دو نقطہ ہائے نظر ہیں۔ایک مادی نقطہ نظر اور دوسرے اخلاقی نقطہ نظر۔ مادی تناظر میں تاریخ کا مطالعہ اور نتائج لائے گا۔ اور اخلاقی تناظر میں نتائج اور ہوں گے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ چاہے "پرانی روشنی" ہو یا "نئی روشنی"...... ان دونوں میں روشنی کے تعین کا مستقل معیار اخلاق اعلیٰ قدریں ہوتی ہیں جن کا سرچشمہ اسلام ہے۔ یہی دائمی معیار ہے جو ناقابل تغیر ہے۔ اگر اس معیار کو پیش نظر رکھیں گے تو ابہام دور ہو گا۔ اصل میں ہر دور میں چاہے پرانا ہو یا نیا' خدا کی رضا ہی وہ کسوٹی ہے جس پر کسی طرز عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ واقعی وہ نور ہے یا ظلمات۔

سوال : ماضی پر نظر ڈالنا بیکار ہے؟

جواب : تعلیم کا ایک اہم کردار یا وظیفہ (Role) مستقل روایات اور اقدار کی حفاظت اور پاسداری ہے۔ البتہ تعلیم کے تنقیدی اور تخلیقی کردار سے پہلو تہی بھی نہیں کرنا چاہئے۔ اصل میں ماضی سے بے تعلقی اور اسے بیکار تصور کرنے کا نعرہ (Slogan) بھی مغرب کے بے خدا فلسفہ کا ہی دیا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس قوم کے لئے کوئی معنی رکھتا ہو' جس کا کوئی قابل قدر ماضی نہ ہو اور جو صرف مستقبل کی مادی ضرورتوں کو ہی اہمیت دیتی ہو۔ لیکن جس قوم کی ایک درخشاں تاریخ ہو' جسکا اپنا ایک قیمتی تاریخی و ثقافتی ورثہ ہو اور بحیثیت مجموعی جس کا اپنا ایک پاکیزہ نظام حیات ہو' وہ ماضی سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم "میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو"...... عروج و زوال کے معیار کو سمجھنے کے لیے ماضی کا مطالعہ ضروری ہے۔ پھر اس مطالعہ کی روشنی میں اجتہادی فکر کے ساتھ حال و مستقبل کے لیے تعلیم کی اسلامی تشکیل وقت کا اہم تقاضا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ الٰہی نقطہ نظر ماضی' حال' مستقبل یعنی سب زمانوں پر محیط ہے۔ لہٰذا یہ اہم نکتہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ ہزاروں سال پہلے دی گئی دعوت بھی اسی طرح حال اور مستقبل کے لیے کارگر ہے جس طرح پہلے تھی اور آئندہ بھی ہوگی۔ الٰہی نقطہ نظر کو چھوڑ کر دور جدید کی دانشوری سوائے درماندگی فکر اور نظر کی رسوائی کے اور کچھ نہیں۔ ماضی کی مستقل اور دوامی قدروں کو [illegible] کار [illegible] (Pragmatism) [illegible] (Progressivism) [illegible]

[illegible]

مستقبل۔

سوال: معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کے لئے کسی الہ دین کے چراغ کی ضرورت ہے؟

جواب: الہ دین کے چراغ کی اصطلاح تو افسانوی ہے۔ حقیقی دنیا میں اگر آپ تاریخ' نظریات' فلسفوں اور مروجہ مذاہب کا معروضی مطالعہ کریں تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ معاشی ناہمواریوں کا جامع اور کلی حل صرف اسلام پیش کرتا ہے۔ اسلام اپنی حکمت معیشت میں اجتناب حرام اور طلب حلال کو بنیادی نظریہ قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں سود کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ پر مبنی معاشی نظام دینوی زندگی کا بھی کفیل ہے اور اخروی زندگی کا بھی۔ معاشی ناہمواریاں ہوں یا معاشرتی۔ ان کا حل کسی الہامی فکر کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا اور یقیناً یہ جامع فکر دین اسلام کے علاوہ کسی کے پاس نہیں۔ اسلام اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے کہ اخلاق و مذہب کا معاش سے کوئی تعلق نہیں۔ دور جدید کے معاشی مسائل کا حل' سرمایہ داری' اشتراکیت' خدا ناشناس اور سیکولر نظام کے پاس نہیں بلکہ صرف اسلام کے پاس ہے جو ایک مکمل نظام زندگی ہے اور جو معیار زندگی کو بلاشبہ اہمیت دیتا ہے لیکن اس سے بھی بڑھ کر معیار انسانیت کو اہم مقام دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اخلاقی علو کے بغیر معاشی ترقی کا نظریہ صحیح نہیں۔

سوال: تفریح' براہ راست یا بالواسطہ برائی کی ذمہ دار ہے؟

جواب: اصل میں پہلے آپ کو مقصد کا تعین کرنا ہوگا کہ تفریح کس لیے؟ جیسا مقصد ہوگا' ویسے ہی تفریح کا انداز اور اسلوب ہوگا۔ مجرد تعلیم برائے تعلیم یا ادب برائے ادب' یا تفریح برائے تفریح کا نظریہ صحیح نہیں۔ بلکہ بقول سید قطب شہید (اخوان المسلمون مصر کے معروف قائد) تعلیم برائے تعمیل کا نظریہ زیادہ قابل قبول ہے۔ اسی طرح جو ادب پاکیزہ احساسات اور حیا دارانہ جذبات کا ترجمان نہیں ہے' وہ ادب جائز ادب نہیں ہو سکتا۔ یہی صورت عام کھیل کود اور سیر تفریح کی ہے۔ ہم جائز تفریح کے قائل ہیں۔ مخلوط مجالس اور لبرل رویوں سے گریز کرتے ہوئے حیا دارانہ ماحول اور ساتر لباس میں تفریح انسانی زندگی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن تعلیم و ادب ہو یا سیر و تفریح' زندگی کا اصل مقصد تو بہر حال دعوت دین اور اطاعت رب ہی ہے۔

سوال: "اعلیٰ تعلیم" ہر شخص کے لیے ضروری ہے؟

جواب: ہر شخص پر چاہے وہ مرد ہو یا عورت' جس علم کا حصول فرض اور ضروری قرار دیا گیا [illegible]

[illegible] لے ہی علیم و خبیر اور وحدہ لاشریک

مانتا ہے۔

○ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے' کوئی کام اس کی مرضی کے منافی نہیں کرتا اور اللہ کی رضا کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرتا ہے۔
○ حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبیین اور پوری انسانیت کا قائد تسلیم کرتا ہے۔
○ علم کا اصل سرچشمہ وحی الٰہی کو مانتا ہے اور اس کی صورت قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کو گردانتا ہے۔
○ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام امور میں حرام سے اجتناب کرتا ہے اور حلال کا طالب رہتا ہے۔
○ حق و باطل اور خیر و شر کی اس تقسیم کا قائل ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے کی ہے۔
○ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اس نے یہ کائنات بامقصد بنائی۔
○ انسان خلیفتہ اللہ ہے اور اس کا مقصد بندگی رب ہے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اسے سونپا گیا ہے۔
○ اقامت دین کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کو ضروری خیال کرتا ہے۔
○ آخرت کے اسلامی تصور' حیات بعد الموت پر یقین رکھتا ہے۔
○ خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کے سامنے سر جھکا کر اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ ایک روحانی مقصد کو مان کر خواہشات نفسانی کی آزادی سے دستبردار ہوچکا ہے۔

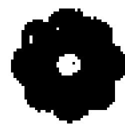
----ایسا شخص ہی حقیقت میں "اعلیٰ تعلیم" کا حامل ہے۔ اور اسلامی اصطلاح میں یہی "العلم" ہے۔ چاہے وہ شخص مروجہ مضمون میں کسی ڈگری کا حامل نہ بھی ہو بلکہ اس کے برعکس اگر کوئی شخص اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگری بھی رکھتا ہو' لیکن درج بالا خصوصیات نہ رکھتا ہو' وہ درحقیقت جاہل ہے۔ البتہ انسانی اور اکتسابی علوم مثلاً" سائنس اور ٹیکنالوجی میں تعلیم و تحقیق اور دوسرے علوم میں اعلیٰ تربیت کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ہر چند کہ ضروری نہیں کہ تمام لوگ لازما" اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ طلبہ کے طبائع اور رجحانات کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اور قومی و ملی ضرورتوں کو بھی۔ بہر حال ایک اسلامی ریاست کے لئے ضروری ہے کہ حصول علم کے یکساں مواقع' مفت تعلیم' غیر طبقاتی اور یکساں نظام تعلیم کی سہولیات میسر ہوں [illegible] لئے ایک اعلیٰ قوم تیار ہو [illegible]

بھی یک نگاہ ہو۔

سوال: ہماری ثقافت کی اصل کیا ہے؟

جواب: ہماری ثقافت کی اصل کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں کیا جاسکتا جب تک اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی مثلاً" خدا' کائنات' انسان' علم' اقدار اور عقائد کا جامع اور کلی اسلامی تصور موجود نہ ہو۔ اس حوالے سے ہماری ثقافت' ہدایت الٰہی پر مبنی ہے' جس کا مرکزی نکتہ عقیدہ توحید ہے۔ اس تناظر میں ثقافت کی تعریف اور اس کے لوازمات کے تعین میں بنیادی قدر رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اسی اساسی قدر کی روشنی میں حسن فکر اور حسن عمل کا نظام بنتا ہے اور اسی پر مبنی حیات طیبہ ہماری ثقافت کی پہچان ہے۔ حقیقت میں اپنے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں ثقافت صرف اسلام نے پیش کی ہے۔ اس میں مادی اور روحانی دونوں پہلو آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک متوازن اور ہمہ جہت (Multi-dimensional) ثقافت ہے' جس کے لوازمات وہی ہیں جو قرآن و سنت نے طے کر دیے ہیں۔ چنانچہ اس ماخذ سے منحرف ثقافت ہماری ثقافت نہیں ہے۔ خلاصہ کے طور پر ہماری ثقافت درحقیقت وہ طریق زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے مطابق ترتیب دیا گیا ہو۔۔۔۔۔ اور جو اس اہم نکتہ کی داعی ہو کہ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور آخرت کی زندگی ابدی ہے۔ جہاں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ حقیقت میں اسلامی اخلاقیات جو ہماری ثقافت کی جان ہے' اس کی تشکیل کی پشت پر اصل قوت نافذہ' خوف خدا اور آخرت میں جواب دہی کا احساس ہے۔۔۔۔ ہماری ثقافت کی اصل کی مکمل تفہیم کے لئے عالم اسلام کے عظیم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی گراں قدر کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" اور ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی معروف کتاب "اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو" کا مطالعہ طلبہ و اساتذہ کے لئے انتہائی اہم ہے۔

(ایم ایڈ ثانوی سپیشل پروگرام کا خصوصی مجلہ علم و آگہی' آئی ای آر' پنجاب یونیورسٹی' لاہور 1986 ---- ماہنامہ تعلیمات لاہور' انجمن فاضلین' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور' ستمبر 1986ء)



کتابیات

زیر نظر کتاب میں شامل مقالات قومی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات میں حوالہ جات کا اسلوب یہ تھا کہ ہر مقالہ کے آخر میں متعلقہ ریفرنسز کی ایک فہرست دی گئی تھی۔۔۔۔ موجودہ کتابی صورت میں یہ تبدیلی کی گئی کہ ان تمام حوالہ جات کو یکجا کر کے ایک ہی فہرست میں مرتب کر دیا گیا۔ ان میں اکثر حوالے تو وہ ہیں جو مقالات میں کسی نہ کسی طور زیر بحث آئے ہیں، البتہ بعض ایسے ہیں جن کو شامل کرنے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مزید مطالعہ و تحقیق میں مددگار ثابت ہوں۔

ابوالحسن ندوی، سید، مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۸۱ء۔

۔۔۔۔، نقوش اقبال، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۷۳ء۔

احمد سجاد، ڈاکٹر، تعمیری ادبی تحریکیں: افکار و مسائل، قاضی پبلشرز و ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء۔

۔۔۔۔، اسلام کا روشن مستقبل، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۰ء۔

احمد شلبی، ڈاکٹر، تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ (مترجم: محمد حسین خان زبیری)، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

ادارہ بتول، صادقہ، (مجموعہ احادیث)، ادارہ بتول، اچھرہ، لاہور، ۱۹۶۸ء۔

ادارہ مطبوعات طلبہ، تعلیم کی تشکیل نو، کراچی، ۱۹۶۶ء۔

اسماعیل الراجی الفاروقی، ڈاکٹر، علوم جدید کی اسلامی تشکیل (مترجم: پروفیسر سید محمد سلیم)، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

اسماعیل سنبھلی، پروفیسر، "اسلامی تعلیمات اور تربیت اساتذہ"، اخلاقیات نبوی ﷺ (مرتبہ حکیم محمد سعید)، ہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۸۳ء۔

[illegible] القرآن فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

----' فلسفے کے بنیادی مسائل' (قرآن حکیم کی روشنی میں) فاران فاؤنڈیشن لاہور' ۱۹۹۱ء۔

اصلاحی' محمد یوسف' قرآنی تعلیمات' (حصہ اول' دوم) مکتبہ الحسنات' لاہور' ۱۹۹۶ء۔

افضل حسین' فن تعلیم و تربیت' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۸۳ء

انجمن فاضلین' تربیت اساتذہ' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور' ۱۹۷۰ء۔

----' ماہنامہ تعلیمات (سید مودودی اور تعلیم) خصوصی اشاعت' ادارہ تعلیم و تحقیق' لاہور' جلد ۴' شمارہ ۴-۵' ستمبر اکتوبر ۱۹۸۱ء۔

----' ماہنامہ تعلیمات (اقبال اور تعلیم)' خصوصی اشاعت' ادارہ تعلیم و تحقیق' لاہور' جلد ۱۲' شمارہ ۹-۷' جولائی- ستمبر ۱۹۸۹ء۔

ایم۔اے۔ عزیز' ڈاکٹر' تعلیم اور معاشرتی تبدیلی' کاروان ادب' ملتان صدر' ۱۹۸۲ء۔

پاکستان ماڈل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنز فاؤنڈیشن' جدید نصاب تعلیم (پہلی تا بارہوں جماعت) نکلسن روڈ' لاہور' ۱۹۹۲ء۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ' نظریہ پاکستان اور نصابی کتب' پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ' لاہور' ۱۹۷۱ء۔

پنجاب یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین' مجلہ محور (تعلیم نمبر)' مرتبہ پروفیسر سلیم منصور خالد' پنجاب یونیورسٹی' لاہور' ۱۹۷۷ء۔

ترمذی' شمیم حیدر' ڈاکٹر' اسلام کا نظام تعلیم' کاروان ادب' لاہور' ۱۹۹۳ء۔

جامعہ ام القراء' توصیات' (چار عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنسوں کی سفارشات) المرکز العالمی للتعلیم الاسلامی' سعودی عرب' مکتہ المکرمہ' ۱۹۸۳ء۔

جلیل احسن ندوی' راہ عمل (انتخاب حدیث) اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۷۸ء۔

حافظ محمد سلیمان' "ہمارے تربیتی اداروں کا کردار" مجلہ تعلیم و تحقیق' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور' ۱۹۶۷ء۔

حامدی' خلیل احمد (مترجم) اذکار مسنونہ' (تالیف: امام ابن تیمیہ [illegible]) اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۶۷ء۔

حکومت پاکستان، رپورٹ کمیٹی برائے نصاب، وزارت تعلیم، راولپنڈی، ۱۹۶۰ء۔
حمود الرحمٰن، "تعلیم کیوں؟" مجلہ تعلیم کا مسئلہ، ادارہ مطبوعات جمعیت، کراچی، ۱۹۶۵ء۔
حیدر زمان صدیقی، تعمیری انقلاب اور قرآنی اصول حکمت، البدر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۶ء۔
خالد علوی، ڈاکٹر، "عالم بحیثیت دوست، استاد اور رہنما" ماہنامہ تعلیمات لاہور، جلد ۱۱، شمارہ ۳، مارچ ۱۹۸۹ء۔
۔۔۔، انسان کامل، یونیورسٹی بک ایجنسی، لاہور، ۱۹۷۹ء
خرم مراد، احیائے اسلام اور معلم، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۸۵ء۔
۔۔۔، سیکولر معاشرہ میں مسلمانوں کی تعلیمی حکمت عملی، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۸۸ء۔
۔۔۔، "اشارات" ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، اکتوبر ۱۹۹۱ء۔
۔۔۔، (مرتب) دینی مدارس کا نظام تعلیم، ترجمان ری پرنٹس سروس، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، جولائی ۱۹۹۵ء۔
۔۔۔، مسائل و افکار (مرتب سلیم منصور خالد) البدر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء۔
خورشید احمد پروفیسر، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۱۹۸۲ء۔
۔۔۔، نظام تعلیم: نظریہ، روایت، مسائل، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔
۔۔۔، "اشارات" ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور، اکتوبر ۱۹۹۴ء۔
۔۔۔، "ابتدائیہ" تعلیم: اسلامی تناظر میں، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، جنوری۔ جون ۱۹۸۵ء۔
رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر، "اقبال اور تعلیم کی تشکیل جدید" ماہنامہ تعلیمات لاہور، جلد ۱۲، شمارہ ۹۔۷، جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۹ء۔

رفیع الدین ہاشمی' ڈاکٹر' (مرتبہ) خطوط اقبال مکتبہ خیابان ادب' لاہور ۱۹۷۶ء۔

روزنامہ جسارت کراچی (اشاعت خصوصی: نظام تعلیم)' ۱۷ جنوری ۱۹۸۴ء۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور۔

- انٹرنیشنل ڈیسک میڈیا رپورٹ ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء' ص ۵۔
- ادارتی نوٹ: ٹی وی پروگرام۔ منزل ہے کہاں تیری' ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء۔
- ادارتی نوٹ: امت مسلمہ' جرم ضعیفی کی سزا' ۲۔ نومبر ۱۹۹۱ء۔
- نیو ورلڈ آرڈر کے اصل اہداف از پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر خان' ۲۔ نومبر ۱۹۹۱ء۔
- "کویت نے پاکستانیوں کے ہاتھ میں جھاڑو پکڑا دیئے" صفحہ اول کی خبر' ۹ نومبر ۱۹۹۱ء۔
- "امریکہ اور یورپ کے مقابلے میں تیسری قوت مسلمانوں کی ہے" از حافظ محمد ادریس ۹ نومبر ۱۹۹۱ء۔
- ادارتی نوٹ: سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی ضرورت' ۱۲۔ نومبر ۱۹۹۱ء۔
- جمعہ میگزین: شہزادہ عالم منوں سے انٹرویو' ۲۲ نومبر ۱۹۹۱ء' ص ۳۔
- اسلامک ورلڈ آرڈر! کیوں اور کیسے؟ از پروفیسر محمد یعقوب شاہق' ۲۳۔ دسمبر ۱۹۹۱ء۔

سعادت فاطمہ' عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنسوں کی سفارشات کی روشنی میں پاکستان کی قومی تعلیمی پالیسی کا جائزہ' غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے تعلیم' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور' اکتوبر ۱۹۸۵ء۔

سعید اختر' پروفیسر' ہمارا نظام تعلیم اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور' ۱۹۷۹ء۔

سلیم احمد' مشرق' ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ' کراچی' ۱۹۸۹ء

سلیم تابانی "حضرت سید ابوالحسن علی ہجویری داتا گنج بخش ﷺ" روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۹ فروری ۱۹۷۶ء۔

سلیم فارانی' ڈاکٹر' اردو زبان اور اس کی تعلیم' ادارہ مطبوعات' لاہور' ۱۹۹۲ء

سید ابوبکر غزنوی' "عصر حاضر میں استاد اور شاگرد کا رشتہ" ماہنامہ شمس الاسلام' بھیرہ' جلد ۲۶' شمارہ ۴-۵' اپریل مئی ۱۹۸۸ء۔

سید اسعد گیلانی' اختر حجازی (مرتبین)' اسلامی نظریہ ادب' ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۸ء۔

سید شبیر بخاری' الاختصار البیان فی مانی القرآن مخدوم جہانیاں اکیڈمی' لاہور' ۱۹۹۶ء۔

سید عبداللہ' "نصابات میں نظریہ پاکستان کس طرح سمویا جائے؟" نظریہ پاکستان اور نصابی کتب' پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور' ۱۹۷۱ء۔

----' تعلیمی خطبات' (مرتبہ ممتاز منگلوری) مجلس ارادت مندان سید' لاہور' ۱۹۶۶ء۔

سید قطب' اسلام میں عدل اجتماعی (مترجم: محمد نجات اللہ صدیقی) اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۷۱ء۔

----' نقوش راہ (مترجم: عنایت اللہ سجانی)' البدر پبلی کیشنز' لاہور ۱۹۸۱ء۔

----' اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل (مترجم: ساجد الرحمان صدیقی) ادارہ معارف اسلامی' کراچی' ۱۹۷۳ء۔

----' جادہ و منزل (مترجم: خلیل احمد حامدی)' اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۶۸ء۔

سید محمد سلیم' پروفیسر' مسلمان مثالی اساتذہ اور مثالی طلبہ' ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور' ۱۹۸۳ء۔

----' اسلام کا نظام تعلیم ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور' ۱۹۹۳ء۔

----' مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور ۱۹۸۱ء۔

----' ہند و پاکستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۰ء۔

----' مسلمان اور مغربی تعلیم (پاک وہند میں) ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور' ۱۹۸۵ء۔

----' تعلیمی انحطاط کے اسباب ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور' ۱۹۸۶ء۔

----' ہمارا نظام تعلیم' تاثرات و تجاویز' ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور ۱۹۸۷ء۔

---، اسلامی تعلیم: بنیادی افکار و تصورات، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۸۹ء۔

---، عہد اسلامی کے عظیم مدارس، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

شاہ ولی اللہ، رسالہ دانش مندی (طریق تدریس) مترجم: مولانا ظہیرالدین احمد، مقدمہ و تعلیقات: پروفیسر سید محمد سلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

شاہق محمد یعقوب، پروفیسر، موجودہ تحریک آزادی کشمیر میں اساتذہ کا کردار، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۰ء۔

شبیر احمد منصوری، "اسلامی تناظر میں فطرت انسانی کی توجیہہ" ماہنامہ تعلیمات لاہور، جلد ۱۳، ۱۹۹۰ء۔

شوکت علی صدیقی، ڈاکٹر (مدیر) تعلیم و تربیت اساتذہ، مکتبہ اشاعت ادب، انارکلی لاہور ۱۹۷۰ء۔

صدیقی بختیار حسین، مسلمانوں کی تعلیمی فکر کا ارتقاء، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

---، برصغیر پاک و ہند میں قدیم عربی مدارس کا نظام تعلیم ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

صدیقی عبدالحمید، پروفیسر، نظام تعلیم کا اساسی تخیل، احباب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۱ء۔

---، میکالے کا نظریہ تعلیم، زوبیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۵ء۔

صفدر علی، چوہدری، "تعلیم کا اسلامی مفہوم" ماہنامہ تعلیمات لاہور، جلد ۱۰، شمارہ ۷، اگست ۱۹۸۷ء

صقر، عبدالبدیع، ہم دعوت کا کام کیسے کریں؟ (مترجم جاوید احسن فلاحی) ادارہ مطبوعات طلبہ، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

عباسی مدنی، ڈاکٹر، جدید نظریات کی شکست اور اسلامی نظام (مترجم: خلیل احمد الحامدی) ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

عبدالحسیب احسن، پروفیسر، "مسلمان اساتذہ کے اوصاف" ماہنامہ تعلیمات لاہور، جلد ۱۴، شمارہ ۲، جون ۱۹۹۱ء۔

عبدالرشید ارشد، ڈاکٹر، گم گشتہ منزل کا سراغ (تعلیم کا ایک اسلامی تصور) ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۵ء۔

۔۔۔۔، تعلیمی پالیسیاں اور اصلاح کی تجاویز، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

عبدالعزیز مغل، سید مودودی کا معلم مطلوب، پنجاب بک سنٹر، لاہور ۱۹۸۹ء۔

عبدالغنی فاروق، ڈاکٹر، مغرب پر اقبال کی تنقید، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

عبدالقیوم، ڈاکٹر، قرون وسطی کا اسلامی نظام تعلیم، بساط ادب، لاہور، ۱۹۵۲ء۔

عبدالمغنی، ڈاکٹر، اقبال کا نظریہ خودی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء۔

۔۔۔۔، اقبال اور عالمی ادب، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

عرفان صدیقی "تعلیم کی نظریاتی اساس اور مسلم مفکرین" مجلہ سرسیدین (تعلیم نمبر)، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، راولپنڈی، ۱۹۸۰ء۔

عقیل معین الدین، ڈاکٹر، تحریک پاکستان کا تعلیمی پس منظر، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

علی طنطاوی، شیخ، اسلام، (مترجم: سید شبیر احمد)، قرآن آسان تحریک، ایجوکیشن ٹاؤن، لاہور، ۱۹۹۲ء۔

علی عزت بیگووچ، اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش، (مترجم: محمد ایوب منیر)، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

عنایت الرحمان صدیقی، بریگیڈیر (ریٹائرڈ) "مثالی استاد" مجلہ تعلیم و تحقیق ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۸ء

عمیزہ صدیقی، امجد اسلام امجد کی ڈرامہ نگاری "وارث" کے حوالے سے، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اردو، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔

غلام السیدین خواجہ، "ہماری دانش گاہیں اور ان کی عمرانی ذمہ داریاں" (مترجم: شریف حجازی) مجلہ تعلیم و تحقیق آئی ای آر، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

غلام عابد خان، عہد نبوی ﷺ کا نظام تعلیم عوامی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۸ء۔

۔۔۔۔، "پیغمبر تعلیم صلی اللہ علیہ وسلم" ماہنامہ سلسبیل لاہور، ادارہ تصوف لاہور، ۱۹۸۱ء۔

فضل محمد [illegible] ڈاکٹر، ثانوی مدارس کا نظم و نسق مکتبہ کاروان، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

فیروز سنز لمیٹڈ "اردو انسائیکلو پیڈیا" لاہور ' ۱۹۶۶ء۔

فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج ' مجلہ سرسیدین ' (تعلیم نمبر) ' سرسید کالج ' راولپنڈی ' ۱۹۸۰ء۔

قریشی ' محمد شریف ' ثانوی مدارس میں نظریہ پاکستان کی ترویج ' انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز ' اسلام آباد ' ۱۹۸۵ء۔

---- " باوقار معلم باوقار قوم " مجلہ معلم لاہور ' تنظیم اساتذہ پاکستان ' مارچ ۱۹۸۹ء۔

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور ' " ہمارے گرد منڈلاتے خطرات " جلد ۳۱ ' شمارہ ۱۲ ' دسمبر ۱۹۹۱ء۔

مجیب الرحمان قاضی ' " اسلامی تعلیم و تربیت کی خصوصیات " مقالات مذاکرہ ملی : اخلاقیات نبوی ﷺ ' (مرتبہ حکیم محمد سعید) ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی ' ۱۹۸۲ء۔

محمد ابراہیم خالد ' ڈاکٹر (مدیر) تربیت اساتذہ ' پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن ' اسلام آباد ' ۱۹۹۷ء۔

محمد احمد خان ' اقبال اور مسئلہ تعلیم ' اقبال اکادمی پاکستان ' لاہور ' ۱۹۷۸ء۔

محمد ادریس کاندھلوی ' مسئلہ تعلیم مکتبہ عثمانیہ ' جامعہ اشرفیہ ' لاہور۔

محمد افضل رفیق ' گفتار اقبال ' جامعہ پنجاب ' لاہور ' ۱۹۷۷ء۔

محمد اقبال ' ڈاکٹر ' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (مترجم: سید نذیر نیازی) ' بزم اقبال ' کلب روڈ لاہور ' ۱۹۵۸ء۔

---- ' کلیات اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز ' لاہور ' ۱۹۷۳ء۔

---- ' کلیات اقبال (اردو) ' اقبال اکادمی پاکستان ' لاہور ' ۱۹۹۰ء۔

محمد بشیر جمعہ ' آج کا داعی ' کل کا قائد ' ترجمان ری پرنٹس سروس ' ماہنامہ ترجمان القرآن ' لاہور ' جون۔ جولائی ۱۹۹۵ء۔

محمد رفیع الدین ' ڈاکٹر ' اسلام کا نظریہ تعلیم ' ادارہ ثقافت اسلامیہ ' لاہور ' ۱۹۵۰ء۔

محمد سعید ' حکیم ' " محمد رسول اللہ ﷺ بحیثیت ہادی و معلم " ماہنامہ [illegible] ادارہ تصوف ' لاہور ' اکتوبر ' نومبر ' ۱۹۸۱ء۔

----'درون روس: دید شنید' ہمدرد فاؤنڈیشن پریس' کراچی' ۱۹۹۱ء

----'دانائے سبل ہمدرد فاؤنڈیشن پریس' کراچی' ۱۹۹۱ء

محمد صلاح الدین "حضور اکرم ﷺ کا عطا کردہ نظام تعلیم و تربیت" اخلاقیات نبوی ﷺ' ہمدرد فاؤنڈیشن پریس' کراچی' ۱۹۸۲ء۔

----' "نظام تعلیم کو اسلامی بنانے سے کیا مراد ہے؟" ہفت روزہ تکبیر' کراچی' ادارہ مطبوعات تکبیر' ۵ ستمبر ۱۹۹۱ء۔

محمد عبدالعزیز' ڈاکٹر "اسلامی نظام تعلیم کیا ہے؟" سہ ماہی علم کی دستک' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد' جلد ۳' شمارہ ۲ جون ۱۹۸۳ء۔

محمد فاروق' ڈاکٹر' پاکستان اکیسویں صدی کی جانب ادارہ مطبوعات تکبیر' کراچی' ۱۹۹۱ء۔

محمد قطب' انسانی زندگی میں جمود و ارتقاء (مترجم: ساجد الرحمان صدیقی) البدر پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۸۲ء۔

----'اسلام کا نظام تربیت (مترجم: ساجد الرحمان صدیقی) اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۰ء۔

محمد مسعود' ڈاکٹر' "آنحضرت ﷺ بحیثیت معلم و محرک علم" مقالات سیرت' ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد' ۱۹۸۲ء۔

محمد منور مرزا' پروفیسر' ایقان اقبال (باب: علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت)' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۸۳ء۔

محمد وصی اللہ خان' ڈاکٹر' "معلم کا مقام" مجلہ تعلیم و تحقیق لاہور' ۱۹۶۷ء۔

----' (مدیر)' تربیت اساتذہ (سالنامہ) انجمن فاضلین' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب لاہور' ۱۹۷۰ء۔

مختار حسن' "حال واحوال" ماہنامہ بنیادی حقوق لاہور' جلد ۲' شمارہ ۸' دسمبر ۱۹۹۱ء۔

مسلم سجاد' پروفیسر' پاکستان میں نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمت عملی انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' اسلام آباد' ۱۹۸۲ء۔

----، تعلیم: اسلامی تناظر میں (شمارہ ۳، اشاعت خصوصی 'اسلامی ریاست میں نظام تعلیم) انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، جنوری، جولائی ۱۹۸۶ء۔

مشتاق احمد گوراھا، "زندہ تعلیم" مجلہ تعلیم و تحقیق آئی ای آر، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء۔

----، "پاکستانی نظام تعلیم کو اسلامیانا: توجیہہ اور لائحہ عمل" جرنل آف ریسرچ بہاءالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، جلد ۲، ۱۹۸۵ء۔

مصطفیٰ سباعی، ڈاکٹر، اسلامی تہذیب کے چند درخشاں پہلو (مترجم: معروف شیرازی)، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

مظفر بیگ (مدیر)، ہفت روزہ آئین (تعلیم نمبر)، ریلوے روڈ لاہور، ۱۹۸۴ء۔

ممتاز محی الدین غوری، پروفیسر، مسئلہ کیا ہے؟ (غیر مطبوعہ مقالہ)، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، نومبر ۱۹۹۱ء۔

منور ابن صادق، تعلیم و تعلم، صادقیہ پبلی کیشنز، لاہور، جولائی ۱۹۷۳ء۔

----، "اسلامی نظام تعلیم کے بنیادی فلسفیانہ تصورات" مجلہ تعلیم و تحقیق، ادارہ تعلیم و تحقیق، جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۰ء۔

----، "پاکستان میں تعلیمی انقلاب کا لائحہ عمل" ماہنامہ تعلیمات لاہور، مئی ۱۹۷۸ء۔

مودودی، سید ابوالاعلیٰ، تعلیمات، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

----، تصریحات (تعلیم سے متعلق انٹرویوز کا مجموعہ)، مرتب: سلیم منصور خالد، احباب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء۔

----، تنقیحات، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

----، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۶۶ء۔

----، سیرت سرور عالم، (جلد اول، دوم)، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۹ء

----، عصر حاضر میں امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل [illegible]

حامدی)ٔادارہ معارف اسلامی' لاہور' ۱۹۸۸ء۔

----' رسائل و مسائل (جلد چہارم)ٔاسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۰ء۔

----' خطبات یورپ (مرتب: اختر حجازی)ٔاحباب پبلی کیشنز' لاہور۔

----' تفہیم القرآن ادارہ ترجمان القرآن' لاہور' ۱۹۷۲ء۔

----' تمثیلات قرآنی (مرتب اختر حجازی) مکتبہ تعمیر انسانیت' لاہور' ۱۹۸۲ء۔

مولوی فیروز الدین (مترجم)' بیان المطلوب (سید علی ہجویری ؒ کی کتاب کشف المحجوب کا اردو ترجمہ)'فیروز سنز لمیٹڈ' لاہور ۱۹۷۶ء۔

مولوی محمد شفیع' "مقدمہ" کشف المحجوب مصنف سید علی ہجویری' طباعت بہ اہتمام احمد ربانی' لاہور' ۱۹۴۸ء۔

میاں طفیل محمد (مترجم)' ترجمہ کشف المحجوب (سید علی ہجویری ؒ کی کتاب کشف المحجوب کا اردو ترجمہ)ٔاسلامک پبلی کیشنز' لاہور' ۱۹۶۶ء۔

مہر محمد سعید اختر (مدیر)' تعلیم کی نظریاتی اساس: اسلامی تناظر' انجمن فاضلین' ادارہ تعلیم و تحقیق' جامعہ پنجاب' لاہور' ۱۹۹۲ء۔

نجاتی' محمد عثمان' القرآن اور علم النفس' الفیصل ناشران و تاجران کتب' لاہور۔

----' حدیث نبوی ؐ اور علم النفس' الفیصل ناشران و تاجران کتب' لاہور۔

نذر محمد' حافظ (مرتب) تعلیمی مقالات' (حصہ اول)' مجلس تعلیمات پاکستان لاہور' ۱۹۶۷ء۔

نعیم صدیقی' تعمیر سیرت کے لوازم ٔاسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۸ء۔

----' رسول اللہ ﷺ بحیثیت معلم ادارہ تعلیمی تحقیق' لاہور' ۱۹۸۵ء۔

----' محسن انسانیت ﷺ ٔاسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۱ء۔

----' "اسلام کی حکمت تعلیم و تربیت" مجلہ تنظیم تنظیم اساتذہ پاکستان' لاہور' جون ۱۹۸۱ء۔

----' "ادبی تحریک کے بنیادی تقاضے" اسلامی نظریہ ادب' (مرتب اسعد گیلانی' اختر حجازی)' ترجمان القرآن' (پرائیویٹ) لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۸ء۔

----،"تعلیم کا تہذیبی نظریہ" سہ ماہی تعلیمی زاویے' پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن' اسلام آباد' جلد ۶' شمارہ ۲' جولائی ۱۹۹۵ء۔

----"اشارات" ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور' جلد ۹۴' شمارہ ۳' نومبر ۱۹۸۰ء۔

----' معرکہ دین و سیاست ادارہ معارف اسلامی' لاہور' ۱۹۹۰ء۔

----' "دس باتیں" عشق رسول ﷺ کے حقیقی تقاضے' مکتبہ منصورہ' لاہور' نومبر ۱۹۸۵ء۔

----"خبردار امریکہ!" روزنامہ پاکستان لاہور' ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ء۔

نقوی' غلام الثقلین' "زمزمہ محبت ہے" ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور' جلد ۳۱' شمارہ ۱۲ دسمبر ۱۹۹۱ء۔

نوشینہ تحسین "فکر غزالی کی روشنی میں تشکیل نصاب" ماہنامہ تعلیمات لاہور' جلد ۱۳' شمارہ ۵' ۱۹۹۰ء۔

وحید الدین خان' علم جدید کا چیلنج مجلس نشریات اسلام' کراچی' ۱۹۷۷ء۔

وحید قریشی' قرآن حکیم کی روشنی میں تعلیم "آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس' لاہور۔

وسیم اختر' ڈاکٹر "صدر مملکت اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نام کھلا خط" ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور' جلد ۱۱۶' عدد ۱' ستمبر ۱۹۹۱ء۔

ہاشمی' بشیر احمد' تعلیمی مضامین' رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز' ایجوکیشنل پبلشرز' لاہور' ۱۹۳۹ء۔

ہمدرد فاؤنڈیشن' ہمدرد رپورٹ تعلیم ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی ۱۹۸۵ء۔

یوسف القرضاوی' ڈاکٹر' فکری تربیت کے اہم تقاضے (مترجم: سلطان احمد اصلاحی) اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ' لاہور' ۱۹۸۲ء۔

Adbo A. Elkholy "Towards an Islamic Anthropology", *Muslim Education Quarterly,* Vol.1 , No. 2, 1984.

Abdullah, S.M., *Stray Thoughts on Education in Pakistan,* Bazm-e- Iqbal, Lahore, 1989.

Al' Attas Syed Naquib (Ed.), *Aims and Objectives of Islamic Education,* Hodder and Stoughton, London, 1980.

Alexander and Halverson, *Effective Teaching in Secondary Schools,* Rinehart and Company, Inc; New York, 1956.

Association of Muslim Social Scientists, *Proceedings: First Symposium on Islam and Psychology,* American Trust Publications, Indiana, 1977.

Bennett, S.N., *Teaching Styles and Pupil Progress,* Open Book, London, 1976.

Best, John W; & Kahn, James S; *Research in Education,* Prentice-Hall International, Inc., Englewood Cliffs, 1970.

Brubacher, John S; *Modern Philosophies of Education,* McGraw Hill Book Company Inc; NewYork, 1950.

Bruner, J.S., *The Process of Education,* Harvard University Press, Cambridge, 1966.

Bukhtiar Hussain Siddiqui, *Education: An Islamic Perspective,* UGC, Islamabad, 1986.

Combs Arthur W., and others., *The Professional Education of Teachers: A Humanistic Approach to Teacher Preparation,* Allyn and Bacon, Inc., Boston, 1974.

Downey and Kelly, *Theory and Practice of Education: An Introduction,* Harper and Row Publishers, London, 1986.

Dreeben Robert, *The Nature of Teaching,* Scott, Foresman and Company, N.J., 1970.

Good, Biddle and Brophy, *Teachers Make a Difference,* Holt, Rinchart and Winston, New York, 1975.

Government of Pakistan, *Proceedings of the Pakistan Educational Confrence,* Karachi, 1947.

----,*The First Five Year Plan (1955-60),* National Planning Board, Karachi, 1957.

----,*Report of the Commission on National Education,* Ministry of Education, Karachi, 1959.

----,*The New Education Policy,* Ministry of Education, Islamabad, 1970.

----,*National Education Policy Implementation Programme,* Ministry of Education, Islamabad, 1970.

----,*Action Plan for Educational Development 1983-88,* Ministry of Education, Islamabad, 1983.

Highet, Gilbert, *The Art of Teaching,* Vintage Book, New York, 1950.

Hussain, S.S., and Ashraf S.A. (Eds.), *Crisis in Muslim Education,* Hodder and Stoughton, London, 1980.

Ilyas Ba-Younas, "Sociological Realism: An Islamic Paradigm" *The American Journal of Islamic Social Sciences,* Vol. 8, No. 1, March 1991.

Ismail Saad, Dr; "Islamization of Education in Pakistan" An Evaluative Study", Quarterly *Muslim Education,* The Islamic Acadmey, Cambridge, Vol. 4, No. 4, 1987.

Jacobson, Reavis, and Logsdon, *The Effective School Principal,* Prentice-Hall, Inc., Englewood Cliffs, N.J., August, 1960.

Khan M. Hamiuddin, *History of Muslim Education,* Academy of Educational Research, All Pakistan Educational Conference, Karachi, 1967.

Khan, Muhammad Sharif, *Islamic Education,* Republica Books, Lahore, 1987.

Khurshid Ahmad, Prof., *Principles of Islamic Education,* Islamic Publications Ltd., Lahore, 1978.

----, "Islam and Educational Reconstruction", *The Universal Message,* Karachi, Vol. 4, No. 9, February, 1983.

Lawrence, Elizabeth, *The Origins and Growth of Education* (Chapter on Pestalozzi), Penguin Books, London, 1970.

Lindsey Margaret (Ed.), *New Horizons for the Teaching Profession*, National Education Association of the United States, Washington, D.C., 1961.

Lowman Joseph, *Mastering the Techniques of Teaching*, Ferozersons Limited, Lahore, 1984.

M. Atta, Dr. "Islamic Education" *The Universal Message*, Islamic Research Academy, Karachi, Vol. I, No. 3, August 1979.

Maryam Jameelah, *Islam and Modernism*, M. Yousaf Khan, Sant Nagar, Lahore, 1966.

Moore, T.W., *Philosophy of Education: An Introduction* (Chapter on Teaching and Education), Routledge and Kegan Paul, London, 1982.

Muhammad Hamid Al-Afendhi and Nabi Ahmad Baloch, (Editors), *Curriculum and Teacher Education*, Hodder and Stoughton, London, 1980.

Munawar Ibn-e-Sadiq, "Strategies of Islamization of Education in Pakistan", *Bulletin of Education and Research*, Lahore,Vol. XIV, Nos. 1-2, 1982.

Mushtaq Ahmad Goraha, "An Interview with Dr. Din Muhammad Malik," *Taleem-o-Tahqeeq*, Vol. I, No.2, April 1969.

Naisbitt John and Aburdene Patricia, *Mega Trends 2000: Ten New Directions for the 1990s*, William Morrow and Company, Inc; New York, 1990.

Peters, R.S., *Education and the Education of Teachers*, International Library of the Philosophy of Education, London, 1977.

Pullias Earl V., and Young James D., *A Teacher is Many Things*, Indiana University Press, Bloomington, 1969.

Qamar Wahid Dr., "Application of Kohlberg's Theory of Cognitive Moral Development to Teacher Education", *The Sind University Journal of Education*, Vol. XIX, 1983.

Qureshi, Ishtiaq Hussain Dr., *Education in Pakistan,* (An Inquiry into the Objectives and Achievements), Maaraf Ltd., Karachi, 1975.

Richy W. Robert, *Planning for Teaching: An Introduction to Education,* McGraw Hill Book Company, New York, 1977.

Robert S. Zais, *Curriculum: Principles and Foundations,* Harper and Row Pub, Inc; New York, 1976.

Ryans, David G., *Characteristics of Teachers,* American Council on Education, Washington, 1960.

Sayyid Qutab, *Milestones* (English Translation), International Islamic Federation of Student Organization, Beirut, 1978.

Sayyid Sajjad Rizvi, *Islamic Philosophy of Education,* Institute of Islamic Culture, Lahore, 1986.

Saiyyidain, K.G., *Iqbal's Educational Philosophy,* Sheikh Muhmmad Ashraf, Lahore, 1954.

Shaikh, Asghar Ali, *Perspectives in Education,* Aziz Publishers, Lahore, 1981.

Shalaby, Ahmad, *History of Muslim Education,* Dar-ul-Kashshaf, Beirut, 1954.

Siddiqi, Abdul Hameed, *A Philosophical Interpretation of History,* Idara Nashriyat-i-Islam, Lahore, 1977.

Siddiqi Shamim A., *Methodology of Dawah Ilallha in American Perspective,* The Forum for Islamic Work, New York, 1989.

Siddiqui, Shahid Kaleem, "Collaborative-Learning Approach in School Language Acquisiton", *Bulletin of Education and Research,* Lahore, Vol; XVI, No. 1-2, 1994.

Skinner B.F., *About Behaviourism*, Vintage Books, New York, 1974.

Smith, Stanley and Shores, *Fundamentals of Curriculum Development*, Harcourt Brace and World Book Company, New York, 1967.

Syed Ali Ashraf, *New Horizons in Muslim Education*, The Islamic Academy, Cambridge, 1980.

Toffler, Alvin , *Future Shock*, Banton Books, New York, 1971.

----"The Changing Business Structure" ---- A Interview with Alvin Toffler by A.J. Vogl, Quarterly *Dialogue*, No. 93-3/91, pp. 7-10---- U.S. Information Agency, Washington and the American Centre, Islamabad.

Turner and Rushton (Eds.), *The Teacher in a Changing Society*, Manachester University Press, Manchester, 1974.

Townsend Robert, *Up the Organization*, A Fawcett Crest Book, Fawcett Publications, Inc; Greenwich, Conn; 1970.

Umm Al-Qura University, *Recommendations of the Four World Conferences on Muslim Education*, Ministry of Higher Education, Saudi Arabia, Makka Al-Moukarrama, 1983.

Van Dalen, Deobold B., *Understanding Educational Research: An Introduction*, McGraw Hill Book Company, Inc., New York, 1967.

Walter Yust (Ed.), *Encylopaedia Britanica*, Chapter on "Language" Britanica, Inc; 1964.

Wasi Ullah Khan Dr; (Ed.), *Education and Society in the Muslim World*, Hodder and Stoughton, London, 1980.

Will Durant, *The Story of Philosophy*, Feroze Sons Ltd; Lahore, 1988.

Wilson, John, *Educational Theory and the Preparation of*

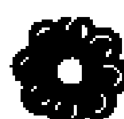
Teachers, NFER Publishing Company Ltd., New Jersey, 1975.

World Centre for Islamic Education "Makkah Declaration on Muslim Education", *News and Views on Muslim Education,* Vol. 1, No. 1, January-February, 1981.

Yates, A.J., (ed.), *Current Problems in Teacher Education,* Unesco, Hamburg, 1972.

Zafar Iqbal Siddiqui, "Academic Freedom", Quarterly *Taleem-o-Tahqeeq*, IER, Punjab Univeristy, Lahore, December 1974.

Zaltman and others, *Dynamic Educational Change,* Collier Macmillan Publishers, London, 1977.



پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن اسلام آباد

بلاک ۳۳ گرین پلازہ' الرکز جی۔۹' اسلام آباد۔ فون: ۲۵۵۰۶۳

شعبہ تربیت اساتذہ

- دوران ملازمت علمی اور پیشہ ورانہ تربیت کا انتظام
- تعلیمی سیمینارز' کانفرنسز اور ورکشاپس کا انعقاد
- تعلیمی ٹیکنالوجی اور سائنسی منصوبہ جات کے بارے میں نمائشوں کا اہتمام
- تعلیمیات سے متعلق مختلف امور و مسائل میں رہنمائی و مشاورت

شعبہ تحقیق و اشاعت

- تعلیم و تدریس کے اہم موضوعات پر تحقیقی کام
- قومی اور بین الاقوامی تعلیمی ریسرچ پراجیکٹس میں شرکت
- تعلیم و تعلم سے متعلق ماہرین تعلیم کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت
- پیشہ ورانہ تحقیقی جرائد "تعلیمی زاویے" اور "پاکستان ایجوکیشن ریویو" کی اشاعت

شعبہ بہبود اساتذہ

- اساتذہ کے بچوں کی تعلیم کے لئے وظائف اور فری کوچنگ
- سکول سطح پر مستحق طلبہ کو درسی میٹیریل کی مفت فراہمی
- اساتذہ کی نمایاں تعلیمی و تحقیقی کارکردگی اور خدمات پر مختلف ایوارڈز
- اساتذہ کے لئے رہائشی سکیموں کا اجراء

(مرگلہ ٹاؤن' فیروزہ ٹاؤن راولپنڈی / جی۔15 سیکٹر اسلام آباد / ایجوکیشن ٹاؤن لاہور)

شعبہ انتظامی امور

- ارکان کو فاؤنڈیشن کی کارکردگی کے بارے میں نیوز لیٹر کے ذریعے آگہی
- فاؤنڈیشن کے پراجیکٹس میں سرمایہ کاری کے مواقع
- فاؤنڈیشن کے رکن بن کر ان عظیم علمی و فلاحی منصوبوں میں شریک ہوں
- رکنیت فارم اور دیگر تفصیلات کے لئے مرکزی یا صوبائی دفاتر سے رابطہ کیجئے

صوبائی مراکز	لاہور	پشاور	کوئٹہ	کراچی	مظفر آباد (آزاد جموں وکشمیر)
	7833713	813581	41843	6764238	3619